

پہلی کہانیاں آپ بیتیاں جگ پیتیاں

کراچی

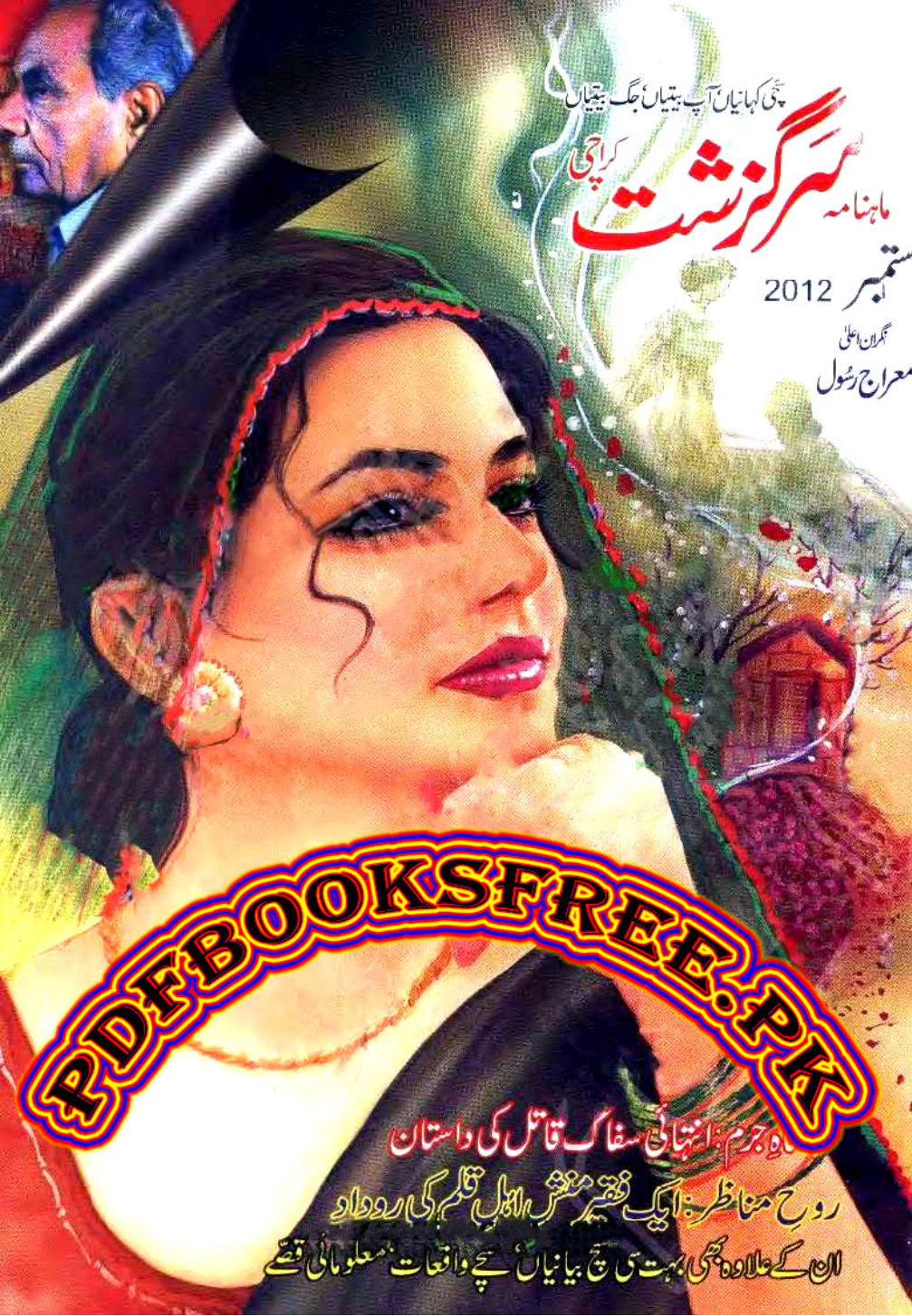
سنگرز نشست

ماہنامہ

ستمبر 2012

نگرانِ اعلیٰ

معراج رسول



PDFBOOKSFREE.PK

ادب جرم: انتہائی سفاک قاتل کی داستان

روح منظر: ایک فقیر معشر، اہل قلم کی روداد

ان کے علاوہ بھی بہت سی نیاں بیانیائیں سچے واقعات، معلوماتی قسطے

موجد

ادارہ

ایک صفحے میں مکمل ایک نادر روزگار کا تعارف خاص

شہر خیال

مدیر اعلیٰ

آپ کی باتیں آپ کے مشورے اور آپ کے سوال

روح مناظر

ڈاکٹر ساجد امجد

ایک نامور اہل علم کا زندگی نامہ

تحقیق

51

63

روداد زندگی

جنگ عظیم

83

اولاد چنگیز

مختار آزاد

چنگیز خان کی نسل آج کہاں اور کس حال میں ہے

شو بھو گیان

ابن کبیر

پاکستان کے ایک نامور ریڈیو کاتر

خونخوار عورتیں

لے اور اجپوت

عورتیں بھی کیا ایسی شقی القلب ہوتی ہیں

جنگل نامہ

93

103

فلم و صحافت

تذکرہ خاص

119

دشمن

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

ایک جانور اور ایک انسان دونوں دشمنی پر آمادہ تھے

فلمی الفیہ

علی سفیان افغانی

فلم و صحافت کی کئی ان کہانیاں، اس شخص کا تذکرہ جس کی معروف فلم کار کے تحقیقی شب و روز بنائی دھنیں ہرزبان پر ہے

سفیر موسیقی

سید عدنان ڈاکر علی

اس شخص کا تذکرہ جس کی معروف فلم کار کے تحقیقی شب و روز بنائی دھنیں ہرزبان پر ہے

جرم و سزا

131

151

ادب

کھیل کھلاڑی

153

شہنشاہ جرم

صائمہ اقبال

اس امر کی قاتل کا تذکرہ جو خوف کی علامت تھا

غالب

محمد ایاز رابی

کہتے ہیں کہ غالب کلمہ انداز بیان اور، ایک مختصر سی تحریر

اوپیکس

محمد عمران الحق

کھیلوں کی دنیا کا سب سے نمایاں شخص کشش کوئی اپنل میں محسوس کر لیتے

سراب

کاشف ذہیر

بلند حوصلوں اور بے مثل ولولوں سے گندمی تہلکہ خیز داستان

بیت بازی

قارئین

شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک دلچسپ سلسلہ

علمی آزمائش

ادارہ

ذہن قارئین کے ذوق جستجو کی تسکین کے لیے نفاذ انعامی سلسلہ

پہلی سچ بیانی

206

223

دوسری سچ بیانی

تیسری سچ بیانی

233

انسان

جمیل یوسف

وہ معراج انسانیت کی تلاش میں تھا اور اسے بہت کچھ مل گیا

گلاب

خوشبو

گلاب کسی بھی رنگ میں ہو خوشبو ہی بکھیرتا ہے

وہمی

ظفری

اسے وہم نے اپنا شکار بنالیا تھا جس کا نتیجہ ہے یہ روداد

چوتھی سچ بیانی

245

259

پانچویں سچ بیانی

چھٹی سچ بیانی

263

مہمان

راحیلہ منصور

بلوچستان میں جا بسنے والی کراچی کی ایک دوشیزہ کی دلچسپ کھٹا

سوال

منظر اما

وہ اپنے آپ کو کس عجیب انداز سے سزا دے رہا تھا؟

پرائز بانڈ

عالیہ ریاض

اسے راہ چلتے ایک پرائز بانڈ ملا جس نے اس کی زندگی بدل دی

ساتویں سچ بیانی

269

279

آٹھویں سچ بیانی

نویں سچ بیانی

283

وعدہ

شکیلہ قرآن علی

خود کو تباہ کر لیتا ہی محبت کا تقاضہ ہے، اس نے یہی کر دکھایا

سفید پوش

اختر شہاب

آج کا ان کس قدر بے بس ہو چکا ہے

لغزش

ڈاکٹر احمد صدیقی

الحمہ کی لغزش کی سزا عمر اے ملی

مدیر اعلیٰ: عذرا رسول

مصور: شاہ حسین

شعبہ اشتہارات

غیر اشتہارات: محمد زوہدان 0333-2256789

لنڈر کھانی: محمد صدیق خان 0333-2168391

رائی محمد 0323-2895528

فرزعلی بخش 0300-4214400



قیمت فی پیچ: 50 روپے • زیر سالانہ 600 روپے

پبلشر پروبر انٹر: عذرا رسول

مقام اشاعت: C-63، فیز 11 ایکس پریشن

ڈیزائنر: شریا یاسین کورنگی روڈ

75500 کلونی

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ایجنٹ پرنٹنگ پریس

ہاکی اسٹیڈیم کراچی

ذات کرامت کا پتہ: پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone: 35804200 Fax: 35802551
E-mail: jdggroup@hotmail.com

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قارئین کرام!
السلام علیکم!

بالآخر ماہ رحمت بھی گزر گیا، وہ مہینا جس میں قدرت کی سخاوت جوش میں رہتی ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ گناہگاروں کے لیے ایک نادر موقع ہوتا ہے مگر دیکھا یہ گیا ہے کہ اکثر افراد اس ماہ مبارک کی برکتوں اور رحمتوں سے پوری طرح فیضیاب نہیں ہو پاتے۔ روزہ نماز میں وقت نہ دے کر دنیا بنانے میں کوشاں رہتے ہیں۔ گراں فروشی اس مبارک ماہ میں جتنی کی جاتی ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ غربا کی عید حسرت و یاس میں گزر جاتی ہے مگر اس بار تو غربا پر ہی نہیں درمیانے طبقے پر بھی بجلی گری ہے کہ وہ بھی غربا کی سطح سے خود کو نیچے محسوس کر رہے ہیں۔ یہ بجلی کراچی ہے محکمہ بجلی نے۔ ایک طرف تو بلوں میں ہوش رہا، اضافہ تو دوسری جانب لوڈ شیڈنگ نے کہیں کا نہ چھوڑا۔ کاروبار ٹھپ رہا، آمدنی کے وسائل ختم، لوگ صفر پر آ گئے۔ جبکہ ہمارے وزیر خزانہ آئی ایم ایف کا قرضہ ادا کرنے کے لیے مزید قرضہ لیتے نظر آئے۔ یعنی ملک کو ہر جانب سے اندھیروں کی طرف دھکیلا جا رہا ہے۔ اس پر تہیہ کہ پورے رمضان کہیں نہ کہیں سے بڑی خوں ریزی کی اطلاع بھی آتی رہی جسے مغربی میڈیا خوب اچھا لتا رہا۔ پاکستان کا چہرہ داغدار کرتا رہا۔ ایسے میں ایک دو خبریں حوصلہ افزا بھی آئیں، مثلاً تنور پر روٹی سینکنے والے نے امتحان میں ٹاپ کر دکھایا، یا پھر پاکستانی طلبہ نے تقریری مقابلے میں دنیا بھر میں اول پوزیشن حاصل کر کے حیران کر دیا مگر حوصلہ شکن خبروں کا پلہ بھاری رہا۔ گو یا کہ ہم نے رمضان کے تقدس کو بھی مجروح کیا اور اس سے وہ فائدہ بھی نہیں اٹھایا جس کا اللہ نے ہم سے وعدہ کیا ہے۔ ایسے وقت میں احمد ظفر کا یہ شعر مجھے شدت سے یاد آ رہا ہے۔

جس بستی کا ہر دیوانہ اندر سے فرزانہ ہے
اس بستی پر وقت کا جادو چلتے چلتے چل ہی گیا

معراج رسول

17 مئی 1880ء بروز جمعہ کو دوست محمد خان کا گھر چلی مٹی سے پوتا جا رہا تھا۔ لیپائی کے بعد دیواروں پر سفیدی کرائی گئی۔ شام تک یہ تمام کام انجام پا گئے اور روشنی کا معقول انتظام کیا گیا۔ اریب قریب کے ذی حیثیت شرفا اور رشتے دار آنا شروع ہو گئے۔ ان کے بیٹھنے کے لیے یہاں سے وہاں تک چاندنی بچھا دی گئی۔ اس گھر میں ایک بچی پہلی آواز بلند ہوئی تھی۔ یہ ایک بہت بڑی خوشخبری تھی۔ اسی لیے اس خوشی میں شریک ہونے والے امیڈ آئے تھے۔ والد کو ڈال تھے تو نانا احمد خان کا کرشمہ حاصل دار۔ خوجہ (یوپی، بھارت) میں اس خاندان کا بڑا نام تھا اس لیے ہر کوئی مبارک باد دینے چلا آ رہا تھا۔ بھراکری بات اور تھی۔ خاندان بھر میں ایک غم سے کسی کے ہاں زندہ بچہ پیدا نہیں ہو رہا تھا اس لیے جس نے بھی بچے کے بارے میں سنا، دوڑا چلا آیا۔ یوں بھی یہ بچہ ایک بزرگ کی دعاؤں کے حصار میں تھا۔ بٹاور کے نزدیک کے کسی علاقے میں ایک بزرگ رہتے تھے، وہ اکثر اپنے مریدوں سے ملنے ہند کے دیگر علاقوں میں بھی چلے جاتے تھے۔ خوجہ میں بہت بڑی تعداد میں بختون آباد تھے۔ انہی میں دوست محمد خان اور احمد خان کا کڑ کا گھر اب بھی تھا۔ اخوندی دیگر مریدوں کے ہمراہ خوجہ تشریف لائے تو کاکڑ نے دعا کے لیے کہا۔ اخوندی نے پیش گوئی کر دی تھی کہ بیٹا ہوگا اور اس کا نام بھی تقی محمد رکھنا۔ یہ بچہ اسی دعا کا ثمر تھا۔ اسی لیے نام وہی رکھا گیا۔ اس رات خوب مہمانداری ہوئی۔ غربا تھرا کی جھولیاں بھری گئیں۔ بچے نے ہوش سنبھالا تو اس نے ابجد سے روشناس کرایا پھر کچھ بڑا ہوا تو اسے ملا نور احمد کے کتب میں داخل کر دیا گیا۔ خوجہ میں یہ سب سے اعلیٰ کتب تسلیم کیا جاتا تھا اور فیس بھی اٹھ آنے لگی۔ اس کتب میں نہ تو کسریٰ قبل کارواج تھا، نہ گھڑی تھی۔ وقت دیکھنے کے لیے دھوپ والی جگہ پر نشان لگا ہوا تھا۔ جب نشان تک دھوپ پکچتی تو چھٹی دے دی جاتی۔ کمروں میں چٹائیاں بھی تھیں جن پر طلبہ بیٹھتے۔ جمعہ کے دن تمام بچوں کو حکم تھا کہ گھر سے آئیں اور ملائی کے ساتھ جا کر جامع مسجد میں نماز ادا کریں۔ وہ وقت ہی اور تھا۔ ملائی کا رب و تعلیم کا اثر کہ بچے کی سرشت میں نمازی اور ملائی بیٹھ گئی۔ کتب کی تعلیم مکمل ہوئی تو دینی تعلیم کا خیال آیا اور بچے کو نو روپے جونی اسکول کے درجہ ہڈل میں داخلہ دلوا دیا گیا۔ یہاں کی تعلیم مکمل کی تو کوری کا خیال آیا اور سید سے انسپکٹر جنرل آف پولیس کے پاس پہنچ گیا جو انکسپشن دورے پر خوجہ آیا ہوا تھا۔ یہ دسمبر 1898ء کی بات ہے۔ ان دنوں ایک انگریز افسر کے سامنے تن کر کھڑے ہو جانا معمولی بات نہ تھی مگر وہ سید خان کے پاس گیا اور بولا ”عالی جناب! امیر خاندانی پیشہ سناہ گری ہے اس لیے مجھے محکمہ پولیس میں بھرتی کیا جائے۔“ انگریز افسر نے بھانپ لیا کہ وہ تو جوان حوصلہ مند ہے مگر عمر کم ہے۔ بیس سال سے قبل افسری مل نہیں سکتی تھی اس لیے بطور ہیڈ کانسٹیبل علی گڑھ بھیج دیا تاکہ قانون و قواعد پر پڑے آگاہی حاصل ہو جائے۔ اس زمانے میں ہیڈ کانسٹیبل کی تنخواہ دس روپے تھی۔ دو سال کی فزینگ کے بعد 1901ء میں فزینگ کالج مراد آباد بھیج دیا گیا۔ ایک سال وہاں فزینگ حاصل کی اور علی گڑھ آ گیا۔ اس شہر میں چند ماہ گزارے تھے کہ کوٹوالی مظفر نگر تاجہ ہو گیا۔ مظفر نگر کا کوٹوال ہر پرشاد تھا۔ انتہا درجے کا متعصب، بدعنوان اور رشوت خور۔ اس کی وجہ سے تقی محمد خان کو پولیس کی ملازمت سے نفرت محسوس ہونے لگی۔ جب ہر پرشاد صرف چند روپوں کی خاطر مسلمانوں کو کوٹوالی میں بلا کر تشدد کا نشانہ بناتا تو تقی محمد خان بچ و تاب کھا کر رہ جاتا۔ بلا خرہ انگریز سپرنٹنڈنٹ آف پولیس کے پاس شکایت لے کر پہنچا مگر سپرنٹنڈنٹ بھی مسلمانوں سے خار کھاتا تھا۔ اس نے بھی شکایت پر کان نہ دھرے۔ جب ڈپٹی انسپکٹر جنرل معائنہ کے لیے آیا تو یہ ان کے پاس پہنچا اور تمام حالات بیان کیے۔ ڈپٹی انسپکٹر جنرل نے ہر پرشاد کی عمرانی اور تقی محمد خان کے تاجہ لے کر حکم صادر کر دیا۔ تقی محمد کو فزینگ سپرنٹنڈنٹ جنرل آف پولیس لایا گیا۔ یہ 1904ء کی بات ہے۔ یہیں رہ کر مزید فزینگ حاصل کی اور آئی ڈی کے محکمہ میں ترقی دے دی گئی۔ فزنگ پرنٹ پر خود ہی ریسرچ کرتا رہا۔ آج جو نظام فزنگ پرنٹ رائج ہے، اس کے موجد بھی تقی محمد خان ہیں۔ محکمہ میں رہتے ہوئے یہ حیثیت سی آئی ڈی افسر اس نے بہت سارے اچھے ہوئے کیس حل کیے۔ انہی میں سے ایک ٹوٹوں کی چوری کا کیس ہے۔ یہ ایٹمی نوعیت کا عجیب و غریب کیس تھا۔ اس کیس کو حل کرنے میں محکمہ پولیس اور یو پی پولیس نا کام ہوئی تھی۔ واقعہ کچھ یوں تھا کہ محکمہ سے مر کنگھال پینک نے ایک ہزار روپے کے نوٹ پولش انشورڈ لفافے میں بنارس کے ایک سیٹھ کے نام روانہ کیے۔ سیٹھ نے لفافہ کھولا تو اس میں رڈی کاغذات تھے۔ اس اچھے ہوئے کیس کو اس نے سمجھا کہ انگریز افسروں کو گرفتار کر دیا۔ اسے حکومت نے خان بہادر کا خطاب دیا۔ اپنے دور میں اس نے ایسے ایسے کیس حل کیے کہ ہند کے محکمہ پولیس کے نصاب میں شامل کر دیا گیا۔ 1952ء میں کراچی آ گئے اور یہیں کی خاک میں مل گئے۔

ماہنامہ سرگزشت

شہرِ خیال

✉ خالد یوسفی، ایہ کے طویل خط کا اختصار ہے۔ "بے ترتیب" و "مکڑوں کو ترتیب" اور بے قرار چیزوں کو قرار دینے میں مرگ زشت کا مقصد "کا نام نہیں آتا۔ پہنچا۔" و "مکڑے کے دل کے ساتھ مردوق دیکھا جو باہن حال سے کہتا نظر آ رہا تھا کہ یہ عشق نہیں آتا جس میں اس نے اتنا کچھ لیے ہے آگ کا دریا ہے اور دُوب کے جانا ہے، فہرست کا مطالعہ کیا تو یہاں سے وہاں تک اور جہاں سے وہاں تک، عشق، عشق، عشق نظر آیا۔ ایک تو عشق دے دیے جاوے جائے اور مستزاد یہ کہ نہ کامیابی، یعنی

ہوا ہوں عشق کی عارت گری سے شرمندہ
سوائے حسرتِ تعمیر، مگر میں خاک نہیں

✉ محمد اسماعیل آج اگر نے پڑی کعب سے لکھا ہے ”تقریباً ایک سال کے بعد گزشتہ کی محفل میں حاضری دے رہا ہوں۔ امید کرتا ہوں اب ہمیشہ کی طرح خوش آمدید میں گے (دوبارہ شریف آوری پر خوش آمدید) اور اب باہمیں باکسر گزشتہ کی ۱ اگست 2012 کو کوہاٹ میں غریبوں کے تقاریر کا نمبر پڑا تھا۔ اور اب ہمیشہ کی طرح پھر۔ عشق اک لافانی جذبہ ہے، یہ عشق ہی تو تھا جو لاکھوں افراد نے اپنا خون بہایا، اس وطن کے لیے اس وطن یا مشن پر چڑھی۔ جس کی توجہ ملک پر ضرور مسائل کے باوجود قائم ہے اور وہ عشاق ہی قائد اعظم، علامہ اقبال، یلانی علی خان، چودری رحمت علی جب حیات رہے، اپنے عشق کی یعنی پاکستان کی حفاظت بڑی لگن سے کرتے رہے۔ اور جب سے اس عشق سے باور لاکھوں کے ہاتھ یہ وطن آیا تو ارض وطن کے

خان صاحب کے بارے میں اتنا معلوم نہیں تھا کیونکہ یہ میٹھا یا سہویتی دور بھاگتے ہیں۔ یہ جان کر اور بھی دکھ ہوا کہ ان کو خدا سے الگ کر دیا گیا اور محبت بھی نہ ملی۔ عطا اللہ خان میرے شروع سے نفرت منگ رہے ہیں۔ اب آگے چلا ہوں۔ سراب بہت زبردست جاری ہے۔ کاشف زہر صاحب کیا بات ہے آپ کی۔ اس بار صاحب کی خطا کچھ تھیں۔ اعزاز کے ساتھ بھی۔ باقی شہرہ جو ابھی میں نے پڑھا نہیں کیونکہ رمضان کریم میں مصروف تھا۔ آتی ہوئی ہیں کہ وقت نہیں ہوتا۔ ویسے امید ہے کہ باقی تمام کہانیاں زبردست ہوں گی۔ جناب عالی، برائے سہر یا بیانی خطا ضرور شائع کیجئے گا۔ ویسے آپ کی مرضی ہے کہ شائع کریں یا نہ کریں۔ کیونکہ شہر خیال میں سب پرانے لکھاری اور قاری ہوتے ہیں اور نئے لوگوں کا نام و نشان نہیں ہوتا، اب اجازت چاہوں گا۔“ (ہماری کوشش ہوتی ہے کہ نئے لوگوں کو بھی ستر لوگوں جیسی قدر تیرے، یہاں سے پرانے کی کوئی قدیمیں، قابلیت کی اہمیت ہے)

✍ **معراج الدین بن تکی** کا محبت و خلوص بھرپور ہوا تو میرا دل سے "نکارہ چونکہ حسب معمول لیٹ ملاں لیے صرف کچھ ہی حصہ پڑھا ہے۔ سراب بہت اچھی جاری ہے لیکن بہت سست رفتاری سے۔ مصنف سے ہماری درخواست ہے کہ اس کے ٹیپ کو تورا تیرے کیجئے۔ دوسری کہانی تقدیر عشق ہمیں بے انتہا پسند آئی۔ واقعی ایسی کہانیاں سرگزشت ہی کا خاصہ ہے۔ تقدیر عشق ہمارے پٹھانوں کے حلقے کی جی اور بہت اچھی تھی اور مصنف کے اعزاز یاں نے اسے چار چاند لگا دیے تھے۔ سب کے تھمرے بہت اچھے تھے۔ مہوش بائی کا تہیہ بہت پسند آیا۔ ان کو ہمارا سلام۔ طاہرہ بائی کو بھی سلام۔ آخر میں سب کو ہماری طرف سے رمضان کی خوشیاں مبارک اور ایلے وائس عید مبارک، خصوصی طور پر انکل شرعاس کو۔"

✍ **سردارہ بانو کاغذ**، شیرشاہ کراچی سے "ناکام عاشقوں کے ناکام فنانوں سے شہرہ عشق ناکام نبرہ ہاتھوں میں ہے۔ ایک منفرد اور خاص شہرہ جو تمام خاص نمبر پر بازی لے گیا۔ موضوع کے حوالے سے انکل ادارے میں وطن سے عشق کا اظہار کرتے نظر آئے مگر خرمیں وہ تجویز ادھی ہو گئے۔ عشق رنگین میں ایف ایم حسین کا ماحوری سے عشق حیران کر گیا۔ عشق بے چین میں مدح والا ہے۔ عشق کبھی نہ آسکے۔ لاکھوں دلوں پر راج کرنے والی حسینہ زہرا کی زندگی میں کس کس کس سے دو جاگتی، یہ تحریر پڑھنے سے پہلے میں اعزاز نہ تھا۔ عشق مسلسل پڑھ کر حیرت ہوئی کہ ایڈیٹر کا کیا جس کے پاس شہرت اور دولت کی کمی تھی، وہ بھی اپنے عشق کو پانے میں ناکام رہی۔ عشق شش جہت میں عافیہ فاروقی مختلف ناکام عاشقوں کے احوال بیان کرتی نظر آئیں۔ ایسے عاشقوں کے جو اپنے عاشق کو پانے میں ناکام رہے مگر آج وہ اپنے ناکام عشق کی وجہ سے اپنی اپنی ایک منفرد پہچان رکھتے ہیں۔ فلمی ایلید میں حسب توقع انکل آفاقی عشق ناکام نمبر کے حوالے سے فلمی دنیا کے روشن ستاروں کے ناکام عشق لے کر آئے۔ یہ حفاظتی حد ہے کہ وہ تو فنانوں کا موقع کے لحاظ سے تھے واقعات انھیں کے ذخیرے سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر لے آئے ہیں۔ سلام ہے آفاقی انکل کی بہت۔ عشق ناکام نمبر کے تمام ناکام عاشق اس شعر کی تصویر بنے نظر آئے۔" وہ میں ہی جانتا ہوں جو کچھ پڑھ کر گئی۔ دینا تو لطف لے گی میرے واقعات میں۔" 19 جولائی کے ایکسپریس اخبار میں جناب عارف خان کو انی نے مصنف کاشف زہر کے حالات زندگی لکھے ہیں، پڑھ کر دھوکے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ 11 سال میں کاشف مہذوری کا شکار ہوا لیکن آخرین ہے اس پر کہ اس نے بہت نہیں باری اور جسم کے مطلوب ہو جانے کے بعد اپنی وقتی فتن کو کام میں لا کر دینا سے دھوکا دیا اور اپنا مقام بیکر کیا۔ مگر یہ بھی ایک بڑی حقیقت ہے کہ ان کے کرداروں میں اخلاقی اقدار بہت زیادہ ہوتی ہیں کہ ان کے ہیرو دے رادھ نہیں ہوتے۔ پہلی جگہ بیانی عشق تمام ایک زبردست کہانی تھی۔ یہ کہانی سپر ہیتھی۔ اماں بی سے اتفاق کرتی ہوں کہ سلیو سے ہونے والی اولاد و ماحشرے میں فداقی بن جاتی۔ اماں بی نے بہت دور کی سوچی سمجھی، اصول عشق شاہینہ صاحبہ کی تحریر شروع سے آخر تک وہی الجھنوں کا شکار رہی، پڑھ کر کوئی متعجب نہ ہوا۔ معراج عشق میں ارشد بیانی سے عشق مجازی سے عشق الہی کا سفر بیان کیا، نہ جانے فرہانے کیا کیسی کہ تھی کہ عشق مجازی سے ہوتا ہوا وہ عشق الہی کو پانے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر عشق میں پھر کے عشق کا تذکرہ ہوا۔ ایسا کہ اس جملے نے دل کو چھو لیا کہ ایک محبت کی اس سے بڑی خواہش اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کی شادی ہو جائے اور وہ اپنے شوہر کے نام سے پہچانی جائے، اس خصوصی شہرہ کو پڑھنے کے بعد ہم بھی کسی انجانے شاعر کے جانے پہچانے شعر سے عشق ہوئی گئی کہ عشق نہیں آساں، بس اتنا سمجھ لیجئے، واک آگ کا دریا ہے اور دوب کے جانا ہے۔"

✍ **سعید احمد چاند** کا مکتوب متبرک کراچی سے "پوچھ حسب معمول لیٹ ملاں لیے شہر خیال میں حصہ میری تاخیر سے لے رہا ہوں۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ میرے خط کو شال اشاعت کرتے ہیں یا نہیں؟ (خیرت ہے کہ کراچی میں پڑھان پہلے آ جاتا ہے پھر میں آپ کو لیٹ ملاں شاید آپ پرانی تاریخوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہیں۔ اب سرگزشت کی تاریخ ایک ہفتہ آگے بڑھا دی گئی ہے) معراج رسول صاحب کا ادارہ یہ موجود حالات کے مطابق تھا جنہوں نے اس ملک کی تکمیل میں حصہ لیا، وہ اس جہاں سے سدا رہے کسی ان کی اولاد تو اس نے اس ملک کو سونپنے میں کوئی دیکھی نہیں لی۔ وہ اپنی روزی روٹی کے پھر میں ایسے پڑے کہ انہیں اس ملک کی بھلائی کی طرف دیکھنے کی فرصت ہی نہ ملی۔ یکے میں سرگزشت میں ناکام عاشق پڑی۔ ان کی شہرہ آفاق "بیر رانجھا" پڑھی جی کافی عرصہ پہلے اور اس کے بعد اس موضوع پر قلمیں بھی دیکھیں۔ خورشید انوری قلم میں انجاز اور فردوس نے بیر رانجھا کا کردار کیا تھا۔ قلم دیکھ کر لگتا ہے بیر رانجھا پھر سے زمین پر اتر آئے ہیں۔ عمارتوں کے عمارتوں کا ہم کھلے دل سے استقبال کرتے ہیں۔ غلام حسین نوٹاری صاحب، مایوسی کفر ہے، اس غلام کو کراچی کو قلم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی مٹی کو کھینچ دے گا۔ بھائی رانا محمد شاہ شکر ہے آپ نے اللہ سے میری خیر و عافیت کی دعا مانگی۔ مگر یہ۔ میں تو دن رات پاکستان کے ہر فرد کے لیے دعا ہے خیر ہی دعا کرتا ہوں اللہ تعالیٰ سے۔ طویل مگر دلچسپ تمبروں میں انجاز حسین شہار، عارف رسائل، خالد یوسفی، ایم۔

اسے خالق یعنی، غلام حسین نوٹاری، سدا رہا نوٹاری، رانا حبیب الرحمن، محضر علی خان، رانا محمد شاہد، ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی، رانا محمد سجاد، مہوش رفیق۔ محضر تہرلوں میں مدح خان، مارے خان، عافیت خان، تنگ۔ اس دفعہ ڈاکٹر یوسفی پھر میرے حاضر ہیں۔ اللہ کرے وہ خیریت سے ہوں۔ ڈاکٹر ساجد کی کاوش اچھی تھی مگر یہ کاشف کے تھیں کے پنے پڑی ہوئی۔ ساجد امجد صاحب، مجذوب عشق کی جگہ مدح جو بیانی سکسن ڈاکٹر ملک نے لکھے تو کوئی بات تھی۔ عشق رنگین پسند آئی۔ مریم کے خان صاحب کی پر دل آ جاتے ہے عمر کا کوئی نقش نہیں ہوتا۔ تصویر ریاض صاحب، آپ نے سوز عشق میں کچھ مبالغے سے زیادہ ہی لکھ گئے۔ معراج امام صاحب عشق بے یقین میں مدح بولا کی زندگی پر کچھ روشنی ڈالی ہے جو عشق سے۔ سرین منصور صاحب سراب عشق، اچھی محبت انگیز ہے۔ صاحبہ اقبال کی عشق کہ نصیب میں ابراہیم ملک کو پڑھا۔ ابن کیر کی کہ عشق، آصف ملک کی عشق مسلسل۔ زین مہدی کی عشق جنتی، بے جان کہانیاں تھیں۔ اس دفعہ مہر فہرست دہی مرزا صاحب، مریم عشق۔ اس داستان پر مملکت نے فرخ نور بھان بھان اور ترلوک کپوری مرزا صاحب اس 1947ء میں، میری طرف سے ڈاکٹر امداد گیلانی کو مبارکباد، باقی پڑھا ہے۔"

✍ **حکیم سید محمد رضا شاہ**، نورنگہ، میانوالی سے لکھے ہیں "عشق ناکام نمبر کا فی انتظار کے بعد ملا۔ وارث علی شاہ کے مختصر نامے میں اس کے حالات سے آگاہی ہوئی۔ شہر خیال میں انچاز حسین شہار مدح محفل کا محبت نامہ پڑھا۔ مفصل اور مقرر مقالہ ہے۔ اس کے علاوہ ایم اے باقی، محضر، سدا رہا نوٹاری، رانا حبیب الرحمن، محضر علی خان، رانا محمد شاہد، ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی، رانا محمد سجاد، مہوش رفیق کے محبت نامے پڑھے۔ محفل کے ذریعے خطوط میں ان دوستوں سے ملاقات ہوئی رہتی ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی مجذوب عشق میں فریڈرک نیلسن کے حالات زندگی پڑھے اور سلیو سے اس کی جذبہ دانی، دہشت سے آگاہی ہوئی۔ کچھ عشق ایسے محفل کا کبیر اختری کرتا ہے۔ عشق میں دل کی گئی چاہیے مگر دل کی گئی نہ ہائیں۔ انسان لیکن کا نہیں رہتا۔ مریم کے خان کے عشق رنگین میں فدا حسین کے حالات زندگی اور ادا کارہ ماحوری میں دلچسپی سے آگاہی ہوئی۔ ثابت ہوا ہے کہ عشق کی کوئی عمر نہیں ہوتی۔ پڑھا ہے میں بے دروغ فدا حسین کوگا۔ ماہرین نفسیات کے مطابق افسر باقت، استاد شاکر، ڈاکٹر مریم بیانی، سیریلینڈس انکھے رہنے سے ایک خاص حلق پیدا ہو جاتا ہے جس کو دیکھنے والے ایک خاص نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہ تعلق یا محبت ایک پاکیزہ جذبہ ہوتا ہے جس کو کوئی معافی پتائے نہیں جاسکتے۔ ہمارے عید اللہ بیگ، آخری محفل کے مختصر حالات زندگی پڑھے۔ سوز عشق میں تصویر ریاض نے عطا اللہ خان مصلیٰ نیلوی کے حالات زندگی کا احاطہ کیا ہے۔ کچھ ہے، خان صاحب کے گلے میں درد کا ایک پڑھ سوز جہاں آباد ہے۔ ہمارے علاقے کے ہیں۔ اور خان صاحب میانوالی کی پہچان ہیں۔ ان کے متعلق میرے پڑھا ہائیں بھلائے والے قابل ذمت ہیں۔ عشق بے یقین میں نا موراد کارہ مدح والا جن کی ذاتی زندگی مصائب سے عمارت ہے، قارئین کے لیے سب سے آواز ہے۔ سراب عشق میں ماحی کی ادا کارہ پروین بولنی کے حالات زندگی رقم ہیں۔ ان کے حالات اور خاص کر آخری عمر میں نرس بریک ڈاؤن ہونے کا پڑھ کر فکس ہوا۔ عشق کہ نصیب میں صاحبہ ابراہیم نے فنانوں اور ہولی ٹوڈی زندگی کو اجاگر کیا ہے۔ ابراہیم گلن کے ساتھ شادی کے بعد بھی اس کی زندگی میں بھی برقرار رہی۔ شکست عشق میں ابن کیر نے جو زمین اور حکیم نیلسن بولنا بیٹ کی عشق کی داستان کو رقم کیا ہے اور مدح ہائے میں ان کے حالات زندگی کے اتار چڑھاؤ کو بیان کیا ہے۔ عشق مسلسل میں آصف ملک نے پاکستانی ڈاکٹر حسنا اور مدح برطانوی شہزادی ڈیانا کے عشق کو رقم میں لاتے ہوئے ایک دردناک انجام عشق سے باخبر کیا ہے۔ عشق جنتی میں زین مہدی نے حافظہ عبدالکریم کے عشق مجازی سے عشق حقیقی کی طرف گامزن حالات کو ضابطہ تحریر میں لاتے ہوئے زندگی کا تاریخ دکھایا ہے۔ حاجی وارث علی کی کوششوں سے حافظہ عبدالکریم ایک نئی دنیا میں پہنچ گئے۔ عشق میں مرزا صاحبان کے واقعات پڑھے۔ اس پر قلم بھی بن چکی ہے۔ عشق ناکام نمبر ایک مکمل مملوئی جریہ ہے۔ اس کو پڑھ کر اور رمضان اچھا توڑ رہا ہے۔ آپ سب کو ایسا ہی نامہ شائع کرنے پر مبارکباد۔"

✍ **احمد خان تو حیدری**، کراچی سے رقم طراز ہیں "کاشف قرنی جی سوٹ والے عیاش مکران، معراج رسول جیسے پھرے عاشق کی طرح پاک سرزمین کے عشق میں قلعے ہوئے تو ہم دنیا کی سب سے بڑی دولت مند قوم ہوتے۔ بابر تک مبارک شب میں ملنے والی مملکت کا یہ حال، آف ہائے۔ ناکام عاشق حیرانجامی کی داستان بچپن سے زبان پر۔ محفل شہر خیال میں غوطہ لگا۔ انچاز حسین شہار کبھی ممدات پر براجان پایا۔ سب کے طویل تمبرے گئے، میرا نام و نشان ردی کی نوکری۔ عبدالرحیم فہم، علاء قسواں پڑی والے نہ بچا، نہ مکن۔ خالد یوسفی، پنی حیرت کے سرگزشت کا تو ڈیڑھ ماحفل آئے، یوسفی کی جگہ یوسف سوٹ تو نہیں ہے۔ مہدی حسن اور میں اختر جیسے ٹیم فنکار، آف ہائے کہاں سے لائیں۔ ایم اے خالق یعنی، واقعی زبردست۔ سرگزشت، سرگزشت ہے۔ یامین نوٹاری، ہجرہ گڈ۔ کرشن ولوت مار کہاں؟ علاء تمبرک سوئس بینک میں محفوظ ہے۔ تو تین عدالت کاٹل، باوجود رمضان شریف۔ کم کو جولا نے پنے ملنے پر ملاؤ گھبراؤ ہمیں حال جون کی تھوڑی بھی نہیں لی۔ آفاقی انکل سے شکوہ کیا کہ بادام میٹھکے کا حفظ کریں۔ مدح خان و مارے خان، خالد بننے پر مبارکباد۔ رانا حبیب الرحمن، رانا شاہد، قدرتی وسائل سے مالا مال۔ خاندانی لیبروں نے راعت، وقت و اپنی اپنے ذاتی دھن سے بھی کچھ نہ کیا۔ مہوش رفیق، محضر علی تمبرے ایسے۔ ناکام عشق وجہ جاتے کے لیے مجذوب عشق کو لگا کر اختصار سے سلمان عشق کے باروں سے انتہا ہے کہ اسلام میں مایوسی کا وہ ہے۔ شادی سنت نبوی ہے۔ شادی ضرور کریں۔ عشق رنگین، مریم کے خان۔ مقبول فدا حسین جیسے لوگوں کی کب اور کہاں قدر کی گئی۔ سوز عشق تصویر ریاض عطا اللہ نیلوی خوب پڑھا نا اب بھی سنتے ہیں۔ پانچ شادیوں کا قلم نہ تھا۔ عشق بے یقین، واہ معجزہ واہ معجزی امیر کرنے والی طسراقی شخصیت کا مدح والا ہے عشق تو پھر دنیا میں مدح والا ہے پڑھ کر کون خیر و صورت ہوگا۔ بالکل لاعلم تھے۔ سراب عشق، پروین بولنی کا تذکرہ آفاقی صاحب

روح مناظر

ڈاکٹر ساجد امجد

مسلمانان پر صغیر کی تاریخ..... بغداد، مصر و غرناطہ سے کم نہیں۔ اس سرزمین پہ کیسے کیسے لعل و گہر پیدا ہوئے۔ اس سرزمین کو یہ فخر حاصل رہا کہ اہل علم سے اس کا دامن بھرا رہا ہے جن پر آنے والی نسلیں بھی فخر کرتی ہیں۔ انہی میں سے ایک صاحب علم و عرفان، مجاہد قلم کا تذکرہ جس نے تمام عمر مجاہدہ میں گزاری، پر جا بحر علم جاری کیا مگر بھیس فقیرانہ رچائے رکھا۔ برق صفت، شعلہ نما بوکر بھی دل کو موم بنائے رکھا۔ اس اہل علم کا زندگی نامہ جسے ہم نے طاق نسیان پر رکھ دیا ہے۔

ایک صاحب عرفان کی زندگی کے شب و روز کا عکس

ہندوستان میں خلافت تحریک شروع ہوئی تو مسلمانوں میں اس کی مقبولیت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ ہر شہر میں زور و شور سے جاری تھی۔ ٹونک کا علاقہ دور دراز ہونے کی وجہ سے الگ تھلک رہا تھا لیکن ایک دن ایک مولوی صاحب چندے کے نام پر وہاں بھی پہنچ گئے۔ جمہور کا دن تھا وہ ایک مسجد میں پہنچے اور چندے کی اکیلے کے لیے تقریر کی ان کی تقریر میں زور بیان نہیں تھا۔ ہفتوں گزر گئے تھے۔ مشکل سے ہر جمہور چار پانچ روپے چندہ ہو یا تھا۔ تنگ آکر مولوی صاحب نے اہل ٹونک کو کھری کھری سنا ڈالیں۔

”اس شہر میں عربی مدرسہ بھی ہے، علم بھی ہیں اور طلبہ بھی ہیں لیکن جمود و بے حسی کی یہ انتہا ہے کہ ہفتوں سے چلا رہا ہوں کوئی میری پشت پناہی کے لیے تو کیا اُٹھتا بات بھی نہیں پوچھتا۔“

ان نمازیوں میں ایک طالب علم مناظر احسن گیلانی موجود تھا۔ اس پر مولانا کا طعن نہایت شاق گزرا۔ وہ یہ سوچ کر مسہر سے نکلا کہ اگلے جمہور کو وہ تقریر کرے گا اور مولوی صاحب کو بتائے گا کہ تقریر کیسے کی جاتی ہے۔ اس طالب علم نے پہلے ہی تقریر نہیں کی تھی لیکن اسے

اپنی قابلیت پر پورا یقین تھا۔ جمہور آیا تو وہ کسی خاص تیاری کے بغیر مسجد پہنچ گیا۔ جیسے ہی سنتیں ختم ہوئیں وہ تقریر کے لیے دفعتاً کھڑا ہو گیا۔ لوگ حیران تھے کہ وہ کیا تقریر کرنے لگا ہے۔ اس نے ایک آیت تلاوت کی اور پھر تقریر شروع کر دی۔ ابھی چندہ منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ مسجد میں کھرام مچ گیا، لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ ذرا ہوش آیا تو جس کے پاس جو چھوٹا پھینکا شروع کر دیا۔ کسی کے پاس روپے تھے، کوئی گھڑیاں بیچ کر رہا تھا، انگوٹھیاں اُچھال رہا تھا۔ تقریر ختم ہوئی تو پانچ سو روپے کا سرمایہ جمع ہو گیا تھا۔ کئی ہفتوں میں سو روپے بھی جمع نہیں ہو سکے تھے، ایک دن میں پانچ سو جمع ہو گئے۔

”کون ہیں یہ صاحبزادے جو مسلمانوں کو لوٹ کر چلنے پڑے؟“

”ارے صاحب، آپ نہیں جانتے، جان بھی کیسے سکتے ہیں؟ یہ ٹونک کے تو ہیں نہیں۔ مولانا برکات احمد کے پاس پڑھنے کے لیے ٹھہرے ہوئے ہیں۔ سنا ہے ان کے دادا بھی بہت بڑے عالم تھے۔“

”دہلی یا کھنکو کے تو معلوم نہیں ہوتے۔“

”ہیں بھی نہیں۔ بہار کا ایک گاؤں ہے گیلانی وہاں



”کے ساکن ہیں۔“

”یہی نام سنائیں۔“

”کوئی بڑی جگہ تو ہے نہیں جو آپ نے نام سنا ہوتا۔ باجج جو آدیوں پر مشتمل چھوٹا سا گاؤں ہے۔ برہمچہ سے ایک سڑک بہار شریف کو جاتی ہے۔ اسی سڑک پر بھگت سے میل دو میل کی دوری پر گیلیاں واقع ہے۔ اس کا پورا نام محی الدین پور گیلیاں تھا مگر اب تو صرف گیلیاں کہلاتا ہے۔ اتنا بھی اس لیے مشہور ہو گیا کہ اس لڑکے کے دادا مولانا محمد احسن بہت بڑے عالم تھے۔ انہوں نے گیلیاں میں درس و تدریس کا آغاز کیا۔ شہرہ ہوا تو کامل تک کے طلبہ پڑھنے کے لیے آنے لگے۔ خاندانی زمیندار تھے اس لیے پیسے کی ہوس بھی نہ ضرورت۔ فی سبیل اللہ پڑھایا کرتے تھے۔“

”کیا نام بتایا آپ نے ان صاحب کا؟“

”مولانا محمد احسن۔“

”یہ نام کچھ سنا ہوا معلوم ہوتا ہے۔“

”ضرور سنا ہوگا۔ آپ تو رام پور کے رہنے والے ہیں۔ مولانا احسن نے رام پور میں بھی تعلیم حاصل کی تھی۔“

”جی ہاں، جی ہاں، یاد آگیا۔ پچھلے دنوں میرا رام پور جانا ہوا تھا۔ وہاں میں چند علما کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ ذوقی علم کا تذکرہ چھڑ گیا۔ مثال میں مولانا احسن کا نام لیا گیا تھا مگر وہ تو کہہ رہے تھے کہ صاحب بہار کے تھے۔“

”بہار ہی سمجھو، گیلیاں وہاں کا گاؤں ہی تو ہے۔“

”راپوری علما نے مجھے عجیب لطیفہ سنایا۔ مولانا احسن بالکل پڑھ لکھے نہیں تھے جیسا کہ زمیندار گھرانوں میں ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ شادی بھی ہو چکی تھی بلکہ ایک لڑکا بھی تھا۔ ایک دن کسی نے کوئی ایسا طعنہ دے دیا کہ تحصیل علم کے لیے گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور چودہ سال تک گھر لوٹ کر نہیں آئے۔ بنارس، بھکسو اور رام پور میں رہ کر علم حاصل کیا۔ گھر اس وقت لوٹے جب مفتاح عالم بن چکے تھے۔“

”میں نے آپ کو تو کہہ دیا کہ وہاں میں یہ قہر بھی سن چکا ہوں۔ واقعی عجیب مثال ہے۔ تو یہ لڑکا اس تعلیم دادا کا پوتا ہے۔“

”سچ کہا ہے کسی نے چراغ سے چراغ ضرور جلتا ہے۔ یہ صاحبزادے بھی اپنے دادا کے نقش قدم پر چلتے نظر آرہے ہیں۔“

”ان سے بھی دو ہاتھ آگے نظر آتے ہیں۔ دیکھا نہیں کیسی پرتا شیر نظر رہی۔ نمازیوں کو لڑا کر ہی دم لیا۔“

”ہاں صاحب، یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے۔“

اس دن سے اگلے دن تک پورے شہر کی زبان پر اسی طالب علم کے چرچے تھے۔ اس طالب علم کا نام مناظر احسن گیلیاں تھا جو گیلیاں میں پیدا ہوا۔ والد حافظ ابوالخیر مگر پڑھے لکھے آدمی تھے۔ مولانا احسن کی بے وقت موت نے انہیں علم سے دور کر دیا تھا البتہ تایا ابوالنصر نے پڑھنا اور لکھنا جا کر مروجہ نصاب کی تکمیل کی تھی۔ ان کے کوئی اولاد نہیں تھی اس لیے مناظر احسن گیلیاں کی تعلیم کی ذمہ داری انہوں نے قبول کی۔ ابتدائی تعلیم خود دی اور پھر اسے مزید تعلیم کے لیے ٹونک بھیج دیا۔

یہ پہلا موقع تھا جب مناظر احسن گیلیاں نے ریل کی شکل دیکھی۔ بہار دیو پنی جیسے علمی صوبوں کے شہروں اور بڑے بڑے علمی مراکز سے گزرتے ہوئے اسے اس ریل نے راجپوتانہ کے ایک اسٹیشن پر اتار دیا۔ وہ خوش تھا کہ منزل آگئی مگر اسے بتایا گیا کہ وہ جس منزل کا طالب ہے وہ تو یہاں سے چالیس میل دور ہے۔ تو کیا مجھے دوسری ٹرین میں بیٹھنا ہوگا؟ کوئی ٹرین وہاں نہیں جاتی۔ کوئی لاری تو جاتی ہوگی؟

کچھ سڑک کوئی بنی نہیں ہے پھر لاری کیسے چلے گی یہ بیاباں پیدل پار کرنا ہوگا ہمت ہے اور پیسے نہیں ہیں تو پیدل، ورنہ شتر گاڑی پر جانا پڑے گا۔

وہ راجپوتانہ کے نوآبادی اسٹیشن پر کھڑا تھا۔ اب تک اس نے غور نہیں کیا تھا ورنہ شتر گاڑی اس کے قریب ہی کھڑی تھی۔ اونٹوں کی دو منزلہ عجیب و غریب شکل کی گاڑی۔ اس کے علاوہ دو مسافر اور بھی تھے۔ ان کے ساتھ وہ بھی سوار ہو گیا۔ شتر گاڑی نے اپنی آہستہ خرابی دکھانی شروع کی۔ کمر کی چوٹیں لپٹنے لگیں تو اسے عربوں کی بے چارگی پر رحم آنے لگا۔ ان کی تو سواری خاص یہی تھی۔ کیسے سفر کرتے ہوں گے؟ شاید وہ اونٹ کسی دوسری نسل کے ہوں گے۔

”میاں صاحبزادے، ٹونک کس سلسلے میں جانا ہو رہا ہے؟“

”سید برکات احمد صاحب کے پاس کسی کام سے جا رہا ہوں۔“

”طالب علم ہو؟“

”وہ بھی ہوں۔ فی الحال تو ان سے ملنے جا رہا ہوں۔“ وہ یہاں کے ماحول کو دیکھ کر اچھی یہ فیصلہ نہیں

کر پار تھا کہ یہاں رہ کر تعلیم حاصل کر بھی سکے گا۔ اسی لیے خود کو طالب علم کہتے ہوئے بچپن رہا تھا اور زیادہ بات بھی کرتے ہوئے کترا رہا تھا۔ اسی لیے دوسری طرف کر کے بیٹھ گیا تھا۔

”میں جب آتوں تو آپ مجھے ان کا بتا دیں گے؟“

”وہ ٹونک کے امرا میں ہیں۔ خیر آباد کا مقبولی مدرسہ

ان کی پہچان ہے جس سے بھی کہو گے ہاتھ پکڑ کے پہنچا دے گا۔ گھبراتے کیوں ہو؟“ وہ پھر اسی طرح مزہ دوسری جانب پھیر کے بیٹھ گیا۔ اب کوئی بات کرنے کی تھی بھی نہیں۔ صبح سے شام ہو گئی تھی، اونٹوں کی آہستہ بلکہ ست خرابی کم ہی نہیں ہو رہی تھی۔

اسے یہ تو یقین تھا کہ جب بھی پہنچے وہ برکات احمد تک پہنچ جائے گا لیکن وہ یہ ضرور سوچ رہا تھا کہ برکات احمد صاحب اس سے کس طرح پیش آئیں گے اور بعد میں استاد کیسے ثابت ہوں گے؟

مناظر احسن کے دادا مولانا احسن کے علاوہ میں موگیر کے مولانا داعم علی بھی تھے جنہوں نے درسیات عربی کے بعد طب پڑھ لی تھی اور ریاست ٹونک میں شاعری طبیب مقرر ہو گئے تھے۔

مولانا داعم کے فرزند سید برکات احمد کا ان دنوں بڑا شہرہ تھا خصوصاً علم معقولات میں ان کا کوئی نعم البدل نہیں تھا۔ برکات احمد مشہور مقبولی عالم مولانا عبدالحق خیر آبادی کے شاگرد رشید تھے جن کی خدمت میں وہ سولہ سال رہے تھے اور نصاب معقولات کی تکمیل کی تھی۔

انہوں نے مدرسہ قائم کیا تھا۔ طلبہ سے کوئی معاوضہ نہیں لیتے تھے بلکہ خود اپنے گھر سے بیس بیچیں طلبہ کو روزانہ دونوں وقت کھانا دیتے تھے۔

والد کی جگہ والی ٹونک کے طبیب خاص ہو گئے تھے۔ معقول تنخواہ تھی، ایک گاؤں بھی جاگیر میں تھا۔ کئی ذاتی مکان تھے لہذا وہ یہ سب برداشت کر سکتے تھے کہ ذاتی خرچ سے مدرسہ چلائیں۔ ان کے مدرسے میں معقولات (عقلی علوم، منطق و فلسفہ وغیرہ) کی تمام کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ جن کے پڑھنے کا اب ٹونک کے سوا کہیں رواج باقی نہیں رہ گیا تھا۔ ان علوم کی طلب جس کو ہوتی تھی وہ ٹونک کا رُخ کرتا تھا۔ مناظر احسن کے تایا نے اسی تعلق کی وجہ سے جو برکات احمد کے والد سے تھا انہیں ٹونک بھیجا اور اس لیے بھی کہ ابوالنصر معقولاتی علوم کو اہمیت دیتے تھے اور یہ سہولت

ٹونک میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ چودہ سال مناظر احسن جب سید برکات احمد کے سامنے پہنچا اور انہیں معلوم ہوا کہ وہ مولانا احسن مرحوم کا پوتا ہے تو بے اختیار شفقت کا ہاتھ سر پر رکھ دیا۔

وہ ٹونک کے اسی مدرسے میں جم کر بیٹھ گیا اور تعلیم حاصل کرنے لگا۔ وہ اپنے وطن گیلیاں میں منطق کی کچھ کتابیں پڑھ چکا تھا لیکن برکات احمد صاحب نے غیر معمولی شفقت اور توجہ کی وجہ سے اس فن کے ابتدائی رسالہ ایسا غوثی سے پڑھانا شروع کیا۔

جب پہلی کتاب شروع کی تو محنت و شوق کا یہ عالم تھا کہ اس رسالے کے مبلوطہ کئے کثرت ملتے تھے لیکن اس نے اس کا نسخہ اپنے ہاتھ سے تیار کیا۔ روز کا سبق قلم سے لکھ لیا کرتا تھا اور استاد سے جو تقریر اس سبق کے متعلق سنا اسے حاشے پر یہ زبان اردو چڑھا لیا کرتا تھا پھر دوسری کتابوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ استاد کی درسی تقریروں کے نوٹ لکھنے کا سلسلہ زمانے تک جاری رہا۔ اسی کے ساتھ معقولات ہی کے سلسلے کے بعض نادار مخطوطات کو اپنے قلم سے نقل کیا۔

اس مدرسے کے ایک دوسرے استاد مولانا اشرف سے عربی ادب، ریاضی اور ہیئت و هندسہ کی کتابیں پڑھنے کا موقع ملا۔ یہی وہ دن تھے جب اس نے خلاف تحریک کا چندہ جمع کرنے کے لیے پہلی مرتبہ تقریر کی۔ اتفاق یہ بھی تھا کہ مولانا برکات نواب صاحب کے ساتھ ٹونک سے باہر گئے ہوئے تھے۔ میدان خالی تھا ورنہ شاید وہ تقریر کرنے کی ہمت نہ کرتا کیونکہ استاد محترم طلبہ کے لیے وعظ کوئی کو سخت ناپسند کرتے تھے۔

استاد کو واپس آنے میں ایک ماہ کا عرصہ لگ گیا اور شاگرد کی تقریروں کو موقع ملتا رہا۔ ایک تقریر کے بعد ہی وہ واعظ شہر مشہور ہو گیا۔ لوگوں نے دعوتیں شروع کر دیں۔ ملتے جلتے جلسے ہونے لگے۔ چندہ جمع کرنے والے مولوی صاحب کی تو چاندی ہو گئی۔ ہر وقت اسے اپنے ساتھ لگائے رہتے۔

دس بیس تقریروں کے بعد اسے محسوس ہوا کہ جو کچھ اسے یاد تھا وہ سب سنا دیا۔ کہنے کو کچھ باقی ہی نہیں رہا۔ ادھر جو پندہ برائی ہوئی تھی اس کے بعد وصلہ بڑھ گیا تھا۔ تقریریں چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ تقریروں کے لیے نئے مضامین کی تلاش ہوئی تو امام غزالی کی کتاب احیاء العلوم کی طرف متوجہ ہوا۔ غیسا نایاب ہاتھ آیا۔ تقریروں میں مزید

جان آگئی۔ لوگ اس کی تقریریں سننے کے لیے اڈے پڑتے تھے۔ اس کے لیے تو یہ بہت آسان تھا کہ عربی میں پڑھ کر اردو میں بول دیا کرتا تھا لیکن عام لوگوں کے لیے یہ نئی دنیا تھی۔

تغذیب ابھی مزید کی آرزو کر رہے تھے کہ استاد سفر سے واپس آ گئے۔ آتے ہی یہ خبر ملی کہ وہ شاگرد دے وہ مدرس بنانا چاہتے تھے واعظ شہر بن گیا ہے۔ اس دن اس نے یہ بھی دیکھ لیا کہ استاد کو غصہ بھی آتا ہے اور یہ غصہ اس پر اتر سکتا ہے۔ جب خوب گرج برس چکے اور یہ وعدہ لے چکے کہ وہ آئندہ تقریر کرنے... کہیں نہیں جائے گا تو پھر ان مجرموں کے بارے میں پوچھا جنہوں نے اسے واعظ شہر بنانے کا جرم کیا تھا۔ ان بے چاروں کی جو درگت بنی وہ تو بیان سے باہر ہے۔ مناظر احسن نے اجاء العلوم کا مطالعہ دوسروں کے لیے شروع کیا تھا لیکن اس کے سحر میں وہ خود گرفتار ہو گیا۔ یہ تو دنیا ہی نئی تھی۔ معقولات کے وہ سارے تانے بانے بکھر گئے جو سات سال میں بڑی کارگیری سے تیار ہوئے تھے۔ علم تو وہ ہے جو اس کتاب میں ہے۔ اس نے چپکے چپکے امام غزالی کی بعض دوسری کتابیں بھی ختم کر لیں۔ وہ اب تک اپنے تائیا کی زبانی بھی یہی مانتا آیا تھا کہ منطق و فلسفہ ہی سب کچھ ہے۔ استاد نے بھی یہی بتایا تھا لیکن اجاء العلوم پڑھ کر تو معلوم ہوا ”چیزے دیگر است“ علوم معقولات کی شان ہی اور ہے۔ فہم عشق کی تڑپ ہی دوسری ہوتی ہے۔

اب تو حال یہ ہوا کہ نہ منطق کی کتابوں میں جی لگتا تھا نہ فلسفے میں۔ ایک اضطراب تھا جو دل کو سسل رہا تھا، کیا پڑھے کہاں جائے۔ اضطراب تھا کہ بڑھتا ہی جاتا تھا۔ اس عالم اضطراب میں خواجہ اجیر کی یاد آئی۔ یہ ٹونک سے قریب بھی تھا اور قیام کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ اسے یاد آیا کہ ایک صاحب مولانا امین الدین ہیں جو سید برکات احمد کے علاوہ میں سے ہیں۔ اس اعتبار سے وہ میرے استاد بھائی ہوئے۔ استاد کا خیال کرتے ہوئے وہ مجھے اپنے پاس ٹھہرا لیں گے۔

درگاہ اجیر پر پہنچ کر شاید دل کو قرار آ جائے۔ آپ وہاں کی جدی ملی بھی ہو جائے گی۔ یہی سب سوچ کر اس کے سمندر شوق نے اجیر کی جانب پرواز کر ڈالی۔

دربار اجیر کا خیال آتے ہی بے اختیار جذبات اٹھ کر آئے۔ اپنی بے بساختی پر نظر ڈالی۔ اتنے بڑے دریا میں جہاز ہاؤں کے لڑکے کیا ٹھاون؟ جب کوئی بادشاہ کے بلند

میں جاتا ہے تو نذر پیش کرتا ہے۔ میرے پاس کیا ہے، کیا پیش کروں گا۔ ذہن میں پچھل ہوئی اور یہ نظم کاغذ پر منتقل ہو گئی۔

بے طرح درد سے دل آج بھرا آتا ہے
خون بن کر جگر آنکھوں میں چلا آتا ہے
حسرت و یاس کا سینے سے پر آتا ہے
شکوے آتے ہیں چلے اور بگڑ آتا ہے
جسم میں آج مری جان کھٹی جاتی ہے
میرے ارمانوں کی انکم لٹی جاتی ہے
☆☆☆

ہائے اسلام پہ کفار مظالم توڑیں
ہم ضعیفوں پہ چلے دل کے پھولے پھوڑیں
عورتوں تک کو نہ مردود شیطاں چھوڑیں
جہنمیں سکیزوں اٹلی ہی وہ ہم پر جوڑیں
آہ دنیا سے مسلمان اٹھے جاتے ہیں
تج سٹیت سے مظلوم کٹے جاتے ہیں
☆☆☆

نہ یہی بلکہ وہاں گنبد افلاس ڈھایا
لوٹا غارت کیا جس چیز کو اس نے پایا
اس ستم نے فلک بھر کو بھی چکرایا
گویا ایران پہ پھر چڑھ کے ہلاک آیا
روضہ پاک میں اور خون مسلمانوں کا
پھر بھی ٹھنڈا نہ کچھ ہوا شیطانوں کا
جوانی میں سب شاعر ہوتے ہیں وہ یہ تھا۔ کبھی کبھی اشعار نظم کر لیا کرتا تھا لیکن یہ نظم جس روانی سے اور جتنی جلدی ہوتی اس پر وہ خود حیران تھا۔

اس نے یہ نظم جب میں ڈالی اور کسی کو کچھ بتائے بغیر ٹونک سے غائب ہو گیا۔ شوق کی سواری اسے کشاں کشاں اجیر لے جا رہی تھی۔ اس سواری نے اسے یہ خیر و عافیت اپنے استاد بھائی مولانا امین الدین کے مکان پر اُتار دیا۔ وہ بھی حیران کہ اُدھر کا چاند اُدھر کیسے نکل آیا۔ کیفیت سنی تو ٹھنڈی سانس بھری۔

”بالکل صحیح جگہ پر آ گئے۔ جب تک جاہو قیام کرو۔ تم خود نہیں آئے ہو خواجہ نے بلایا ہے۔“ ذوقی خطابت کا احوال سن کر بڑے خوش ہوئے۔

دو ایک دن بعد ہی اجیر کی شاہ جہانی مسجد لے کر پہنچ گئے۔ وعظ گوئی کا جنون ابھی اُتر نہیں تھا اور پھر مانتے مانتے

بہار کا مجمع۔ نو جوانی کا چشما تھا، مسکے وہ بے خودی شروع سے تھی اور اب تو وہ خواجہ کے شہر میں تھا۔ بولنا شروع کیا تو مجمع حویرت ہو کر دیکھ رہا تھا۔ انداز و اعظانہ نہیں خطیبانہ تھا۔ موقع با موقع منتخب اشعار کی گل افشانی ہو رہی تھی۔ نکتہ آخری بھی تھی اور علمی معلومات کا سیلاب بھی جو اٹھ چلا آتا تھا۔ ایکس سال کی عمر اور یہ انداز۔ بھی پھول برسا رہا تھا، کبھی آگ لگا رہا تھا۔ جو حال ٹونک کی مسجد میں لوگوں کا ہوا تھا وہی حال یہاں بھی ہوا۔ اس نے تقریر ختم کی تو آہوں اور سسکیوں کے سوا وہاں کچھ نہیں تھا۔

وہ نظم میں بھی جو وہ خواجہ اجیر کی نذر کرنے کے لیے لایا تھا اور پچھل رہی تھی کہ اسے سنایا جائے۔ اس نے یہ نظم خواجہ کے قبضہ کے سامنے کھڑے ہو کر سنائی تو سانس باندھ دیا۔

اجیر کے کچھ دن قیام نے دل کو کچھ سکون بخشا۔ دل قابو میں آیا تو استاد دھڑم کا خیال۔ کیا سوچتے ہوں گے کہ میں نے ان کے احسانات کا کیا بدلہ دیا۔ اجازت لیے بغیر ہی بھاگ آیا۔ واپس جا کر رخصت معذرت تو کروں۔ اس کے بعد دیکھوں گا مجھے کیا کرنا ہے یہ شرم بھی دامن گیر تھی کہ میزبان پر کب تک بوجھ بنا رہوں گا۔ اس نے اجازت طلب کی اور ٹونک واپس آ گیا۔

یہاں پہنچتے ہی قدرت کی طرف سے ایک نیا حادثہ پیش آیا کہ ہیضہ جیسی وبائی بیماری پھیل گئی۔ ایک ایک دن میں کئی کئی افراد اپنی جان سے ہاتھ دھوئے لگے۔ ایک دن تو مرنے والوں کی تعداد اسی تک پہنچ گئی۔ غصہ تو یہ ہوا کہ وہ خود بھی اس وبائی مرض کا شکار ہو گیا۔ حملہ اتنا شدید تھا کہ سینے کی کوئی امید نہیں رہی تھی۔ مدرسے کے دس بارہ طالب علم شب و روز اس کی تیمارداری میں لگے ہوئے تھے۔ مولانا برکات خود حاذق حکیم تھے نہایت تندہی سے اس کا علاج کر رہے تھے لیکن ہر روز مایوسی کا ایک لفظ کہہ کر اٹھ جاتے تھے۔

ایک دن سر ہانے آ کر بیٹھے۔ وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ مولانا برکات نے بغیر ٹوٹی اور آبدیدہ ہو کر سر ہانے سے اٹھ گئے۔ اسی وقت ایک معمر بزرگ جہنمیں سید احمد بریلوی کی رفاقت کا شرف تو عمری میں حاصل ہوا تھا عیادت کے لیے تشریف لائے۔ نیم بے ہوشی کی حالت میں ان بزرگ کی زبان سے اس نے کچھ سنا، کیا سنا تھا یہ اس نے بھی نہ کی کوئی بات بتائی بس آنکھوں سے شبہ نے دیکھا کہ وہ جس

کی طرف سے سب مایوس ہو چکے تھے تیزی سے صحت یاب ہونے لگا۔ گویا مردہ زندہ ہو گیا۔ حملہ اتنا شدید تھا کہ اسے صحت تول کی گئی لیکن پینائی تقریر مفقود ہو گئی لیکن اب طیب مایوس نہیں تھا۔ مولانا برکات نے خوشخبری دی تھی کہ پینائی عارضی طور پر چلی گئی ہے جیسے جیسے صحت بحال ہوگی پینائی بحال ہوتی چلی جائے گی۔ دفتر دفتر روشنی بھی آگئی۔

دباؤ دہ شہر میں داخل ہونے کی نمائندگی کی تھی ہے اس لیے گیلانی سے کوئی بھی تیمارداری کے لیے نہیں آیا تھا۔ اب جو صحت یابی کا تار دواں پہنچا تو وطن واپسی کے قاضے ہونے لگے۔ گھر والوں کے تقاضوں سے ٹونک سے گیلانی آ گیا۔

گیلانی کی تنہائی میں رہ رہ کر اجیر کا خیال آتا رہتا تھا۔ جن دنوں اس کا قیام اجیر میں تھا میزبان کی زبان سے حدیث پڑھانے کی تشریف بخاہند حضرت مولانا محمود حسن کے متعلق سن چکے تھے۔ بار بار خیال آتا تھا کہ معقولات کی ساری کتابیں پڑھ چکا، نصاب کی تکمیل ہو چکی، صرف حدیث پڑھنے کا مسئلہ باقی رہ گیا ہے لہذا شیخ الہند کی خدمت میں دیوبند چلنا چاہیے۔ اس نے اپنے تائیا ابوالنصر سے عرض کیا کہ اب وہ ٹونک نہیں جائے گا۔ اسے حدیث پڑھنے کے لیے دیوبند جانے کی اجازت مرحمت فرمادیں۔

تائیا کو کسی طرح گوارا نہیں تھا کہ وہ دیوبند جائے۔ وہ ٹونک بھیجے کے حق میں تھے۔ ٹونک کی طرف سے دل پھر چکا تھا بلکہ معقولات کی طرف سے دل پھر چکا تھا اور ٹونک میں معقولات کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ردود قرآن کا سلسلہ جاری رہا اور بالآخر اس کے مربی تائیا کو اس کا فیصلہ ماننا پڑا۔ طے ہو گیا کہ رمضان اور عید گزارنے کے بعد وہ دیوبند چلا جائے گا۔ اجازت مل گئی لیکن اب سوال یہ تھا کہ داخلے کا مرحلہ کیسے طے ہو؟ کسی دیوبندی عالم سے شناسائی نہیں تھی۔ کوئی اور ذریعہ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ آخر یہ سوچا کہ دارالعلوم کے مہتمم صاحب کے نام خط لکھا جائے۔ حافظ محمد احمد منید اہتمام پر قافز تھے۔ اس نے ان کے نام خط لکھا۔

”میں فلاں فلاں نصاب ختم کر چکا ہوں اور اب دورہ حدیث کے لیے دارالعلوم دیوبند میں داخلے کا خواہش مند ہوں داخلے کی کیا صورت ہوگی؟“

اس خط کا فوراً جواب آیا ”تم فوراً دیوبند پہنچ جاؤ۔ ہر چیز کا انتظام کر دیا جائے گا۔“

رمضان تھے پھر وطن میں عید کے موسم سے لطف اندوز ہونے کے بعد وہ تین تین چار چار بے تکلیف ٹھہرا ہوا گھر بسے۔

اشیوں تک کا فاصلہ پندرہ میل سے کم نہیں ہوگا جو پیدل طے کرنا پڑتا تھا۔ یہاں سے ”گیا“ گیا۔ سہارن ہوتا ہوا دیوبند پہنچ گیا۔ مگر سچا تھا تو دیوبند کے ایک طالب علم منظر حسن کے نام اس کے بڑے بھائی سے ایک خط لیا تھا۔ وہ خط بھی جیب میں پڑا تھا۔

تاگے والے سے دارالعلوم چلے کو کہا اور سامان کی گھڑی بغل میں دبا کر سوار ہو گیا۔ تاگے والے نے تاگہ آگے بڑھا دیا۔ قصبے کی سڑکوں اور کوچوں سے گزرتا ہوا یہ تاگہ ایک اونچے دروازے کے سامنے رک گیا۔ دروازے کی پیشانی پر ”درس اسلامی عربی دیوبند“ لکھا تھا۔

اس نے منظر حسن کے نام لکھے گئے خط کو بھی میں دبا لیا اور کسی طرح پوچھتے پوچھتے منظر حسن کے کمرے تک پہنچ گیا۔ خط دکھا یا تو تعارف بھی ہو گیا۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد اس نے منظر حسن کو ساتھ لیا اور بیٹھنے کے دفتر میں پہنچ گیا تاکہ اپنی آمد درج کرادے۔ اس نے وہ خط بیٹھم کو دکھا یا جو ان کی طرف سے ملا تھا۔

”تم آگئے ہو۔ تمہارا نام درج کر لیا گیا ہے۔ داخلے کا امتحان ہوگا۔ اس وقت تک انتظار کرو۔“ بیٹھم نے کہا اور ساتھ ہی منظر حسن کو حکم دیا کہ یہ صاحبزادے تمہارے واقف کار ہیں ایسے ہی انہیں اپنے پاس رکھو۔

مناظر احسن اس مدرسے میں زندگی کی پہلی دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ بارہ سولہ کا مجمع ان میں بھی بھانت بھانت کے لوگ۔ مکی بھی غیر مکی بھی۔ وہ اب تک بیس تیس طالب علموں کے حلقوں میں رہتا ہوا دستور تعلیم حاصل کرتا رہا تھا۔ یہ مجمع دیکھ کر وہ سوچنے لگا تھا کہ یہاں تو بڑی بد انتظامی ہوتی ہوگی۔ تعلیم حاصل کرنے کی صورت کیا ہوگی لیکن سب سے پہلے وہ یہاں جس چیز سے متاثر ہوا وہ یہاں کا حسن انتظام ہی تھا۔ نماز باجماعت سے لے کر کھانے کی تنظیم تک۔ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ کسی کو کس کام کی جلدی ہے۔ ہر کام خود بہ خود ہوتا چلا جاتا تھا۔ کھانے بھی مفت، مکان بھی مفت، روٹی بھی مفت، کتابیں بھی مفت، بیمار پڑ جاؤ تو طبیب اور دوا میں بھی مفت۔

ایک ہفتہ گزرا تھا کہ داخلے کا امتحان کا وقت آ گیا۔ مولانا نور شاہ کشمیری جو محدث العصر کہلاتے تھے اس امتحان کے لیے مقرر کیے گئے۔ مولانا نور شاہ کشمیری کتب خانے میں تشریف فرما تھے۔ داخلے کے خواہشمند طلبہ باہر کھڑے تھے۔ دروازے پر لکھا تھا ایک آدمی ایک ایک

طالب علم کا نام پکارتا جاتا تھا۔

آواز پڑی۔ ”مناظر احسن گیلانی۔“ امتحان کا نام ہی کچھ ایسا ہے کہ اچھے اچھے گھبرا جاتے ہیں۔ وہ بھی گھبرایا ہوا تھا۔ کاپتے قدموں سے وہ کتب خانے میں داخل ہوا۔ سیکڑوں تقریریں کر چکا تھا۔ سات سال ٹونک کے مدرسے میں پڑھ چکا تھا لیکن اس وقت یہ معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے پہلی مرتبہ گھر سے نکلا ہو۔

مولانا نور شاہ کشمیری فرش پر بیٹھے تھے۔ چھوٹی سی دتی میز رکھی تھی جس پر ایک کتاب تھی۔ یہ کتاب مناظر کے لیے نئی نہیں تھی۔ مولانا نے کتاب کھولی اور ایک عبارت پڑھ کر حکم دیا کہ اس کا مطلب بیان کرو۔ نہ یہ کتاب ابھی تھی نہ عبارت۔ یہ کتاب ٹونک کے مدرسے میں رہ کر وہ پڑھ چکا تھا۔ ایک ایک لفظ گھونٹ کر پی لیا تھا مگر وہ اس وقت اتنا مرعوب تھا کہ ایک لفظ بھی زبان سے ادا نہیں ہو رہا تھا۔ ادھر سے پھر حکم ہوا کہ مطلب بیان کرو۔ اس نے اس طرح بولنا شروع کیا جیسے بے ہوشی میں بول رہا ہو۔ مولانا نے دو ایک سوال اور پوچھے ان کے جوابات بھی اسی طرح دیے پھر اس نے یہ سنا کہ مولانا اس سے اٹھ جانے کے لیے کہہ رہے ہیں۔ یہ حکم ایسا تھا جیسے قید سے رہائی ملی ہو۔ وہ وہاں سے اٹھ آیا اور یہ سوچ کر اٹھا کہ کامیابی کی کوئی امید نہیں۔ گھر چلنے کی تیاری کر رہی تھی۔ وہاں سے آنے کے بعد اس نے کئی مرتبہ سوچا کہ کل ہونے کی خبر سے بغیر گھر چل دینا چاہیے۔ اس نے اپنا فیصلہ منظر حسن کو بھی سنا دیا لیکن اس نے تسلی دی کہ نتیجے کا انتظار کیے بغیر اسے نہیں جانا چاہیے۔

ایک دور دراز میں فہرست آویزاں ہو گئی۔ وہ داخلے کے امتحان میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اب معلوم ہوا کہ اس سخت بدحواسی کے باوجود بہت اچھے جوابات دیے تھے۔

امتحان میں کامیابی کے بعد دورۂ حدیث میں اس کا نام درج ہو گیا۔ اسباق کا آغاز ہو گیا۔ علامہ کشمیری مسلم شریف پڑھانے لگے۔ بخاری کا درس شیخ الہند خود دیتے تھے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی ابوداؤد پڑھاتے تھے۔ اسی طرح دوسرے اساتذہ۔ اساتذہ کی کرم فرمائیاں اس کے شامل حال تھیں۔ شیخ الہند خود اس پر خصوصی توجہ دیتے رہتے تھے۔ علامہ شبیر احمد عثمانی نے تو خود اسے اپنے پاس بلا کر کہا تھا۔ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کسی آدمی کو کسی سے محبت ہو تو اس کو مطلع کرو۔“ اس لیے میں نے

آپ کو طلب کیا ہے کہ اس حدیث کے مطابق آپ کو مطلع کروں کہ میں اپنے دل میں آپ کی محبت پاتا ہوں۔“ ان سب محبتوں کے باوجود اس کے دل کی حالت دگرگوں تھی۔ وہ اب تک یونانی فلسفہ اور منطق پڑھتا رہا تھا۔ درس حدیث شروع ہوا تو دونوں میں ٹکراؤ بھی شروع ہو گیا۔ وہ وجودیت پر بحثات ہی دل میں اعتراضات بھی اٹھاتا رہتا یعنی حدیث کے الفاظ اپنی عقل جیکر اپنا کام دکھا رہی تھی۔ ٹکڑوں شبہات بڑھتے جا رہے تھے۔ یہ شبہات اتنے بڑھے کہ خود حضور اکرم کی ذات مبارک بھی ان کی زد میں آنے لگی۔ بدگمانیوں کا ایک طوفان تھا جو اٹھتا رہتا تھا۔

یہ ایسی باتیں تھیں جو کسی استاد سے تو کیا کسی ساتھی سے بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس وقت عالم یہ تھا کہ اگر کوئی ان حدیثوں پر اس سے بحث کرتا تو وہ ان سب کو غلط ثابت کرنے پر تیار جاتا۔ وہ ذہن کو جتنا جھٹکنا یہ خیالات اتنے ہی اس پر حاوی ہوتے چلے جا رہے تھے۔ دل میں ایسا چور بیٹھ گیا تھا کہ کسی کا سامنا کرتے ہوئے کترانے لگتا تھا کہ کہیں وہ دل کا حال جان نہ لے۔ کسی سے کہتا بھی تو کیا۔ یہ کہ ان حدیثوں پر میرا ایمان نہیں؟

یہ آگ ایسی طرح بھوک رہی تھی کہ بقرعید کی چھٹیاں آ گئیں۔ چشمہ سلسلے کے مشہور بزرگ حضرت علی احمد صابر کا مزار مبارک دیوبند کے قریب ہے۔ سو چار چار پر حاضری دوں اور دعا مانگوں کہ ان فاسد خیالات سے مجھے نجات ملے۔

روٹی اسٹیشن پر اتر کر گھڑی بغل میں دباے نہر کے کنارے کنارے چلتا رہا۔ کلیر شریف پہنچ گیا۔ روٹنے میں داخل ہوا۔ فاتحہ خوانی کی۔ کتنی ہی دیر اپنی حالت پر آنسو بہاتا رہا۔ گناہ گار سے گناہ گار مسلمان کو بھی احادیث کی حقانیت پر یقین ہوگا مگر میرا یہ حال کہ ان پر سے ایمان ہی اٹھتا جا رہا ہے۔ یہاں سے اٹھ کر مسجد میں پہنچ گیا اور دعائوں کرنے بیٹھ گیا۔ کوئی صاحب چند چپاٹاں اور مسور کی دال لے کر آگئے۔ پانی بھی میسر آ گیا، خدا کا شکر ادا کیا۔

کسی سے منگور کا پتا پوچھا۔ جوئے اتار کر گھڑی میں باندھے اور پیدل بلکہ ننگے پاؤں دن بھر چلنے کے بعد جب آفتاب غروب ہونے لگا تو وہ منگور پہنچا۔ یہاں کسی بزرگ سے ملاقات مقصود تھی۔ ان بزرگ سے تو کئی بھی کہ وہ اس کی اس حالت کو دور کرنے میں اس کی مدد کریں گے لیکن ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ لامحالہ رات ایک مسجد میں گزارنے کے بعد صبح ہوئے ہی وہاں آتا پڑا اس سفر سے لوٹنے کے

تاثرات

ایک ان کی شریں گفتاری و شکفتہ بیانی۔ دوسرے ان کی نورانی صورت، خندہ پیشانی۔ ان دونوں مشقوں نے نل کر ان کی شخصیت میں عجب دل آویزی اور دلکشی پیدا کر دی تھی اور کسی طرح ان کی موجودگی یا گفتگو طبیعت پر بار نہیں ہوتی تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا کو اس لطافت سے خوب نوازا تھا اور اس وجہ سے وہ اپنے حلقہ احباب میں بڑے محبوب اور حلقہ ملائمہ میں بڑے مقبول تھے جو ان کی صحبت میں ایک مرتبہ بیٹھ جاتا وہ یہ کہتا ہوا اٹھتا کہ ”بہت لگتا ہے جی صحبت میں ان کی۔“

(مولانا سید ابوالحسن ندوی)

بعد بھی حالت جوں کی توں رہی۔ پریشانی برحق جاری تھی بالآخر یہ طے کیا کہ شیخ الہند خود احسن کی خدمت میں پہنچ کر اپنا مرض ان کے سامنے رکھ دوں پھر بھی کوئی علاج نہ ہو سکا تو دارالعلوم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دوں گا۔

اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ وہ اس کا نام بھی جانتے ہیں اور اس کا شعبہ بھی۔ وہ صدر مدرس ہیں اور طلبہ کو نام بہ نام جانتے ہیں یہ توجہ ہے اسی لیے تو مدرسہ چل رہا ہے۔ اس نے اپنا درد دل عرض کرنے اور سامنے کی درخواست کی۔ حضرت اکٹھ کر اعد کر کے میں تشریف لے گئے۔ وہاں پہنچ کر مناظر نے اپنے ان خیالات فاسدہ کی تفصیل سنا لی، دیر تک سناتے رہے۔ جب سب سنالیا تو آنسوؤں کی جھری لگ گئی۔ ”حضرت میرا تو ایمان ہی گیا۔“

شیخ الہند نے ڈھارس بندھائی۔ ”مولوی صاحب اتنے پریشان کیوں ہیں اپنا یہ حال جب آپ کے لیے اتنا ناگوار ہے تو یہ بے ایمانی کی نہیں، آپ کے ایمان کی دلیل ہے۔ ایمان نہ ہوتا تو ان خیالات سے اتنے پریشان ہی کیوں ہوتے؟“ ان جملوں نے مرم کا کام کیا۔ افسوس ہوئی نہیں بیٹھ گئی۔ درد میں کمی آ گئی۔ اس لیے بھی کہ دل کی پھوس نکلی تھی اور اس لیے بھی کہ استاد محترم نے گواہی دی تھی ”یہ ایمانی نہیں ایمان کی دلیل ہے۔“

یہ کئی چھاؤں ابھی سر سے دھست نہیں ہوئی تھی کہ شیخ الہند نے مزید فرمایا کہ ”آپ نے کہاں کہاں اور کیا کیا پڑھا ہے؟“ اس نے تفصیل بیان کر دی۔

حضرت نے سن کر فرمایا۔ ”جو کچھ آپ پکارتے تھے چلے

گئے ہیں وہی سب کچھ باہر لگ رہا ہے پریشان ہونے کی بات نہیں۔ مولوی صاحب جاؤ اب کوئی شہ اور کسی قسم کا شکم کو نہ ہوگا۔ ان لفظوں میں نہ جانے ایسا کیا جادو تھا کہ دنیا ہی بدل گئی۔ اب نہ وہ دوسو تھے نہ شکوک و شبہات۔ حدیث کے اسباق میں جی لگنے لگے۔

اس واقعے کے بعد شیخ الہند اس پر بہت مہربان ہو گئے تھے۔ ایک دن کہتے تھے ”میں نے سنا ہے کہ تم ایک اچھے ادیب بھی ہو مگر دے کی طرف سے القاسم رسالہ لکھا ہے اس میں مضمون کیوں نہیں لکھتے؟“ اسے بڑا عجیب تھا کہ اس نے نہ تو کوئی مضمون لکھا تھا نہ کہیں شائع ہوا تھا۔ نہ کسی سماجی سے کوئی ذکر کیا تھا پھر استاد محترم کو کیسے معلوم کہ میں ادیب ہوں؟ شاید انہوں نے بھانپ لیا تھا کہ یہ لڑکا ایک اچھا ادیب بن سکتا ہے۔ اس کی پوشیدہ صلاحیتوں کو ابھارنے کے لیے وہ کھد رہے تھے کہ اسے لکھنا چاہیے۔

اس نے استاد کو کہا پورا کیا۔ لکھنے پڑھنے کا شوق تو تھا ہی نہایت محنت سے ایک مضمون ”خیر الام کا طفرائے امتیاز“ لکھا۔ یہ مضمون القاسم دیوبند میں کئی قسطوں میں شائع ہوا۔ اس مضمون کی شہرت اساتذہ و طلبہ دونوں میں ہوئی۔ باہر سے بھی خطوط آئے جن میں اس مضمون کی تحریف کی گئی تھی۔ سب سے دقیق تعریف مولانا اشرف علی تھانوی کی تھی۔ آپ نے فرمایا ”یہ لڑکا تو محقق ہے یا آگے چل کر بن جائے گا۔“ ان تعریفوں نے اس کا بھی دل بڑھایا۔ آگے چل کر اسے ایک عظیم ادیب بن کر سامنے آتا تھا۔

قاعدہ ہے کہ جب کوئی ہونہار اور ذہین طالب علم ہوتا ہے تو اساتذہ کو اس سے محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ تمام اساتذہ اس سے محبت کرنے لگے تھے اور اس پر خصوصی توجہ رکھتے تھے۔

سامی طلبہ میں یہ شہرت ہوئی چکی تھی کہ مناظر احسن گیلانی علم معقولات میں دوکر رکھتے ہیں۔ ان میں سے کچھ کو شوق پیدا ہوا کہ اس علم کی کوئی کتاب ان سے پڑھی جائے۔ وہ تیار بھی ہو گئے کہ پڑھادیں گے مگر جو بھی اس کتاب کو پڑھانے کا ارادہ کیا لڑکھ ساطاری ہونے لگا۔ یہ میرزا بہ رسالہ تھا۔ اس پر انہیں پورا عبور تھا۔ جی کڑا کر کہ رسالہ ہاتھ میں لیا۔ چند منٹ نہیں ہوئے تھے کہ نیند غالب آگئی۔

خواب میں کیا دیکھتے ہیں کہ جنگلی سوروں نے گھیر رکھا ہے۔ خوف جب بڑھ گیا تو ایک درخت پر چڑھ گئے۔ اتنے میں دیکھا کہ ایک آدمی آگیا۔ اس کے ہاتھ میں بندوق تھی۔

اس نے بندوق چلا دی۔ کچھ سوروں سے، مگر سے اور باقی بھاگ کھڑے ہوئے اور آنکھ کھل گئی۔ آنکھ کھلی تو بدن پسینے میں بھگا ہوا تھا۔ اسی وقت لڑکوں کو کھلوا دیا کہ پڑھانا میرے بس میں نہیں ہے۔ اس کے بعد آپ خواب پر غور کرنے بیٹھ گئے۔ پہلے اس جملے کا خیال آیا جو شیخ الہند نے فرمایا تھا۔ ”مولوی صاحب جاؤ، اب کوئی شہ اور کسی قسم کا شکم کو نہ ہوگا۔“

اس کے بعد ہر دوسرے دن سے رخصت ہو گیا تھا۔ اب یہ خواب؟ اسی سلسلے کی کڑی معلوم ہوتا تھا۔ اس خواب میں بھی یہی بتایا گیا تھا کہ معقولات کے قریب نہ جاؤ۔ بندوق والا آدمی کہیں حضرت تو نہیں تھے۔

☆☆☆

دارالعلوم کے درود پورا اس وقت خاموش تھے۔ رات گہری ہو گئی تھی۔ یہ طالب علم اس وقت کروٹیں بدل رہا تھا۔ کچھ باطنی روگ لگے ہوئے ہیں۔ ان کا زار الضروری ہے۔ میں کب تک شکوک و شبہات کا قائل رہتا رہوں گا۔ دارالعلوم میں ہمیشہ تو رہنا نہیں ہے۔ شیخ الہند بھی ہمیشہ نہیں رہیں گے۔ کسی ایسے عارف اللہ کے دامن سے وابستہ ہونا ضروری ہے جن کی نگاہیں مجھ خام کو پختہ بنادیں۔ وہ نہ بھی رہے تو اس سے تعلق مجھے بھٹکنے نہ دے۔ اس کی نگاہ انتخاب شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن پر جا کر رہی جن کے تصرف باطنی کا تجربہ اسے پہلے بھی ہو چکا تھا۔

طالب علم تہجد کے لیے اٹھنے لگے تو وہ یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اگر شیخ الہند قبول فرمائیں تو وہ ان کے دست حق پرست پر بیعت کر لے گا۔ یہ بہت بڑی جسارت تھی لیکن اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔

تہجد اور اس کے بعد نماز فجر ادا کرنے کے بعد وہ ان کی خدمت میں پہنچ گیا۔ اسے امید تھی کہ حضرت شیخ بے اعزاز اسے بخش دیں گے۔ ان کے روحانی تربیت یافتوں میں ایسی کسی ہستی شامل ہیں۔ ان کے سامنے ایک طالب علم کی حیثیت کیا۔ یہ تو وہی مثال ہوئی کہ پرانہری کا طالب علم یونیورسٹی میں داخلہ لیتا چاہے۔ وہ اگر طالب علموں کو بیعت سے سرفراز فرمانے لگیں تو پورا دارالعلوم ان کا مرید ہو جائے۔ اس کے اعتراضات بجا تھے۔ حقیقت پر مبنی تھے لیکن ابھی وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ دل کے سودے قیمت سے ملے نہیں ہوتے۔ شیخ جانتا ہے کہ اس کے سامنے کنگر ہے یا موتی۔ حضرت نے چمکی درخواست ہی میں اسے بیعت کر لیا۔

وہ ایک مرتبہ پھر حیران کھڑا تھا کہ یہ سب کیسے ہو گیا ہے مرشدِ اول سے استفادے کا زیادہ موقع نہیں مل سکا کیونکہ شیخ الہند جو انگریزوں کے خلاف جہادِ آزادی شروع کیے ہوئے تھے اور پورے ملک میں انہوں نے مجاہدوں کا جال پھیلایا ہوا تھا۔ عبید اللہ سندھی کو افغانستان بھیج دیے تھے۔ خود وہ بھی ان مجاہدوں سے ملاقات کے لیے جج گئے۔ یہاں ہندوستان سے نکلے لیکن انگریزوں کی خفیہ پولیس نے ان کے خلاف رپورٹ دے رکھی تھی۔ انہیں گرفتار کر کے ہالٹا بھیج دیا گیا اور پھر تین چار سال بعد رہا ہو کر ہندوستان پہنچے تو سخت بیمار تھے اور بہ مشکل چھ ماہ بعد انتقال کر گئے۔

مولانا گیلانی نے دورہ حدیث کا سالانہ امتحان دے دیا تھا۔ نمایاں کامیابی بھی حاصل کر لی تھی۔ اب انہیں ذریعہ معاش کی تلاش تھی۔ وہ یہ جانتے تھے کہ جو کچھ پڑھا ہے اس دائرے میں رہ کر کام کر سکتے ہیں۔ جن کاموں میں معاوضہ اچھا مل سکتا ہے ان کاموں کی صلاحیت نہیں۔ اپنے وطن گیلانی جانے کا کوئی قائلہ نہیں تھا۔ وہاں اتنے کا بھی آسرا نہیں تھا۔ اب ایک ٹونک ہی رہ گیا تھا جس سے شائستگی کی تھی۔ اسلامی ریاست تھی لہذا مولویت کی سمجھاؤں ہو سکتی تھی۔ اساتذہ بھی زندہ تھے جن سے مدد مل سکتی تھی۔ کچھ دنوں کے لیے اپنے گاؤں گیلانی گئے اور پھر وہاں سے سیدھے ٹونک چلے گئے۔ اساتذہ کرام سے ملے اور درخواست کی کہ ان کے لیے کوئی اسامی نکالی جائے۔ اتفاق سے مدرسہ میں تدریس کی کوئی اسامی خالی نہیں تھی۔ سروسٹ انہیں کتب خانے میں رکھ لیا گیا، کہ وہ فہرست سازی کی خدمات انجام دیں۔ حق محنت پانچ روپے دینے کا وعدہ کیا گیا۔ انہیں دارالعلوم دیوبند یاد آگیا وہ کیسے جید عیلماء کے نورِ نظر تھے۔ ساتھیوں میں ممتاز تھے اور یہاں کتب خانے کی فہرست سازی۔ تدریس بھی ہوتی تو شوق کی تسکین تو ہوتی۔ انہیں شش و پنج میں کچھ کہ یہ وعدہ کیا گیا کہ مدرسے میں جو بھی کوئی اسامی نکلے گی انہیں شہید تدریس میں رکھ لیا جائے گا۔ وہ فہرست سازی۔ کام کرنے لگے۔

ایک مہینے بعد ہی مدرس کی ضرورت پیش آئی۔ انہیں رکھ لیا گیا۔ مشاہیرہ پندرہ روپے ملے ہوا۔ فہرست سازی بھی کرتے رہے۔ اس طرح تین روپے ماہانہ کی آمدن ہو گئی۔ وہ یہاں تین چار مہینے کام کرتے رہے لیکن سوچتے ضرور رہے کہ یہاں ختمی کا تو کوئی امکان نہیں۔ اس چھوٹی سی

ایک مکتوب

”آپ سے دل کی بات عرض کرتا ہوں۔ دینی خدمت کا شعور دماغ میں جب سے پیدا ہوا ہے وہی طور پر میرا دماغ ہمیشہ اس پہلو کو سوچتا رہا ہے کہ ہندوستان کے غیر مسلم اقوام تک اسلام کو آگے بڑھانے کی کوئی صورت نکالی جائے۔ میرا خیال ہے کہ موجودہ مسلمانوں کو زندہ کرنے کی کوشش لا حاصل سی ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ کوئی تازہ خون اسلام کی رگوں میں کسی راہ سے آگرا جائے تو ممکن ہے کہ یہ اس کی حرارت سے ان پڑانے ٹھکے ہوئے مسلمانوں میں زندگی پیدا ہو مگر براہِ راست ان کے جگانے اور جھنجھوٹنے کے کام کو قریب قریب مردود کو جگانے کے ہم معنی سمجھ رہا ہوں۔ جب حکیم الامت (حضرت تھانوی) کی اسی سال کی حکومت میں یہ سوئے رہے اور کچھ ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ان میں کون آیا ہے اور کون چھوڑ چلا گیا ہے تو اب دوسروں سے متاثر ہوں گے؟ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی بہار ہی ممکن تھا کہ معیار ہو جاتا لیکن اس کا دل قطعاً بدل گیا اور اب تو اسلام سے یہ صوبہ بہت دور ہو گیا۔

(بنام سید سلیمان ندوی)

ریاست میں اسی تنخواہ پر کام کرنا پڑے گا۔ دنیا بہت بڑی ہے گھوم پھر کر دیکھا تو جائے۔ شاید کوئی بڑی اسامی مل جائے۔ جوانی رگوں میں دوڑ رہی تھی۔ اپنی قابلیت کا عرفان بھی تھا۔ برطانوی قلمرو میں جانے کا قائلہ نہیں تھا۔ علما کے لیے وہاں کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ہائی اسکولوں میں مولوی رکھے جاتے تھے لیکن مشاہیر وہاں بھی کم تھا۔

کانوں میں آوازیں پڑتی رہتی تھیں کہ ریاست حیدر آباد بہت بڑی اسلامی ریاست ہے۔ وہاں علما کی قدر دانی بھی ہے اور ان پر خرچ کرنے کے لیے ریاست کے پاس پیسے بھی بہت ہیں۔ وہ وہاں جانے کے بارے میں سوچتے رہے اور بالآخر فیصلہ کر لیا۔

یہ ارادے دل ہی دل میں بن رہے تھے۔ کسی کو شریک نہیں کیا تھا۔ یہ خیال بھی آتا تھا کہ اگر یہاں سے نکل بھی گئے تو تنہا جانا ہوگا۔ یہ تنہائی بھی کام کی جاتی ہے لیکن

چپ کر نکلتا ہوگا کوئی ساتھ تو ہوشریک راز تو ہے۔ آخر اپنے ایک غلط دوست کو شریک راز کرنا پڑا۔

”مجھے مدرسے والے پر خوشی تو تک سے نہیں جانے دیں گے۔ اسٹیشن یہاں سے دس پندرہ کوس کے فاصلے پر ہے۔ رات کے وقت نکلتا ہے، کسی ایسی سواری کا بندوبست کرو جو مجھے اسٹیشن تک پہنچا دے۔“

سواری کا بندوبست ہو گیا۔ اسٹیشن پہنچے اور حیدر آباد کا ٹکٹ لے کر راہی دکن ہوئے۔ راستے بھر سوچتے گئے تھے کہ نکل تو آیا ہوں، شہر نے کا بندوبست کہاں ہوگا؟ ذہن پر بہت زور ڈالا۔ کوئی نام ایسا ذہن میں نہیں آیا جو واقعہ کار ہو اور حیدر آباد میں رہتا ہو پھر مشہور عربی مدرسہ نظامیہ کا نام ذہن میں آیا۔ شاید وہ لوگ میرے مولوی ہونے کا خیال کر لیں۔

حیدر آباد پہنچے ہی وہ مدرسہ نظامیہ پہنچ گئے ایک طالب علم باہر نکلا۔ انہوں نے اپنا تعارف یہ کہہ کر کر وایا کہ وہ مدرسہ عربی دارالعلوم دیوبند کے طالب علم ہیں اور یہاں گھومنے پھرنے اور مدرسہ نظامیہ کا انتظام انصر ام دیکھنے آئے ہیں۔ طالب علم کاہر کرنا اس لیے ضروری تھا کہ طالب علم کو اجنبیت نہ ہو۔ وہ انہیں اپنے کمرے میں لے گیا توھوڑی ریش میں دوسرے طلبہ بھی آکر ملنے لگے۔ فنی مذاق شروع ہو گیا جیسا کہ طالب علموں میں ہوتا ہے۔ قیام کا بندوبست ہو گیا تھا لیکن جلد از جلد اسے کوئی دوسرا انتظام کرنا تھا ورنہ طالب علم کہتا کہ گھومنے پھرنے آئے تھے تو گلے ہی بڑ گئے۔

قدرت جب مدد کرنے پر آتی ہے تو یوں کرتی ہے۔ دوسرا
 دانہ وہ اس طالب علم کے کمرے سے نکل کر ایک شٹا ساچرے
 پر نظر پڑی۔ یہ ان کے ساتھ ٹوک میں پڑے ہوئے ایک
 ساٹھی مولوی شاہ سید یعقوب احمد تھے۔ مہاراشٹر کے رہنے والے
 تھے اور پیر خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

مولانا گیلانی کی نظر ان پر پڑی۔ ”اگر میرا خیال غلط نہیں تو تم مقبول احمد ہی ہوتا؟“

”اور تم مناظر احسن گیلانی؟“ انہوں نے بھی فوراً پہچان لیا۔ ”مگر تم یہاں کہاں؟“

”میں تو یہاں کسی کام سے آیا تھا مگر تم کیا یہاں پڑھنے آگئے ہو؟“

”پڑھنے تو نہیں آیا۔ دیوبند سے دورۂ حدیث مکمل کر کے نوکری کی تلاش میں نکلا ہوں۔“

”ابھی کہاں، رات ہی کو تو پہنچا ہوں۔ قیام کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی یہاں آ گیا۔“

”منظر، یہ ریاست ہے۔ یہاں کسی کو اس کی قابلیت پر توکری نہیں ملتی جب تک کوئی ایسی شخصیت تم پر مہربان نہ ہو جائے جن کا براہ راست تعلق میر عثمان علی خاں نواب حیدرآباد سے نہ ہو، کیا سمجھے؟“

”اب ایسی شخصیت کہاں سے لاؤں؟ خیر اللہ مالک ہے۔“

”اب میں مل گیا ہوں۔ یہ مشکل بھی حل ہو جائے گی۔
میں تو دو ایک روز میں حیدرآباد سے چلا جاؤں گا۔ آؤ میں تمہیں
ایسی شخصیت سے ملوا دوں جس سے تعلق رکھو گے تو کام بن جائے
گا۔“

”کون ہے وہ ذات شریف؟“

”انوار اللہ خاں۔ امور مذہبی کے وزیر اور اس عہدے کے جہاں تم کھڑے ہو سر پرست بھی ہیں۔ کیا پتا تمہارے لیے کوئی اسائی نہیں نکل آئے۔“ وہ اس کے ساتھ مولانا انوار اللہ کی کونچ پر پہنچ گیا۔ وہ اسی محرم کی دروازے سے اندر داخل ہوا ہی تھا کہ ایک صاحب پر نظر پڑی۔ ان کا نام شاعر تھا اور یہ اجیر شریف کی درگاہ کے متولی تھے۔ مولانا گیلانی کی ملاقات ان سے اجیر میں ہو چکی تھی اور اس وقت وزیر صاحب کے مہمان تھے۔ وہ بھی ان کے ساتھ مولانا انوار اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کا تعارف نہایت اچھے الفاظ میں کرایا۔ اس میں آپ کی خطابت کا تذکرہ خاص طور پر شامل تھا کیونکہ اجیر میں وہ اس کا شاہدہ کر چکے تھے۔

تعارف کچھ اس انداز میں ہوا تھا اور ایسے معتبر آدمیوں نے کیا تھا کہ مولانا انوار اللہ کا مہتر ہو جانا لازمی تھا۔ خود مولانا گیلانی کی شخصیت میں ایسی جاذبیت تھی اور متنگوں کا انداز ایسا دلکش تھا کہ روزِ مرموصوف ان کی خبر گیری کے لیے مجبور ہو گئے۔

”آپ کا قیام اس وقت کہاں ہے؟“

”مدرسہ نظامیہ میں ٹھہرا ہوا ہوں۔“

”وہاں تو آپ کو بہت تکلیف ہوتی ہوگی۔ میرے مکان میں بہت گنجائش ہے۔ آپ یہاں کیوں نہیں آجاتے؟“

”پھر آپ کو تکلیف ہوگی۔“

”اہل علم کی دی ہوئی تکلیف میں بھی راحت ہوتی ہے۔“

بس آپ یہاں آجائیں۔“ مولانا نے اسی وقت کسی کو بھیجا اور مولانا کا سامان مدرسہ نظامیہ سے وزیر کی کبھی پہنچ گیا۔ ایک کمرہ انہیں دے دیا گیا اور نوکروں کو ہدایت کر دی گئی کہ مولانا کو کوئی

تکلف نہ ہونے پائے۔

مولانا انوار اللہ صرف وزیر نہیں تھے بلکہ عالم دین اور علمی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ رات میں درس دیا کرتے تھے۔ بڑے بڑے علماء اس درس میں شریک ہوا کرتے تھے۔ مولانا گیلانی بھی اس میں شریک ہونے لگے۔ ایک رات ابن عربی کی مشہور کتاب ”فتوح مکیہ“ پر بحث کی جارہی تھی۔ مولانا گیلانی نے اس کتاب پر ایسی پرزور تقریر کی کہ کچھ ناہنکام بہنیں آ رہی تھیں کہ ایک نوجوان لڑکا فتوحات مکیہ جیسی مشکل کتاب پر ایسی پرمغز تقریر کر سکتا ہے۔ خود وزیر صاحب کو اپنے انتخاب پر فخر ہو رہا تھا۔

جب درس ختم ہوا تو ملا سراج نے مولانا بیانی کو دوسرے دن اپنے گھر کھانے پر مدعو کر لیا۔ یہ دعوت دوستی میں بدل گئی۔ جلد جلد ملا سراج ہوئے نکلیں۔ کتابوں کے کاروبار کی وجہ سے ملا کاہلی کی شناسائی بہت سارے اعلیٰ علم سے تھی۔ حیدر آباد میں اعلیٰ علم کی کمی نہیں تھی۔ ملا کاہلی کے ذریعے مولانا بیانی کے تعلقات وسیع ہونے لگے۔

”آپ نے مہاراجا کشن پرشاد کا نام تو سنا ہوگا؟“ ملا کا بلی نے ایک دن کہا۔

”جی ہاں، کوئی حیدر آباد آئے اور یہ نام نہ سنے۔“

”بس تو چکر لگتا رہا ہو کہ آج آپ نے ہمارا جاکے کی طرف چلنا ہے۔“ حیدر آباد میں دو شخصیات نہایت ممتاز تھیں۔ ایک مولانا انوار اللہ اور دوسرے ہمارا جاکشن پرشاد۔ وزیر اعظم حیدر آباد کے شہنشاہ کار بلکہ اپنی علمی خدمات کی وجہ سے یہی سب سے اہم تھے۔ نواب کے بہت منہ چڑھے تھے۔ داؤد بخش میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔

ملا کا ملی انہیں لے کر مہاراجا کی مجلس میں حاضر ہوئے اور مولانا کا تعارف کچھ اس انداز سے کیا کہ مہاراجا کو سہانے لے کا گمان ہونے لگا۔ انہوں نے محض استحسان لینے کے لیے "وحدت الوجود" کا مسئلہ چھیڑ دیا کہ دیکھیں مولانا کیا کہتے ہیں؟ مولانا نے الہند کے تربیت یافتہ تھے۔ مولانا اشرف علی تھانوی کی آنکھوں دیکھے ہوئے تھے۔ اس مسئلے پر بولنا شروع کیا تو جارا جابھیل کر بیٹھ گئے۔ ایک ایک نکتے کی وضاحت ہوتی چلی جاتی تھی۔ مہاراجا خود عالم تھے۔ اس مسئلے کے ایک ایک پہلو سے واقف تھے لیکن ایسی تشریح اس سے پہلے انہوں نے نہیں سنی تھی۔

”میں تو آپ کی کم عمری سے دھوکا کھا گیا تھا۔ میری طرح کئی دوسرے بھی آپ کی قدر نہیں کر سکیں گے۔ اب تک آپ

ماهنامه سرگزشت

ایک آدمی

”بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ وسعتِ نظر و وسعتِ مطالعہ، رسوخِ العلم اور ذکاوت میں ان کی نظیر اس وقت ہمارے اسلام میں ملنی مشکل ہے۔ تصنیف و تالیف کے لحاظ سے وہ عصرِ حاضر کے عظیم مفکرین میں شمار کیے جانے کے مستحق ہیں۔ انہوں نے اپنی کتابوں میں جو مواد جمع کر دیا ہے وہ بیحد آدمیوں کو مصنف و محقق بنا سکتا ہے۔ اس ایک آدمی نے تنہا وہ کام کیا ہے جو یورپ میں پورے ادارے اور منظم جماعتیں کرتی ہیں۔ ان جیسا آدمی ہر برسوں میں پیدا ہوتا ہے اور اب ان جیسا آدمی شاید برسوں میں بھی پیدا نہ ہو۔“

(مولانا علی میاں)

کے جو ارمان پر نہ کھل جائیں۔ میں چند علماء کو جمع کرتا ہوں۔ کہ
تران کے سامنے تقریر کرو گے؟“ مہاراجا نے ان سے کہا۔
”کوئی مضائقہ نہیں جو کچھ میں سمجھا ہوں انہیں بھی
سمجھا دوں گا۔“ تاریخ مقررہ پر مہاراجا کی کونہی میں انتظام
ہو گیا۔ علمائے وقت جمع ہو گئے۔ مولانا گیلانی کی عمر اس وقت
اٹھاس تیس سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔ علمایہ سوچ ضرور ہے
ہوں گے کہ وحدت الوجود جیسا مسئلہ ہے تو نیز لڑکا کیا سمجھ سکے گا
لیکن جب وہ بولنے کھڑے ہوئے تو دلائل ایک طرف کھڑے
تھے، انداز تقریر دلوں پر چھرا میں چلا رہا تھا۔
گھنٹہ گھنٹہ ہوئی تو سب ایک زبان ہو کر کہ اُٹھے کہ ایسا
تقریر کرنے والا انہوں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔
تو اب عثمان علی خاں سے بھی ملوایا جائے۔ ان کے بہت
کام آئے گا۔ ندیم خاص بن کر رہے گا اور عیش کرے گا۔

اس واقعے کے بعد مہاراجا ان کے گرویدہ ہو گئے۔
صرار ہونے لگا کہ وہ مولانا انوار اللہ کی مہمانی ترک کر کے
مہاراجا کے گھر آجائیں لیکن وہ تیار نہیں ہوئے البتہ یہ وعدہ
کر لیا کہ آتے جاتے رہیں گے۔

ہمارا جسے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ علی مسکن پر گفتگو بھی ہوتی رہی، لیکن جب کئی مہینے گزر گئے تو مولانا پر حساس ہوا کہ جس مقصد کے لیے وہ حیدرآباد آئے تھے وہ نواسے میں ہی رہ گیا۔ میں تو ہمارا جا کا ندیم خاص بن کر رہ گیا ہوں۔ معاش کا کوئی سلسلہ تو بننا نظر ہی نہیں آتا۔ اس رے میں انہیں یہ تجربہ بھی ہو گیا تھا کہ تعلیمی اداروں کا حال

اچھا نہیں ہے۔ کچھ لوگوں نے تو یہ مشورہ بھی دیا کہ حیدر آباد کے کسی انتہائی تنگے میں داخل ہونے کی کوشش کی جائے۔ ایک صاحب نے پولیس کے تنگے کی طرف بھی توجہ دلائی۔ کسی نے کہا دلاکت کریں۔ وہ بعد تھا کہ کام درس و تدریس ہو اور مشاہیرہ معقول ہو۔ انگریزی پڑھنے والوں کو ایسی نوکریاں ملتی ہیں کہ نوکر چاکر ساتھ رکھتے ہیں تو پھر مولوی کو کیوں نہیں؟ وہ علم دین کی خدمت سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھے۔

انہوں نے تنگ آکر حیدر آباد چھوڑ دینے کا ارادہ کر لیا۔ مہاراجا کو معلوم ہوا تو طرح طرح کی عنایات کے لیے تیار ہو گئے مگر وہ یہ نہیں کر سکتے تھے کہ انہیں کسی مدرسے میں نوکری دلا دیں اور تنخواہ اس سے زیادہ دلا دیں جو اس تنگے میں ملتی ہیں پھر آخر یہ طے کیا کہ ”مولانا آپ اپنی صحبت سے مجھے فیض یاب کرتے رہیں۔ تنخواہ میں اپنی جیب سے دوں گا۔“

وہ سخت کش مکش کا شکار ہو گئے۔ یہاں رہتے تو قیام دنیاوی تعلیم مل سکتی تھی مگر خیال آتا تھا کہ علم دین اس لیے حاصل کیا تھا کہ ایک غیر مسلم کی مصاحب میں زندگی گزاروں؟ بس خیال آتا تھا کہ اپنی دانست میں دنیا کو لات مار کے تاریک مستقبل کے جنگل میں واپسی کا عزم کر لیا۔

دنیائے ریسی تھی۔ مہاراجا خوشامد کر رہا تھا۔ بس ٹکڑے بدلنے کی شرط تھی مگر وہ نہیں مطمئن نہیں ہو سکا۔ اپنی مرضی سے حیدر آباد آئے تھے اپنی مرضی سے جا رہے تھے۔ اسٹیشن پر پہنچ کر سوال پیدا ہوا کہ کہاں کا ٹکٹ لیا جائے۔ ذہن میں شاہ مقبول احمد کا نام آیا جس سے حیدر آباد میں ملاقات ہوئی تھی اور جو مولانا انوار اللہ سے ملاقات کا ذریعہ بنے تھے۔ وہ منشاؤ (گجرات) کے پاس ایک گاؤں کے رہنے والے تھے۔ مولانا گیلانی نے منشاؤ کا ٹکٹ لے لیا۔

دنیائے تیزی سے ان کا پیچھا کر رہی تھی۔ جیسے ہی منشاؤ اسٹیشن پر اتارے بالکل اتفاق سے شاہ مقبول سے آشنا سامنا ہو گیا۔ گفتگو کرنے سے معلوم ہوا مقبول احمد اپنے مریدوں میں جا رہے ہیں۔

”مناظر احسن بڑا اچھا ہوا جو تم مل گئے۔ میرے ساتھ ہی چلو۔ تفریح بھی ہوگی اور آپ کی تقریری صلاحیتوں سے مجھے فائدہ بھی ہوگا۔ ہر دروازہ براتو آپ کو بھی مل ہی جائیگا۔“

مولانا گیلانی اس سے زیادہ..... ٹھنکرا کر آئے تھے۔ انہیں دنیاوی لالچ تو کیا ہوتا لیکن اس ارادے سے ساتھ ہو لیے۔ کچھ تفریح ہو جائے گی۔ گجرات کے کئی علاقوں میں مقبول

احمد کے مریدوں کے ہستیاں تھیں۔ یہ سب غریب لوگ تھے لیکن پیر صاحب آئے تھے اور ان کے ساتھ ایک مولوی صاحب بھی جو ان غریبوں کے نزدیک بڑے پیچھے ہوئے ہوں گے جنہی تو پیر صاحب انہیں اپنے ساتھ لائے ہیں۔ معتقدین نے راہ میں انھیں بچھا دیں۔ مولانا کی تقریروں نے الگ دھوم مچا کر رکھی تھی۔ دن رات دعوتیں ہو رہی تھیں۔ نذرانے چڑھاتے.... جا رہے تھے۔ مقبول احمد صاحب کی ایسی گرم بازاری تھی کہ لوگ حیدر سے گر رہے تھے۔

پندرہ مئی دن گزر گئے تو مولانا گیلانی کو احساس ہوا کہ وہ کس مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ دنیا داری کی ایک مشکل یہ بھی تو ہے جس میں وہ پھنس گئے ہیں بلکہ یہ تو ایک طرح کی فریب کاری ہے جس کا وہ بھی حصہ بنے ہوئے ہیں۔ انہوں نے یہی بھی تڑانے کا فیصلہ کر لیا۔

”مقبول شاہ ہم توکل جا رہے ہیں۔“

”کہاں؟“

”دیکھو کہاں جانا ہوتا ہے ابھی کچھ سوچنا ہیں۔“

”میرا کہاں تو میرے ساتھ ہی رہ جاؤ۔ دو چار مہینے بعد یہاں پھر اگلا لیتا ہوں اور پھر پیچہ رکھتا ہوں۔ تمہیں بھی کچھ کرنے کی ضرورت کیا ہے۔“

مولانا مناظر نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔ دنیا پوری دلربائی کے ساتھ ان کے سامنے کھڑی تھی۔ تمام سامان راحت میرا آسکتے تھے لیکن یہ تو کدنداری ہے۔ اگر یہی کرنا تھا تو حیدر آباد کیا بڑا تھا۔ مجھے یہ سود منظور نہیں۔ گجرات سے چلے اور ایک مرتبہ پھر دینا بند آگئے۔ آتے ہی نائب مہتمم مولانا حبیب الرحمن عثمانی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولانا عثمانی نے پوچھا اتنے عرصے کہاں رہے؟ مولانا گیلانی نے تمام احوال اجمالاً سنا دیا۔

”اچھا ہوا تجربہ ہوا ہوگا۔ اب یہاں سے کہیں مت جانا۔“ مولانا عثمانی نے سردست دس روپے ماہوار ان کے نام جاری کر دیے تاکہ طعام و قیام سے سبک دوں جو جائیں۔ قیام کا بندوبست مدرسے ہی میں ہو گیا۔ ایک ماہ بعد باقاعدہ ملازمت ہوئی۔ تنخواہ تیس روپے ماہوار ملے ہوئی۔ اس تنخواہ میں درس و تدریس کی خدمت بھی انجام دیتے۔ دیوبند سے نکلنے والے القاسم و الرشید رسالوں کے مضامین کی ترتیب کا فریضہ بھی انجام دیتے اور انہیں آس پاس کے دیہات میں واعظ کی طلبی آتی تو وہاں بھی بھیج دے جاتے۔ جا کر تقریر پر کرتے گویا اب وہ مدرسہ بھی تھے رسالے کے مدیر بھی اور مبلغ بھی۔

انہی رسائل کے ذریعے مضمون نگاری کا بھی آغاز ہوا۔ اپنے اپنے مضامین خط تحریر میں لائے کہ ”سلطان القلم“ اور ”نیکس الخیر“ کے القابات سے نوازے جانے لگے۔

ان کے اساتذہ تک نے دیکھا کہ وہ ایک بڑے ادیب کی صورت میں سامنے آ رہا ہے۔ جس موضوع اور عنوان پر قلم اٹھاتے ایسا معلوم ہوتا کہ سمندر جھکے جوش مار رہا ہے۔ جدید و قدیم دونوں مواد اور معلومات کا بڑا ذخیرہ ذہن و دماغ میں جمع رہتا جو کچھ وقت صفحہ قرطاس پر پھیلتا جاتا۔ بے ساختگی، زور بیان، مضبوط استدلال اور سوز و گداز عینی خصوصیات پڑھنے والے کو اپنے سر میں گرفتار کر لیتی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ علوم و معارف کا ایک اتمہ سمندر ہے جو ٹل کھار رہا ہے۔ تاشی مواد اس سلیقے اور ترتیب سے استعمال کرتے کہ ایک قدم دور کے فاضل اور محدث ظاہر ہونے کے بجائے عصر حاضر کے معصف معلوم ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے قلم سے نکلے ہوئے مضامین جدید تعلیم یافتہ طبقے میں بھی مقبول ہو رہے تھے۔

دیوبند سے نکلنے والے دونوں پرچوں کو اس خوبی سے ایڈٹ کیا کہ ان کا شمار ادبی پرچوں میں کیا جانا لگا۔ تاریخ، ہند پرانی گہری نظر ڈالی کہ وہ مولوی سے زیادہ مورخ نظر آنے لگے۔

ان کے مضامین معارف اعظم گڑھ، برہان دہلی، الفرقان لکھنؤ اور صدقہ جدید لکھنؤ میں باقاعدگی سے شائع ہونے لگے۔ یہی مقالات بعد میں کئی شکل میں شائع ہوئے اور اردو کی تاریخ میں معلومات کے کئی خزائن نکھر گئے۔

ایک مصنف کے لیے وسعت مطالعہ کی ہی نہیں قوت مشاہدہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ مولانا اس مشاہدے کے لیے بھی... کچھ نہ کچھ وقت نکال ہی لیا کرتے تھے۔ دور طالب علمی میں بھی وہ دیوبند سے باہر کچھ نہ کچھ وقت سیر و تفریح کے لیے نکال لیا کرتے تھے۔ اس ملازمت کے دوران بھی جب تعطیلات ہوئیں تو وہ دیوبند سے نکلے۔

پنڈت دیانند سرمستی آریہ سماج کے بانی تھے۔ ان کے ماننے والوں نے ایک خاص طرح کی تعلیم کا گہر کھل کی نگرانی میں جاری کر رکھی تھی جہاں ہندو طلبہ کو مذہبی تعلیم دی جاتی تھی۔ مولانا کو اس درس گاہ کے دیکھنے کا بہت شوق تھا۔

وہ ان دنوں رڑکی میں تھے۔ وہاں سے یہ علاقہ قریب تھا لہذا وہاں جانے کا ارادہ کیا۔ وہاں کے لوگوں سے ذکر کیا۔ لوگوں نے بتایا کہ وہ جنگل کا علاقہ ہے۔ ان دنوں برسات ہے وہاں جانا ٹھیک نہیں ہوگا لیکن مولانا بغیر تھے۔ نام کے

مجاہد صاحب سیکرٹری

ساتھ مولانا نالکھاجا جاتا تھا تاہم تھیں تھو جوان اور جوانی کسی مامی ہے۔ راستے کے کھانے کے لیے کچھ سامان ساتھ لیا بعض سن رسیدہ لوگوں سے راستہ بھی اچھی طرح سمجھ لیا۔ ٹرین میں بیٹھے اور ہر دو آگئے۔ سوچا تھا رات کی سرائے میں گزار لیں گے۔ سرائے اسٹیشن کے پاس ہی تھی لیکن سرائے والا کسی قیمت پر تیار نہیں تھا کہ ایک مولوی مسلمان کو قیام کی اجازت دے۔ پورا شہر ہندوؤں کا تھا۔ مسلمان دیکھنے کو بھی نہیں تھا۔ سرائے میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں مل رہی تھی۔ واپس آکر اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر رات گزار دی۔ صبح ہوئی تو ایک بوڑھے سادھو پر نظر پڑی۔ اس سے گاڑی کا راستہ پوچھا۔ پیلے تو وہ بتانے سے گریز کرتا رہا پھر اسے ترس آ گیا۔ اس نے بتایا فلاں جگہ جا کر سکتی ہے اس بار ہو جائیں اور وہاں سے جنگل میں داخل ہو جائیں۔ وہاں اگر کوئی مل جائے تو اس سے پوچھ لیا۔ مولانا نے یہی کیا۔ گھاٹ پر پہنچ کر سکتی ہے اس پار پہنچ گئے۔ راستے جنگل کھڑا تھا۔ نہ کوئی سواری نہ مسافر۔ گھڑی بھل گئی تھی جنگل کی گڈمڈی پر چل پڑے۔ کئی چھوٹے بڑے نالے آئے جنہیں پار کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ کیا خبر کتنا راستہ طے کیا ہوگا کہ غیب سے مدد ہو گئی۔ ایک بوڑھا آدمی مل گیا۔ اس جنگل میں وہ کیا کر رہا تھا نہ انہوں نے پوچھا نہ اس نے بتایا۔

اس بوڑھے نے کہا ”میں آپ کو وہاں تک چھوڑ آؤں۔“ وہ ان کے ساتھ چلتا رہا یہاں تک کہ کمرات صاف نظر آنے لگی۔ ”یہ آپ کی منزل پر پہنچ گئے۔ میں چلا۔“ اس بوڑھے نے کہا اور واپس ہو گیا۔

مولانا اللہ کا نام لے کر عمارت میں داخل ہوئے۔ کچھ لوگ انہیں دیکھ کر ان کے گرد جمع ہو گئے اور مولانا کو پرپل کے پاس لے گئے۔ پرپل بھلا آدمی تھا بڑی گرم جوشی سے ملا۔ دیر تک باتیں کرتا رہا۔ ان باتوں کا لب لباب یہ تھا کہ اس ادارے کے قیام کا مقصد قدیم و جدید کو باہم قریب لانا ہے۔

”اس سنان جنگل میں؟“

”یہ جگہ اس لیے منتخب کی گئی ہے کہ شہری تمدن کے زہریلے اثرات سے طلبہ محفوظ رہ سکیں اور نیکو ہو کر اپنی تعلیم میں مہمک رہیں۔ یہاں وہی آئیں گے جو علم کی آشتارکتے ہوں جیسے آپ آئے ہیں۔“ پرپل نے ایک آدمی ساتھ کر دیا جس نے تمام کالج دکھایا۔ کتب خانے کی سیر کرائی۔ اس کے بعد انہیں مہمان خانے میں پہنچا دیا گیا۔ اس وقت بارہ بج رہے تھے۔ ظہر کا وقت ہوا تو بھلی آواز سے اذان دے کر نماز ادا کی اور لیٹ گئے۔ عصر پڑھ کر واپس آیا کہ ارادہ کر لیا۔ پرپل نے سنا تو سر جھٹک دیا۔

”مولوی جی، کیا کرتے ہیں۔ تین چار گھنٹے پیدل کا راستہ ہے۔ رستے میں رات ہو جائے گی۔ رات نہیں گزارلو سویرے چلے جانا۔“

مولانا کو جانے کی جلدی تھی وہ چل دیے۔ گینڈی پکڑے گردن جھکائے چلتے رہے کنارے آئے تو آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ کالج کا مہمان خانہ اب یاد آ رہا تھا۔ وہ ایک جنگلی نالے کے کنارے کھڑے تھے جس کے ایک طرف گٹھا جنگل اور دوسری طرف اونچے اونچے خوفناک پہاڑ تھے۔ دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ مغرب کی نماز کا وقت

ہو رہا تھا۔ سو چاہا جو ہوسو ہونا زون پڑھ لی جائے۔ ابھی نماز ختم کرنے کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تھے کہ ایک آہٹ سی محسوس ہوئی۔ دیکھا تو کچھ لوگ بیل ہکاتے آ رہے تھے۔ وہ دوڑ کر ان لوگوں کے پاس پہنچے اور ان کے ساتھ اس جنگل سے لگنا نصیب ہوا پھر وہی راستہ اختیار کیا۔ ہر دور اسٹیشن پہنچے اور رٹھی ہوتے ہوئے دیوبند واپس آ گئے۔

وہ بڑے بڑے خواب لے کر حیدر آباد گئے تھے۔ وہاں سب کچھ بھی سکتا تھا لیکن خدمت دینی کا جذبہ انہیں دیوبند لے آیا۔ یہاں تنخواہ صرف تیس روپے تھی لیکن وہ اس میں خوش تھے۔ دنیا کو ٹھکرا کر دین کی طرف آ گئے تھے۔ کچھ مہینوں بعد وطن کی یاد دانی۔ دارالعلوم سے رخصت لی۔ انہیں گیلانی سے شدید عہدیت تھی۔ گیلانی کو اپنے نام کا جزو بنایا تھا۔ وطن کی نشاندہی میں ایک مثنوی بھی لکھی تھی۔

مقطع الراس وہ وطن پیارا
عہد طفلی کا اپنے گہوارہ
وہ درختوں کی اس کے رعنائی
اور بانگوں کے حسن و زیبائی
گیلان پنج کر عزیز و اقارب سے ملاقاتیں اور بچپن کے دوستوں کے ساتھ ہر تفریح کا لطف ہی عجیب تھا۔ پختہ مڑک کے کنارے بنی بیٹھک میں ہر وقت دوستوں کا ہجوم رہنے لگا۔ ایسی ہی ایک محفل میں مولوی سید علی عظیم سے ملاقات ہوئی۔ دارالعلوم دیوبند کے ایک قدیم فارغ مولوی تھے۔ مولانا گیلانی ان سے نہایت تپاک سے ملے پھر وہ تقریر باز آنے لگے۔ ایک دن آئے تو ملاقاتوں میں سے کوئی موجود نہیں تھا اور وہ غالباً اسی موقع کے انتظار میں تھے۔ میدان صاف دیکھتے ہی بات چیمبردی۔

”آپ کو دیوبند لے کئے پیسے دیتے ہیں؟“

”صرف تیس روپے ماہوار۔“

”صرف..... آپ کبھی شخصیت اور تیس روپے۔“
”میری شخصیت ہی کیا۔ آپ تو وہاں پڑھا چکے ہیں۔ وہاں کیسے کیسے جید علما موجود ہیں۔“
”میں نے سنا ہے آپ حیدر آباد بھی تشریف لے گئے تھے۔“

”وہاں خدمت دینی کا موقع نہیں مل سکا جو دیوبند میں مل رہا ہے۔“
”آپ یہ خدمت تو گھر سے قریب بہار میں رہ کر بھی انجام دے سکتے ہیں اور مشاہیر بھی شاید اس سے کچھ زیادہ ہی ملے۔“

”یہاں ایسی کون سی درس گاہ ہے جس کی آپ بات کر رہے ہیں؟“
”درس گاہیں دس بن جائیں گی۔ اس وقت تو پروگرام یہ ہے کہ تمام علما کو متحد کیا جائے اور ایک پارٹی، جمعیت العلماء بنائی جائے۔ اس کا پہلا اجلاس قصبہ بہار شریف میں ہو رہا ہے۔ سوچتے دین کی یہ تھی بڑی خدمت ہوگی کہ تمام علما ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں پھر ہم اس جمعیت کو پورے ملک میں پھیلائیں گے۔“ انہوں نے اس طرح کی اور بھی باتیں کیں بڑے بڑے عزائم کا ذکر کیا۔

مولانا ان کی باتوں میں آگئے خاص طور پر اس لیے کہ وطن سے قریب رہیں گے۔ مولانا گیلانی اس سلسلے میں خانقاہ رحمانی مونگیر گئے جہاں بانی عہدہ العلماء لکھنؤ حضرت مولانا سید محمد علی مونگیری سے ملاقات ہوئی۔ ان کی باتوں سے بھی ظاہر ہوا کہ وہ بھی سید علی عظیم کی رائے کی تائید میں ہیں۔“
اس خانقاہ کو مرکز بنایا گیا اور بہار شریف میں ہونے والے اجلاس میں شرکت کے لیے مناظر گیلانی ہی کو بھیجا گیا۔ جہاں انہیں زور خطابت سے علما کو قائل کرنا تھا۔

مولانا دیوبند سے ایک ماہ کی رخصت پر آئے تھے مونگیر میں تین مہینے رہ گئے۔ مولانا حبیب الرحمن عثمانی نے خط لکھ کر دیر کی وجہ دریافت فرمائی۔ آپ نے لکھ دیا کہ کچھ لوگوں کا مشورہ ہے کہ بہار میں رہ کر دین کی خدمت کروں۔ یہ خدمت کیا ہے یہ بھی تحریر کر دیا۔

عثمانی صاحب کا پھر خط آیا۔ انہوں نے مولانا گیلانی کو نصیحت کی تھی اور لکھا تھا کہ تمہارے لیے مناسب یہی کہن دارالعلوم آجاؤ اور یہ بھی لکھا تھا کہ دارالعلوم اب تمہیں بچپان کے دوستوں سے ملے گا۔

ابھر چار مہینے کے قیام کے بعد ان پر یہ بھی کھل گیا تھا کہ انہیں جس کام پر لگا دیا گیا ہے وہ کامیاب ہونے والا نہیں بہار کے لوگ قدر ناشناس ثابت ہو رہے تھے۔ باتیں بتانے والے بہت تھے وقت پر کوئی کام نہیں آ رہا تھا۔ ایسے میں دیوبند سے خط آگیا تو انہوں نے بھی بہتر سمجھا کہ دیوبند واپس چلے جائیں۔

مولانا گیلانی ایک مرتبہ پھر دارالعلوم دیوبند پہنچ گئے۔ ابھی دارالعلوم آئے ایک مہینہ گزرا تھا کہ کلکتہ میں ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک انگریزی اخبار نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق نامناسب الفاظ شائع کیے۔ اس بدکلامی نے کلکتہ کے مسلمانوں اور خاص طور سے علما میں بیجان برپا کر دیا۔ حکومت برطانیہ کی بھی۔ مسلمانوں کے دلوں میں انگریزوں کی طرف سے ویسے ہی نفرت تھی۔ سیاسی تحریکیں چلنے لگی تھیں۔ ایسے میں کسٹا کی کل میں آگئی۔ جگہ جگہ ہنگامے پھوٹ پڑے۔ خدشہ تھا کہ یہ ہنگامے کسی بڑے فساد کا روپ دھار لیں گے۔ کل ہند پیمانے پر یہ فیصلہ کیا گیا باضابطہ ایک مجلس بنائی جائے تاکہ اس قسم کے بے ادبیوں کی راہ ہمیشہ کے لیے مسدود کر دی جائے۔ کلکتہ میں سارے ہندوستان سے علما کو طلب کر کے ایک اجلاس عظیم کیا جائے اور حکومت سے مطالبہ کیا جائے کہ آئندہ اس قسم کی ناہمواریوں کی وہ ضمانت لے۔

کلکتہ کے تاجروں کی جانب سے دارالعلوم کو خط لکھا گیا کہ دارالعلوم سے علامہ تشریف لائیں اور سارے ڈٹے دار حضرات ابھی زحمت سہر برداشت کریں۔ اس درخواست پر غور کیا گیا۔ مطالبہ بالکل جائز تھا۔ یہ سانحہ ایسا تھا کہ علمائے وقت کو آنا چاہیے۔ کلکتہ میں جلسے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اس وفد کو ضرور جانا چاہیے۔ ملے گیا کیا عظیم دارالعلوم حافظ محمد احمد مولانا حبیب الرحمن عثمانی، مولانا انوار شاہ کشمیری پر مشتمل وفد تیار کیا جائے۔ اس وفد میں مناظر احسن گیلانی بھی شامل ہوں۔ ان کے زور خطابت کی اس وقت بڑی ضرورت تھی۔ کلکتہ اطلاع بھیج دی تھی کہ وفد فلاں تاریخ کو پہنچ رہا ہے۔

سب کو معلوم ہو گیا تھا کہ علمائے دیوبند کا وفد کلکتہ جا رہا ہے۔ راستے میں آنے والے اسٹیشنوں پر عوام کا ہجوم تھا جو ان علما کے استقبال کے لیے جمع ہو گئے تھے اور اللہ اکبر کے نعروں کی گونج سن انہیں اگلے اسٹیشن کی طرف روانہ کر رہے تھے۔ ان ہی روح پرور مناظر کے درمیان گزرتی ہوئی یہ

سوانحی خاکہ

نام: سید مناظر احسن گیلانی

والد: حافظ ابوالخیر

تعلیم: مدرسہ خلیلیہ (ٹونک)، دارالعلوم، دیوبند

ملازمت: مدرسہ خلیلیہ (ٹونک)،

دارالعلوم (دیوبند)، جامعہ عثمانیہ (حیدر آباد دکن)

پیدائش: 9 رجب الاول 1310ھ بمقام گیلانی ضلع پٹنہ

وفات: 5 جون 1956ء

تدفین: گیلانی ضلع پٹنہ

ثرین الد آباد پٹنہ۔ اسٹیشن ماسٹر پلیٹ فارم پر پریشان ہل رہا تھا پھر وہ اس ڈبے کی طرف لپکا جس میں یہ وفد سرگردا تھا۔

”حافظ محمد احمد کون سے ہیں؟ ان کے نام کلکتہ سے میرے پتے پر تارا آیا ہے۔ یہ تارا نہیں پہنچا ہے۔“ کلکتہ کا نام نرس کرسب کے کان کھڑے ہوئے کرسب کیسا تارا گیا۔ یہ تار ظاہر ہے انگریزی میں تھا اور یہاں سب عربی داس، تار کا ترجمہ اسٹیشن ماسٹر نے پڑھ کر بتایا۔ اس میں لکھا تھا کہ ”آپ لوگ واپس ہو جائیں کلکتہ کی حالت حد سے زیادہ نازک ہوتی چلی جارہی ہے۔ تفصیل خط سے معلوم ہوگی۔“ تار کا مضمون سننے ہی مولانا حبیب الرحمن عثمانی نے جلدی جلدی سامان اٹارنے کا حکم دیا۔

”سب لوگ اتر جائیں۔ صرف مولانا گیلانی اسی ٹرین سے کلکتہ جائیں۔ اگر جلسہ ہوتا ہے تو اس میں شریک ہوں اور تقریر کریں اور نہ وہاں جا کر حالات سے مطلع کریں۔“ سب لوگ اتر گئے۔ مولانا گیلانی کو اسی ٹرین سے کلکتہ جانا تھا لہذا وہ بیٹھے رہے اور ٹرین نے رفتار چڑکی۔

انہوں نے دیوبند سے روانہ ہوتے وقت اپنے چھوٹے بھائی مکارم احسن کو خط لکھ دیا تھا کہ علما کا وفد کلکتہ جا رہا ہے۔ میں بھی اس میں شریک ہوں۔ تم پٹنہ اسٹیشن پر آ جانا۔ ملاقات ہو جائے گی چنانچہ پٹنہ پر گاڑی رکی تو بھائی کو موجود دیکھا۔ ملاقات ہوئی۔ مکارم احسن کو جب معلوم ہوا کہ وفد واپس جا چکا ہے اور مولانا لے لے کلکتہ جا رہے ہیں تو مکارم نے انہیں بھی روکنے کی کوشش کی۔

”کلکتہ کے حالات بہت نازک ہیں کوئی آپ کے ساتھ

نہیں ہے آپ بھی وہاں نہ جائیں۔“ میرے بڑوں کا حکم ہے مجھے تو ضرور جانا ہے اور پھر معاملہ حرمت رسول کا ہے۔“ بھائی نے آپ کو روکنے کی بہت کوشش کی لیکن آپ نہ مانے۔ اسی کش مکش میں ٹرین نے سٹی دے دی۔ بھائی ٹرین کے ساتھ ساتھ بھاگتا رہا لیکن مولانا ٹرین پر چڑھ چکے تھے۔ ٹرین نے رفتار بڑھائی۔ بھائی پیچھے رہ گیا گاڑی آگے بڑھ گئی۔

باؤدھ اسٹیشن پر گاڑی رکی تو مولانا نے دیکھا پلیٹ فارم استقبال کرنے والوں سے کچھ کچھ بھرا ہوا ہے۔ گاڑی رکتے ہی لوگ ٹوٹ پڑے۔ ایک ایک ڈبے کو جھانکتے پھرتے تھے۔ عطا کا کہیں پتا نہ تھا۔ ایک ڈبے میں انہیں مناظر احسن گیلانی مل گئے جن سے ساری صورت حال کا علم ہوا۔

”آپ لوگوں نے تو تار دے دی تھا کہ آپ لوگ نہ آئیں۔ وفد الہ آبادی سے واپس ہو گیا مجھے فقیر کو بیچ دیا ہے میں حاضر ہوں۔“

”تار تو کسی نے بھیجا ہی نہیں۔“ ہر شخص کو حیرت تھی کہ ایسا تار کس نے بھیج دیا ہے ضرور کسی سازش کا حصہ ہے مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ مولانا کو ایک کار میں بٹھا کر مولوی عبدالرحیم اپنی کوشی پر لے گئے جہاں دیوبند کے وفد کے ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا تھا لیکن وفد میں تھا کون؟ ایک مناظر احسن گیلانی۔

لوگ مایوس ہو رہے تھے کہ جلسہ سونا ہوجائے گا۔ وفد تو آیا ہی نہیں۔ یہ راز اب تک نہیں حل سکا تھا کہ تار کس نے بھیجا تھا اور کیوں بھیجا تھا؟ یہ معما ابھی حل نہیں سکا تھا کہ ایک صاحب عبدالصمد... نام کے مولانا کو تہاد کچھ کران کے پاس آئے۔ ادھر ادھر کچھ کر اطمینان کر لیا کہ نزدیک میں کوئی ہے تو نہیں پھر سرگوشی میں کہا۔

”مولانا تار میں نے دیا تھا۔ کسی سے تذکرہ نہ کیجیے گا“ ورنہ عوام میری دجیاں اڑا دیں گے۔ حالات کی نزاکت کا تقاضا یہی تھا جو میں نے کیا۔ حکومتی حلقوں میں میرے بہت سے جانے والے ہیں۔ ان سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ عطا کو شہید کرنے کا منصوبہ بن چکا ہے۔ یہ کوشی جہاں آپ ٹھہرے ہوئے ہیں خفیہ پولیس کی نظروں میں ہے۔ آپ کے آنے جانے پر نظر رکھی جائے گی۔ آپ میرے ساتھ میرے گھر چلیں۔ وہیں سے جلسہ گاہ میں تعریف دے جائیے گا۔ یہاں سے تو کوئی آپ کو نکلنے بھی نہیں دے گا۔“ مولانا نے صاحب خانہ سے اجازت لی اور عبدالصمد کے گھر منتقل ہو گئے۔

حکومت اور مسلمانوں کے درمیان تنازع بڑھتا جا رہا تھا۔ مسلمان جلسہ کرنے پر بضد تھے اور حکومت اس جلسے کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ زکریا اسٹریٹ کی مشہور مسجد ناسخا میں مسلمانوں پر گولیوں چلا دی گئیں۔ بہت سے مسلمان شہید اور زخمی ہو گئے۔ کیسا جلسہ کہاں کا جلسہ۔ اب تو مولانا گیلانی کے دل میں جذبہ شہادت موجزن ہوا۔ سختی عزت کی بات ہے مسلمان تو حرمت رسول کے لیے اپنا خون بہا رہے ہیں اور میں گھر میں بیٹھا ہوں۔ وہ حاجی عبدالصمد سے بار بار کہتے تھے کہ مجھے چھوڑ دیجیے تاکہ میں بھی مسلمانوں کے ساتھ شریک ہو جاؤں۔ حاجی صاحب انہیں روک رہے تھے کہ آپ کی جان دوسروں سے زیادہ قیمتی ہے۔ حاجی صاحب نے گھر کے تمام دروازے بند کر دیے تھے۔ مولانا کا حال یہ تھا کہ ہر دروازے سے سرکراتے تھے۔ حاجی صاحب کو ٹھوڑی دیر کے لیے یہ شک ہونے لگا کہ مولانا اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے ہیں۔ انہوں نے مولانا کو کھنڈا لیا۔

”میں نے کچھ لوگوں کو بلایا ہے۔ وہ آج آئیں تو پھر چلے ہیں۔ میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔“ اسی کش مکش میں رات ہو گئی۔ چند نوجوان موٹر کار لے کر آ گئے۔ اب یہ معلوم نہیں کہ حاجی صاحب نے بلایا تھا یا وہ لوگ خود آئے تھے۔ ”مسلمانوں نے جلسے کا اہتمام کر لیا ہے۔ آپ کار میں بیٹھیں تاکہ ہم آپ کو جلسہ گاہ تک لے جا سکیں۔“ مولانا کار میں سوار ہو گئے۔ یہ نوجوان انہیں شہر سے باہر کی علاقے میں لے گیا اور مولانا کو ایک مکان میں جا کر بٹھا دیا۔

”آپ لوگ تو جلسہ گاہ میں لے جانے کے لیے لائے تھے۔“ ”جلسہ گاہ میں پولیس پہنچ گئی ہے۔ جلسہ ملتوی کر دیا گیا ہے۔ اب جب تک حالات ٹھیک نہیں ہو جاتے آپ کو اسی مکان میں رہنا ہوگا۔ باہر جانے کا خیال بھی نہ کیجیے گا۔“ اب مولانا کو احساس ہوا کہ وہ قید کر لیے گئے ہیں۔ ان کی پوری نگرانی کی جا رہی ہے۔ خدا جانے یہ حکومت کے آدمی تھے یا ان کے ہمدرد؟

اخبارات پابندی سے مل رہے تھے۔ ان اخباروں سے معلوم ہو رہا تھا کہ ہندو مسلم فساد چھڑ گیا ہے۔ بڑے پیمانے پر لوگ قتل کیے جا رہے ہیں۔ ٹرینیں تک محفوظ نہیں رہیں۔ ایک دن ایک اخبار میں بڑھاپنڈ اور گیا جانے والی ٹرین کے راستے میں کوئی ہل توڑ دیا گیا ہے۔ ٹرین کی آمد و رفت بند ہے۔ بڑے پیمانے پر گرفتاریاں شروع ہوئی

تھیں۔ مولانا سے وعدہ کیا گیا کہ اگر وہ کلکتہ شہر میں داخل نہ ہوں تو ان کو دیوبند بھیجے گا انتظام کیا جاسکتا ہے۔ مولانا نے وعدہ کر لیا۔

بہاری طالب علموں نے اسٹیشن پہنچا کر ٹکٹ لیا اور ناچو ریل میں بٹھا دیا اور کچھ دیا کہ راستے میں بکشن آئے گا وہاں ٹرین بدل جائے گی سکندر آباد، حیدر آباد والی گاڑی میں بیٹھ جانا۔ وہاں سے منہار ہو کر دیوبند پہنچ جاؤ گے۔

گاڑی سکندر آباد پہنچی تو معلوم ہوا کہ کل بقرعید ہے۔ اب اگر گاڑی میں بیٹھے رہتے تو عید گاڑی میں گزر جاتی آپ حیدر آباد میں اتر گئے کہ کل عید کی نماز پڑھ کر دیوبند کے لیے روانہ ہو جاؤ گا۔

اپنے ایک خاص عزیز مولوی سید محمد الدین حیدر آبادی کا خیال آیا۔ وہ اسٹیشن سے سیدھے ان کے مکان پر پہنچ گئے۔ جس جیلے میں وہ تھے اس میں کئی بے تکلف دوست کے گھر بھی پہنچا جاسکتا تھا۔ محمد الدین گھر سے نکلے اور دوست کو اس حال میں دیکھا تو پریشان ہو گئے۔ سفر کی گرد چہرے پر، ایک لنگی اور لمبا کرتا بدن پر۔ یہ تھی رئیس اختر ریل اور سلطان انظم۔

ایک نیا جوڑا کلکتہ کے چلے میں پہنچنے کے لیے ساتھ رکھ لیا تھا۔ صبح زیب تن کیا اور عید کی نماز کے لیے چلے گئے۔ ارادہ یہی تھا کہ نماز عید ادا کرتے ہی دیوبند کے لیے روانہ ہو جاؤں گا لیکن یہ قیام بڑھتا گیا۔ محمد الدین کا اصرار بڑھتا گیا اور مولانا مجبور ہو گئے۔ دیوبند کو خط لکھ دیا کہ کلکتہ سے پیچھے رہ جائیں اور لمبا ہوں۔ اب حیدر آباد میں ہوں دوستوں نے روک لیا ہے۔ بہت جلد دیوبند کا قصد کروں گا۔

مولانا حمید الدین فرامی نے درس قرآن کا ایک حلقہ قائم کیا تھا۔ مغرب کے بعد یہ مجلس ہوتی تھی۔ حمید الدین فرامی تقریر فرماتے تھے۔ لوگ خشک پیش کرتے تھے۔ مولانا حمید الدین کے جوابات دیتے تھے۔

مولانا محمد الدین، مولانا گیلانی کو ایک روز اس مجلس میں لے گئے۔ یہاں کا پاکیزہ ماحول اور مولانا حمید الدین فرامی کا انداز خطابت ایسا بھایا کہ اس مجلس میں تو اتار سے حاضر ہونے لگے۔ یہ بھول ہی گئے کہ دیوبند واپس بھی جانا ہے۔ مولانا حمید الدین فرامی سے تعلقات استوار ہوئے تو وہ بھی مولانا گیلانی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان دنوں حیدر آباد میں جامعہ عثمانیہ کا قیام مکمل میں آئے والا تھا۔ مولانا حمید الدین فرامی مدرسہ دارالعلوم کے پرنسپل تھے۔ یہ

یونیورسٹی جس کی بنیاد رکھی جا رہی تھی انہی کی تحریک و تحیل کا کرشمہ تھی۔ مولانا حمید الدین فرامی... کو معلوم تھا کہ سال ڈیڑھ سا بعد جب یہ جامعہ اپنا کام شروع کرے گی تو اس کے لیے اساتذہ کی ضرورت پیش آئے گی۔ انہوں نے کام کے لوگوں کا ابھی سے انتخاب کرنا شروع کر دیا تھا۔ انہوں نے مولانا پر زور دینا شروع کیا کہ وہ جامعہ عثمانیہ کے لیے درخواست دے دیں۔ مولانا کا دل تو دیوبند میں اٹکا ہوا تھا۔ وہ دیوبند چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ مولانا فرامی نے جب بہت مجبور کیا تو انہوں نے دیوبند ہٹا لکھا اور اس کی اجازت چاہی۔ دیوبند سے حسب مشا جواب آیا۔ دیوبند والوں کا خیال تھا کہ دکن میں دیوبند کے ایک عالم کا قیام دینی حیثیت سے مفید ہوگا لہذا انہوں نے درخواست دے دی۔

مولانا حبیب الرحمن خان شروانی حیدر آباد کے صدر الصدور تھے۔ مولانا فرامی، مولانا گیلانی کو ان کے پاس لے گئے اور فرمایا کہ ”میں ان کو بطور امانت آپ کے سپرد کرتا ہوں۔“

اس مرد مجاہد نے بھی فرمایا۔ ”یہ امانت میرے پاس محفوظ رہے گی۔“

مولانا حبیب الرحمن شروانی نے امانت داری کا حق ادا کر دیا۔ انعام و اکرام کی ایسی بارش کی کہ قدم زمیں پر نہیں رکھنے دیا۔ اسی قیام کے زمانے میں وہ بیمار پڑ گئے تو شروانی صاحب انہیں علاج کے لیے اپنے ساتھ علی گڑھ لے گئے۔ علاج کرایا۔ صحت یاب ہوئے کے بعد وہ اپنے وطن گیلان چلے گئے۔ یہاں آنے کے بعد جامعہ عثمانیہ سے تقرری کا خط ملا اور انہیں سامان سفر باعہنا پڑا۔

مولانا کی شہرت اس تقرری سے پہلے ہی ہو چکی تھی۔ مولانا انوار اللہ اور مہاراجا کشن پرشادان کے علم و فضل کے قائل تھے۔ عوام اور علما ان کی فاضلانہ تقریروں کے قائل تھے۔ القاسم اور الرشید دیوبند میں مولانا کے قلم سے تحقیقی و تاریخی مضامین لکھے جا چکے تھے اور اہل علم سے داد پاچکے تھے۔ تدریس کی بھی خوب اچھی طرح مشق ہو چکی تھی۔ عوام میں مقبولیت بھی کسی سے کم نہیں تھی لہذا جب یونیورسٹی پہنچے اور نیکچروں کا آغاز کیا طلبہ کی بھیڑ جمع ہو گئی۔ ہندو طلبہ بھی کھینچے چلے آ رہے تھے۔

مولانا گیلانی کی وسعت نظر، وسعت فکر، علوم دینی کے ساتھ مسائل حاضرہ پر ان کی علمی دیانت نہ صرف طلبہ کو اپنا گرویدہ کر لیا بلکہ ہر شعبے کا اساتذہ بھی انہیں قدر کی نگاہ سے

دیکھنے لگے۔

جامعہ عثمانیہ میں نئے علوم و افکار سے واسطہ پڑا۔ اسلامی مدارس میں ایک ہی قسم کے علوم سے واسطہ رہا تھا۔ یہاں آکر جدید تعلیم یافتہ ماہرین سے مقابلہ کرنے میں ذہن و کفر نے کسب کمال میں تیز رفتاری دکھائی۔ ان سب نے مل کر مولانا کو جدید علوم اور قدیم علوم کا سنگم بنا دیا۔

مولانا گیلانی کا ذہن رسا تھا۔ مطالعے سے قلبی شغف تھا۔ حافظہ قوی رکھتے تھے۔ وقت کے کسی حصے کو ضائع کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کتب بینی کے ذوق نے آپ کو عالم کل بنا دیا تھا۔ تفسیر وحدیث کو گھول کر ہی لیا تھا مگر اس کے ساتھ ہی نئے علوم کی کتابیں جو سامنے آئیں۔ انہیں بھی پڑھتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے طلبہ میں بھی یہی شان پیدا ہوئی۔ وہ بھی دینیات کے طالب علم ہوتے ہوئے عصری خیالات سے ناواقف نہ رہے۔ انہوں نے ایسے طلبہ کی ایک جماعت تیار کر دی جو برطانوی ہند میں انگریزوں کی آزاد خیال اور دہریت کے سامنے اسلام کا پرچم لے کر کھڑے ہو سکیں۔

یہ تمام علوم جن سے وہ جامعہ عثمانیہ میں آئے کے بعد واقف ہوئے ان کی مضمون نگاری میں نہایت کارآمد ثابت ہوئے۔ ان کے موضوعات میں بھی تبدیلی آئی اور انداز تحریر میں بھی۔ اب کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ مضامین کسی قدیم خیالات کے مولوی کی تحریریں ہیں بلکہ یہ مضامین ایک درد مند دل رکھنے والے مسلمان کی پیمان بن گئے۔ ان کا جو مضمون شائع ہوتا یا جو کتاب سامنے آتی دھوم مچ جاتی۔ منتوں تک اس پر تبصرے شائع ہوتے رہتے۔

☆☆☆

مولانا گیلانی کو قدرت کی طرف سے صاف ستھرا نقصانیت سے پاک دل ملا تھا۔ اس میں ان کے گھر کی تربیت اور حیدر اساتذہ کی صحبت بھی شامل تھی۔ زمانہ طالب علمی ہی میں شیخ الہند کے ہاتھ پر بیعت فرما چکے تھے لیکن مرشد اول سے استفادہ کا موقع نہ مل سکا۔ ذوق تصوف وہی تھا جس کی تسکین کے لیے وہ جلال الدین رومی کی مثنوی اور ابن عربی کی فتوحات مکیہ کا مطالعہ کرتے رہے تھے۔ حیدر آباد کے زمانہ قیام میں انہوں نے محسوس کیا کسی ایسے بزرگ سے پھر رشتہ قائم کیا جائے جو راہ سلوک طے کر چکا ہو کہ یہ راستے رہنما کے بغیر نہیں ہوتے چنانچہ آپ نے غور و فکر کے بعد ایک بغدادی۔۔۔ الاصل بزرگ کو منتخب کیا کہ جس کا قیام حیدر آباد میں تھا۔ ان

کا نام حبیب العبدروس تھا جو شیخ عبدالقادر جیلانی سے نبی اور بطنی نسبت رکھتے تھے۔

ان بزرگ سے اپنا رشتہ سلوک جوڑا اور سلسلہ قادریہ میں تربیت حاصل کی اور خلافت و بیعت سے نوازے گئے مگر اپنے خاص مزاج کی وجہ سے اطمینان کامل محسوس نہیں کیا۔ چشمت کارنگ طبیعت پر غالب تھا۔ کسی اور بزرگ کی تلاش ہوئی اور قدرت نے آپ کو مولانا محمد حسین کی خدمت میں پہنچا دیا جو شیخ محی الدین ابن عربی کے قالا حالاً ترجمان تھے۔ یہاں پہنچ کر مولانا کو طمانیت قلب کا احساس ہوا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد یہاں سے بھی خلافت ملی۔ حال تو یہ ہے کہ خلافت ملتے ہی مرید بنانے کی فکر ہو جاتی ہے اور ہوتی بھی چاہیے لیکن مولانا گیلانی کی عاجزی انہیں اس سے دور رکھتی تھی۔ حضرت گیلانی کی تقریروں میں بلا کا مبالغہ ہوتا تھا۔ خاص طور پر جمعہ کے دن جمع کی شان دیکھنے کی ہوتی تھی۔ بہت سے لوگ آتے تھے۔ بیعت کے لیے درخواست کرتے۔ ٹالے نہیں ملتے تھے لیکن آپ تیار نہیں ہوتے تھے۔

ایک مرتبہ یہ خیال آیا بھی کہ جب لوگ اتنا صرار کر رہے ہیں تو بیعت کرنا شروع کر دوں۔ اس میں حرج بھی کیا ہے لیکن جب رات کو بستر پر گئے اور سوچنے لگے تو اپنا خیال آیا۔ پتا نہیں کل قیامت میں اپنا معاملہ ہی کیسے طے پائے گا مریدوں کا بوجھ کہیں اپنی گردن پر ڈالوں؟ ہمت نہیں ہوئی اور بیعت و ارشاد کے اس رسی طریقے سے ہمیشہ دور رہے جس طرح سیاست سے دور رہے حالانکہ ان سے نزدیکی رکھنے والے ان کے صاحب معرفت ہونے کے قائل اور چشم دید گواہ تھے۔

علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنی آنکھوں سے کچھ دیکھا اور اس احوال کو مولانا گیلانی کے نام ایک خط میں تحریر بھی کر دیا۔ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب سلیم ندوی حج کے لیے گئے ہوئے تھے۔

”میں مطاف کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک میری نظر پڑی کہ تم طواف کر رہے ہو۔ خیال آیا کہ تم آتے تو مجھ سے ضرور ملتے۔ آخر کیا بنا جا رہے۔ میں خود تمہاری طرف لپکا لیکن دیکھا تم غائب ہو گئے۔ صوفیوں میں مشہور ہے کہ کعبہ میں نماز پڑھتے ہیں۔ کیا یہ ایسی کی ظہور کی شکل تھی؟“

انہوں نے اپنی باطنیت کو بہت سے پردوں میں چھپا رکھا تھا۔ یہ باطنیت کہیں طلبہ سے اخلاص میں ظاہر ہوتی تھی۔ تصنیف کی صورت میں بھی وعظ و تقریر کی صورت میں۔ یہی ان

کا تصوف تھا۔

☆☆☆

مولانا گیلانی تحویل گرامر گزرنے لگیان آئے ہوئے تھے۔ اچانک ایک سخت بیماری کا حملہ ہوا۔ اندرون جسم میں پھوڑے ہو گئے۔ ایسا معلوم ہوا کہ سارا بدن یک جہا ہے۔ ایسے مہلک مرض کا علاج گیلانی جیسی چھوٹی جگہ میں کیسے ممکن تھا انہیں پٹنہ لے جایا گیا۔ اسپتال میں داخل کر لیا گیا۔ ڈاکٹروں نے ہر پھوڑے کے لیے آپریشن تجویز کیا۔ یکے بعد دیگرے سات آپریشن ہوئے۔ آٹھویں آپریشن کی تیاری ہو رہی تھی۔ اسی رات آپ نے خواب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت فرمائی۔ اس خواب کی تفصیل آپ نے کبھی کسی کو نہیں سنائی۔

صبح ہوئی، عجیب صبح تھی۔ ڈاکٹر تھیر ہو کر پوچھ رہے تھے ”پھوڑا کہاں تھا؟“ آخر اس فیصلے پر مجبور ہوئے کہ اب آٹھویں آپریشن کی ضرورت نہیں رہی۔

سرکاری جو فنڈرجت ہوئی تھی اس کا ازالہ اسی طرح ہو سکا تھا کہ حضور اقدس کی شان میں نعت مبارک کہی جائے۔ کبھی زبان میں نعت کہی۔

پیارے محمد جگ کے سجن
تم پر واروں تن من و جن
تمری صورتیا من مومن
کھمبو کر اہو تو ورشن
تمری دوریا کیسے چھوڑوں
تم سے توڑوں تو کس سے جوڑوں
تمری گلی کی دھول بٹوروں
تمری گھر میں دم بھی توڑوں
جی کا اب ارمان یہی ہے
آٹھویں پہر اب وہیان یہی ہے

☆☆☆

ایک سال اور گزر گیا۔ آپ کو معلوم ہوا کہ مولانا عبدالباری ندوی اور مولانا عبدالماجد دیبادی جی کی تیاری میں مشغول ہیں اور سارے انتظام سرسہا کر رہے ہیں۔ ان کو باتیں کرتے دیکھ کر سوچتے تھے کاش وہ بھی حج کو جائیں۔ ان دنوں ہاتھ جگ تھا پچھلے سال اتنی بڑی بیماری کے بعد اٹھے تھے پھر سوچتے تھے کیا خبر کب ایسے ساتھی ملیں اور حج کی سعادت نصیب ہو۔ ان حضرات کی روادگی میں ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ باقی رہ گیا تھا کہ ایک رات دل سے مجبور ہو کر حج کا حقی فیصلہ

حلیہ

درمیانہ قد۔ نہ زیادہ موٹے نہ بولے۔ رنگ سپید و سرخ۔ چہرہ گول۔ ہلکی داڑھی نہ سنجان نہ بالکل چھدری۔ پیشانی کشادہ۔ آنکھیں روشن، نہ زیادہ بڑی نہ چھوٹی۔ بال ریشم کی طرح نرم و چمکدار۔

لباس

بدن پر کرتہ، پانجامہ اور شروانی، سر پر بیچ گوشہ ٹوپی، کبھی کبھی عمامہ۔ پاؤں میں سلیم شای۔ کبھی کبھی پمپ شو۔ شانے پر عری رومال۔

کچھ کتابیں

حضرت ابوذر غفاری، ایک ہندوستانی صحابی، اسلامی معاشیات، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، تدوین قرآن، تدوین فقہ، تدوین حدیث، مقالات احسانی النبی الخ تمی، جہاں رسال پہلے مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ، تذکرہ شاہ ولی اللہ، کائنات روحانی، سوانح قاسمی (تین جلدیں) امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی۔

کر لیا۔

عبدالباری اپنے والدین کو لینے لکھنؤ چلے گئے۔ مولانا گیلانی پہلے عزیز و اقارب سے ملنے پہلے گیلان گئے پھر لکھنؤ جا کر عبدالباری ندوی سے ملے۔ عبدالماجد دیبادی بھی وہیں آ گئے تھے۔ یہ قافلہ پہنچا اور وہاں سے جہاز میں سوار ہوئے۔

زیارت حرمین کا وہیان آنکھوں میں تھا۔ دل میں محبت رسول پہلے سے بھی زیادہ گرویش لے رہی تھی۔ اسی عالم مدہوشی میں آپ جہاز کی بالائی منزل پر چلے گئے۔ بے اختیار نعت کے اشعار نوک زبان پر آ گئے۔ اس عالم تہائی میں جو نعت آپ نے کہی جو بعد میں بہت مقبول ہوئی۔

ہر ایک سے نگر کر ہر شغل سے گھبرا کر
ہر کام سے بچتا کر ہر فعل سے شرما کر

☆☆☆

مولانا گیلانی عثمانیہ یونیورسٹی میں جب سے استاد ہو گئے تھے دارالعلوم دیوبند کی آمدورفت تقریباً بند ہی ہو گئی تھی۔

پاک، سوسائٹی ڈاٹ کام آپکو تمام ڈائجسٹ
 ناولز اور عمران سیریز بالکل مفت پڑھنے کے ساتھ
 ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک کے ساتھ
 ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے۔
 اب آپ کسی بھی ناول پر بننے والا ڈرامہ
 آن لائن دیکھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ
 لنک سے ڈاؤنلوڈ بھی کر سکتے ہیں۔

For more details kindly visit
<http://www.paksociety.com>

طرف تو ج بھی دلاتا تو آپ مسکرا دیتے۔

”بھائی! میرے وعظ و تقریر سے عوام و خواص کے ایک بڑے طبقے کو ایمان کی لذت ملی۔ عمل کا جذبہ پیدا ہوا۔ دل و دماغ کی دنیا بدلی اور دینی علوم سے شغف پیدا ہوا۔ اگر مجھے ننگے پاؤں پیدل آنا پڑا تو بھی یہ سودا کیا بُرا ہے۔“

آپ کی تقریروں کی ایسی دھوم تھی کہ نظام حیدر آباد بھی آپ کی تقریریں سنا کرتے تھے۔ اس کی صورت یہ ہوتی کہ کسی رئیس کے یہاں آپ کی تقریر کی جاتی۔ مجمع سامنے ہوتا اور نظام حیدر آباد سب کی نظروں سے اوجھل الگ بیٹھا کرتے۔ واعظ کو غیر تک نہیں ہوتی کہ یہاں نظام حیدر آباد بھی تشریف فرما ہیں۔

موضوع کوئی بھی ہوتا بس یہ معلوم ہوتا کہ خیالات کا دریا بے کراہتا اور اڑتا چلا آ رہا ہے۔ نئے نئے نکتے سامنے آتے۔ قرآنی آیات کے نئے مغایم سے آشنائی ہوتی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اتنی کثرت سے تقریریں کرنے کے بعد کسایت کا شکار ہو جاتے۔ ہر تقریر دوسری سے الگ ہونا کمال ہی تو تھا۔

نواز بہادر یار جنگ جن کی تقریروں کا بعد میں بہت شہرہ ہوا وہ کہا کرتے تھے کہ ”انہوں نے تقریر کرنا مولانا گیلانی سے سیکھی ہے۔ میلاد النبی کے جلسوں میں جب مولانا، حیدر آباد میں تقریر فرماتے تھے تو میں موٹر لے کر ان کے پیچھے دوڑتا رہتا تھا۔“

یونیورسٹی کے فرائض منصبی کے علاوہ رواز نہ کئی کئی لیکچروں کے ساتھ وعظوں اور تقریروں کے اس تسلسل نے ان کی صحت پر بُرا اثر ڈالنا شروع کر دیا۔ رات رات بھر جلسوں میں جانا پڑتا پھر یونیورسٹی میں مغز کھپاتے۔ اب عمر بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ صحت کا متاثر ہونا ضروری تھا۔

مخلص احباب کو گھر ہوئی۔ مولانا سے گزارش کر کے دیکھ لی گئی کہ وہ ہرگز نہ چلیا کریں لیکن ان کا ایک ہی جواب تھا کہ ”بھائی مجھے کسی کو منع نہیں کیا جاتا۔ کوئی اتنی دور سے امیدیں لے کر آتا ہے اس نے بھی کسی سے وعدہ کر رکھا ہوگا کہ وہ مولانا کو لے کر آئے گا۔ میں چلا جاتا ہوں اس کی شان بڑھ جاتی ہے۔“

ان کے چند مخلص احباب نے آپس میں مشورہ کیا اور مولانا کے از خود کہیں جانے پر پابندی عائد کر دی۔ مولانا سلیمان ندوی کو ان کی تقریروں کا اچھا راج مقرر کر کے یہ اعلان کرا دیا گیا کہ ”مولانا گیلانی اپنی رائے سے کسی جلسے میں تقریر کرنے کے مجاز نہیں جس کو تقریر کروائی وہ وہ پہلے سلیمان ندوی صاحب سے اجازت طلب کرے۔“ اس اعلان کے بعد

وہ بے یہ رابطہ ٹوٹا نہیں تھا۔ خط کتابت ہوتی رہتی تھی۔ آپ دیوبند کے نمائندہ کی حیثیت سے حیدر آباد میں قیام پذیر تھے۔ آپ کے اساتذہ سے جب کوئی حیدر آباد پہنچتا تو استقبال کرنے والوں میں آپ ہی سب سے آگے ہوتے۔ اگر دیوبند پر کوئی اعتراض اُٹھتا تو جواب دینے والوں میں وہی سب سے آگے ہوتے۔

ان کے اساتذہ سے بھی ان کی یہ خدمات پوشیدہ نہیں تھیں اور وہ سب دل سے چاہتے تھے کہ کسی طرح مولانا گیلانی کا تعلق دیوبند سے بحال ہو جائے چنانچہ 1930 میں دیوبند کی مجلس شوریٰ میں کچھ مجلس خالی ہوئیں تو مولانا حبیب الرحمن شروانی اور دوسرے اساتذہ کی کوششوں سے انہیں اس مجلس کا باضابطہ رکن منتخب کر لیا گیا۔

دارالعلوم کی سب سے ڈتے دار مجلس مجلس شوریٰ تھی۔ اس کے اراکین ہر دور میں ملک کے مشہور ترین صاحب فضل و کمال ہوتے رہے ہیں۔ اس کارکن منتخب ہونا مولانا کے لیے اعزاز تھا۔

شوریٰ کے اجلاس سال میں دو مرتبہ ہوتے تھے۔ اس بہانے اپنی مادر علمی میں حاضری کی ایک نئی صورت پیدا ہوئی جو ان کی بسکین دل کے لیے بہت تھی اور اس کے ساتھ ہی ان کی شہرت میں اضافہ ہونے لگا۔ اس مقبولیت کا سب سے زیادہ فائدہ حیدر آباد کے لوگوں نے اٹھایا۔ پورا حیدر آباد شہر مولانا کی تقریر کا عاشق و شیدائی تھا اُٹھتا جلسہ بازوؤں نے اس کا خوب فائدہ اٹھایا۔ اتنے بڑے شہر میں ہر رات کہیں نہ کہیں جلسہ ہوتا۔ آپ کو مدعو کیا جاتا۔ مروت اتنی تھی کہ انکار کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ یہ جلسے والے انہیں لیے لیے پھرتے رہتے۔ تقریروں کا یہ سلسلہ یوں تو سال بھر چلتا رہتا لیکن ربیع الاول کے مہینے میں شاید ہی کوئی دن آرام کا ملتا ہو۔

عموماً یہ جلسے رات کو ہوتے اور رات رات بھر چلتے رہتے۔ ان جلسوں کا حال بھی مشاعروں جیسا تھا۔ جلسہ کرانے والے بس اپنا کام کرنا چاہتے تھے۔ انہیں نہ مقرر سے محبت تھی نہ اس کی صحت کا خیال۔ جلسہ گاہ تک لے جانے کے لیے تو بڑی آؤ بھگت ہوتی تھی لیکن جو بھی تقریر ختم ہوتی تو بسا اوقات کارکنان غائب ہو جاتے۔ جسے لائے تھے اسے چھوڑ کر آنے کا خیال تک نہ آتا۔ مولانا کے ساتھ بھی اکثر ایسا ہوتا کہ واپسی میں سواری نہیں ملتی۔ پیدل ہی قیام گاہ کی طرف چل پڑتے۔ کئی مرتبہ تو ایسا ہوا کہ ڈانس سے آئے تو جو غائب، ننگے پاؤں گھر کی طرف چل دیے۔ کوئی اسے جبر ہے کی

تھوڑے دنوں میں معاملات قابو میں آئے اور اس طرح مولانا کی گری ہوئی صحت کو کچھ سنبھالا ملا۔ یہ فائدہ بھی ہوا کہ خطابت سے کچھ فرصت ملی تو آپ تصنیف و تالیف کی طرف زیادہ توجہ دینے لگے۔ جو مضامین انفرادی نوعیت میں شائع ہوئے تھے انہیں کتابی شکل دی۔ کئی کتابیں شائع ہوئیں جنہیں اہل نظر نے دلوں میں جگہ دی۔ ان کتابوں کی اہمیت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ ان کتابوں کے مطالعے نے ایک دو تین کثرت سے ایسے لوگ پیدا کر دیے جو مغربی علوم و فنون کی اسناد کے باوجود اسلامی علوم و فنون کی بڑی قابل قدر خدمات انجام دینے لگے۔

اچھا استاد وہ ہے جو نہ صرف تعلیم دے بلکہ کردار سازی کرے۔ مولانا گیلانی کی یہی کام انجام دے رہے تھے۔ انہوں نے اپنے طلبہ میں بیداری کی روح پھونک دی۔ طلبہ کی ایک ایسی مضبوط ٹیم تیار کی جن کے دل و دماغ اور ذہن و فکر سب مسلمان تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ ملک ابھی آزاد نہیں ہوا تھا۔ یہاں انگریزوں کی حکومت تھی۔ اسلامیات پر خود مسلمان کی طرف سے طرح طرح کے اعتراضات ہو رہے تھے۔ عیسائیت کا پروپیگنڈا اسلام کے خلاف ہو رہا تھا۔ نوجوانوں کا ایک طبقہ وہ بھی تھا جو اس پروپیگنڈے سے متاثر ہو رہا تھا۔ مولانا گیلانی نے ایک طرف اپنی تصانیف کے ذریعے اس پروپیگنڈے کا جواب دیا دوسری جانب ایسے لوگ تیار کرنے میں ہمہ وقت مصروف رہے جو ان کے بعد ان کے کام کو آگے بڑھائیں۔

مولانا خاص طرح اسلام کی خدمت کر رہے تھے وہ غیر مسلموں کو ایک آنکھ نہیں بھاری تھی۔ مولانا گیلانی جب شعبہ دینیات کے صدر ہوئے تو انہوں نے یہ نہ کوشش کر دی کہ دینیات کو لازمی مضمون قرار دے دیا جائے۔ برطانوی عہد تک ان کی یہ کوششیں بار آور نہ ہو سکیں۔ اسی اثنا میں ملک آزاد ہو گیا۔ اب انہیں امید تھی کہ دینیات کو بھی جدید علوم کی جگہ دی جائے گی لیکن آزادی کے بعد تو نہایت شدت سے ان کی مخالفت کی جانے لگی۔ انہیں افسوس تھا تو یہ کہ اس مخالفت میں درپردہ کچھ مسلمان بھی شامل ہیں۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ آزاد ہندوستان میں پہلے کی طرح دینیات ضروری طور پر پڑھائی جائے یا اس کو زیادہ اہمیت دی جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا کو راستے ہی سے ہٹانے کی سعی کی جانے لگی۔ ارباب اختیار نے انہیں دائرہ المعارف کی انتظامی و علمی کمیٹی سے خارج کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ شعبہ دینیات کے رعایتی وظائف بھی ختم

کر دیئے۔ پی ایچ ڈی کا ورک بھی شعبہ دینیات سے نکال دیا۔ ادھر مولانا گیلانی کی مدت ملازمت بھی ختم ہونے والی تھی۔ ان کے احباب مشورہ دے رہے تھے کہ توسیع کے لیے درخواست دیں لیکن حالات ایسے ہو گئے تھے کہ حیدر آباد سے دل اُچاٹ ہو گیا تھا۔ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔

اربابِ حل و غور کو چونکہ کوئی دوسرا آدمی نہیں مل رہا تھا اس لیے ان کی مدت ملازمت میں ڈیڑھ سال کی توسیع کر دی گئی۔ یہ ڈیڑھ سال بھی گزر گیا۔ جیسے جیسے ریٹائرمنٹ کے دن قریب آرہے تھے مختلف دوسری یونیورسٹیوں سے بلاوے آرہے تھے۔ بہاولپور سے وزیر تعلیم کا تار آیا لیکن آپ نے معذرت لکھ کر بیج دی۔ سلیمان ندوی اور عبدالمجید یادوی اس پر زور دے رہے تھے کہ پشپتنے کے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ آجائیں۔ بہار کے حالات ملک کی تسخیم اور اس کے آزاد ہونے کے بعد نازک ہو گئے تھے۔ بہت سے گاؤں ویران ہو گئے تھے۔ گیلانی کا حال بھی اچھا نہیں تھا۔ وطن کے راستے ان پر بند ہو چکے تھے۔ بہار کے خیال ہی سے روٹنے کھڑے ہو جاتے تھے پھر کہاں قیام کیا جائے؟ دن کے حالات بھی کچھ اچھے نہیں تھے۔ مولانا تذبذب میں تھے کہ کیا کریں کیا نہ کریں۔

سلیمان ندوی کا تقاضا پھر آیا۔ تاریخ اسلام کی کوئی جگہ خالی ہوئی تھی آپ نے اس کا جواب دیا۔

”آپ نے یہ عجیب سفارش فرمائی۔ تاریخ اسلام کی تدریس کیا فقیر کے بس کی بات ہے۔ امراض کے بجوم اور پیرائے سالی نے کیا اس کا موقع چھوڑا ہے کہ کسی نئے تدریسی مضمون کے لیے اپنے آپ کو تیار کر سکوں۔“

سلیمان ندوی کا پھر خدایا ”آپ علی گڑھ آجائیں تو لوگوں سے ملاقات ہی رہے گی۔“ آپ نے اس کا بھی جواب دیا۔ ”دل اس قسم کے امور میں ملنے ملانے پر آمادہ نہیں اور جی بات یہ ہے کہ نہ عمری ملازمت کی رہ گئی ہے اور نہ ایسی سعی ہے۔“

توسیع کی مدت بتدریج ختم ہو رہی تھی اور یہ خط کتابت چل رہی تھی۔ آدمی جہاں رہتا ہے اس سے انس ہو جاتا ہے۔ مولانا نے تو یہاں تیس سال گزارے تھے۔ جب خیال آتا تھا کہ حیدر آباد چھوڑنا پڑے گا تو وہ ایک انتہائی تکلیف سے دوچار ہو جاتے تھے۔ ملازمت کا آخری مہینہ آگیا تو غالباً وہ کسی فیصلے تک پہنچ چکے تھے۔

”میری ملازمت کا یہ آخری مہینہ ہے۔ اس وقت تک تو

دل مطمئن نہ تھا لیکن ایک جگہ پڑا ہوا تھا۔ اب کہاں جاؤں؟ سرپرست اس کے سوا کچھ سمجھ نہیں آتا کہ گیلانی چلا جاؤں۔“ آخر مارچ کا مہینہ بھی ختم ہوا۔ انہوں نے سلیمان ندوی کو اطلاع دی۔

”آخر وہ گھڑی بھی آہی گئی جس کا تیس سال پہلے انتظار شروع ہوا تھا۔ 13 مارچ 1949ء بعد ظہر جامعہ عثمانیہ کے شعبہ دینیات کی صدارت کا راجزہ دے دیا۔ دو تین دن بعد اسی گاؤں کی طرف واپسی کا ارادہ ہے جس سے تقریباً نصف صدی پہلے روانہ ہوا تھا۔“

اب کہیں کوئی اور کشش رہ بھی نہیں گئی تھی۔ مجلس شوریٰ کے رکن کی حیثیت سے دیوبند جانا لگا رہتا تھا لیکن یہاں بھی حالات دگرگوں ہوتے چلے گئے تھے۔ وہ محسوس کر رہے تھے کہ شوریٰ میں چند مخصوص لوگوں کو غیر معمولی اہمیت دی جا رہی ہے۔ انہی کی۔ آراء پر فیصلے ہونے لگے ہیں۔ وہ دل برداشتہ تو تھے ہی ایک مرتبہ مجلس میں گئے تو اجلاس کے دوران ہی مولانا تھانوی کے انتقال کی خبر آگئی۔ یہ مجلس، مجلس ماتم بن گئی۔ مولانا واپس آئے تو سخت مایوس تھے۔ دارالعلوم کا آخری ستون بھی مہمند ہو گیا۔ اس کے بعد جی نہیں چاہا کہ شوریٰ کے اجلاس میں شریک ہوں۔ اگلے سال جب دعوت نامہ آیا تو آپ نے جواب دینا بھی گوارا نہیں کیا اور شریک بھی نہیں ہوئے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت تھانوی کی وفات کے بعد دیوبند جانے میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوئی۔ اکابرین دیوبند نے پانچ سال تک ان کا انتظار کیا اور پھر ان کی رکنیت ختم کر دی۔ یہ وہی زمانہ تھا جب ملازمت سے ریٹائر ہوئے۔ یہ فستے داری بھی ختم ہوئی۔ اب گیلانی جانے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ بالآخر وہ گیلانی ضلع پٹنہ تشریف لے گئے۔ اس عرصے میں بہار کے حالات بھی کسی حد تک ٹھیک ہو چکے تھے۔ گیلانی کے وہ مسلمان جو کھر چھوڑ چھوڑ کر جا چکے تھے امن و امان ہوا تو پھر لوٹ کر اپنے گھر میں آبا ہو گئے تھے۔

مولانا کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ پہلے بھی وہ گیلانی آتے رہے تھے لیکن اب تو یہ عالم تھا جیسے بچپن لوٹ آیا ہو۔ گاؤں میں سب کو خوشی تھی کہ اب مولانا نہیں رہیں گے۔ خاندان والے بھی خوش تھے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ وہ خود بہت خوش تھے۔ آنے جانے والوں سے یہی کہتے تھے کہ زندگی کے پھیلوں سے فرصت ملی۔ اب انہماک کے ساتھ لکھنے پڑھنے کا موقع ملے گا۔

پنہ سڑک کے کنارے بیٹھک تھی وہاں لکھنے پڑھنے کا

سامان فراہم کر لیا۔ کتابیں الماریوں میں رکھوا لیں۔ صبح سے شام تک بیٹھک میں ہی قیام رہتا۔ ناشتا اور دن کا کھانا یہیں تناول فرماتے۔ عشا کی نماز مسجد میں ادا کر کے اندر گھر میں تشریف لے جاتے۔

ابھی نئے نئے ریٹائر ہوئے تھے۔ دنیا انہیں بھولی نہیں تھی۔ مختلف یونیورسٹیوں کی طرف سے دعوت نامے آرہے تھے۔ پنجاب یونیورسٹی نے ڈیڑھ ہزار ماہانہ کی پیش کش کی۔ کراچی یونیورسٹی نے اصرار کے ساتھ بلایا لیکن آپ نے معذرت کر لی۔ وہ جو سز کرتے تھے نہیں تھے گیلانی کی معنی میں سٹ کر بیٹھ گئے تھے۔ صحت بھی ابھی تک کچھ زیادہ ناموافق نہیں تھی لیکن دنیا کی طرف سے بے رغبتی تھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

مولانا کا کلونا لڑکا محی الدین کراچی میں تھا۔ اس نے چاہا کہ مولانا اس کے پاس آجائیں۔ وہ خط لکھ لکھ کر بلاتا رہا پھر خود بھی گیلانی آیا لیکن آپ نے گیلانی چھوڑنا پسند نہیں کیا۔ مولانا گیلانی صاحب جانداد تھے۔ کئی باغات تھے، کاشت کی زمین بھی کافی تھی لیکن مولانا ان کاان چیزوں سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ وہ توفانی اعلم تھے۔ دنیا سے قطعی لاطلق۔ جب تک حیدر آباد میں تھے اس وقت بھی یہی حال تھا اور اب تو بڑھ چا ہوا تھا۔ جانداد سے تو کیا لیتے جو اپنے پاس تھا وہ بھی بھائی بیٹیوں پر خرچ کر دیتے یا ضرورت مندوں کو قرض دے کر بھول جاتے۔ فگر بھی تو یہ کہ کون سے عزائمات ایسے ہیں جن پر ابھی کتابیں نہیں لکھی تھیں۔ عموماً اب گیلانی سے نکلنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اگر کبھی نکلے بھی تو ذاتی کام سے نہیں اور اسلام کی خدمت کی غرض سے۔

وہ دارالمصنفین اعظم گڑھ کی مجلس انتظامیہ کے رکن تھے۔ جب ریٹائر ہوئے تو آپ کو مجلس عاملہ کا رکن بھی بنادیا گیا۔ دارالمصنفین کا ایک اہم جلسہ (1950ء) تھا۔ اس میں شرکت کے لیے وہ گیلانی سے اعظم گڑھ پہنچے۔ اسٹیشن پر جولوگ انہیں لینے آئے تو ان کی سادگی دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ ان کے ساتھ صرف ایک درمی، ایک چادر، ایک ٹیکہ، المونیم کا ایک بوتلا اور ایک کپڑے میں لپٹے ہوئے دو جوڑے تھے۔ یہ حال اس شخص کا تھا جس کے گیلانی میں باغات اور زمینیں تھیں لیکن آپ فرماتے تھے ”دنیا میں جتنا میرا حصہ ہے میں اتنا لیتا ہوں۔“ ریٹائرمنٹ کے بعد ایک سفر کرنا چاہی کہ ابھی کرنا پڑا تھا۔ جب مملکت خدا داد پاکستان وجود میں آئی تو مولانا بشیر عثمانی نے چاہا کہ یہاں اسلامی دستور نافذ ہو۔ اس اسلامی دستور کو

مرتب کرنے کے لیے مولانا عثمانی نے بہت سے علماء کو کراچی میں جمع کرنے کی سعی فرمائی۔ ان میں مولانا گیلانی کا بھی نام تھا۔ حکم استاد کا تھا اور پھر یہ بھی دین کی خدمت تھی۔ کوئی بہانہ نہیں چل سکتا تھا۔ آپ کراچی آئے۔ بحث و مباحثہ کے بعد آخری شکل میں اس کو قلمبند کر کے مجلس کے حوالے کیا اور تقریباً سو دن کے قیام کے بعد واپس چلے گئے۔ پاکستان کے دستور اسلامی میں مولانا گیلانی کا خاص حصہ ہے۔

آپ کی زندگی کے آخری دن تھے اور یہ سب لکھنے پڑھنے میں بسر ہو رہے تھے۔ ایک چار پائی تھی اسی پر قلم دوات رکھ لیتے اور علم و فن کا خزانہ لاتے رہتے۔ چار پائی کی لغل میں دوخت تھے۔ ان پر معمولی فرش اور اس کے اوپر ایک قالین تھا۔ قالین اور فرش کے درمیان ان کا دفتر تھا۔ کاغذات اور خطوط قالین کے نیچے پڑے رہتے۔ کمرے میں چار بڑی الماریاں تھیں جن میں منتخب کتابیں تھیں۔ یہی ان کا آفس اور کتب خانہ سب کچھ تھا۔ لکھتے لکھتے جب ٹکنا محسوس کرتے تو چار پائی کی نیچے ہاتھ بڑھا کر ٹین کا ایک ڈبا گھسٹتے۔ اس میں مٹی کے تین برتنوں میں کھانا، چونا اور چھالی ہوتی تھی۔ کپڑے کے ایک ٹکڑے میں کچھ پان اس ڈبے سے پان کی گھوری بناتے اور اسے کھاتے ہی تازہ دم ہو جاتے۔ قلم پر حرکت میں آ جاتے۔

کبھی کوئی طالب علم چلا آ رہا ہے۔ پی ایچ ڈی کرنا چاہتا ہے۔ مشورے کے لیے آیا ہے۔ اپنے کاغذات اٹھا کر ایک طرف رکھ دیتے اور اس کی حوصلہ افزائی میں لگ جاتے۔ ضروری کتابوں کے نام بتا رہے ہیں۔ کس مضمون کو کس طرح سمیٹنا ہے یہ بتا رہے ہیں۔

دروازے پر دستک ہوئی کون ہے؟ معلوم ہوا کسی مدرسے کے مدرس ہیں۔ انہوں نے کوئی کتاب لکھی ہے۔ مسودہ لے کر حاضر ہوئے ہیں۔ اپنے کام پھر رہے۔ یہ کہہ نہیں سکتے کہ مسودہ چھوڑ جائے فرصت ہوئی تو دیکھ لوں گا۔ دو چار دن میں پھر چکر لگائے گا۔ کسی کو بار بار بلانا اچھا نہیں لگتا۔ ویسے ہزار مرتبہ آؤ۔ باتیں بھی کرتے جاتے ہیں اور مسودہ بھی پڑھتے جاتے ہیں۔

”آپ کہیں تو آپ کی اس کاوش پر اپنی رائے لکھ دوں۔“ اس کے کچھ کہنے سے بیشتر خود پیش کش کر دی۔ صرف اس لیے کہ جو شخص مسودہ لایا ہے اس کا مقصد یہ ہی ہوگا۔ اب یہ کیا ضروری ہے کہ وہ خوشامد کرے۔ صفحے دو صفحے کا پیش لفظ لکھ کر اس کے حوالے کیا۔

عشا کے بعد کا وقت اپنے لیے تھا لیکن اپنے لیے یہاں تھا کیا۔ کئی بیوروئی نے سخن مقرر کیا تھا۔ جن دنوں جانچنے کے لیے پرچے آتے ہوئے تھے اپنا یہ وقت بھی پرچے جانچنے میں گزرتا تھا۔

بعض قابل متحن اپنے معیار کو سامنے رکھ کر پرچے جانچتے ہیں لیکن مولانا کی نرم خوئی اور راست طبیعت یہاں بھی کام دکھائی تھی۔ مجھے طالب علم ہے۔ اپنے معیار کے مطابق ہی تو لکھے گا۔ لکھتے لکھتے مشتق ہوئی جائے گی۔ بلا ضرورت نمبر کاٹنے سے گریز کرتے تھے۔ یہ نرم خوئی بعض اوقات ان کے نقصان کا سبب بھی بن جاتی تھی۔ خصوصاً اس وقت جب آپ کسی کو قرض دیتے تھے اور طلب کرنے کی ہمت نہیں پاتے تھے۔ اکثر یہ رئیس ڈوب ہی جاتی تھیں۔ کبھی یہ بھی ہوتا کہ قرض مانگنے والا مصر ہے اور آپ کا ہاتھ اس وقت تنگ ہے۔ وہ اپنی ضمانت پر اسے قرض دلا دیتے اور پھر اپنی جیب خاص سے یہ پیسے ادا کرنے پڑتے۔

عام مسلمانوں سے جتنی شفقت سے ملتے تھے اور ان کی فلاح کا خیال رکھتے تھے۔ بڑے لوگوں سے ملنے میں اتنے گریز اں رہتے تھے۔ اس کا مظاہرہ لوگوں نے حیدر آباد میں مدت ملازمت کے دوران دیکھا تھا۔ نظام حیدر آباد ان کی تقریروں کے شیدائے اور آپ کی تقریروں کو چھپ چھپ کر سنا کرتے تھے۔ کوئی اور شخص ہوتا تو ان سے بڑے فائدے اٹھاتا لیکن آپ نے خصوصی ملاقات کی کبھی کسی نہیں کی۔ تیس سالہ مدت ملازمت میں کبھی ملنے نہیں گئے۔ وہ الگ قفسہ ہے کہ سالگرہ وغیرہ یا بعض خاص جشن کے دنوں میں دوسرے نوکروں کے ساتھ وہ بھی حاضر ہو جاتے تھے۔

ان دنوں دارالعلوم دیوبند کے مہتمم قاری محمد طیب تھے۔ وہ آپ کے پاس حاضر ہوئے اور نہایت مناسب کام کے لیے حاضر ہوئے۔

”مولانا آپ کے قلم میں حق تعالیٰ نے بڑی برکت دی ہے۔ آپ کی تصانیف سے اہل دیں ہمیشہ فیض یاب ہوتے رہیں گے لیکن ایک کام ایسا ہے جو رہ گیا ہے اور آپ کے سوا کوئی انجام نہیں دے سکتا۔“

”ایک کام کیا..... مجھے فقیر کی بساط ہی کیا۔ سیکڑوں کام ایسے ہوں گے جو رہ گئے ہوں گے۔“

”بے شک مگر اس کے لیے آپ نے بہت بڑی جماعت تیار کر دی ہے۔ میں جس کام کے لیے حاضر ہوا ہوں آپ کے اٹھ جانے کے بعد نا کام رہ جائے گا۔“

”میرے کرنے کا ہوا تو میں انکار نہیں کروں گا۔“

”ہانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا قاسم نانوتوی کی سوانح اب تک مرتب نہیں ہو سکی ہے۔ میں چاہتا ہوں یہ کام آپ کے ہاتھوں ہو۔“

”آپ نے میری غفلت کا پردہ چاک کر دیا۔“ مولانا گیلانی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ”یہ میری غفلت نہیں تو اور کیا ہے۔ آپ کے کہنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ یہ خیال مجھے کیوں نہیں آیا؟ میری عملی زندگی ”الھاسم“ دیوبند سے شروع ہوئی تھی۔ کیا اچھا ہو کے خاتمہ ”سوانح قاسمی“ کی خدمت پر ہو۔“

مولانا نے اسے اپنے لیے زاد آخرت سمجھ کر اس خدمت کو قبول کر لیا اور اس کی تدوین میں مشغول ہو گئے۔ یہ کام اتنا آسان نہیں تھا۔ شخصیت اتنی بڑی تھی کہ اس کا پھیلاؤ بھی بہت تھا اور صحت و اوقات کا خیال بھی دامن گیر تھا۔ حوالے کی سیکڑوں کتب کا مطالعہ الگ۔ پیری اور بیماری نے پہلے جیہادِ قلم بھی نہیں رہنے دیا تھا۔ خود آخوڑا کر کے لکھتے رہے۔ مختلف رسائل کے لیے مضامین بھی برابر لکھتے رہے۔ تدوین حدیث کا سلسلہ بھی جاری تھا لیکن خصوصی توجہ اب ”سوانح قاسمی“ پر تھی جسے وہ اپنے لیے زاد آخرت قرار دے رہے تھے۔

اس مسلسل محنت نے صحت پر مختلف قسم کے حملے کیے۔ کبھی سینے کا درد، کبھی معدے کی خرابی، اس پر مستزاد یہ ہوا کہ تنہا کا قدیم مرض جس کے متعلق خیال تھا کہ ختم ہو چکا ہے اچانک حملہ ہوا۔ اس نے رفتہ رفتہ دس کی شکل اختیار کر لی۔ حالت یہ ہو گئی کہ ایک قدم چلنا بھی دشوار ہو گیا۔ دو ڈھائی مہینے تک مسجد کی حاضری سے بھی محروم ہو گئے۔ سوانح قاسمی کا کام سر پر تھا۔ اس عالم میں کبھی کبھہ نہ کچھ تحریر کرتے رہے۔

اب عالم یہ تھا کہ علاج کے بعد کچھ افادہ ہو جاتا تو لکھنے پڑھنے کا سامان نکال لیتے۔ یہ خدشہ برابر لگ رہتا کہ ابھی کسی نہ کسی بیماری کا حملہ پھر ہو جائے گا۔ ابھی صحت سے زیادہ سے زیادہ کام کر لوں۔ اس شدت کار کی وجہ سے پھر بیمار پڑ جاتے۔ ڈاکٹروں کی طرف سے پہرا بٹھایا جاتا تو مجبور ہو جاتے پھر کچھ افادہ ہوتا تو پھر لکھنے بیٹھ جاتے۔ اسی مہوچ چھاؤں میں آپ نے ”سوانح قاسمی“ کی تین جلدیں مکمل کر لیں۔ تدوین حدیث کی تکمیل کی اور پھر اسے طباعت کے لیے دے دیا۔

مقالات احسانی کے کئی مقالات اسی بیماری میں مختلف رسالوں میں شائع کرائے تھے بعد میں آپ کے ایک شاگرد نے مرتب کر کے شائع کرایا۔ یہ تمام مقالات تصوف کے مختلف

پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ امام غزالی کے عہد اور اس کے قابل و مابعد پر بحث کرتے ہوئے اچھا خاصا تاریخی ذخیرہ فراہم کر دیا۔ ابن تیمیہ کے نظریہ مجددیت پر بھی بہت دل پذیر بحث کی ہے۔ امام احمد رضا اور شیخ اکبر نے سلوک و تصوف پر جو احسان فرمایا ہے اس کا تذکرہ بھی بہت مؤثر انداز میں فرمایا۔

نومبر 53ء میں دل کا حملہ ہوا اور پھر اس نے مستقل شکل اختیار کر لی۔ آپ آسانی سے ہار ماننے والے نہیں تھے۔ اس مرض سے بھی لڑتے رہے لیکن ایک سال بعد ہی ایسا سخت دورہ پڑا کہ صحنے کی امید جاتی رہی۔ آپ کو نورانی بیٹنے لے جا کر اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ ڈاکٹروں کو حیرت تھی کہ یہ شخص بیٹھ کیسے گیا۔ شاید آپ کے دماغ کی طرح دل بھی مضبوط تھا کہ اتنا سخت حملہ جھیل گیا۔

جب دل نے ذرا اپنی رفتار پر قابو پایا اور اطمینان ہوا تو گیلانی جیلنے کی ضد ہونے لگی۔ جلدی یہ تھی کہ کچھ ضروری مسودے اور حورے بڑے ہیں۔ اس مرتبہ تو مہلت مل گئی شاید آئندہ نہ ملے اس لیے گھر پہنچتے ہی انہیں مکمل کروں گا لیکن اس وقت منظر گھبرا گیا جب ڈاکٹروں نے لکھنے پڑھنے پر مکمل پابندی عائد کر دی۔ اس پابندی میں یہ راز یقیناً پوشیدہ تھا کہ وہ دل سے لکھتے تھے اور اب دل ہی سا شتر تھا۔

دو ڈھائی مہینے بعد گھر لوٹے تو خود بھی اجنبی لگ رہے تھے کہ بہت کمزور ہو گئے تھے۔ وہ بیٹھک بھی اجنبی لگ رہی تھی جو اٹھتے بیٹھتے کا محل تھی۔ الماری میں رکھی کتابوں کو حسرت سے دیکھتے رہتے تھے۔ بیرون پر سون کے آثار تھے۔ اکثر یہ اشعار گنگناتے رہتے تھے۔

دل نہیں لگتا تو کیوں گھبراؤ شاد جی چکے بس تانکے مر جاؤ شاد میں نے مانا بخشنا لوگے گناہ اور نہ جو اس کی بھی مہلت پاؤ شاد

ایک مہینے بستر پر دراز رہنے کے بعد اتنی اجازت چاہی کہ کچھ دوستوں کو خط لکھ لوں۔ گھر والے کی طرح نہیں چاہتے تھے کہ یہ اجازت بھی دیں۔ ان سے کہا گیا کہ وہ بولنے جائیں کوئی شخص لکھ دے گا لیکن آپ کا کہنا تھا کہ دوستوں کو تو اپنے ہاتھ ہی سے خط لکھا جاتا ہے۔ تحریر بھی تو چہرہ ہوتی ہے۔ دوست میری تحریر دیکھیں گے تو دراصل وہ میرا چہرہ دیکھیں گے۔ کسی اور سے خط لکھنا غیریت کے ذیل میں آتا ہے۔ مجبور ہو کر انہیں قلم دوات دے دی گئی۔ مختلف اوقات میں مختلف دوستوں کو خط لکھتے رہے۔

ستمبر 2012ء

49

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

ماہنامہ سرگشت

48

”آپ کا یہ مریض الہی پناظر احسن گیلانی نہایت تک مرا ہے اور شاید مجھے ہونے کی بشارت سنا سکتا ہے۔ اسی حال میں مکن ہے جس حال میں رکھا گیا ہے۔“

کئی دوست گیلان ان سے ملنے آئے۔ دوستوں کو دیکھ کر وہی بشارت چہرے پر آگئی جو کبھی ان کی پہچان تھی۔ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ اتنی بڑی بیماری سے ہو کر اٹھے ہیں۔ دوست یہ دیکھ کر خوش ہوتے تھے کہ آپ تیزی سے صحت یاب ہو رہے ہیں۔ کمزوری ہے وہ بھی رفتہ رفتہ دور ہو جائے گی۔ آپ پھر کھنے پھرنے میں مشغول ہو جائیں گے۔

ایک رات سب گھر والے آپ کے نزدیک بیٹھے تھے تاکہ آپ کا دل بہلا رہے۔ کچھ ایسی باتیں کی جارہی تھیں جن سے مسرت و شادمانی کا ماحول پیدا ہو۔ خود آپ بھی ان باتوں میں شریک ہو کر جوش و مسرت کا اظہار کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے لیے یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ آپ بیمار ہیں۔ باتوں میں کچھ دیر کا وقفہ آیا تو آپ اپنے بھائی مکارم احسن سے مخاطب ہوئے۔

”مسلمانوں میں سکرات موت کے متعلق طرح طرح کی روایتیں کیوں مشہور ہو گئی ہیں؟“

”کہا تو یہی جاتا ہے کہ مرنے والے کو شدید تکلیف سے گزرنا پڑتا ہے۔“ مکارم احسن نے کہا۔

”یہ خیال ٹھیک نہیں ہے۔“ اس کے بعد آپ نے ایک قرآنی آیت پڑھی اور فرمایا۔ ”اس نص قطعی میں صاف طور پر اعلان کر دیا گیا کہ نیند جیسے آتی ہے موت بھی اسی طرح آتی ہے۔ نیند آنے میں سو نہنے والے کو تکلیف کب ہوتی ہے پھر موت میں تکلیف کا تصور عجیب ہے۔ میرے استاد مولانا حمید اللہ فراہی فرمایا کرتے تھے مرنے والے پر نشے کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔“

”جیسا آپ فرما رہے ہیں ایسا ہی ہوتا ہوگا۔“ مکارم احسن نے کہا اور بات کا رخ موڑنے کے لیے کوئی اور تذکرہ چھیڑ دیا۔ مولانا بھی سمجھ گئے کہ یہ لوگ اب اس بارے میں کوئی بات سنا نہیں چاہتے۔

”ٹھیک ہے بھائی تم لوگ موت کے نام سے ہی وحشت زدہ ہو جاتے ہو۔ اب تم لوگ جاؤ مجھے نیند آرہی ہے۔“ سب لوگ آپ کے پاس سے اٹھ گئے۔

اگلی شب فرمانے لگے۔ ”جنت میں کوئی بوڑھا نہ جائے گا۔“

ہر شخص جوان ہو کر جائے گا۔“ اگلے کئی... دنوں میں گھروالوں نے دیکھا کہ آپ کا چہرہ تروتازہ رہنے لگا ہے۔ اکثر اپنے چھوٹوں سے یہی مذاق کر لیا کرتے تھے۔ وہ بات بھی دیکھنے میں آنے لگی کہ کھڑے ہو کر نماز بھی ادا کرنے لگے۔

4 جون 1956ء کی شب ضرورت سے زیادہ خوش تھے۔ ہر شخص سے لطف و محبت کی باتیں کر رہے تھے۔ بارہ بجے ان کو آرام کرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ انہیں دیر تک نیند نہیں آئی پھر سو گئے۔ صبح اٹھے وضو کیا اور کھڑے ہو کر فجر کی نماز ادا کی۔ وظیفہ پڑھتے رہے پھر پبلنگ پر آ کر لیٹ گئے۔ ملازم سے کہا ”رات نیند کم آئی تھی۔ چادر اڑھا دو اب میں سونا چاہتا ہوں۔“ سوئے تو ابھی نیند سو گئے۔ گھروالوں نے سانس رکھتے ہوئے دیکھا تو چادر اٹھائی۔

ان کے بھائی مکارم احسن کا بیان ہے کہ چہرے پر گوشت تروتازہ تھا۔ اس منظر کو مکارم احسن ہی نے نہیں دیکھا بلکہ ہر شریک جنازہ نے حیرت سے دیکھا۔

مولانا کے بھتی ہوئے کی نشانی اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے۔ مولانا گیلانی کی وفات پر دنیا نے عالم میں کھرام بچ گیا۔ نماز ظہر کے بعد نماز جنازہ ادا کی گئی جس میں آس پاس کے تمام مسلمانوں نے شرکت کی۔ نماز جنازہ اس علاقے کے ممتاز عالم دین مولانا سید فتح احمد استخوانی نے پڑھائی اور اپنے آبائی قبرستان میں سپرد خاک کر دیے گئے۔

ہندو پاک کے تقریباً تمام اخبارات و رسائل نے تقریبی نوٹ لکھے۔ ”ملت بیچا کی ایک ستارہ گراں مایہ لٹ گئی۔ بزم انس و قدس کا چراغ فروزاں بجھ گیا۔“ پناظر احسن گیلانی نے اس عالم آب و گل کو خیر باد کہہ کر عالم آخرت کی راہ لی۔“

(رسالہ برہان دہلی)

جو کل تک ہر غم زدہ کے لیے مجسم تسکین و نشانی تھا خود اس کے غم میں کون اور کس کو ملی دے۔ جو کل تک ہمہ زندگی و تازگی ہمہ جودت و ذہانت تھا کس طرح یقین آئے کہ آج اس کا جسم خاک کی بر زمین پہنچ چکا ہے۔

خوش عقیدگی اور روشن خیالی و سرور فی الدین اور رواداری کی ایسی جامعیت کی نظیر کہیں اور شاید ہی مل سکے۔ (صدق جید مولانا عبدالماجد ربابیادی)

گیلانی میں کئی روز سناٹا چھایا رہا۔ مولانا کی بیٹھک اُواں رہی۔

یہ بات بہت زیادہ پرانی نہیں ہے کہ جب ایک نوجوان منگول خانہ بدوش چرواہے اوج کھونٹن نے ایک پرانا چینی ترک کرانے پر لے کر اس پر اپنا سارا مال و اسباب لادنا شروع کیا تھا۔ وہ سرد اور برف پوش وادیوں کی میدانی چراگاہوں کو چھوڑ کر اپنے پڑھوں کے برعکس ایک نئی طرز کی زندگی بسر کرنے کے لیے کئی سو میل دور واقع منگولیا کے پڑجوم اور بے پتہ انداز میں پھیلے ہوئے دار الحکومت الاان ہاتار کے لیے نقل مکانی کر رہا تھا۔

اوج کھونٹن منگولیا کے ان ہزاروں خانہ بدوشوں میں سے ایک ہے، جو اپنا رشتہ اُس قبیلے سے جوڑتے ہیں جس کا سہرت چنگیز خان تھا۔ وہ چنگیز خان جس نے صدیوں پہلے شوقی جہا گیری میں خون کے دریا بہائے، سروں کے مینار

کھڑے کیے اور عروس الملائہ بغداد کے منقش کتب خانوں میں موجود علم کے اناٹوں کو نذر آتش کر کے رکھ دیا ہے و جلد و فرات میں بہا دی تھی۔ جس کے ہاتھ میں موجود کتوار ہمیشہ دوسروں کے خون سے سرخ رہی۔ جس کے پاؤں گھوڑوں کی رکاب میں ہوتے تھے۔ ایک ہاتھ میں گھوڑے کی باگ تھی رہتی تھی تو دوسرے میں قمشیر بے نیام۔ چنگیز خان اور اُس کے ساتھی جو گھوڑوں کی ننگی پنجھوں پر زین کے بنا سوار ہوتے اور اُن کے سر پٹ دوڑتے گھوڑے جن کے پاؤں زمین کو چھوتے ہی نہیں تھے۔

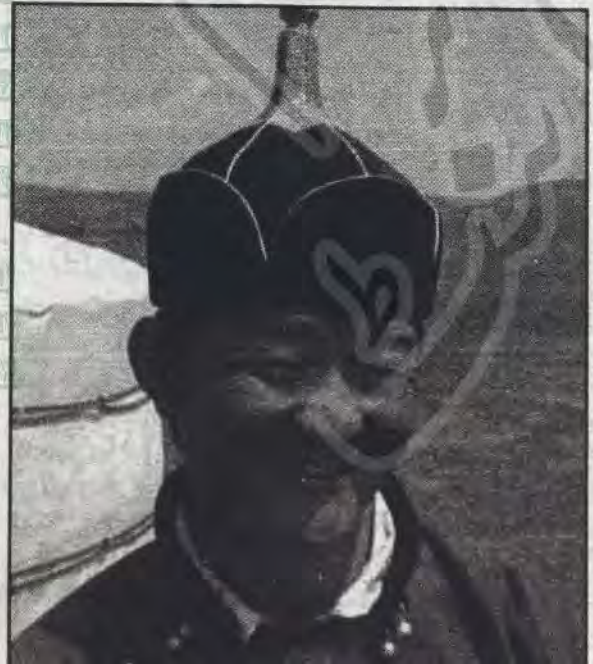
ہزاروں برس سے خانہ بدوش زندگی بسر کرنے والے ان خوں ریز قبائلیوں کی اولاد اوج کھونٹن..... اب اپنے پڑھوں کی روایات کو ترک کر کے سکون کی زندگی بسر کرنا

نہایت جانفشانی سے مرتب کردہ ایک تحقیقی رپورٹ

دنیا کے ہر خطے میں ظلم کے نشان سمجھے جانے والے چنگیز خان کی اولادیں مختلف ممالک میں پھیلی ہیں جنہوں نے کلمہ پڑھ کر دین حق کو قبول کیا وہ انسانیت کے جامے میں آگٹھ مگر جو چنگیزی نسل سے چمٹے رہے وہ عرصہ دراز تک ظلم و جور کی رستی تھامے رہے مگر اب انہیں بھی ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ دنیا کے قدم سے قدم ملا کر چلیں۔ منگولیا کے یہ خانہ بدوش اب کس حال میں ہیں، اس کی روداد دل پذیری

مختار آزاد

اولاد چنگیز



چاہتا تھا۔ وہ چھپتا چاہتا تھا۔ خانہ بدوش زندگی میں چھپنا اور صرف بصورت موت ہے لیکن اوج کھونین نے جیتے جاگتے وجود کے ساتھ چھپ جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ دوسرے خانہ بدوش کی طرح اب صرف زندہ رہنے کے لیے نہیں بلکہ سکون اور اپنے بچوں کے بہتر مستقبل کی آس اور تلاش میں ہجرت کرنا چاہتا تھا۔ اس کی ساری زندگی گھائیوں میں موسیٰ جراتے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ جا کر جیسے گاؤں کے روز شب بسر کرتے گزری تھی لیکن اب وہ ایسی زندگی کا حرح لینا چاہتا تھا جہاں چار دیواری میں وہ اپنے مختصر سے خاندان کے ساتھ نسبتاً شہری انداز کی زندگی گزار بسر کر سکے۔ اُس نے کبھی بھی اپنا سر چھپانے کے لیے خیر گائے کے عیوض زمین کے مالک کو کرایہ ادا نہیں کیا تھا لیکن اب وہ جہاں جا کر لینے والا تھا، وہاں اُسے گھر کا کرایہ بھی ادا کرنا تھا۔ وہ یہ بات جانتا تھا لیکن پھر بھی وہ جانا چاہتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اب اسے دور دور تک چھکی وادیوں کی آزاد فضاؤں کے بجائے چند گز کے زمین کے ٹکڑے پر مقید زندگی بسر کرنا ہوگی مگر پھر بھی وہ الان باتار جانے پر کمر بستہ تھا۔ خیمہ اور گھوڑے اُس کے بڑھکوں کی وراثت تھے لیکن اب وہ خود کو ان چیزوں سے علیحدہ کر رہا تھا۔

اوج کھونین..... کئی ماہ تک مسلسل ذہنی کشش کا شکار رہا تھا۔ ایک طرف مستقبل اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جانب بلارہا تھا تو دوسری طرف اس کا دامن ماضی سے الگ رہا۔ یوں اس کشش میں کافی عرصہ بیت گیا، آخر کار اُس نے فیصلہ کر لی لیا۔ چند ایک پالتو موسیٰ رکھ لیے جنہیں وہ اپنے ساتھ ماضی کی نشانی اور حال کی ضرورت سمجھتے ہوئے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا، باقی سارے گھوڑے، بھیڑیں اور بکریاں فروخت کر کے اس نے نقدی حاصل کی اور اب گرائے پر ایک ٹرک لے کر اس میں سامان لا دیا تھا، نئی طرز زندگی کی تلاش میں شروع کی جانے والی مسافت کے لیے اوج کھونین، اس کی بیوی ثوروا، دو چھوٹے بچے سامان کو ٹرک پر لدا ہوا دیکھ رہے تھے۔ بچوں کی آنکھوں میں حیرت، بیوی کی آنکھوں میں ادا سی اور خود اوج کھونین کے چہرے پر بیک وقت کئی تاثرات موجود تھے۔ وہ آفرودہ بھی تھا اور خوش بھی۔ ہزار ہا برس سے جاری روایتی طرز زندگی کا ساتھ چھوٹے کا دکھ تھا تو نئے طرز حیات کو اختیار کرنے کی خوشی بھی چہرے پر نمایاں تھی۔

اوج کھونین اپنی جنگجو خانہ بدوش کے قبیلے کا ایک فرد تھا جو چنگیز خان کی موت کے سیکڑوں سال بعد نکل پل بدلتی

ہوئی دنیا میں پیدا ہوا تھا۔ اوج کھونین کے بڑھکوں نے بدن پر بھینٹنے کی کمال اوڑھ کر اور ہاتھ میں ننگی تلوار سونٹ کر صدیوں تک نہ جانے کہاں کہاں نکل و غارت کا بازار گرم کیا اور پھر سوتے کو آبائی وطن منگولیا میں بکھر گئے۔ انہی بکھرے ہوئے خانہ بدوش قبیلوں کا باشندہ اوج کھونین بدلتے زمانے میں زندہ رہنے کے لیے گھنے بانی، گھڑ سواری اور ادا بیویوں کو اوداع کہہ کر اب شہر میں نئی جگہ اور نئے لوگوں کے درمیان، بالکل نئی طرز کی زندگی گزارنے کے لیے کمر کسر رہا تھا۔ پالتو موسیوں کا ریوڑ اور گھوڑے فروخت کر دینے سے اوج کھونین کے ہاتھ اتنی رقم آگئی تھی کہ دارالحکومت کے مضافات میں اپنے اہل خانہ کے ساتھ وہ زندگی شروع کر سکتا تھا جس کی چاہ میں اس کا سامان پرانے چچی ٹرک پر لا دیا جا رہا تھا۔

دو مہینے کے اندر اندر اوج کھونین کا سارا سامان ٹرک پر لدا چکا تھا۔ اس کے چند باقی ماندہ موسیوں کو بھی ٹرک پر سوار کر لیا گیا تھا۔ یہ وہ بھیڑ اور بکریاں تھیں جن کا دودھ شیر خوار بچے اور کسن بچی کے علاوہ گھر کی دودھ کی دیگر ضروریات پوری کرنے کے لیے درکار تھا۔ اسی لیے یہ فروخت ہونے سے بچ گئے تھے ورنہ اُس کے دیگر موسیٰ اور گھوڑوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی کب کے پکے چکے ہوتے۔ اوج کھونین کی بیوی اور دو بچے بھی سامان کے اوپر سنے سمنائے بیٹھے تھے۔

اوج کھونین نے آخری بار ٹرک کے چاروں طرف محوم پھر کر اس بات کو یقینی بنایا کہ سامان اچھی طرح باندھا چکا ہے۔ اس کے بعد اُس نے چاروں طرف نظریں گھمائیں اور پھر دروازہ کھول کر ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں فی اُتر آئی تھی۔ وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ”چلو“ اُس نے ڈرائیور کی طرف دیکھے بنا کہا۔ ٹرک ایک گز گڑھاٹ کے ساتھ اشارت ہوا اور پھر وہ وادی کے اوٹے نیچے، کپے کے پورے آڑھے ترچھے راستوں پر لڑکھاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

اوج کھونین کی منزل کئی گھنٹوں کی دوری تھی۔ اس نے ٹرک کی لکڑی سے سرنگل کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ اس کا ماضی ٹرک سے اُٹنے والی دھول اور اس کے سامنے سفر سے نکلنے والے دھوئیں کی دھند میں ڈھنلا رہا تھا۔ اس کے دل سے ایک ٹوک اُٹی اور پھر اس نے گہری سانس لے کر دھڑا اسکرین کے بار نظریں جمادیں۔ اس کا دل ماضی کی یادوں اور نگاہیں مستقبل کے سہانے سننے دیکھ رہی تھیں جبکہ

اس کی روح ان دونوں کے سچ گھڑا ل کے پند و لم کی طرح ڈولے جا رہی تھی۔

روانہ ہونے سے چند مہینوں پہلے اوج کھونین الان بٹا گیا تھا، جہاں اُس نے اپنے ایک واقف کار کی مدد سے شہر کے مضافات میں زمین کا ایک چھوٹا سا قطعہ کرائے پر لے لیا تھا۔ یہ جگہ مرکوز شہر سے خاصے فاصلے پر تھی جہاں اوج کھونین جیسے سیکڑوں اُن خانہ بدوشوں کے گھر تھے جو اپنا روایتی طرز زندگی ترک کر کے کئی خوش مشکلات سے بھری شہری زندگی کو اپنا چکے تھے۔ یہ لوگ اتنی بڑی تعداد میں یہاں آباد تھے کہ وہ علاقہ اب ایک بہت بڑی بیٹی آبادی کی شکل اختیار کر چکا تھا جہاں بنیادی شہری سہولتوں سے محروم یہ لوگ خاصی پس ماندہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ اب انہی لوگوں میں اوج کھونین بھی شامل ہونے والا تھا۔

کئی گھنٹوں کی مسافت کے بعد آخر اوج کھونین کی سربراہی میں اس کا مختصر سا خاندان اپنی منزل پر پہنچ گیا۔ ان کا نیا گھنا کا چھوٹے سے قطعہ اراضی پر بنا ایک کمرہ تھا جس کے گرد لکڑی کی قد آدم باڑ بندھی ہوئی تھی۔ یہی کمرہ اس کی منزل تھی۔ کچھ ہی دیر میں اس کا سارا سامان ٹرک سے اتارا چا چکا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ بہت بہت شکر ہے تمہارا“ اوج کھونین نے سامان اُتر جانے کے بعد ڈرائیور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ٹوروا، شیر خوار بیٹا الا کا اور چھ سالہ بیٹی انوکا گھر کے باہر سامان کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ ٹرک کے چلے جانے کے بعد اوج کھونین پلٹا اور لکڑی کے دروازے کو کھولا۔ یہ دروازہ بظاہر تو نہایت سادہ سی لکڑی کا بنا تھا۔ اسے دیکھنے پر کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آتی تھی لیکن جیسے ہی اوج کھونین اور پھر اُس کے پیچھے پیچھے خاندان کے دوسرے افراد نے اس دروازے کے اندر قدم رکھا، اُن واحد میں اُن کا ماضی کی خانہ بدوش زندگی سے بھی رابطہ منقطع ہو گیا۔ وہ زندگی جس کے یہ ہزار ہا برس قدیم ثقافتی ورثہ کے امین تھے، بوسل و رسل سفر کرتا ہوا ان تک پہنچا تھا۔ اوج کھونین تک بھی یہ ورثہ پہنچا ضرور لیکن اب یہ یقین نہیں تھا کہ اُس کے بیٹے الا کا اور بیٹی انوکا تک اوج کھونین کے خانہ بدوش قبیلے کا یہ ورثہ کبھی پہنچ بھی سکے گا یا نہیں، یا پھر وہ نگریت سے بے گرم اور پختہ کمرے میں بیٹھ کر، قبوے کی چٹکیوں کے درمیان قہقہے کھانوں کی طرح اپنے آجداد کی داستان سن سن کر لطف لیں گے۔

ماہنامہ سرگزشت

اوج کھونین کی نئی منزل کو دیکھتے ہوئے اب یہ کہنا بھی بہت ہی مشکل تھا کہ انوکا اور الا کا اب بھی گھوڑوں، موسیوں، اونٹنیوں اور منگولیا کی آزاد فضاؤں کی سرسبز چراگاہوں، تنگ گھائیوں، پہاڑی کیلڈنڈیوں، بچتے پشوں اور گرتی برف کے گالوں کو بھی آزاد فضا تھیں خانہ بدوش کی طرح دیکھ پائیں گے، انہیں محسوس کر سکیں گے..... یا نہیں۔ اوج کھونین نے اُس چھوٹے سے کمرے کا دروازہ ہی پار نہیں کیا بلکہ ایک تہذیب سے دوسری تہذیب اور ایک تمدن سے دوسرے تک کا طویل فاصلہ بھی صرف ایک قدم میں ہی طے کر لیا تھا..... صرف ایک قدم اٹھا اور اجداد کی ہزاروں سالہ خانہ بدوش زندگی تاریخ میں داخل ہوگئی۔ اوج کھونین کے لیے یہ صرف ایک کمرہ تھا لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ یہ کمرہ اس کے آنے والی نسلیں کی تہذیب و تمدن کی سفر کا سنگ میل تھا۔ سنگ میل کا نظریہ آنے والا ہندسہ زیر و میل..... جہاں سے سفر شروع ہوتا ہے۔ اوج کھونین اور اُس کے خاندان کا بھی نیا تہذیبی سفر شروع ہو چکا تھا۔

☆☆☆

اوج کھونین کی طرح اس کی بیوی بھی اس ہجرت سے خوش نہیں تھی لیکن شوہر کے دلائل اسے جذبات سے زیادہ مضبوط لگے تھے۔ اس لیے وہ بھی بنا چوں چراں کیے اسے تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کر چکی تھی۔ الان بتا رہے ہوئے وہ بھی مستقل طور پر جذباتی تغیرات سے گزرتی رہی تھی لیکن جب وہ یہاں پہنچی تو اس نے سب خیالات بالائے طاق رکھ دیے۔ اس پر ایک عورت کی سوچ غالب آ چکی تھی۔ وہ اپنے بند سامان کو کھول کر اس ایک کمرے کے مکان کو گھر بنانے میں بھٹ گئی۔ چند گھنٹوں کے اندر اندر ان کا نیا گھر بننے کے لیے آراستہ ہو چکا تھا۔ ہر چیز فرینے سے اپنی اپنی جگہ پر پہنچ چکی تھی۔

چھوٹے سے ایک کمرے کا گھر سلیتے سے سنوارا گیا تھا۔ پختہ فرش پر ہاتھ سے بنا نمندہ بچھا ہوا تھا۔ کونے میں چھوٹی سی لکڑی کی میز پر پی وی رکھ دیا گیا تھا۔ دیوار پر مختصر سے خاندان کی یادگار تصویریں لگی ہوئی تھیں اور پنا پٹ کی سادہ سی الماری میں برتن رکھ دیے گئے تھے۔ یہ گھر علیحدہ سے باورچی خانہ کے تکلف سے عاری تھا۔ اس لیے کمرے کے ایک کونے میں اسٹیل سے بنا اور مٹی کے تیل سے چلنے والا نیا چولہا رکھا ہوا تھا۔ منگولیا شد بد سردی والا ملک ہے۔ یہاں بالعموم رہائشی کمرے کا استعمال بطور باورچی خانہ بھی ہوتا ہے۔ اس طرح ایک ”پختہ اور دو کاج“ والا کام ہو جاتا

ستمبر 2012ء

ہے یعنی کھانا بھی پک جاتا ہے اور کرا بھی گرم ہو جاتا ہے۔ اُس وقت باہر کافی ٹھنڈی لیکن کھانا پکنے کے دوران چولہا جلنے سے کمرے کا درجہ حرارت قابل برداشت تھا۔ اوج کھوئین فرش پر بیچے گدے پر بیٹھا ہوا تھا۔ دونوں بچے اس کے نزدیک کھیل کود رہے تھے اور وہ خود ہی وی پر موسیقی کا پروگرام دیکھ رہا تھا۔ خانہ بدوش اوج کھوئین کے خاندان کی شہری زندگی کی یہ پہلی شام تھی۔

☆☆☆

صبح کا سورج اپنے معمول کے مطابق نکلا مگر ٹورا اور اوج کھوئین آسمان پر پیدہ بھلنے سے پہلے ہی جاگ چکے تھے۔ انہوں نے کل ہی کمرے کے سامنے مندرے سے بنا خیمہ گاڑ کر اپنی گنتی کی چند بیچڑوں اور بکریوں کا باڑا قائم کر دیا تھا۔ اُس وقت ٹورا موسیقیوں کا دودھ نکال رہی تھی۔ خیمے کے اندر موسم بہت ہی مل رہی تھی۔ شہری زندگی کی اس نئی صبح کا احساس انہیں اب تک نہیں ہوا تھا لیکن جب وہ خیمے سے باہر نکلے تو دودھ کی پانی ہاتھ میں تھامے ہوئے اوج کھوئین کی نظر سامنے پڑی۔ دن کا آلا آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا۔ وہ چند گز زمین کے احاطے کے اطراف لکڑی کی بنی پتی پتی شہیروں سے باندھی گئی سات فٹ اونچی پاڑ کے حصار میں تھے۔ پہاڑی ڈھلوانوں پر جد نظر تک گھر بنے ہوئے تھے اور ہر گھر اسی طرح کی پاڑ کے حصار میں قید تھا۔ منگولیا کی دور دراز گھاٹیوں اور وادیوں میں سرکش گھوڑوں کی طرح سر پٹ دوڑنے والے اس خانہ بدوش جوڑے نے خود کو پاڑ کے حصار میں قید پایا تو انہیں عجیب سے دکھا کا احساس ہوا۔ دونوں کچھ دیر تک وہیں کھڑے رہے۔ اوج کھوئین اور ٹورا سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس نے نظر اٹھائی اور پوئی کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھ میں بھی ہلکی سی نمی اُتر آئی تھی۔ رات کو ہونے والی ہلکی برف باری سے زمین پر برف کی پتلی سی چادر جم گئی تھی۔ جگہ جگہ سبز اور پانی کے قطرے نظر آرہے تھے۔ اسی طرح جیسے ٹورا کی آنکھوں میں چپکے سے نمی اُتر آئی تھی۔

خانہ بدوش جوڑا اپنی وادی سے صرف ساڑھے تین سو میل کی دوری پر تھا مگر اُس وادی اور یہاں کے احساس و منظر میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہاں اس جوڑے کے خیمے کے برابر میں اُس کے عزیز اقارب اور سسرال والوں کے خیمے تھے لیکن یہاں برابر میں کس کا گھر تھا، وہ نہیں جانتے تھے۔ وہاں وادی میں جب صبح وہ سوکر اٹھتے تھے تو ان کے گھوڑوں کے چہنہانے کی آوازیں ان کے کانوں کو ہلکی گنتی

تھیں لیکن یہاں پاڑ کے باہر ایک ٹومنہ سیاہ آوارہ کتا کانوں کے پردے بھاڑ دینے والی آواز میں بھونکے چلا جا رہا تھا۔ وہاں صبح کی ہوا تازگی لاتی تھی لیکن یہاں..... اچانک ایک ٹرک برابر سے گزرا اور اس کے سائیکس سے اٹنے والا دھواں اُن کے حلق تک میں سرایت کر گیا۔ وہ دونوں کھانستے ہوئے جلدی جلدی کمرے کی طرف بڑھنے لگے۔ جلد بازی میں تھوڑا سا دودھ پانی سے چمک کر زمین پر گر پڑا مگر شہری زندگی کی پچھل کو قبول کرنے والے، کھانسنے کھانسنے کرے حال جوڑے کو اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ اُن کی روایتی خانہ بدوش زندگی میں دودھ کا برتن سے چمک جانا عورت کی گرجہ کی صلاحیت پر سوالیہ نشان لگایا ہے۔ شہری زندگی سے ان کا تعارف ہو چکا تھا اور وہ اس کو قبول کر چکے تھے۔ اب منگولیا کی کھلی گھاٹیوں میں پھرنے والے خانہ بدوش جوڑے کو مستقبل میں اسی طرح کے حالات سے خود کو ہم آہنگ کرتے ہوئے زندگی بسر کرنا تھی۔

☆☆☆

دارالحکومت الان بتار کی آبادی ایک کروڑ بیس لاکھ نفوس سے زائد پر مشتمل ہے جس کا لگ بھگ ساٹھ فیصد حصہ دارالحکومت کے مصافحات میں واقع ملک کی اس سب سے بڑی چکی آبادی میں رہتا ہے جس میں اوج کھوئین کا خاندان مقیم ہے۔ یہ آبادی خانہ بدوش چرواہوں کے حوالے سے مشہور ہے۔ یہاں آیا لوگ زیادہ وہ ہیں جو بہ حالت مجبوری خانہ بدوش زندگی ترک کر کے مستقل طور پر سکونت پذیر ہو چکے ہیں۔

خانہ بدوشوں کی یہ شہری چکی آبادی زندگی کی ہر اس شہری سہولت سے محروم ہے جو شہری معاشرے کا لازمی جزو تسلیم کی جاتی ہیں۔ یہاں نہ پکی سڑکیں ہیں، نہ ہی فراہمی آب و نکاسی کا باقاعدہ نظام موجود ہے۔ منگولیا کی دارالحکومت میں کئی اور چکی آبادیاں بھی قائم ہیں لیکن خانہ بدوشوں کی اس سب سے بڑی چکی آبادی کا حال، دوسروں کی نسبت بہت ہی بُرا ہے۔ بھلیوں تو ہیں ہی مفقود مگر یہاں سماجی مسائل بھی بہت سنگین نوعیت اختیار کر چکے ہیں۔

خانہ بدوش زندگی میں جرائم نہ ہونے کے برابر ہیں لیکن خانہ بدوشوں پر مشتمل الان بتار کی دس لاکھ نفوس پر مشتمل چکی آبادی میں جرائم معمول کی زندگی کا حصہ ہیں۔ یہاں لوٹ مار کے واقعات کا ہونا قابل ذکر بات نہیں، شراب نوشی بھی نہیں دیگر اقسام کے تمام گھٹائیے یہاں کیے جاتے ہیں۔ غربت اور پسماندگی نہایت عام ہے اور نا

امیدی ہر اس چہرے پر چمکتی ہے جو خوبصورت فطری ماحول کو چھوڑ کر اپنی خوشی یہاں آکر بس گیا تھا لیکن محرمیاں، ماویاں اور تار یک مستقبل کے سوا، چند ایک کو چھوڑ کر کسی کو کچھ نہیں مل سکا مگر پھر بھی اس کی آبادی کے کینوں کی تعداد ہر روز بڑھتی جا رہی ہے۔

خانہ بدوش زندگی تالے سے آشنا نہیں مگر یہاں کا ہر سکین رات کو سونے سے پہلے یہ تسلی کر لیتا ہے کہ پاڑ کے گیٹ میں تالا لگا دیا ہے اور سونے سے پہلے کمرے کو اندر سے بند کر لینے کا یقین ہو جائے تک وہ بستر کی طرف قدم نہیں اٹھاتا۔ یہ حفاظتی اقدام صرف رات کے لیے مخصوص نہیں، دن میں بھی پاڑ کے گیٹ پر تالا لگائے رکھنا عام سی بات ہے۔ اسی لیے پاڑ کی اونچائی قید آدم سے بھی کئی فٹ اونچی رکھی جاتی ہے کہ کہیں کوئی پاڑ بھلا گئے کر اندر نہ آجائے۔ اوج کھوئین اور ٹورا بھی تالے سے نا آشنا تھے۔ کل رات تو خیر سے گزرنے لگی مگر شہری زندگی سے ہم آہنگ ہونے کے لیے انہیں آج دو تالے خریدنا تھے جس کے لیے اوج کھوئین نے بازار جانے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔

اوج کھوئین بازار سے لوٹ کر آیا تو اس نے پاڑ کا گیٹ بند کرنے کا تالا لگا دیا اور چابی جب میں رکھنے کے بعد چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔ ”میری زندگی اس طرح کے انسانی جگہوں سے نا آشنا تھی لیکن الان بتار نے مجھے اپنی نئی زندگی سے آشنا کر دیا۔“ اس کا لہجہ افسردہ تھا۔ وہ کچھ دیر تک خاموش رہا اور پھر کہنے لگا۔ ”میں خانہ بدوشوں کو تو چھوڑ بی، ہمارے تو مویشی بھی آزاد زندگی بسر کرنے کے عادی ہیں۔“ پھر اس نے داہنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور پاڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ”یہ سب تو ایسا ہی ہے جیسے کہ بچہ گھر کے اندر قید ہو کر صرف سانس لیا جائے۔“

آج الان بتار میں اس کا دوسرا دن تھا لیکن وہ یہاں زندگی بسر کرنے کے اسرار و رموز کو ابھی طرح سمجھ چکا تھا۔ ”یہ زندگی تم نے اپنی مرضی سے منتخب کی ہے۔ اس میں کسی اور کا کوئی دخل نہیں۔“ اس نے یہ سنا تو حیرت سے میری طرف دیکھا۔

”یہ بات درست نہیں۔“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”سب موسموں کی مہربانی ہے۔ اگر موسم خالص نہ ہوتا تو میں زندہ رہنے کے لیے یہاں بھی نہیں آتا۔“ اس نے اپنی بات مکمل کر کے میرے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ ”تم زندہ ہو مگر زندگی سے دور۔“ اس کی بات سن کر

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ویسے تمہارے نزدیک سانس لینا زندگی ہے تو تم زندہ ہو مگر میرے خیال میں تم اپنی زندگی وہیں گزار آئے ہو، جہاں پر کل صبح تم نے اپنی اس نئی زندگی کے لیے ہجرت کا آغاز کیا تھا۔“ یہ سن کر اس نے میری طرف ابھری نظروں سے دیکھا۔ اسی دوران ٹورا روا ہوا آئی۔ اس نے قبوہ تیار کر لیا تھا اور اب وہ اپنے اس غیر متوقع مہمان کو اندر لانے کے لیے شور مچا رہا تھا۔ کمرے میں بھی جو تالا خریدنے کے لیے بازار جانے والے اوج کھوئین کے ساتھ ساتھ یہاں تک آچکا تھا۔

چند لمحوں کے بعد میں اندر کمرے میں بیٹھا ہوا، کل تک خانہ بدوش زندگی گزارنے والے جوڑے کی اُس روایتی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہو رہا تھا جو منگولیا کی خانہ بدوشوں کی روایت ہے۔ میرے سامنے بنیر، پاک کے دودھ کا بنیر، میٹھی اور خشک موٹی سی خیرہ روٹی اور قبوہ کی کیتلی رکھی ہوئی تھی۔

☆☆☆

چٹکیز اور ہلا کو خان جیسے ہیبت ناک خانہ بدوش مگر خالص حکمرانوں کے دس میں ہزار ہا سال سے خانہ بدوشی زندگی کا محور رہی ہے لیکن جیسے جیسے رسل و رسائل کی سہولتوں میں اضافہ ہو رہا ہے، اُسی رفتار سے زندگی کے انداز بھی بدلتے جا رہے ہیں۔

منگولیا کی خانہ بدوش، ہزار ہا سال سے اس سرد ترین خطے کے شدید ترین موسموں کی سنگینیوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتے چلے آئے ہیں لیکن اب موسمی شدت کا مقابلہ کرنے کی اُن کی قوت کم زور پڑتی جا رہی ہے۔ اب انہیں پل پل بدلتی دنیا میں سکون اور آسائشوں کے لیے شہری زندگی اور ٹھہراؤ میں ہی بقا نظر آرہی ہے۔ اسی لیے منگولیا میں خانہ بدوشوں کی تعداد تیزی سے کم ہو رہی ہے اور الان بتار ہی نہیں کئی اور چھوٹے بڑے شہروں میں چھوٹی بڑی چکی آبادیاں تیزی سے پھیلنے جا رہی ہیں۔ آج منگولیا میں پھیلی ہوئی چکی آبادیوں کی اکثریت خانہ بدوشوں پر ہی مشتمل ہے۔ وہ خانہ بدوش جو مستقل ٹھہراؤ اور زندگی کی ضمانت پر روایتی طرز حیات تیزی سے ترک کرتے جا رہے ہیں۔

میں اُن دنوں خانہ بدوشوں کی زندگی پر بدلتے ہوئے زمانے کے اثرات پر تحقیقی رپورٹ تیار کرنے کے لیے پینٹل جیوگرافک میگزین کے ایک پرائیکٹ کے توسط سے منگولیا پہنچا تھا۔ گھومتے گھومتے اُن دن الان بتار کے بازار میں اُس وقت اوج کھوئین سے ملاقات ہوئی جب وہ ایک

ڈکان سے تالا خیر دیا تھا۔ مستقل سکونت کے لیے اس خانہ بدوش کی شہری زندگی کو شروع ہوئے ابھی چوبیس گھنٹے بھی پورے نہیں ہوئے تھے۔ اس سے باتیں کر کے مجھے لگا کہ منگولیا کے خانہ بدوش زندگی میں نئے رجحانات کو جاننے کے لیے یہ دلچسپ کردار ہے اور یوں ہمارے درمیان تعارف ہوا اور پھر کئی ماہ طویل رفاقت کی بنیاد پڑی۔

اوچ کھوگنین پہلی ہی ملاقات میں مجھے اپنے گھر لے گیا۔ اس کی بیوی نے جس انداز میں میری خاطر مدارت کی، اس پر منگولیا کی شہری زندگی کا رتبہ شائبہ تک نہیں تھا۔ جس کمرے میں میرے سامنے کھانے پینے کی روایتی چیزیں چھنی ہوئی تھیں، وہ سب کی سب یہ لوگ چلے ہوئے اپنے ساتھ لے کر ہی یہاں آئے تھے۔ اُس وقت وہ کرا مجھے منگولیا کی کسی دور دراز گھاٹی میں، کسی خانہ بدوش چرواہے کا نمدے سے بنا ہوا خیمہ لگ رہا تھا۔ وہ خیمہ جس کے باہر کلکڑی کا جنگلا نہیں بلکہ آزاد فضا تھی مگر یہ سب میرا خیال تھا۔ حقیقت کچھ اور تھی۔

☆☆☆

اوچ کھوگنین اور ٹوروا، دونوں آزاد خانہ بدوش زندگی کے پالے ہوئے تھے لیکن الان بتار میں انہیں اس پختہ کمرے میں زندگی گزارنا تھی جس کے باہر صرف چند ترکے فاصلے پر کلکڑی کی قد آدم اونچی باؤ لگی ہوئی تھی۔ وہ باؤ جسے اوچ کھوگنین نے بنجرے سے تعمیر کیا تھا اور وہ اب خود اس بنجرے کا قیدی تھا۔ وہ بنجرہ جس کے دروازے پر قیدی نے خود اپنے ہاتھ سے خرید ہوا تالا لگا رکھا تھا۔

خانہ بدوش، پابند زندگی بسر کرنے سے نا آشنا ہوتے ہیں۔ اوچ کھوگنین اور ٹوروا ابھی اس طرز زندگی سے نا آشنا تھے مگر پھر بھی اُن کے پاس بھٹا کا یہی راستہ تھا مگر یہ راستہ انہوں نے بھی خوش نہیں چٹا، اس کے پیچھے موسمیاتی جبر موجود تھا۔ وہ جبر جس کا سامنا کرنے کی صلاحیت ان کے پُرکھوں میں تو بہت زیادہ تھی مگر اب ہزاروں سال سے جاری لڑائی لڑتے لڑتے یہ خانہ بدوش شاید تھک چکے تھے۔ ان کے بازو شل ہو گئے تھے۔ شاید اسی لیے موسی جبر کے خلاف اس لڑائی میں پیچھے خان کی اولادوں کو پسپائی میں ہی بٹھا کا راستہ نظر آ رہا ہے۔

2009-10ء کا سرد ترین موسم اوچ کھوگنین اور ٹوروا کے لیے تباہی و بربادی کا پیغام لایا تھا۔ اُس سال منگولیا کے طول و عرض میں شدید سردی پڑی تھی۔ معمول سے بہت زیادہ برف باری ہوئی۔ سردی اور برف باری کے باعث

زمین پر سبزے کی نہ بخل گئی۔ درخت پتوں سے خالی ہو گئے۔ مٹی مٹیوں تک زمین پر چاروں طرف برف کی چادر چھپی ہوئی نظر آتی تھی۔ گلہ بانی ان کا واحد ذریعہ معاش تھا۔ دوسرے خانہ بدوشوں کی طرح انہوں نے بھی چارے کا ذخیرہ کر رکھا تھا لیکن وہ بھی کم پڑ گیا۔ پہلے تو موسم سرما میں اُن کے مویشی زمین پر ہاتی ماعذہ مزہ، بھٹاڑوں اور سدا بہار درختوں کے پتے پڑ کر پیٹ بھر لیا کرتے تھے اور اگر پھر بھی پیٹ خالی رہتا تو ذخیرہ شدہ چارہ اُن کی خوراک کی ضرورت پوری کر دیتا تھا لیکن اُس موسم سرما میں آنے والے برفانی طوفانوں نے گھاس کی ایک ایک پتی جلا ڈالی تھی۔ مویشی کم خوراک کا شکار تھے۔ کم خوراک اور سرد ترین بریفیلے موسم نے اُس سال لاکھوں مویشیوں کو مار ڈالا تھا۔

خدا خدا کر کے موسم سرما ختم ہوا۔ خانہ بدوشوں نے مکھ کا سانس لیا کہ چلو جو کچھ بچ گیا، وہی غنیمت ہے لیکن مختصر موسم گرما میں ایک اور قیامت اُن شامت کے ماروں پر ٹوٹ پڑی۔ مختصر موسم گرما میں بدترین خشک سالی کے باعث قحطی حملہ آور ہو گیا۔ اب تو مویشیوں کو کھلانے کے لیے کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔

موسم سرما کے آغاز پر اوچ کھوگنین کے گلے میں مختلف اقسام کے ساڑھے تین سو مویشی تھے مگر جب موسم سرما اور قحط ختم ہوا تو صرف نوے مویشی ہی زندہ بچے تھے۔ وہ بھی مکمل طرح سے مستند نہیں تھے۔ کم خوراک نے انہیں نہایت ڈبلا کر دیا تھا۔ بھڑ بکریوں کے دودھ تک میں معمول سے بہت زیادہ کمی آچکی تھی۔ یہ اُن کے لیے نہایت تشویشناک صورت حال تھی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب اوچ کھوگنین کے ذہن میں ہجرت کے خیال نے جنم لیا۔

اوچ کھوگنین اور ٹوروا جہاں نہیں تھے۔ منگولیا کے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اُس برس منگولیا میں موسی تغیرات اور شدت کے باعث اسی لاکھ مویشی مارے گئے تھے، جن میں بھڑیل، بکریاں، یاک، اونٹ اور کھوڑے شامل تھے۔

یہ وہ بدترین معاشی نقصان تھا جس نے اوچ کھوگنین اور اس جیسے لاکھوں خانہ بدوشوں کی زندگیوں کو بدل کر رکھ دیا۔ خانہ بدوش زندگی میں معاشی ضروریات کی تکمیل کا انحصار بالخصوص مویشیوں پر ہوتا ہے جب مویشی ہی نہ ہیں تو پھر اُن کے لیے مشکلات کے سوا کچھ اور چیز باقی نہیں رہتی۔ شدید معاشی نقصان کے باعث، بڑی تعداد میں گلہ بان خانہ بدوش دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے

ستمبر 2012ء

قابل نہیں تھے۔ آخر اوچ کھوگنین کی طرح لاکھوں خانہ بدوشوں نے شہروں کی طرف ہجرت کا فیصلہ کیا۔

”اس چاہی کے بعد ہمارے پاس اس کے بوا کوئی دوسرا راستہ نہیں بچا تھا کہ خانہ بدوشی ترک کر کے شہر میں آجائیں۔ سوا ہمارے پاس جو کچھ مویشی زندہ بچے تھے، انہیں بیچ باج کر ہم نے ایسا ہی کیا۔“ اوچ کھوگنین نے ایک دن باتوں باتوں کے دوران یہاں آنے کی توجیہ پیش کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ”کم از کم یہاں ہماری زندگی تو محفوظ ہے۔ ہم بھوکے تو نہیں مر سکتے۔ ہمیں ملتی سہولت مل سکتی ہے۔ ہمارے بچوں کا مستقبل محفوظ ہے۔ اسی لیے ہم پہاڑی گھائیاں چھوڑ کر شہر میں آجائے ہیں۔ یہاں کم سے کم محنت مردوری کر کے اپنی گزربس تو کر سکتے ہیں۔“ اس نے جب اپنی بات مکمل کر کے میری طرف دیکھا تو میں نے تائید میں سر ہلادیا۔ مجھے صرف اوچ کھوگنین کی بات پر ہی یقین نہیں تھا۔ میں اس کا پس منظر بھی جانتا تھا۔ زندگی کی بقاء، رسم و روائیوں سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ معاش کمزور ہو، زندگی خطرات سے دوچار ہونے لگے تو پھر اپنی بقاء پر شے پر حاوی ہو جاتی ہے۔ اوچ کھوگنین اور ٹوروا ہی نہیں، منگولیا کے لاکھوں خانہ بدوش اپنی اپنی بقاء کے لیے پُرکھوں کی روایتی خانہ بدوشی ترک کر چکے ہیں۔

اس بات پر کوئی دوسری رائے نہیں تھی کہ مستقل سکونت اختیار کرنے والے خانہ بدوشوں کو شہر میں کئی نعمتیں اور نئے معاشی مواقع اور کوششیں میسر آئیں گے۔ ان کی اور ان کے بچوں کی زندگیاں یہاں زیادہ بہتر انداز میں گزریں گی۔ اوچ کھوگنین اور ٹوروا کو شہری زندگی سے بہت زیادہ لگاؤ نہیں ہے البتہ انہیں یہاں ملنے والے زیادہ بہتر معاشی مواقع اور بچوں کے بہتر مستقبل کا یقین ضرور ہے۔ وادیوں اور گھاٹیوں میں گلہ بانی کر کے زندگی بسر کرنے والے ان خانہ بدوشوں کو وہاں تو قبی سہولت یا آسانی مل پاتی ہے اور نہ ہی ان کے بچے اسکول جاسکتے ہیں لیکن شہروں میں ایسا ایسا ہے۔ ٹوروا کو یقین ہے کہ شہر میں اس کے شیر خوار بیٹے کو کاکو اچھے اسکول میں پڑھنے کا موقع مل جائے گا۔ بیٹے کے اسکول جانے میں ابھی کئی سال باقی ہیں، البتہ بچی کی عمر چھ سال ہے اور وہ اسکول جاسکتی ہے لیکن خانہ بدوشی میں پروان چڑھنے والی ٹوروا اس سوال کے جواب میں بالکل خاموش تھی کہ اس کی بیٹی کب اسکول جانا شروع کرے گی۔ شاید وہ عورت کے اُس روایتی کردار کو اپنی بیٹی کی شکل میں زندہ رکھنا چاہتی تھی جس میں وہ صرف گھر گریہ

مویشیوں کی دیکھ بھال، بیچ پالنا اور میاں کی خدمت گزاری تک ہی محدود رہتی ہے۔ ویسے وہ اس سوچ میں کسی قدر حق بجانب ہی تھی۔ اپنی جلدی صدیوں پرانی رسم و روائیوں سے دامن کیے چھڑایا جاسکتا ہے۔ البتہ مجھے یقین تھا کہ شہری ماحول میں پلنے والی اُس کی بیٹی ضرور اسکول جائے گی۔ مجھے اس بات کا یقین اوچ کھوگنین کے چہرے کو دیکھ کر ہوا تھا۔

الان بتار کے پاسی اسے مختصراً ”یونی“ کہتے ہیں۔ اس وقت یونی میں ساٹھ کے آریب خرب خانہ بدوش آباد ہیں جن میں سے زیادہ تر موسمیاتی جبر کے ہاتھوں پسپا ہو کر یہاں پناہ لینے پر مجبور ہوئے ہیں۔ ویسے بھی گزشتہ چند برسوں کے دوران الان بتار کے نواح میں قیمتی معدنیات کے بھاری ذخائر دریافت ہوئے ہیں جس میں گلہ بانی کے مقابلے میں کان کنی کر کے پیسے کمانے کے زیادہ مواقع موجود ہیں۔

منگولیا کی نئی منافع بخش صنعت کان کنی نے صرف خانہ بدوشوں کی ہی آنکھیں نہیں بندھائی ہیں بلکہ ان سے فائدہ حاصل کرنے والی کثیرالتوی کمپنیوں نے بھی حکومت سے کیے گئے معاہدوں کے ذریعے آئندہ کئی برسوں تک کے لیے کھربوں ڈالر کی سرمایہ کاری شروع کر دی ہے۔ سرمایہ بے شک باہر سے آیا ہے لیکن کان کنی کے لیے افرادی قوت منگولیا کی ہی ہے اور وہ زیادہ تر اُن خانہ بدوشوں پر مشتمل ہے جنہیں بہتر زندگی کی آس فطری ماحول سے لبریز وادیوں سے تھک کر شہروں کی آلودہ فضاؤں میں ٹھیک لائی ہے۔ کوئٹہ، سونا اور تانبے کے بھاری ذخائر، زمین کی تہوں کو چھ کر باہر نکالنے کے لیے کان کنی کی صنعت تیزی سے فروغ پا رہی ہے۔ جس تیزی سے یہ نئی صنعت پھل پھول رہی ہے، اسی ہی تیزی سے خانہ بدوشوں کا اپنی روایتی زندگی سے قائم مضبوط رشتہ بھی ٹوٹ رہا ہے۔ موسمیاتی جبر اپنی جگہ، بہتر معاش بھی دوسری بڑی وجہ بن رہی ہے منگولیا کے خانہ بدوشوں کی مستقل سکونت کا۔

☆☆☆

اوچ کھوگنین اور ٹوروا کا شہر الان بتار دلچسپ تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ پہاڑوں میں گھری ہوئی وادی ہے جس کے پتھروں چٹانوں کی ڈنچ پر پھیلا ہوا شہر بتا ہے جس کے عقب میں دیر بھتا ہے۔

کہتے ہیں کہ شہر کے بننے سے پہلے یہ ایک تجارتی گزرگاہ تھی۔ 1639ء میں ایک بودھ راہب ٹھوٹا گھاتا یہاں آکلا۔ کہتے ہیں کہ یہ جگہ چین سے وسط ایشیا کو جانے

ستمبر 2012ء

57

والی ایک تجارتی رہ گزرتی۔ راہب نے اس جگہ ایک بودھ معبد تعمیر کیا جس کے ساتھ ہی بعد کے برسوں میں یہاں ایک چھوٹا سا تجارتی مرکز بھی قائم ہو گیا۔ رہ گزرتی بھی تجارتی مرکز قائم ہوا تو کاروانوں کا پڑاؤ پڑنے لگا۔ رفتہ رفتہ کچھ تاجر چشم یہاں مستقل سکونت پذیر ہو گئے۔ ان کے غلام بھی یہیں بس گئے۔ رفتہ رفتہ کچھ اور لوگ آتے گئے اور شہر بستا چلا گیا۔ یوں آج کے پُرہجوم الان بتار کی بنیاد پڑی تھی۔ کہتے ہیں کہ انہی ڈیڑھ صدی میں اس جگہ ایک پورا شہر آباد ہو چکا تھا۔ تاریخی حوالوں کے مطابق 1778ء میں بھی الان بتار اسی مقام پر واقع تھا جہاں یہ آج موجود ہے۔ شہر کا مرکز وہی بودھ عبادت گاہ تھی جس کے برابر تجارتی مرکز قائم کیا گیا تھا۔

بودھ راہب نے تو اُس وقت آج کے الان بتار کو نہایت ویران پایا تھا لیکن جب میں اس شہر میں پہنچا تو ہر طرف لوگوں، تعمیراتی ساز و سامان اور گاڑیوں کا جھوم ملا۔ شہر لہائی کے رُخ پر پھیلا ہوا ہے اور اس کے پتلیوں بچ سے "شاہراہ اسن" گزرتی ہے۔ یہ دارالحکومت کی واحد مرکزی سڑک ہے جو آپ کو شہر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لے جاتی ہے۔ شہر کے ایک سرے پر لاکھوں لوگ آباد ہیں۔ یہ اس شہر کی افرادی قوت ہے اور ان کی اکثریت سابق خانہ بدوشوں کی ہے۔ دوسرے کنارے پر صنعتی علاقہ اور کام کرنے کے دیگر مقامات واقع ہیں۔ اس لیے صبح اور شام کے اوقات میں سڑک پر ٹریفک کا اتنا زیادہ جھوم ہوتا ہے کہ گاڑیاں چلتی نہیں ہیں بلکہ ایک ایک انچ کر کے اپنی منزل کی جانب ہٹتی چلی جاتی ہے۔ صبح ہوتے ہی لوگوں کا سیلاب دورو یہ شاہراہ امن کے ایک حصے پر بہہ لگتا ہے اور شام کو سیلاب انسانی سڑک کی دوسری طرف بہنے لگتا ہے اپنے اپنے گھروں تک پہنچنے کے لیے۔

الان بتار میں ہر روز بڑی تعداد میں سیکڑوں خانہ بدوش گھرانے ملک کے مختلف حصوں سے آکر ساتے جارہے ہیں۔ اپنی پچان، روایات اور صدیوں قدیم طرز زندگی چھوڑ کر آنے والے یہ سادہ لوح خانہ بدوش جہاں شہر میں پہنچ کر مختلف سماجی، نفسیاتی اور بعض اوقات معاشی مسائل کا شکار ہوتے ہیں، وہیں شہری بھی اُن سے شامی نظر آتے ہیں۔ شہریوں کو شکوہ ہے کہ وہ شہر کی بھیڑ بھاڑ کی زندگی کے عادی نہیں ہوتے۔ انہیں جھوم میں سڑک پار کرنے کی تربیت نہیں ہوئی۔ وہ سبیلوں کے استعمال سے نا آشنا ہوتے ہیں۔ شہری زندگی سے خود کو ہم آہنگ کرنے میں وہ برسوں

بتا دیتے ہیں مگر پھر بھی خود کو اچھی طرح شہری معاشرے میں سمجھتے ہیں۔

الان بتار میں بڑی تعداد میں خانہ بدوش قبائلیوں نے سکونت اختیار کی ہے، اس کے باعث شہر میں کئی سماجی مسائل پیدا ہو چکے ہیں۔ اکثر اوقات سادہ لوح خانہ بدوش پُرہجوم سڑک پر گھنٹوں اس انتظار میں کھڑے رہتے ہیں کہ گاڑیاں چلی جائیں تو سڑک پار کرتے ہیں۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وہ سڑک پار کرنے کے لیے سڑک پر قدم تو رکھ دیتے ہیں لیکن آتی جاتی گاڑیوں کے بچ، بچہ بچا کر گزرنے کے بجائے سٹ پٹا جاتے ہیں۔ کچھ گاڑیوں سے گھرا کر زخمی تو کئی بے نصیب موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔ اکثر یوں بھی ہوتا ہے کہ ان کو بچانے کے چکر میں جب کوئی ڈرائیور اچانک اپنی گاڑی کے بریک لگاتا ہے تو اس کے پیچھے آنے والی گاڑیاں ایک دوسرے سے ٹکرا جاتی ہیں۔ جس کی وجہ سے ایک آدھ ٹھنڈے تک سڑک ٹریفک کے لیے بند ہو جاتی ہے اور گاڑیوں کی لمبوں لمبی قطاریں لگ جاتی ہیں۔

منگولیا بھی کیونٹ ملک تھا۔ شہر میں لوگوں کو قطار لگا کر اشیائے ضرورت خریدنے کی عادت ہے جب کہ یہاں آکر بس جانے والے سٹے سٹے شہریوں کو یہ اعزازہ ہی نہیں کہ قطار کیا چیز ہوتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ گاڑیوں کا دار کو پیسے دو اور چیز لو۔ اس کے لیے قطار میں کھڑا کیوں ہوا جائے۔

شہری تیور کا کہنا ہے "بعض اوقات تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی خانہ بدوش، سر پر کلڑی کا صندوق اٹھائے ہوئے فٹ پاتھر پر جا رہا ہوتا ہے لیکن قطار دیکھ کر صرف یہ جاننے کے لیے لوگوں میں ٹھٹھا چلا آتا ہے کہ یہاں لوگ کیوں جمع ہیں؟ ایسا کئی بار میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ بعض لوگ اس بات پر ان سادہ لوح بچے انسانوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ کچھ انہیں ڈانٹ بھی دیتے ہیں۔ جب کسی کو انہیں ڈانٹا ہوا دیکھوں تو بچ مانو مجھے دلی انصاف ہوتا ہے۔"

شہر والے شاید خانہ بدوشوں کی نفسیات، ان کی بود و باش اور تاریخی پس منظر سے آگاہ نہیں ہوتے۔ اُن کے لیے تو یہ وہ بے وقوف لوگ ہیں جو منہ اٹھا کر شہروں کا رُخ کر لیتے ہیں۔ بہت تھوڑے لوگ ہیں جو تیور کی طرح ان سے ہونے والی زیادتیوں پر انصاف کا اظہار کرتے ہیں۔

الان بتار میں ایک شخص ایسا بھی ہے جو ان خانہ بدوشوں کی تاریخ، نفسیات، سماج اور مسائل کو بہت اچھی طرح سمجھتا تھا۔ یہ ہیں باہر۔ وہ منگولیا کے معروف پبلشر اور مورخ ہیں۔ منگولیا کی تاریخ اور تاریخی کرداروں پر اُن

کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اُس دن وہ ہجرت کر کے مستقل سکونت اور بہتر معاشی مستقبل کی آس لیے یہاں آنے والے خانہ بدوشوں کے بارے میں بتا رہے تھے:

"یہ آزاد فطرت کے حامل لوگ ہیں۔ نئے آنے والوں کو تو چھوڑ دے، میں متحدہ ایسے گھرانوں سے مل چکا ہوں جو کئی سالوں سے یہاں رہ رہے ہیں لیکن اُن کی ذہنیت اب بھی خانہ بدوش معاشرے والی ہی ہے۔ یہ لوگ لیجن وہی کرتے ہیں جو وہ کرنا چاہتے ہیں۔ سرکاری اور آزادی اُن کے لبوں میں شامل ہے۔ صرف اپنی سوچ کے مطابق فیصلہ کرنا اور پھر عمل کرنا اُن کی فطرت ہے۔ وہ دوسروں کے بنائے ہوئے قوانین کی پروا نہیں کرتے۔ اُن کے لیے تو اپنی سوچ اور اپنا فیصلہ ہی اصل قانون ہے۔ ذرا ٹریفک کوئی لے لیں۔ یہ لوگ قانون کی رتی برابر بھی پابندی نہیں کرتے۔ اگر وہ یہ سوچ لیں کہ انہیں ابھی سڑک پار کرنی ہے تو وہ دائیں بائیں دیکھ پنا سڑک پر قدم رکھ دیتے ہیں اور کسی کی پروا کئے بنا آگے بڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ انہیں اس بات کی کوئی فکر نہیں کہ کوئی گاڑی انہیں چل سکتی ہے۔ ان کو بچانے ہوئے کوئی تیز رفتار گاڑی اُلٹ سکتی ہے، وہ گاڑی کسی دوسری گاڑی سے ٹکرا سکتی ہے مگر..... یہ خانہ بدوش اس بات کی پروا نہیں کرتے۔ ان کا مقصد سڑک پار کرنا ہے اب چاہے کچھ کیوں نہ ہو جائے، انہیں کوئی فکر نہیں ہوتی۔ یہ کہہ کر باہر نے گہری سانس لی اور پھر مسکراتے ہوئے کہا۔ "قصور اُن کا نہیں، اصل قصور تو اُس خانہ بدوش آزاد ذہنیت کا ہے جو ان کے خون میں سمائی ہوئی ہے۔" یہ کہہ کر وہ پھر بھر کے لیے خاموش ہوئے اور پھر بولے "آخر کو یہ ہیں تو چنگیز خان کی اولاد نا۔" اس کے بعد ایک زوردار قہقہہ اُن کے منہ سے نکلا۔ میں بھی کافی دیر سے خاموش بیٹھا اُن کی باتیں سن رہا تھا۔ اُن کے قہقہے میں میری طبیعت بھی شامل ہو چکی تھی مگر یہ طبیعت نہیں تحریر تھی اور باہر کا قہقہہ بھی اُن سادہ لوح مگر آزاد فطرت چنگیز خان کے وارثوں کی تعریف میں تھا۔

یہ تھے چنگیز خان کی سر زمین کے اُن قبائلیوں کے بارے میں الان بتار کے شہریوں کے تجربات اور باتیں جو خانہ بدوش زندگی سے نا توڑ کر شہر میں چلے آئے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان خانہ بدوش مہاجرین کی خود اپنے بارے میں رائے، شہریوں کی رائے سے کچھ مختلف نہیں تھی لیکن وہ حالات کو دوسرے زاویے سے دیکھتے ہیں۔ "ہم نے اس طرز کی زندگی، اُس سے پہلے بھی نہیں

دیکھی تھی۔ یہ لوگوں کا سمندر ہے۔ یہاں کوئی کسی سے واقف نہیں۔ ہر شخص اپنی زندگی میں گمن ہے جب کہ ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا۔" اوج کھوگنیں نے الان بتار میں کئی ماہ گزارنے کے بعد اپنے تجربے سے مجھے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ "اُن کا سماج ہمارے ہاں سے قطعی مختلف ہے۔ ہمارے ہاں ایک کا دکھ سب کا دکھ اور کسی ایک کی خوشی سب کی خوشی ہوتی ہے مگر یہاں جس کو آپ جانتے ہیں، اُس کی خوشی اور دکھ سے ہی آپ کا تعلق ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ تعلق چھاپا بھی ہو۔ بہت کچھ صرف دکھاوا ہوتا ہے۔ ہمارے جذبے خالص، ہماری محبت سچی اور ہماری عقیدت ملاوٹ سے پاک ہوتی ہے۔ شہر میں سب کچھ اس کے برعکس ہے۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہوا اور محبت کو گھورنے لگا اور پھر میری طرف دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "مجھے لگتا ہے کہ ہم جو ہجرت کر کے یہاں آباد ہو چکے ہیں، شاید کبھی بھی ان جیسوں کی طرح کے شہری نہیں بن سکیں گے۔ ہم شاید کبھی بھی الان بتار والوں جیسے نہیں ہو سکتے، البتہ مجھے یقین ہے کہ ہمارے بچے اُن جیسے ہی ہو جائیں گے لیکن انصاف....." یہ کہہ کر وہ چند لمحے کے لیے خاموش ہوا اور پھر اُداس لہجے میں کہنے لگا۔ "ہم سب کے بچے اُن جیسے تو ہو جائیں گے لیکن انصاف کہہ کر وہ کبھی بھی اپنے بچوں جیسے نہیں رہ سکیں گے۔" یہ کہتے ہوئے اُس کی آنکھوں سے موٹی جیسے دو آنسو ٹھک کر گالوں پر آ کر ٹپک گئے۔ اُس وقت مجھے یہ دو آنسو بچے موتی لگے..... انمول بچے موتی جو شہر کی آلودہ فضا میں دھندلا کر بہت جلد اپنی آب و تاب کھودینے والے تھے۔

☆☆☆

الان بتار میں کئی ماہ گزارنے کے بعد ایک ہفتے کی صبح اوج کھوگنیں اپنے مختصر سے خاندان کے ہمراہ بس کے ذریعے چند روز کے لیے اپنے آبائی علاقے کو روانہ ہوا۔ اس سفر میں، نہیں بھی اُن کے ہمراہ تھا۔ وہ اپنے سر کی مدد کے لیے جا رہا تھا۔ گرمیوں کا موسم ختم ہونے والا تھا اور اسے اپنے سر کے ٹھیک کی صفائی، فصل کی کٹائی اور سردیوں میں مویشیوں کے لیے چارہ ذخیرہ کرنے میں اُن کا ہاتھ ملانا تھا۔ گاؤں، شہر سے ڈھائی گھنٹے کی دوری پر تھا۔

نوروا کے باپ کا نام جایا تھا۔ وہ بھی گڈہ بان خانہ بدوش ہے۔ کبھی اُس کے مویشیوں کا ریوڑ ایک ہزار سے زائد بھیڑوں، بکریوں اور یاک پر مشتمل تھا لیکن گزشتہ موسم سرما کی شدید سردیوں، برفانی طوفان اور پھر گرمیوں میں ٹھک سالی اور قحط کے باعث اس کے بھی سیکڑوں مویشی

ہلاک ہو گئے تھے۔ اب اس کے ریوڑ میں صرف تین سو بیڑ بکریاں ہی باقی رہ گئی تھیں مگر جایا بڑھا ہونے کے باوجود نہایت باہمت تھا۔ وہ اپنی زمین کو چھوڑنے کے بجائے یہیں کی مٹی میں لکر خاک ہو جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اُس نے اوج کھو گئیں کو بھی بہت سمجھایا تھا کہ وہ یہاں سے نہ جائے لیکن اُس نے کسی کی ایک نہ سنی۔ جب وہ نہانا تو جایا نے اُس کو بادل ناخواستہ جلنے کی اجازت دے دی تھی۔

جایا، اوج کھو گئیں کی طرح کم ہمت نہیں تھا۔ وہ جہاں دیدہ شخص تھا۔ اُسے یقین تھا کہ بہت جلد ایک بار پھر اس کے حالات بدل جائیں گے۔ اس کا ریوڑ ایک بار پھر ہزار سے زیادہ مویشیوں پر مشتمل ہوگا۔ گزرے موسم سرما سے اس نے ایک سبق سیکھا تھا۔ اس بار وہ نہ صرف مویشیوں کے لیے زیادہ مقدار میں چارادر خیرہ کر رہا تھا بلکہ اس بات کی بھی منصوبہ بندی کر چکا تھا کہ اگر اس موسم سرما میں بھی سردیاں سخت پڑیں اور برف باری شدید ہو تو وہ کس طرح اپنے مویشیوں کو چارادرے گا کہ وہ پورے موسم میں خوراک کی کمی کا شکار نہ ہونے یائیں۔ اس لیے اُس نے موسم گرما میں اپنے چھوٹے سے گھیت پر جہاں اناج کاشت کیا، وہیں کافی بڑے رتبے پر چارادر بھی آگایا تھا، جسے اب وہ کاٹ کر، خشک کرنے کے بعد ذخیرہ کرنے والا تھا۔ جایا کی مدد کے لیے اُس کی بیٹی نوروا اور داماد اوج کھو گئیں بھی بچھ رہے تھے۔

بس منگولیا کے خوبصورت کچے پلے راستے پر بچکولے کھائی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ میں اوج کھو گئیں اور نوروا کی زبانی جایا کی کہانی سن چکا تھا۔ اب اس سے ملاقات کا انتظار تھا۔ میں صرف جایا سے ہی نہیں ملنے والا تھا بلکہ ایک قدیم تہذیب کے جدید عہد میں موجود ایک کردار سے ملنے والا تھا۔ خانہ بدوش تہذیب کا وہ کردار جس کے دو رخ تھے، ایک جایا دوسرا اوج کھو گئیں۔ ایک وہ جو موسم کی سختی کو ٹھیک کر کے لکھا سمجھ کر شکار و صابروں اور ایک بار پھر ہمت جمع کر کے حالات کی بہتری پر کمر بستہ ہو گیا۔ دوسرا وہ جو اپنے جیسے لاکھوں خانہ بدوشوں کی طرح ہمت بار بیٹھا اور اپنی معاشرت میں آکر اپنی شناخت کو اپنے ہی ہاتھوں مٹانے پر شل گیا۔

یہ ایک خوبصورت وادی تھی۔ قدرت کے حسین نظاروں کی فراوانی تھی۔ ہوا خالص اور کیف آگئی تھی۔ بس سے اترتے ہی میں نے گہری سانس لی۔ میرے پیچھے دوے خالص آسمان تھے۔ میرے سامنے دو گھنٹہ کی مسافت پر ایک

میں نے اوج کھو گئیں اور نوروا کی طرف دیکھا۔ اُن کے چہروں پر بھی ایسے تاثرات تھے کہ مجھے برسوں کے بعد وہ اپنے کسی بہت ہی پیارے مگر چھڑے دوست سے ملاقات کر رہے ہوں۔ بچوں کے چہروں پر بھی نہایت پاکیزہ، بچی اور مصحوم مسکراہٹ رقصاں تھیں۔

ہم نے سامان اٹھایا اور پیدل آگے بڑھنے لگے۔ ہمیں جایا تک پہنچنے کے لیے میں منٹ کی پیدل مسافت طے کرنی تھی۔ ہم پلڈنڈریوں پر آگے بڑھتے جا رہے تھے۔

☆☆☆

شام ہو چکی تھی۔ خیمے کے باہر موسم سرد تھا۔ میں جایا اور اُس کے اہل خانہ کے ساتھ بیڑ کے بالوں سے بنے بڑے سے گول خیمے میں بیٹھا ہوا قبوہ دہا کر رہا تھا۔ ہم کھانا کھانے کے بعد دائرے کی شکل میں بیٹھے ہوئے بائیں کر رہے تھے۔ میں نے جایا سے سوال کیا کہ ”تم نے اوج کھو گئیں کی طرح یہاں سے شہر چلے جانے کا فیصلہ کیوں نہیں کیا؟“

”یہ میری زمین ہے۔“ میری بات سن کر اُس نے نہایت اعتدال سے کہا شروع کیا۔ ”میرے بچوں کی زمین ہے۔ اس زمین پر میں اپنے انداز کی زندگی بسر کرتا ہوں۔ یہاں صرف میرا قانون چلتا ہے۔ مجھے کسی اور کے بنائے ہوئے قانون پر نہیں چلنا پڑتا۔ میں صرف روٹی کے لیے اپنا سب کچھ کیوں چھوڑ دوں۔“ یہ کہہ کر وہ چند لمحے کے لیے خاموش ہوا۔ ”ہم خانہ بدوش ہیں۔ مویشی ہی ہماری معیشت ہے۔ یہ بات سچ ہے کہ پچھلے موسم سرما میں ہمارے بہت سارے مویشی مر گئے تھے۔ یہ بہت بڑا نقصان تھا مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اپنی دھرتی چھوڑ دوں۔ اپنی زندگی کا چلن چھوڑ دوں۔“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہوا اور گہری نظروں سے اوج کھو گئیں اور نوروا کو دیکھنے کے بعد ایک بار پھر بولنا شروع کیا۔

”میں بوڑھا ہوں مگر کم ہمت نہیں۔ مجھے اپنے بچوں سے پیار ہے، اپنی تہذیب سے پیار ہے۔ میرے سارے جانور مر جائیں تب بھی میں یہ دھرتی چھوڑ کر نہیں آؤں گا۔ میں یہاں رہتا ہوں کہ میں نے اپنی زندگی کا جو کچھ میں نے بنایا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہماری افسر شاہی بدعنوان ہے۔ ہمیں وہ کوئی خاص سہولت نہیں دیتے لیکن یہ کیونرم کی مہربانی ہے کہ ہمارا سب کچھ ختم ہو جانے کے باوجود بھی یہ ہمیں بھوکا مرنے نہیں دیں گے۔ ہمارا نلک، ہماری حکومت ہمیں ہمیں پردہ وقت کی روٹی پہنچانے کی تاکہ ہم زندہ رہیں۔“ یہ کہہ کر وہ پھر کے لیے خاموش ہوا۔ پھر اس نے

مسکراتے ہوئے کہا شروع کیا۔ ”ویسے بھی انسان بھوک سے نہیں مرتا۔“

”یہ کس طرح ممکن ہے؟“ اُس کی بات سن کر میں نے حیرت سے کہا۔

”ممکن ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”انسان بھوک سے نہیں، حوصلہ ختم ہو جانے پر مر جاتا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں عزم و حوصلے کی جواں چمک رقصاں تھی۔

جایا کی بات سن کر میں نے باری باری اوج کھو گئیں اور نوروا کے چہروں کی طرف دیکھا۔ اُن کی نظریں فرش پر گڑی ہوئی تھیں۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ شہر نے ان کے گوشت پوست کے وجود کو تو زندہ رکھنے کی ضمانت فراہم کر دی ہے لیکن یہاں سے ہجرت کرنے کا فیصلہ کرتے وقت ہی ان کا حوصلہ شاید مر چکا تھا۔ اب میں یقین سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ جایا کی نظریں وہ دونوں زندہ تھے یا پھر.....

”ویسے آپ شہر کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟“ میں نے حقوس کی خالی پیالی جایا کی بیوی چنسل کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”انسانوں کا جنگل ہے۔“ چنسل نے دہلی آواز میں جواب دیا۔ ”یہ سن کر میں مسکرایا۔“ ”شہروں میں رکھا ہی گیا ہے۔“ جایا نے بیوی کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”شور، دھواں، ہنگامے، لوٹ مار، نہ ہوا خالص نہ ہی لوگوں میں اپنائیت..... میں تو شہر میں ہفتہ بھر بھی نہیں رہ سکتا۔ اگر کبھی میں ایک ہفتہ شہر میں رہ گیا تو تھینا پیار پڑ جاؤں گا، مگر جاؤں گا۔“ ”مگر نوروا اور اوج کھو گئیں بھی تو.....“ میں نے جایا سے ادھر اسوال کیا۔

”سچ کہہ رہے ہو۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ وہ اس دھرتی کو اس طرح محسوس نہیں کرتے جیسا کہ میں اور میری بیوی۔“ یہ کہہ کر اُس نے چنسل کی طرف دیکھا، وہ مسکرا دی۔ ”ان دونوں کا ذہن ہمیں ہمارے برابر تھا۔“ اُس نے نبی اور ادا کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ویسے یہ اُن دونوں کا فیصلہ تھا۔ ہم خوش نہیں تھے لیکن ان کی خوشی کے لیے مجبوراً اجازت دے دی۔ اب بھی اُن کا خیمہ یہیں موجود ہے۔ کبھی بھار اُس پر نظر پڑتی ہے تو دل سے بوک اٹھتی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ نبی اور ادا کے چہروں پر بدستور ہیشمائی کے آثار تھے۔ مجھ دریں خاموشی کے بعد اس نے کھنکھار کر گھاسا

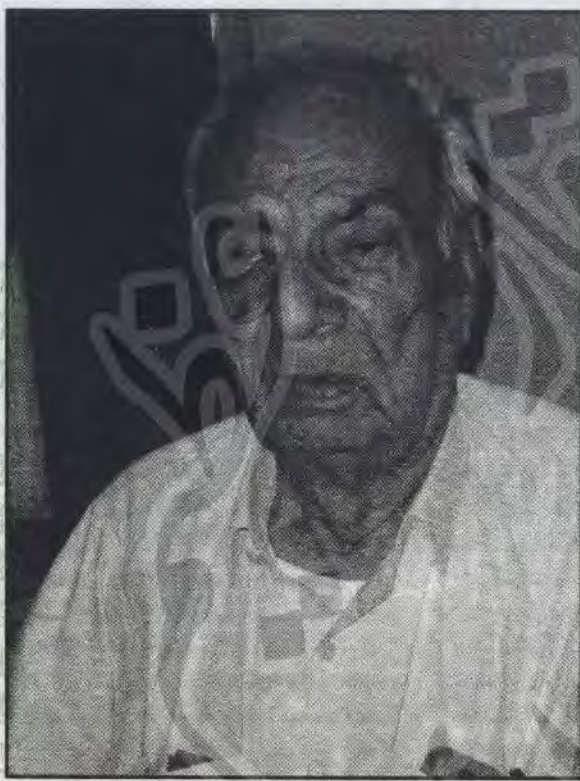
کیا۔ ”کبھی کبھی اُس خیمے کو دیکھ کر سوچتا ہوں کہ وہ دونوں وہاں آجائیں گے مگر مجھے یقین ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔ ان دونوں کو تو سن کی آسانی اور بچوں کا شہری مستقبل چاہیے۔ وہ انہیں مل گیا مگر روح کی بے آرامی کی قیمت پر۔“ یہ کہہ کر اُس نے آنکھوں میں اُمڈ آنے والے آنسوؤں کو پونچھا اور ہاتھ بڑھا کر نوروا کی گود سے اپنے شیر خوار نوے کو لے کر اپنے سینے سے چمکایا۔ ”انہیں خوش رہنا چاہیے۔ ان کی خوشی ہماری خوشی ہے۔“ اس نے بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جایا کی بات سن کر بیوی بار اوج کھو گئیں اور نوروا نے فرش پر سے نظریں ادا پر اٹھائی تھیں۔

☆☆☆

”اوج کھو گئیں اور جایا جیسے لوگ قابل اور تجربہ کار گلہ بان ہیں۔ ویسے بھی گلہ بانی اور خانہ بدوشی کا تو بچوئی وا سن کا ساتھ ہے۔“ الاان بتا رہا تھی پر میری ملاقات باہر سے ہوتی تو میں نے انہیں جایا سے ملاقات کا احوال سنایا تو انہوں نے کہا۔ ”ویسے ناکامی اور دلبرداشتہ ہونے میں قصور اوج کھو گئیں کا نہیں۔ یہ موسم کا جبر تھا۔ اس جیسے ہزاروں خانہ بدوش ہیں جو ان جیسے ہی حالات کی تسلیم ظریفی کا شکار بنے۔“ یہ کہہ کر انہوں نے کچھ دیر تک سوچا۔ ”ویسے جایا ٹھیک کہتا ہے۔ وہ سچا خانہ بدوش ہے۔“ اُس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”بات یہ ہے کہ سودیت یونین کے کیونسٹ دور میں منگولیا کے تمام چھوٹے بڑے علاقوں میں مختلف قسم کے کارخانے لگائے گئے تھے۔“ باہر نے تفصیل سے بتانا شروع کیا۔ ”1990ء کی دہائی کے اوائل میں جب سودیت یونین کا شیرازہ ٹھکرا تو کارخانے بھی بند ہو گئے۔ ستر سالہ سودیت کیونسٹ دور میں خانہ بدوشوں کی کئی ٹیلیں صرف مزدور بن کر رہ گئی تھیں۔ جب روزگار ختم ہوا تو خانہ بدوشوں کی ان بے روزگار مزدور اولادوں نے الاان بتا کر زرخ کیا۔ وہ شہر کے مضافات میں واقع پہاڑی ڈھلوانوں کی قدرتی چراگاہوں کو استعمال میں لا کر ایک بار پھر وہی پیشہ اپنانا چاہتے تھے جو کئی لسوں پہلے اُن کے باپ داداؤں کا تھا۔ بڑی تعداد میں لوگوں نے گلہ بانی کر کے ٹرکس پر لے کر کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ وہ سب کچھ بھول چکے تھے۔ بطور خانہ بدوش اُن کی کھٹی میں موجود گلہ بانی کے علم کی سیاحی پھیل چکی تھی۔ انہیں راستہ یاد تھا لیکن اس پر چلا کیسے جائے وہ یہ بات نہیں جانتے تھے۔ یہی سچ ہے، چڑا گا ہاں میں گئیں مگر تین چار لسوں پہلے خانہ بدوشی بڑا کرنے والوں کی

سستور 2012ء [61]



شوہوگیان

ابن کبیر

زندگی گزارنا آسان نہیں، قدم قدم پر رنج و محن کی بیڑیاں، آزمائشیں، خطرات منہ کھولے منتظر رہتے ہیں۔ پھر بھی ان کٹھن حالات میں کچھ لوگ باوقار انداز میں بامقصد زندگی گزارتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں میں شوہوگیان چندانی کا شمار ہوتا ہے جسے رابندر ناتھ ٹیگور، موئن جودڑو کا آدمی، کہہ کر پکارتے تھے۔ جس نے وطن عزیز کو انگریزوں کے چنگل سے آزاد کرانے کے لیے قربانیاں کا نیا باب رقم کیا، آزادی کے بعد بھی ظلم و استبداد کے خلاف جنگ جاری رکھی۔ ہندو ہونے کی وجہ سے اسے جب جب ہندوستان جانے کا کہا گیا اس کا جواب ہوتا، یہ وطن صرف مسلمانوں کا نہیں، ہم اقلیت کا بھی ہے، ہم کیوں جائیں کسی غیر دیس میں۔

ایک بے لوث خدمت گار پاکستان کی جیون کھتا

یہ اُس درویش کی کھتا ہے جس کی داستان زیست و انصاف کی فراوانی اور حالات کے تشیب و فراز کے سبب افسانوی معلوم ہوتی ہے۔ یہ وہی قابل احترام انسان ہے جسے ”گردو پو“ یعنی رابندر ناتھ ٹیگور نے ”موئن جودڑو کا آدمی“ کہا، شخ ایاز جیسے دانشور نے ”قلندر“ کہہ کر پکارا اور اس یقین کا اظہار کیا کہ اس کی موت کے بعد اس کی مادھی پر سیلا لگے گا! جس طرح جہول ڈیکال نے سارتر کے ہاتھ میں کہا

روٹی تو مل جائے گی۔“ یہ کہہ کر وہ زکا اور پھر کچھ سوچ کر کہنے لگا۔ ”اس طرح بنی کو اسکول چھوڑنے اور لانے کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔“

”یہ بات تو ٹھیک ہے۔“ میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ویسے گلہ بانی کے متعلق کیا خیال ہے؟“

”الان بتا اس کام کے لیے موزوں نہیں البتہ یہاں بچوں کی پرورش بہتر انداز میں ہو سکتی ہے۔“

کافی دیر تک باتیں کرنے کے بعد ہم دونوں کمرے سے باہر نکلے۔ اس نے باڑے کے دروازے کو کھولا۔ لکڑی کا بڑا سا پھاٹک نما دروازہ ایک چرچاہٹ سے کھلا۔ میں اُس کی طرف پلٹا اور کہنے لگا۔ ”تم کھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھنے کے عادی تھے۔ کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر کیسا محسوس کرو گے؟“

میرے سوال کے جواب میں اس نے منہ نہیں کھولا بلکہ سختی سے اپنے ہونٹ جھنجھ لیے تھے۔ میں اس کے اندرونی کرب کو محسوس کر چکا تھا۔ مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا تھا۔ چند لمحے تک ہم دونوں خاموش کھڑے رہے۔

”یا خدا..... میں اپنے کھوڑوں کی کی بہت محسوس کرتا ہوں۔“ اس نے یہ بات میری طرف نہیں آسان کو فور سے کہنے ہوئے کہی تھی۔ میں آگے بڑھا اور اُسے گلے سے لگا دیا۔

چند گھنٹوں کے بعد ہم دونوں اپنی اپنی شہری زندگی میں کھوجانے والے تھے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ میں الان بتا رہا تھا خالی ہاتھ آیا تھا مگر مجھے کھانے کا یقین تھا۔ اب میں الان بتا رہا تھا ایک خانہ بدوش کی دہی زندگی کی کہانی اپنے ساتھ لے کر گھر لوٹ رہا تھا۔ وہ جیب میں جمع پونجی ڈال کر یہاں آیا تھا کبھی نہ لوٹنے کے لیے مگر اب تک خالی ہاتھ تھا۔ اُس کے پاس اگر الان بتا کر دیا ہوا کچھ تھا تو وہ یادیں تھیں جو یہاں آنے کے لیے اس نے اپنی روایتی خانہ بدوش زندگی کو ترک کر کے بدلے میں بانی تھیں۔ صرف ماضی کی یادیں ہی اب اس کا حاصل ہجرت تھا۔

چنگیز خان کے قبیلے کے اس فرد کو اب الان بتا رہے ہجرت خانہ خیز شب و روز میں اپنی زندگی کے باقی ماندہ دن پٹانے تھے۔ اپنے بچپن کے پورا ہونے کی امید میں..... ہر نئے دن ٹوٹنے والے نئے معاشی عذابوں کے کرب..... اور ماضی کی خانہ بدوش زندگی کی انمول یادوں کے ساتھ.....

ماضی کی وہ انمول یادیں جو دو چار پل کے لیے ہی سہی مگر اوج کھوٹیں پر ٹوٹنے والے عذابوں کی شدت کو ضرور کچھ کم کر دیتی ہوں گی۔

مزبور اولادیں موسیقی، اُس کی نفسیات..... سب کچھ بھول بھال گئے تھے۔“ یہ کہہ کر باہر کچھ دیر خاموش رہے اور پھر کہنے لگے۔ ”میں کچھ اوج کھوٹیں کے پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیوں کے ساتھ ہوگا۔ جایا جیسے لوگ اب منکولیا میں بہت ہی تھوڑے رہ گئے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ کافی دیر خاموش رہے اور سوچتے رہے۔ پھر انہوں نے سراٹھا کر میری طرف دیکھا اور کہنے لگے۔ ”مجھے افسوس ہے اُن لوگوں پر جو اپنے اجداد کی روایتی زندگی کو ترک کر رہے ہیں۔ یہ کہیں کے نہیں رہیں گے۔ نہ تو وہ مکمل طور پر شہری زندگی میں ڈبھ ہو جائیں گے اور نہ ہی انہیں خانہ بدوش میں جینے کا مٹیر یاد رہے گا..... قابل افسوس ہے یہ بات مگر یہی وجہ ہے۔“

☆☆☆

اوج کھوٹیں کو اپنی آنکھوں میں سنہرے سنے سجا کر الان بتا آئے ہوئے نئی ماہ بیت چکے ہیں مگر اب تک اس کے معاشی حالات مستحکم نہیں ہو پائے۔ اُس نے شراکت داری اور از خود کئی کاروبار کرنے کی کوشش کی لیکن کسی کام میں اُسے کامیابی نہ مل سکی۔ اس کی ناکامیوں کا ایک سبب اُس کی نا تجربہ کاری بھی ہے۔ ان کوششوں میں وہ اپنی جمع پونجی میں سے خاصی رقم گنوا چکا ہے لیکن اس کے باوجود وہ الان بتا سے ساڑھے تین سو کو میٹر دور اپنی وادی میں پلٹ کر جانا نہیں چاہتا۔ وہ یہیں رہنا چاہتا ہے۔ اس کی بیٹی اسکول جاتی ہے۔ ایک دو سال بعد بیٹی بھی اسکول جانے کی عمر تک پہنچ جائے گا۔ وہ اپنے بچوں کو تعلیم دلوانا چاہتا ہے مگر ذریعہ معاش اس کو اب تک پریشان کیے ہوئے ہے۔

منکولیا میں تین کرب ڈالر کی غیر ملکی سرمایہ کاری سے کان کنی کا رجحان فروغ پا رہا ہے۔ بڑی تعداد میں مزدور پیشہ اور مہنہ نہ رکھنے والے لوگ اس شعبے میں کھپ رہے ہیں مگر اوج کھوٹیں کہیں زمین کے اندر غاروں میں جانے سے ڈرتا ہے۔ اس لیے وہ اس طرف کا رخ نہیں کر رہا۔

”اب کیا کرو گے؟“ اُس دن میں نے اس سے سوال کیا۔ میں الوداعی ملاقات کے لیے اوج کھوٹیں کے گھر پہنچا تھا۔ میری تحقیق مکمل ہو چکی تھی۔ وہ تحقیق کا مرکز کی دروازہ تھا اور اگلے دن مجھے واپس اپنے گھر لوٹ جانا تھا۔

”بہت تھوڑے پیسے باقی بچے ہیں۔“ اس نے میری بات سن کر افسردگی سے کہا۔ ”اب جتنے پیسے ہیں، سوچ رہا ہوں اس سے کوئی پرانی کار خرید لوں اور ڈرائیونگ سیکھ کر اسے بطور ٹیکسی چلانا شروع کر دوں۔ کم از کم دو وقت کی

تھا کہ ”سارتر فرانس ہے، اور فرانس سارتر!“ اسی طرح دعوے دار یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ”وہ جوڑو ہے اور مون جوڑو وہی ہے!“ اور یہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں کہ اسی قدیم زمین سے اس کی سرشت اُبھری اور اسی دھرتی کے حسین رنگوں نے اُس کی زلیست میں توس قروح کے رنگ بھر دیے۔ یہی سبب ہے کہ آج اس کا ذکر ایک اساطیر، ایک داستان معلوم ہوتا ہے۔ اُن کی تمام عمر مزدوروں، کسانوں اور معاشرے کے پکے ہوئے طبقات کے حقوق کی جنگ لڑتے گزری۔ اس دوران انہیں جیل کی سختیاں اور آسمروں کے مظالم بھی سہنے پڑے مگر وہ اپنے نظریات سے دست بردار نہیں ہوئے۔ وہ اپنی دھرتی کے سچے عاشق ہیں، اسی باعث تقسیم کے بعد بھی سندھ کی زمین سے جوئے رہے۔ آئیے لاڈکانہ میں مقیم قابل احترام اس سیاسی و سماجی راہ نماء، دانش ور، تاریخ داں، افسانہ نگار اور کالم نویس کی زندگی میں جھانکتے ہیں۔

☆☆☆

پُر اسرار شہر مون جوڑو سے ایک میل کے فاصلے پر تارا کینال کے علاقے ”ولندھو“ میں ”بندی“ نامی ایک گاؤں ہے، جو ضلع لاڈکانہ کا حصہ ہے۔

اس گاؤں کے فطری ماحول میں زندگی پُر سکون اور دھیمی ہے۔ پانچ ہزار سال قدیم شہر مون جوڑو سے قربت کا بھی اثر ہے جس کے سبب یہاں ہر کیفیت قدیم اور ٹھہری ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

سن 1920 کا ذکر ہے۔ ماہ اپریل مئی میں داخل ہو رہا تھا۔ سوڈو کانپنڈ کرنے والا کھراڑ میں دار پیر بھ داس اپنے دو ہونہار سپوتوں ثنورل اور کلن داس کے ساتھ دن بھر کی مشقت کے بعد گھر کے کچن میں چپ کا آسن جمائے بیٹھا تھا۔ اُس کے شب و روز یکساں سکون کے ساتھ گزر رہے تھے اور وہ وقت کی رفتار سے مطمئن تھا۔

یہ ایک ایسا خاندان تھا جو سکھ مذہب کے بانی بابا گرو نانک کا پیروکار تھا اور اس تعلق سے ”نانک پنٹھی“ کہلاتا تھا۔ اس عقیدے کے لوگ دائمی و غیرہ نہیں رکھتے۔ بس اپنے بابا کی تقلید میں تمام مذاہب کا احترام کرتے ہیں۔

پیر بھ داس کا جوان بیٹا ثنورل بھی زندگی کے چمکندہ نیاں ایکس آن کی مسرت کے ساتھ عبور کر رہا تھا۔ خدا نے اُسے ایک سکھ بوی دی تھی اور اُس کے کچن کو اولاد کی نعمت سے بھر دیا تھا۔ اور جب نئی کو شروع ہوئے تین دن گزر گئے، اُسے ایک اور خوش خبری ملی جس نے اُس کی مسرت کو

دو چند کر دیا۔

اوپروالے نے اُسے ایک اور بیٹے سے نوازا تھا۔ اُس نعمت خداوندی کو وصول کرنے کے بعد زمین دار کے گھر جشن منایا گیا اور بچے کا نام سوہراج رکھا گیا۔

”یہ بچہ ہمارے خاندان کا نام روشن کرے گا۔“ دادا پیر بھ داس نے اپنے پوتے کا ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ باپ ثنورل نے بھی زربل دعا کی کہ یہ بچہ آنے والے وقتوں میں اُس کا نام روشن کرے۔

معلوم ہوتا ہے کہ وہ قبولیت کی گھڑی تھی، کیونکہ آج اسی سوہراج کے طفیل نہ صرف زمین دار ثنورل اور اُس کے باپ پیر بھ داس کا ذکر آتا ہے بلکہ تفصیلات کھوجنے والے تو سوہراج کے پردادا شری کیان چند تک پہنچ جاتے ہیں جو ہریل داس کا ہونہار سپوت تھا۔

سوہراج کے اجداد کا تعلق کنڈیارو، سندھ سے تھا جو ایک صدی قبل مون جوڑو کے نزدیک مسلمانوں کے گاؤں ”بندی“ میں آئے جہاں اُس زمانے میں نہ تو مندر تھا، نہ ہی کوئی گردوارہ! اور وہاں کی آؤزافضا میں اُس کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں تھی۔ ہندو مسلم شاہ عبداللطیف بھٹائی کو مانتے تھے اور شہباز قلندر کا نام احترام سے لیتے تھے۔ ہر تہوار میں گاؤں کے باسی مذہب سے بالاتر ہو کر یکساں مسرت کے ساتھ شرکت کرتے تھے۔ مسلمان بزرگ ہندوؤں کو توحید دیتے اور ہندوؤں میں مسجد میں منت کا دایا جلائی کرتی تھیں۔

سوہراج کے آباؤ اجداد نے ”بندی“ آنے کے بعد ایک چھوٹی سی نما مکرے میں پنساری کا کاروبار شروع کیا۔ قسمت نے ساتھ دیا، ترقی کرتے کرتے یہ گھرانہ اچھا خاصا بیوپاری بن گیا۔ اب ضرورت مندوں کو سود پر قرضے دینے کا سلسلہ شروع ہوا اور اِس میدان میں بھی کام بابائی نے قدم چوئے۔ الغرض سوہراج کی پیدائش تک یہ بیوپاری خاندان معاشی مسائل سے آزادی حاصل کر چکا تھا۔

والدین کی خواہش تھی کہ اُن کا سپوت انڈین سول سروس میں نام کمائے لیکن شعور کی دبیز پر قدم رکھنے کے بعد اُس نے سرکاری ملازمت کو ردِ خور اہتاء نہ جانا۔ البتہ اِس بابت کبھی اُس کے اہیوں نے شکایت نہیں کی، کیوں کہ سرکاری مشینری کا حصہ بن کر زیادہ سے زیادہ وہ توڑے بہت پیسے اور عزت کمایا اور ریٹائرمنٹ کے بعد پیشین پر گزرا کرتا، پر جس سطح پر وہ آس نے پہنچا دیا، وہ اُسے تین اقوامی شہرت تک لے گئی۔

☆☆☆

پیر بھ داس کے پوتے اور ثنورل کے سپوت سوہراج کا سفر زلیست پوری ایک صدی پر محیط ہے جس میں اُس کا پیدائشی نام کھن پیچھے رہ گیا ہے۔ پہلے وہ ”سوہیا خان“ ہوا، پھر ”سوہیو کیان چندانی“ کے نام سے معروف ہوا۔ بعد میں بڑے احترام کے ساتھ کامریڈ کا سابقہ اُس کے نام کے ساتھ لگا دیا گیا۔ اور وہ کامریڈ سوہیو ہو گیا۔

گاؤں کے فطری اور آزاد ماحول میں پروان چڑھنے والا سوہراج سات بہن بھائیوں میں تیسرا تھا۔ ثنورل کی پہلی اولاد کلپانی تھی، پھر کیول رام پیدا ہوا۔ پھر سوہراج اِس دنیا میں آیا۔ اگلا نمبر پریشوری کا تھا جس کی تقلید خوب چند نے کی، جس کے بعد ودھیانے آنکھ کھولی۔ ثنورل کی آخری اولاد سادری تھی۔

سوہراج نے گاؤں کے فطری ماحول کا مشاہدہ کرنے سے پہلے اپنے اہل خانہ سے ہم آہنگ ہونے کی مشق کی جس نے مستقبل میں مختلف طبقات میں کھل مل جانے کے عمل میں اُس کی معاونت کی۔

سوہراج کی ماں غنٹی، جفائش اور خداترس خاتون تھی۔ وہ سوہراج اور اُس کے بہن بھائیوں کی معصوم ساعتوں کی پیار بھری لویلوں سے بھر دیتی، انہیں حرے دار کھانے کھلائی اور ساتھ ساتھ چکی چستی ربڑتی۔ ہریاں کی طرح وہ ممتا سے بھرپور اور قدرتی بانی کے جذبے سے سرشار تھی۔

کلن داس سوہیو کا چچا تھا جس کے ہاں اولاد نہیں ہوئی۔ اُس نے اپنے بچے، یعنی سوہیو کے بڑے بھائی کیول رام کو بیٹے کی طرح پالا، پر سوہراج سے بھی کچھ کچھ کم محبت نہیں تھی۔

سوہراج اپنے دادا پیر بھ داس سے بہت محبت کرتا تھا جو جن سوہیو کے آٹھ گریبا قاعدی سے امن و شanti اور اپنے بچوں کے لیے مخصوص دعائیں کرتا، جنہیں سکھ لوگ ”ارداس“ کہتے ہیں۔

اُس وقت بندی میں کوئی مندر نہیں تھا پر سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والا دھینڈھاؤں کی صورت دستیاب تھا۔ کم سن سوہراج گرو نانک سے لے کر گرو گوند سنگھ تک کی کہانیاں ”جو سکھ پنٹھ“ کہلاتی ہیں، بہت شوق سے سنتا تھا۔ سندھ کی قدیم دھرتی کی عظیم لوگ کہانیاں سنتے ہوئے سوہراج نے ماں کی گود سے نکل کر چلتا سیکھا۔ اور آگے چل کر بندی نامی خاموش گاؤں کو اپنے وجود کی روشنی سے ایک زمانے کی توجہ کا

مرکز بنا دیا۔

☆☆☆

”غریب بھی انسان ہی ہوتا ہے اور اِس بات کا حق دار ہوتا ہے کہ اُس کے ساتھ انسانی سلوک کیا جائے!“ کھیل کود میں مصروف سوہراج کے ذہن میں یہ خیال بابائے سندھ، کامریڈ حیدر بخش جتوئی کے توسط سے پروان چڑھا۔ جو یہ ہے کہ سوہراج کی کہانی کامریڈ حیدر بخش جتوئی کے ذکر کے بغیر اوجھری معلوم ہوتی ہے۔

وہ تھیلوں کا زمانہ تھا! دنیا کے دوسرے حصوں کی طرح سندھ میں بھی جاگیر دار گھرانوں میں پیدا ہونے اور تربیت پانے والے کئی بڑھے لکھے نوجوانوں نے خود کو انقلابی جدوجہد کے لیے وقف کر دیا تھا، جن میں 10 اکتوبر 1901 کو پیدا ہونے والے حیدر بخش جتوئی کا نام نمایاں ترین تھا۔

حیدر بخش جتوئی ایک نظریاتی انسان تھے۔ وہ کارل مارکس کی تعلیمات سے متاثر تھے اور انہیں عملی جامہ پہنانے کے خواہش مند تھے۔ بڑی مشکل سے گھر والوں کے اصرار پر انہوں نے سرکاری ملازمت قبول کی تھی۔ سختی آدمی تھے، ترقی کرتے کرتے وہ ضلع لاڈکانہ کے ڈپٹی کلکٹر کے عہدے تک پہنچے لیکن ترقی پسند نظریات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ سرکاری ملازمت میں رہتے ہوئے بھی انہوں نے ہاریوں کے لیے خاصا کام کیا۔

اور ایک خوب صورت صبح سوہراج نے اِس مجاہد کو اپنے دادا کی اطاق میں دیکھا۔

دراصل جس زمانے میں حیدر بخش جتوئی ہیڈنشی تھا، انہوں نے بندی کا دورہ کیا تھا۔ اُس وقت سوہراج سات برس کا تھا۔

اُس موقع پر پیر بھ داس نے حیدر بخش جتوئی سے شکایت کی کہ اُن کا پڑوسی جان بوجھ کر اُس مقام پر گائے ذبح کرتا ہے جہاں ہندو اور گاؤں کے دوسرے لوگ بیٹھا پانی بھرنے جاتے ہیں، اِس عمل سے بھائی چارے کی فضا خراب ہوتی ہے۔

اقلیت کے ڈھک درد کو محسوس کرنے والے حیدر بخش جتوئی نے جب یہ سنا تو فوراً اُسے بلایا اور خوب ڈانٹا۔ اُس دن سوہراج نے پہلی بار عملی سرکاری عہدے پر فائز ایک ایسے شخص کو دیکھا جو مذہبی و طبقاتی تقسیم سے بلند ہو کر انصاف پر مبنی فیصلے کرتا تھا۔

اُس زمانے میں سرکاری اہل کار اُن کسانوں کا مال و

اسباب ضبط کر لیتے تھے، جو حکومت کو ٹیکس ادا نہیں کرتے تھے۔ ایک بار سرکاری اہل کار کسانوں کے ضبط شدہ اسباب کے ساتھ مویشی اور برتن بھی ساتھ لے گئے۔ جب جوتی صاحب کو پتا چلا، تو انہوں نے سخت غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا، ”تم سے یہ کس نے کہا تھا کہ جو غریب کسان ٹیکس ادا نہیں کر سکے، اس کے گھر کے مویشی تک اٹھاؤ، فوراً جاؤ اور انہیں واپس کر دو“

یہ سوچو کہ کہانی کا انتہائی اہم موڑ ہے، کیوں کہ مستقبل قریب میں کم سن سوہراج اسی ہمدرد انسان کے نقش قدم پر چلنے والا تھا!

اس ملن سار اور اُچلے شخص (حیدر بخش جوتی) نے 1945 میں سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے کر ”ہاری کمیٹی“ میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ واضح رہے کہ سندھی ہاری کانفرنس کی بنیاد 1930 میں رکھی گئی تھی جس کا مقصد سکھ بیراج کے مصفاات میں واضح غیر آباد زمین کو ہاریوں میں تقسیم کروانے کے لیے جدوجہد کرنا تھا۔ اس جماعت کا تعلق ”آل انڈیا کسان سبھا“ سے تھا۔ تنظیم میں کامریڈ عبدالقادر کو نمایاں مقام حاصل تھا۔ ہاری کمیٹی نے سندھ کے جاگیرداروں کے خلاف نڈو جام اور دوسرے علاقے میں موثر تحریکیں چلائیں۔ کامریڈ عبدالقادر کے ساتھ کام کرنے والوں میں ایک بڑی کھپ کسان اور کیونسٹ راہ نمائوں کی تھی۔ پھر حیدر بخش جوتی اس کا حصہ بنے، جن کی قیادت میں ہاری کمیٹی نے ٹریڈ یونین کی طرز پر کسانوں کے لیے جدوجہد کی۔ وہ 1947 میں کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے۔ انہوں نے ہاریوں میں شعور بیدار کرنے کے لیے ”حق دار“ نامی ایک ہفت روزہ بھی نکالا۔ قصہ مختصر، بعد میں اسی انقلابی کے نقش قدم کا تعاقب کرتے ہوئے سوہراج نے بھی ہاریوں کے لیے شان دار جدوجہد کی۔

لیکن یہ تو بعد کی کہانی ہے، اُس وقت تو کم سن سوہراج یہ سوچ سوچ کر حیران ہوتا تھا کہ ایک باہر کا آدمی جو ہمیں ٹھیک طرح جانتا تک نہیں ہے، وہ ہماری مدد کیوں کر رہا ہے؟ اُس کے ننھے دل میں بھی دوسروں کی خدمت کرنے اور دکھ درد میں کام آنے کے جراثیم پلنے لگے۔ اُس کی شفیق ماں کی تربیت بھی شامل حال رہی، جو وہی خواتین کی دل کھول کر مدد کیا کرتی تھی اور اُسے بھی کچلے ہوئے انسانوں کی مدد کرنے کا پتہ پڑ جاتا تھا۔

دیر نہ دیر سے غریبوں کی مدد کرنے کا جذبہ قوی ہوتا

گیا۔ جب کبھی دادا کے ساتھ اناج کے بٹوارے کے وقت سوہراج کھیتوں میں جاتا تھا تو ہمیشہ ہاریوں کی طرف داری کرتا۔

ایک دن باپ نے ننھے سوہراج سے کہا۔ ”آج اناج کا بٹوارا تم کرو گے۔“ ننھے نے جھٹ پٹ بڑا حصہ ہاری کو اور چھوٹا حصہ دادا کو دے دیا۔

باپ نے حیرت سے اس کا سبب دریافت کیا تو سوہراج نے جواب دیا۔ ”بابا، اس غریب ہاری کا خاندان بڑا ہے، ہمارے پاس ویسے بھی بہت سی زمینیں ہیں۔“

اُس موقع پر پیر بھہ داس نے حیران و پریشان ٹنورل کے کانڈھے پر شفقت سے ہاتھ رکھا اور بڑے ہی شفقتانہ انداز میں پوتے سے کہا۔ ”ہاں سوہراج تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔“

ایسا نہیں ہے کہ سوہراج ابتدا ہی سے انقلابی تھا، وہ تو فقط غریبوں کا ہم درد تھا۔ متحرک طبیعت اُسے کچھ نیا کرنے کو آکسانی دیتی تھی۔

☆☆☆

مستقبل میں سرمایہ دارانہ مظالم کے خلاف سیدہ پلائی دیوار بن جانے والا سوہراج بچپن میں شرمیلا اور کم گو بچہ تھا۔ اُس کے والدین کو تعلیم کی اہمیت کا اندازہ تھا لیکن اُس وقت ”بندی“ میں کوئی اسکول نہیں تھا۔ ہاں، ساتھ والے گاؤں ”مٹی“ میں ایک اسکول ضرور تھا، سوہراج بھہ داس کے پوتے نے پانچ برس کی عمر میں حصولِ علم کے لیے گاؤں سے باہر قدم رکھا اور یوں 1925 میں سکھنے کا ایک ندرکنے والا سلسلہ شروع ہوا۔

ماں نے اپنے سپوت کے لیے اپنے ہاتھ سے ایک بستہ تیار کیا جس میں ننھے سوہراج کی کتابیں سا جاتیں، جو اُسے اُس وقت غیب سے در آنے والی عجب و غریب اشیاء معلوم ہوتی تھیں۔ اسی بستے میں ایک سلیٹ، قلم اور سیاہی ہوتی جس کی بوتل کا ڈھکن اگر ڈھیلا ہو تو وہ ضائع ہو جاتی اور سوہراج کے ساتھ تو اکثر ایسا ہی ہوتا تھا۔

اسکول گاؤں سے بڑبڑھ دو میل دور تھا، اور کم سن سوہراج کو علم کے پیچھے پاپیادہ جھانکنا پڑتا تھا۔ ہاں، کبھی بھھار نیل گاڑی یا گدھا گاڑی میں سفر کی سہولت میسر آ جاتی تو سوہراج کی عید ہو جاتی۔

یہ ایک صدی پڑانے اسکول کا ذکر ہے، جو آج کی جدید درس گاہوں سے بھرپور مختلف تھا۔ اساتذہ جہاں سزا دینے

سے لے کر آزاد تھے، وہیں اپنے طلباء کی تربیت کے معاملے میں بھی طاق تھے۔ اور استاد کے گھر کے لیے لکڑیاں اکٹھی کرنا باعثِ شرم نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ہر غم سے آزاد سوہراج نے بھی بچپن میں اپنے استاد کے گھر کے لیے دیگر ساتھیوں کی طرح لکڑیاں اکٹھی کیں۔

اُس کی ہمدردیاں ابتدا ہی سے محنت کشوں کے ساتھ تھیں۔ جب گاؤں کے ماسٹر جی لکڑیاں جمع کرنے کا حکم دیتے تو وہ غریب ہاریوں کے بچوں کے ساتھ لکڑیاں کاٹنے جنگل چلا جاتا۔ بڑا بھائی کیول رام ذرا ڈوبی راسم کا بچہ تھا۔ وہ محنت نہیں کرتا تھا۔ ایک دن اُس نے اپنے باپ ٹنورل سے چھوٹے کی شکایت کر دی۔ ”بابا، سوہراج ہاریوں کے بچوں کے ساتھ جنگل میں لکڑیاں کاٹنے جاتا ہے۔“

اُس موقع پر پیر بھہ داس نے اپنے ننھے پوتے سے کہا۔ ”اگر تمہارے ماسٹر کو ضرورت ہے تو میں لکڑیوں سے سوہراج نے مصیبت سے جواب دیا۔ ”مجھے تو اس کام میں مزہ آتا ہے!“

پانچویں تک تعلیم اپنی مادری زبان یعنی سندھی میں حاصل کی۔ سندھی کے ساتھ ساتھ سوہراج کی گھر کی پریمی خوب گرفت تھی۔ آنے والے وقت میں انگریزی زبان پر بھی یدِ طولی حاصل ہو گیا۔

پانچویں پاس کرنے کے بعد اس آزاد مٹش بچے نے قہر کا رُخ کیا جہاں اُسے دی ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا۔ اسکول گھر سے دور تھا سوہراج گنگ ہاؤس میں ڈیڑا ڈال لیا۔ راہ نما کا کردار تین سال بڑے کیول رام نے نبھایا۔

وہیں سوہراج ایک بیماری میں مبتلا ہو گیا، اور یہ تھی مطالعے کی بیماری!

سندھی زبان کی سب سے اُسے عشق تھا۔ اُس وقت تک دنیا کی اہم ترین تصانیف کے سندھی تراجم دستیاب تھے۔ اس میں مذہبی کتابیں، جاسوسی ناول اور کلاسیک ادب بھی شامل تھا۔ اسی زمانے میں سوہراج نے رامائن اور مہابھارت کی کہانیاں پڑھیں۔

ان دنوں ہندوؤں میں ایک مصلح مہاراج روچی رام تھیو رام کا چچا تھا جو فرسودہ رسم و رواج کے خلاف لکھتے تھے اور ایک رسالہ ”ہرم پرچاریہ“ نکالتے تھے۔ اس رسالے نے سوہراج کے خیالات پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

اُس کا حافظہ کمال کا تھا اور یہ قابلیت بڑھ چکے تھے

ساتھیوں کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں تھی۔ شام دھلنے کے بعد بچے اپنے قابلِ ساتھی کے گرد جمع ہو جاتے، مہابھارت اور رامائن کی کھاناٹنے کی فرمائش کی جاتی اور پھر رات کے خوش گوار پلوں کو سوچو کی آواز ہمیز کرتی۔ جلد اس داستان کو نے ساتھیوں میں مقبولیت حاصل کر لی۔

پڑھائی میں تیز سوچو لڑائی جھگڑے میں بھی آگے آگے رہتا۔ یہ فعال طبیعت ہی تھی جو اس کام پر آکسانی تھی۔ اگر کوئی اور نہیں ملتا، تو بڑے بھائی ہی سے دو دو ہاتھ کر لیتا۔ آزاد فطرت یہ بچہ خاصا منہ چھٹ تھا۔ دوسرے کے ”نک نیم“ رکھنے میں تو اُسے لگہ حاصل تھا۔

ایک روز قہر کے ایک ٹرانسپورٹر کے بیٹے کو سوہراج نے ”گھسے باز“ کہہ کر پکارا، تو ساتھیوں نے خوب قہقہے لگائے۔ بعد میں بچارے کا نام ہی ”گھسے باز“ پڑ گیا۔

اگلا شکار اساتذہ تھے۔ شرارتی سوہراج نے اپنے ٹیچر کو بھی عجیب عجیب نام دے رکھے تھے جن کی بڑبڑاز اداسی ساتھیوں کو شش ٹس لوٹ پوٹ ہونے پر مجبور کر دیتی۔ اور ایک دن اساتذہ تک یہ اطلاع پہنچ گئی۔ توقع کے عین مطابق خوب درگت بنی لیکن آزاد مٹش سوہراج تو سفر جاری رکھنے پر یقین رکھتا تھا۔

”سوہراج بد تمیز نہیں، بس اس کی طبیعت میں طراری ہے۔“ سرزنش کرنے کے بعد ایک استاد نے دوسرے سے کہا۔

دوسرے نے تائید کی۔ وہ سب قابلِ سوہراج کو پسند کرتے تھے۔ اس بچے میں کوکوں کو گرویدہ بنانے کی بھرپور صلاحیت تھی۔

☆☆☆

سفر سوہراج کی قسمت میں تھا۔

قصہ کچھ یوں ہے کہ اُس کے شفیق ہیڈ ماسٹر روچی رام شاہانی 1934 میں ریٹائر ہو گئے۔ اُن کی جگہ علی گڑھ سے آنے والے ایک استاد نے لی۔ نہ جانے کیوں ہندوؤں کے اُس استاد سے خائف تھے سو اکثریت نے نا مانگیریشن کروانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ فیصلہ سوہراج اور کیول رام دونوں کو لاڈ لگانے لگیا جہاں انہوں نے لاڈ لگانے ہائی اسکول میں داخلے کے لیے میٹ دیا۔ سوہراج تو پاس ہو گیا، لیکن شونی قسمت کیول رام کام یابی حاصل نہیں کر سکا۔

یہ ظاہر دونوں بھائیوں کی راہیں الگ ہونے کو تھیں پر قسمت کو کچھ اور منظور تھا۔

جب ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر کو اطلاع ملی کہ سوہراج مذہبی مزان کا حامل نوجوان ہے اور گرتھ، مہا بھارت اور رامائن کے علاوہ معلومات عامہ کے مضمون میں بھی خوب گرفت رکھتا ہے تو لاہوری محلے میں مقیم اہل طالب علم کو ہدایت کی کہ اپنے بھائی کے ساتھ بورڈنگ ہاؤس میں منتقل ہو جائے۔ یوں کیول رام کو سوہراج کی ذہانت کے طفیل ہائی اسکول میں داخلہ مل گیا۔

وہاں انگریزی کے استاد سوہراج پر بہت مہربان تھے جن کی لائبریری اس نوجوان کا مسکن بن گئی۔ مطالعے نے اُسے موثر جوڈو کے قریب کر دیا جس کا شمار سو پونچیا اور کریت کی طرح قدیم ترین تہذیبوں میں ہوتا ہے اور جسے مہر گڑھ کی نو ہزار سال قبل مسیح کی تہذیب کا تسلسل تصور کیا جاتا ہے۔

مستقبل کا کیونٹ اور سیکرل دانش ور اس زمانے میں بہت حساس تھا۔ کیفیت یہ تھی کہ مذہبی کتابیں پڑھتے ہوئے وہ آپ دیدہ ہو جاتا۔ شاید اسی حساسیت نے سنیا سی بننے کی راہ دکھائی۔

ایک دن گھر سے بھاگ کر سوہراج رادھا سوامی پنڈت کی شاخ کے ایک آشرم پہنچ گیا جہاں توحید پرست سنیا سی مقیم تھے جو شادی نہیں کرتے تھے۔

وہ خود کو آشرم کے ماحول سے ہم آہنگ کرنے میں بٹتا تھا کہ راجا چک اپنے والد کو رو پیا وہ خاموشی سے ہاتھ پکڑ کر اُسے اپنی زری ارضی پر لے گئے جو سا کیٹر کے رہنے پر پھیلی تھی۔ یوں وہ سنیا سی بنے بغیر واپس اپنے دادا کے پاس آ گیا۔

لاڑکانہ میں جن اساتذہ سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا، ان میں نمایاں ترین ہیڈ ماسٹر کرم چند بھگوانی تھے، جو سوہراج سے بہت شفقت برتتے تھے۔ جب ان کا تبادلہ لاڑکانہ سے این جے وی ہائی اسکول کراچی ہوا انہوں نے اپنے جیتے شاعر کو بھی وہیں بلوایا۔ اس شفیق استاد نے نہ صرف اسے اپنے گھر میں شہرہ کی سہولت دی بلکہ این جے وی اسکول میں داخلہ بھی کروا دیا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کی دو بھتیجیاں تھیں جو سوہراج کی ہم عمر تھیں، دونوں بہت ہی نٹ کھٹ، شوخ اور چٹل تھیں لیکن کتابوں میں کم سوہراج نے ان کی جانب توجہ نہیں دی۔

تنہائی پسند اس نوجوان میں عجیب کشش تھی۔ لوگ اس کی جانب کچھ چلے آتے۔ ایک دن اس نے ایک لڑکے کو اپنا

بیچھا کرتے پایا۔ رک کر اس کا مسئلہ دریافت کیا تو پتا چلا کہ وہ تو اس کی علیت کا دیوانہ ہو گیا ہے۔ بعد میں اُس نے محبت بھرا ایک خط اس کے نام لکھا۔

یوں سوہراج اور اس کی دوستی ہو گئی۔ وہ اس کے اہل خانہ سے بھی مل ل گیا۔ گھر سے دوری کا احساس جاتا رہا۔ اُس لئے سوہراج نے خود سے کہا۔ ”میں خوش نصیب ہوں کہ اچھے لوگ مجھے منتخب کر لیتے ہیں اور مجھے سے دوستی کرتے ہیں!“

☆☆☆

تیرہ برس کے سوہراج کو ایک روڈ کی نئے بھگت سنگھ کی تصویر پکڑادی۔ اس انقلابی کی فکر نے سوہراج کو اتنا متاثر کیا کہ وہ اس کی تصویر جب میں رکھ کر کھونٹے لگا۔ دراصل لاڑکانہ کے زمانے میں اس کا تعلق پرچی نامی ایک لڑکے سے قائم ہو گیا تھا جو انقلابی تبدیلیوں کے لیے تشدد پسندی کا حامی تھا۔ وہ دوران کلاس سوہراج کے کان میں بھگت سندھ، راج گرو اور سکھ دیو کے کارنامے سرگوشیوں کی صورت آٹھ پٹا رہتا۔ اُس زمانے میں ایک طرف مہاتما گاندھی اور جواہر لعل نہرو زندہ باد کے نعرے بھگتے تھے، دوسری طرف بھگت سنگھ زندہ باد کے نعرے بھی لگا کرتے تھے۔ ان دونوں چٹا گنگ کے انقلابیوں کا بھی ذکر رہتا تھا، جنہوں نے 1932 میں چٹا گنگ کے اسلحہ خانے پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا تھا۔

اُس وقت تک سوہجو (سوہراج) معروف اسکرال سوامی رام تیرتھی کہ ”ان دی روڈز آف گاڈ ریڈیشن“ پڑھ چکا تھا جس میں یہ پیغام دیا گیا تھا کہ سوشل ازم اور ہندومت میں کوئی خاص فرق نہیں۔ اسی طرح ایک کتاب ”سوشل ازم ان ہندومت“ بھی اس کے زیر مطالعہ رہی۔ دوسرے دوسرے اُسے نوجوان کارخان سوشل ازم کی جانب بڑھنے لگا۔ جلد ہی اُسے احساس ہو گیا کہ امارت اور غربت خدا کی طرف سے نہیں بلکہ انسانوں کی پیدا کردہ ہے۔

”اب مجھے عملی طور پر اس عمل کا حصہ بننا ہوگا!“ اُس نے فیصلہ لیا اور ”بائیکاٹ برش“ اور ”گویک سائن کمیشن“ جیسی تحریکوں میں یہ طور طالب علم بھر پور حصہ لیا۔

1937 میں سوہجو نے میٹرک کیا۔ موسمی قسمت، بڑے بھائی کیول رام امتحان میں کامیابی نہیں حاصل کر سکا۔ ”کیول زمین سنہالے گا اور سوہراج تم کالج جاؤ گے!“ والد نے حکم صادر کیا جو ان کی خواہش کے عین مطابق

ستمبر 2012ء

تھا۔ اب اس کے قدم ڈھلے سندھ کالج کی جانب بڑھ رہے تھے جہاں وہ شعبہ آرٹس میں تعلیمی مدارج طے کرنے کا حتمی فیصلہ کر چکا تھا۔

”میاں، طب کے شعبے کا انتخاب کرو، آرٹس میں کیا رکھا ہے۔“ اُس موقع پر ایک صاحب نے کہا۔

”اے جناب، مستقبل انجینئرنگ کا ہے، اس کا چناؤ کرو۔“ ایک اور خیر خواہ نے مشورہ دیا، لیکن دھن کا پکا سوہجو عمرانی علوم میں گرفت حاصل کرنے کا خواہش مند تھا۔

”میں تو فقط سیاست داں بننا چاہتا ہوں۔“ سوہجو نے یہ کہہ کر ناصحوں کو پٹ کر دیا۔ اس زمانے میں یہ نوجوان کانگریس کی فکر سے متاثر تھا اور گاندھی جی کی تقلید میں کھدڑی قمیض پہنا کرتا تھا لیکن جو شخص اس کی روح کو اپنی جانب کھینچتا تھا، وہ تو ”گیتا غبی“ کا خالق یوگور ہی تھا۔

بھوک اور غربت سے پاک معاشرے کا خواب دیکھنے والے سوہجو نے یوگور کو توجہ سے پڑھا۔ وہ دوستوں سے کہا کرتا تھا ”یہ کتابیں میرے لیے آسمانی مصحفیوں کی سی حیثیت رکھتی ہیں۔“

☆☆☆

1939 میں انٹرمیڈیٹ کا مرحلہ طے کرنے والے سوہجو کے سامنے ایک روز اُس کے ساتھی لکھو تلسانی نے ”شانتی نکتین“ میں پڑھنے کی خواہش کا اظہار کیا جسے سوہجو نے اپنے دل کی آواز خیال کیا۔

”تمہارے اس فیصلے کا سبب کیا ہے؟“ والد نے سوال کیا۔

”شانتی نکتین بہترین ہندوستانی اور مغربی روایات کا امتزاج ہے۔ وہاں ہوش ہے، دو فیکٹیاں ہیں۔ وہاں زندگی ہے!“ سوہجو نے احترام کے ساتھ اپنا نقطہ نظر پیش کیا۔

والد نے اجازت دے دی۔ سوہجو نے داخلے کے لیے خط لکھا۔ جواب نہارا!

اب کیا کیا جائے؟ اُس نے پرسنل کے نام ایک تار بھیج دیا۔

”جناب میرا کردار اچھا ہے، پڑھائی میں خوب ہوں، شانتی نکتین آنا چاہتا ہوں، پریکٹیکل ٹیسٹ پاس کرنے کے لیے تیار نہیں!“

چند روز بعد جواب ملا۔

”تمہارا داخلہ ہو گیا ہے۔ کراچی میں ہمارے نمائندے سے ملو، داخلے کی منظوری خود یوگور نے دی ہے!“

ماہنامہ سرگودشت

تار پڑھ کر سوہجو کی باچھیں کھل گئیں اور وہ سفر کی تیار یوں میں جُٹ گیا۔ اُس موقع پر شفیق چچا نے یہ کہہ کر اُس کی مخالفت کہ کلکتہ بہت دور ہے لیکن سوہجو نے بڑے بھائی کی سفارش کے طفیل بالآخر اجازت حاصل کر لی۔

اس برس شانتی نکتین جانے والوں میں لاڑکانہ کی دو لڑکیاں بھی تھیں۔ سوہجو ان سے ملا اور سفر کے انتظامات میں جُٹ گیا۔

ایک خوش گوار صبح ”کلکتہ ایکسپریس“ میں وہ 23 لڑکیوں اور ایک لڑکے گل چندر، ہم سفری میں شانتی نکتین کے لیے روانہ ہوا۔ تین دن کا سفر تھا اور وہ اس گروپ میں بیوپاری خاندان سے تعلق رکھنے والا واحد طالب علم تھا۔

پٹری پر دوڑتے ریل کے ڈبے میں دھیرے دھیرے اجنبیت کا احساس گھٹا گیا۔ اس کا لڑکیوں سے بھی مکالمہ ہوا۔ ان میں ایک لڑکی سندری، جو کسی زمانے میں سوہجو کی کلاس فیورہ چکی تھی، اس کے ہر سوال کا بڑی محبت سے جواب دیا کرتی تھی۔

گھر سے دور جانا آسان تو نہیں۔ موسم گرما میں تین دن کا سفر وہ آکٹاہٹ سے بھر پور تھا لیکن سرنگ کے اختتام پر روشنی تھی!

بالآخر وہ شانتی نکتین پہنچ گیا۔ اُس سحر انگیز علمی گوارے میں قدم رکھنے کے بعد ایک اور پریشانی نے اُسے گھیر لیا۔ دراصل کالج کو تین دن بعد کھلنا تھا۔ لڑکوں کا ہاسل خالی پڑا تھا۔ اُس تنہائی نے سوہجو کو خوف زدہ کر دیا۔ اُس رات وہ گھر کی یاد میں آپ دیدہ ہو گیا۔ اُس نے اپنے بڑے بھائی کو خط لکھا جس میں اداسی ہی اداسی تھی!

پریشانیوں کے اُن دنوں میں اس صبح مسرت نے من کے دروازے پر دستک دی۔

سوہجو کی جب آنکھ کھولی تو پورا ادارہ سُر لیے سازوں سے ترتیب دی جانے والی موسیقی سے گونج رہا تھا، کہیں بانسری بج رہی تھی تو کہیں ستار، یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے کائنات گنگنا رہی ہو۔

موسیقی کے اس سمور کن ماحول میں ایک بے چینی نے اسے آلیا۔ وہاں اُس کی دھڑکی جیسی سندھ کے سُر نہیں تھے۔ سوہجو چونکا۔ ”سندھ سے بھی طالبات شانتی نکتین آئی ہیں، پھر سندھی سُر کہاں گم ہو گئے؟“ یہ سوچتے ہوئے سوہجو لڑکیوں کے ہاسل کی جانب دوڑا۔

وہاں کچھ کر لاڑکانہ سے تعلق رکھنے والی ایک دوسرے

ستمبر 2012ء

69

68

69

سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی، جو چند ساعت بعد نیم لاس اس کے سامنے آن کرکڑی ہوئی، اور سو بھوسہ لگایا۔
”بہن، تم اس حالات میں، یہ کیا جا رہے، اور پھر یہاں سندھ کے سر کیوں نہیں گونج رہے؟“ سو بھو نے سوال کیا۔

لڑکی نے اُسے بتایا کہ اُن کا سامان غلطی سے واپس کلکتہ چلا گیا ہے، جس کی واپسی میں کچھ وقت لگے گا، اس لیے سندھ سے آنے والی طالبات ہاسٹل تک محدود ہو گئی ہیں۔
تب سو بھو کو سمجھ میں آیا کہ شانتی نکلین کی شانتی میں

سندھی سر کیوں نہیں۔
شانتی نکلین مخلوط تعلیمی ادارہ تھا جہاں چین، انڈونیشیا اور امریکا سے آنے والے طلباء بھی زیر تعلیم تھے۔ ابتدائی دنوں میں اداسی کا شکار رہنے والے سو بھو کو جلد اُس درس گاہ نے گرویدہ بنا لیا، جہاں صحیح بنگالی زبان میں قومی گیت گائے جاتے تھے اور اُس وقت پرادارے کے اساتذہ اور ملازمین کے بال بچے بھی طلباء کے ساتھ ہم آواز ہوتے تھے۔

وہاں سو بھو کے کئی نئے دوست بنے۔ ڈنڈر بیٹھک لگانے والے لڑکوں سے دوستی ہو گئی۔ جلد اس تحریک اور قابلِ نوجوان کو انگلش اسٹڈی سرکل کا جوائنٹ سیکریٹری بنا دیا گیا۔ یوں اُس میں روسی، جرمن اور فرانسیسی ادب پڑھنے کی چاہ پیدا ہوئی۔ جب اُس نے روسی ادب پڑھا تو اُسے اپنی زمین یعنی سندھ کے مسائل کے بے حد قریب پایا۔ انگریزی ادب کے استاد کے توسط سے انگریزی، فرنگ اور جرمن ادب کی گہرائی سے روشناس ہوا۔

ٹیگور نے وہاں سوویت یونین کا کیون سٹم متعارف کروا رکھا تھا۔ ہاسٹل میں سب کے لیے ایک سالکانا تیار ہوتا تھا اور سب یکساں سہولیات سے مستفید ہوتے تھے۔ اُس ماحول نے سو بھو کو بہت متاثر کیا۔

شانتی نکلین میں دو وسیع لائبریریاں تھیں، ایک طلباء کے لیے وقت تھی اور دوسری ٹیگور کے لیے مخصوص تھی۔ ٹیگور کو سب احترام سے ”گرو دیو“ کہتے تھے۔ کالج کے پرنسپل انیل چند ٹیگور کے پرنسپل سیکریٹری تھے۔ ایک دن گرو دیو نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”مومن جوڑو والے اُس لڑکے کو تو بلاؤ جس نے لکھا تھا کہ اُسے انڈونیزیا کے اعلیٰ داخلہ دیا جائے۔“ حکم صادر ہونے کے چند ساعت بعد سر جھکا کے سو بھو اُن کے کمرے میں داخل ہوا۔

اسے پتہ چلا کہ اس کی شخصیت کے مالک ٹیگور بنے سوال کیا۔

”بھئی تمہیں اس قدر یقین کیوں تھا کہ میں تمہیں داخلہ دے دوں گا؟“
نوجوان نے جواب دیا۔ ”کیوں کہ میں نے آپ کی تمام کتابیں پڑھی ہیں اور مجھے یقین تھا کہ آپ ٹیلنٹ کی قدر کرتے ہیں۔“

80 سالہ ٹیگور نے نوجوان سے اُس کا نام دریافت کیا پھر کہا۔ ”بھئی میرے ادارے میں تمہارا نام مومن جوڑو کا آدی ہوگا۔“

سو بھو خاموش رہا۔ گرو دیو کی شفقت نے اسے مسرت سے بھر دیا تھا، تاہم وہ نہیں جانتا تھا کہ آنے والے برسوں میں اُسے اسی نام سے یاد کیا جائے گا۔

سو بھو نے بی اے آنرز کے لیے پولیٹیکل سائنس، انکسلس اور سٹری آف انکسلس تھائس کے مضامین کا چناؤ کیا تھا۔ انگریزی لازمی تھی، جبکہ اختیاری مضمون کے لیے سندھی ادب کا انتخاب ہوا۔ اس وقت شانتی نکلین میں سندھی پڑھانے کا کوئی انتظام نہیں تھا لیکن ٹیگور کے اُس ادارے میں علم کی قدر ہی سب سے اہم اور مضبوط اصول تھا۔

مومن جوڑو کے آدی کے لیے کلکتہ یونیورسٹی کے پروفیسر کرشنو پلاپانی سے رجوع کیا گیا۔ وہ زمانہ تھی اور تھا۔ شفیق استاد کرشنو پلاپانی نے خود کو سندھی ادب تک محدود نہیں رکھا بلکہ قابلِ طالب علم کو فلسفہ بھی پڑھایا۔ وہ کیونٹ تھے اور مارکسی نظریات کی تعلیم میں سو بھو کے لیے مددگار ثابت ہوئے۔

☆☆☆

یہ 1940ء کا ذکر ہے۔ اُس زمانے میں 26 جنوری آزادی کے دن کے طور پر منایا جاتا تھا، کیوں کہ اُس روز 1928ء میں کانگریس پارٹی نے یوم آزادی کی قرارداد منظور کی تھی۔

طلباء نے فیصلہ کیا کہ وہ قومی آزادی کا یہ دن ضرور منائیں گے۔ واضح رہے کہ یہ دن منانے پر گرو دیو نے پانچ برس قبل پابندی عاید کر دی تھی۔ طلباء نے سو بھو کو آگے کر دیا کہ وہ ٹیگور سے اس بابت اجازت طلب کرے۔ ٹیگور کا سوسوں کو بہت ناپسند کرتے تھے اور انہیں یقین تھا کہ حکومت کو جب یہ خبر ملے گی کہ شانتی نکلین میں یہ دن منایا جا رہا ہے تو حکومتی اہل کار فوراً پینچ جائیں گے لیکن انہوں نے اپنے چیتے طالب علم کی بات مان لی۔

نوجوان سو بھو بہت خوش تھا۔ اجازت ملنے کے بعد وہ

تیاروں میں بٹ گیا۔ اور وہ قریب یادگار ثابت ہوئی کہ اسی روز اُس نے انگریزی میں زندگی کی پہلی تقریر کی۔ تقریر کے بعد جب وہ سینے میں شرابو نیچے اترا، تو آسٹریلیا اور امریکا سے آئے ہوئے اساتذہ نے اُس کا اندھا تھپ تھپایا۔ اُس موقع پر ہندوستان کے عظیم مصور نند لال بوس بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے بھی اُسے بہت سراہا۔ یوں کئی راتوں رات مومن جوڑو کا آدی بن الاقوامی آدی بن گیا۔

کیا ایک تقریر انسان کی قسمت بدل سکتی ہے؟ سو بھو کے لیے اس سوال کا جواب اثبات میں تھا۔

تقریب کے چند روز بعد ایک بنگالی لڑکے نے اُسے پیغام پہنچایا کہ چند ”کرائی کاری“ یعنی انقلابی اُس سے ملنا چاہتے ہیں۔ چائے خانے میں ملاقات ہوئی جہاں عملی جدوجہد سے جڑے سپاہیوں نے اس کی تقریر کو بہت سراہا اور ”بلب پور“ میں معروف کرائی کاری، پنالال داس کپتا کے ساتھ کھانا کھانے کی دعوت دی۔

کچھ گزر گزرنے کی خواہش میں جتلا بارش میں بھیکتا سو بھو ایک ساتھی کے ساتھ مقررہ وقت پر بلب پور پہنچ گیا۔ اور اُس انسان سے ملا جس نے حقیقی معنی میں اُسے سوشل ازم کی راہ دکھائی۔ ملاقات میں پنالال سے سو بھو کی طویل گفتگو ہوئی۔ اس کرائی کاری نے نوجوان کو ٹرانسکی کی مشہور زمانہ کتاب ”روسی انقلاب کی تاریخ“ پڑھنے کا مشورہ دیا۔ اُسی عرصے میں سو بھو نے گاندھی، نہرو اور بوس کو بھی پڑھا۔

سیاسی نظریات دھیرے دھیرے پروان چڑھتے رہے۔ اب اُس نے آزادی کو اپنا نصب العین بنالیا تھا۔

☆☆☆

مطالعے میں غرق رہنے والے اُس نوجوان نے سیاست میں قدم رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا، اب دیگر نوجوانوں کی طرح اُسے محبت کے تجربے سے گزرنے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ وہ لڑکیوں سے گفتگو کرتے ہوئے صرف کام کی باتوں تک محدود رہتا تھا اور غیر ضروری دوستیاں کاٹنے سے اجتناب کرتا۔

پھر ایسا ہوا کہ صوبہ پنجاب سے شانتی نکلین آنے والی ایک لڑکی اُس کے پیچھے پڑ گئی۔

قصہ کچھ یوں ہے کہ برسات کا موسم تھا اور بارشوں میں کلکتہ کے ہاسٹل کے خطرے کے پیش نظر جوتے پہننے سے اجتناب برتتے تھے۔ بارشوں میں وہاں ہر شخص چپل پہننے نظر آتا۔

مئی 1861ء میں کلکتہ میں پیدا ہونے والے ٹیگور کا پورا نام شاہر رابندر ناتھ تھا۔ مصوری اور موسیقی پر گرفت رکھنے والے اُس نوبل انعام یافتہ ادیب نے کلکتہ میں 1921ء میں ”شانتی نکلین کالج“ کی بنیاد رکھی تھی، جو درحقیقت اُن کے والد کے مشن کا تسلسل تھا، جنہوں نے ایک آشرم کی صورت میں سلسلہ شروع کیا تھا۔ ٹیگور دراصل صحت مند روایات کے پرستار اور جدید علوم کے حامی تھے۔ وہ قدامت پرستی کو ترقی کی راہ میں رکاوٹ گردانتے تھے۔

پھر ایک روز شریر لڑکیوں نے دیکھا کہ بارش میں ایک لائق نوجوان جوتے پہنے ہوئے بڑے بڑے ڈگ بھرتا ہوا اُن کے سامنے سے گزر رہا ہے۔

وہ شریف انسان سو بھو بھی تھا۔ لڑکیوں نے اُسے چھیڑنا شروع کر دیا، چند ہٹلے بھی کسے۔ اُس نے بھی جھوٹا سا جواب دے دیا۔

گروہ میں شامل ایک لڑکی کے بہت ہنس محسوس کی۔ جھٹ سے جا کر پرنسپل سے سو بھو کے جنگلی پن کی شکایت کر دی۔ پرنسپل جانتا تھا کہ سو بھو عشق و عاشقی سے دور رہنے والا شریف لڑکا ہے۔ اس موقع پر اُس نے سو بھو کا دفاع کیا۔

بعد میں ایک دو بار اس لڑکی سے سو بھو کا سامنا ہوا، وہ خشکیں لگا ہوں سے کھوری رہی اور سو بھو نے خاموش رہنے میں عاقبت جانی۔

ایک روز لاہور پری سے باہر نکلتے ہوئے سو بھو کو لاڈکانہ کی ہم جماعت سندھی شرن شوداسا مل گئی۔ وہ عمر میں سو بھو سے بڑی تھی اور نہیں جانتی تھی کہ اُس کی منگی شانتی نکلین آنے سے قفل ہی ہو چکی ہے۔

اُس نے ایک ادا کے ساتھ کہا۔ ”تم صرف پڑھتے رہتے ہو، مجھے تو یک سر بھلا بیٹھے۔“

سو بھو نے اس شکایت کو بہت سنجیدگی سے لیا اور اپنی ہم زبان کو ایک درخت کے نیچے کر بیٹھ گیا۔ روانوی گفتگو کیا ہوئی تھی، وہ بھلا مانا اُسے سیاست پر بھگدڑ دینے لگا۔

دلچسپ امر یہ ہے کہ محنت رائگاں نہیں گئی۔ سندھی بہت متاثر ہوئی۔ بعد میں وہ اس عالم فاضل نوجوان سے چٹ ہی گئی اور ہر محاذ پر نہتوں کی طرح اُس کا

دفاع کرنے لگی۔

یہ انقلاب ہی کی کشش تھی کہ سندری سوہجو سے بھی پہلے ”کمیونٹ انڈیا موومنٹ“ میں اپنے خاندان کے ساتھ جیل چلی گئی۔ یہ الفاظ دیگر، سوہجو ایک اچھا استاد اور وہ ایک قابل طالبہ ثابت ہوئی۔

☆☆☆

لاہوری میں ڈیرا ڈالنے والے سوہجو کی لاہوریوں سے اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ ایک دن اُس نے رازدارانہ انداز میں اُسے بتایا۔ ”میاں یہ لاہوری تو کچھ بھی نہیں، اصل لاہیری تو گردو دیو کی ہے۔“

یہ سنتا تھا کہ سوہجو کے من میں آگ سی لگ گئی جس کی تپش ہرگز رتے لمبے کے ساتھ بڑھتی گئی۔ اس شخص میں پرنسپل اینٹل چندا سے سفارش کی۔ انہیں نے بڑے احترام کے ساتھ ٹیکور کے سامنے قابل طالب علم کی خواہش کا اظہار کیا۔ ”ٹھیک ہے۔“ گردو دیو نے کہا۔ ”بس، میرے کمرے میں مت جائے، باقی کمرے موئن جوڈو کے آدمی کے لیے کھلے ہیں۔“

گردو دیو کی لاہیری تو علم کا خزانہ تھی۔ ایک نیا جہان اب موئن جوڈو کے آدمی کے سامنے تھا۔

اُس عرصے میں پنا لال داس گیتا اور دیگر انقلابیوں سے بھی ملاقات رہی۔ انفرض شانتی نلتین میں گزرنے دو برسوں میں اسے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ وہ سوہجو کی زیست کا سب سے خوش گوار دور تھا۔

اسی عرصے میں سوہجو کو بھائی کا ٹیلی گرام ملا کہ اُس کی شادی کی تاریخ 25 اپریل 1941 طے کی گئی ہے، سو وقت پر پہنچ جائے!

دراصل کمسنی ہی میں چودہ سالہ لڑکی لیلا سے اُس کی منگی کر دی گئی تھی۔ اُس نے یہ خبر اپنے ساتھیوں کو بھی دی۔ لڑکوں نے مبارک باد دی، چند نے شرارت سے ٹھوکے بھی دیے۔ لڑکیوں نے بھی اُسے اچھے مستقبل کے لیے دعائیں دیں، البتہ چند ل بہت اُداس تھے۔ خصوصاً کیرالا کی ایک لڑکی لیلا اپنن، جو سوہجو کے بہت قریب تھی اور انکس سرکلی کی جوائنٹ سیکرٹری تھی۔

شادی کی خبر سن کر وہ سوہجو کے پاس آئی۔ ”سوہجو ہم نے سنا ہے کہ تمہاری منگی ہو چکی ہے اور شادی ہونے والی ہے، کیا بھی تم اُس لڑکی سے ملے ہو؟“

سوہجو نے جواب دیا۔ ”نہیں، ہمارے یہاں یہ رواج

نہیں۔“

اُس لڑکی کو یہ سن کو صدمہ ہوا۔

”اُس کا نام کیا ہے؟“ لیلا اپنن نے سوال ہے۔

”وہ تمہاری ہم نام ہے۔“ سوہجو مسکرایا۔ ”لیلا ہے اُس کا نام۔“

یہ سن کا کیرالا کی اس سندری نے قہقہہ لگایا۔ پھر کہا۔

”مجھے یقین ہے تم خوش رہو گے۔ میں تمہارے لیے خوش ہوں۔ میں تمہیں خط لکھوں گی۔“

درس گاہ سے رخصتی کے وقت طریقہ کار کے مطابق ایک استاد نے ہر فارغ التحصیل طالب علم سے یہ سوال کیا کہ اُس نے شانتی نلتین سے کیا حاصل کیا؟

سوہجو نے اپنی باری پر جواب دیا۔ ”میں بچے کی حیثیت سے یہاں آیا تھا اور آدمی بن کر جا رہا ہوں!“ اور حقیقت یہی تھی کہ موئنٹ سیکنے کی خواہش لیے اس درس گاہ کا رخ کرنے والا نو جوان انقلابی بن کر لوٹ رہا تھا۔

شانتی نلتین ہی میں اس نو جوان کی سوین ٹھا کر بھی ملاقات ہوئی تھی جو کمیونٹ پارٹی کا بڑا ناقد تھا۔ ٹھا کر نے سوہجو کو لاڑکانہ واپسی سے قبل ٹھٹھ میں ملاقات کرنے کی تاکید کی تھی۔ سو واپسی میں نو جوان نے تین دن ٹھا کر کے ہاں قیام کیا۔ اس دوران جاسوس اس پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھے

در اصل حکومت کو اندازہ ہو گیا تھا کہ آنے والے وقتوں میں یہ لڑکا اُن کے لیے مسائل کا سبب بن سکتا ہے۔

☆☆☆☆☆

دھوم دھام سے سوہجو کی شادی ہوئی، اور جیلی بار کیس سالہ اس نو جوان نے اپنی شریک حیات کو دیکھا جس سے پندرہ برس کی عمر میں اُس کی منگی طے کر دی گئی تھی۔ وہ ایک خوش گوار تھ!

شادی کے پانچ دن بعد اُسے لیلا اپنن کا خط ملا۔ اُس نے لکھا تھا۔ ”ہمارے دوست سوہجو کی شادی لیلا نامی خوب صورت لڑکی سے ہو گئی ہے، جو بھینٹا نہیں ہے!“

سوہجو بیوی اُس سے سات برس چھوٹی تھی۔ وہ چار جماعتیں پڑھی ہوئی تھی، جو اس زمانے میں بہت تصور کیا جاتا تھا۔ اس باہمت عورت نے ہر موڑ پر اپنے انقلابی شوہر کا ساتھ دیا۔ سوہجو کو خوش قسمت تصور کرتا تھا کہ اُسے لیلا جیسی اچھی شریک حیات ملی۔

☆☆☆

1941 میں سوہجو نے کراچی کا رخ کیا جہاں قوی

تحریک آزادی زوروں پر تھی۔ مورخین کے مطابق یہ قصبہ انھارویں صدی کے اوائل میں کلاچی کے نام سے وجود میں آیا تھا اور اس معمولی مادی گیرستی کو انگریزوں نے تجارتی نقطہ نگاہ سے بندرگاہ بنا دیا۔

سوہجو نے ایسی سی شاہانی لا کالج (سندھ مسلم کالج) میں داخلہ لے لیا۔ اسی زمانے میں اس کا تعلق ”کراچی اسٹوڈنٹس یونین“ سے پیدا ہوا جو آل سندھ اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے منسلک تھی اور نیم سوشلسٹ نظریات کی حامی تھی۔

سیاسی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ طلبہ کی راہ نمائی حشو کیول رامانی کر رہا تھا جو اُن دنوں جیل میں تھا۔ وہ ترقی پسند اور سامراج دشمن نو جوان تھا۔ لندن سے آنے والے اس انقلابی نے آزادی کے تعلق سے جذباتی پمفلٹ شائع کروایا تھا۔ اُس پوسٹر کی اشاعت کی یاداش میں انگریزوں نے اُسے دو سال کی سزا سنائی تھی جو اکتوبر 1941 میں مکمل ہوئی۔ یوں سوہجو کی حشو سے ملاقات ہوئی۔ جلد ہی دونوں دوست بن گئے۔ دونوں کے درمیان ترقی پسند ادب کا موضوع زیر بحث رہتا۔

سوہجو نے حشو کے ساتھ اندرون سندھ کا طوفانی دورہ کیا۔ اُس وقت ”سندھ اسٹوڈنٹس فیڈریشن“ حشو کے زیر اثر تھی۔ اُس نے اپنے دوست کا ہر مقام پر پھر پور تعارف کروایا، یوں سوہجو کوئی شناخت ملی۔ جلد ہی اسے فیڈریشن کا سیکریٹری منتخب کر لیا گیا۔

یہ عہدہ سوہجو کے لیے بہت اہم تھا۔ اُس نے تنظیم کو مضبوط و منظم کرنے کا بیڑہ اٹھالیا اور اس ضمن میں اسٹڈی سرگروہ کا سلسلہ شروع کیا۔

متحرک سوہجو خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ حکومت کی اس نظر تھی۔ وہ جہاں جاتا، سادہ لباس والے اہل کار اُس کا تعاقب کرتے ہوئے پہنچ جاتے، جو اگر اتفاقاً اُس کے سامنے آجاتے تو بھجوزے انداز میں اُلٹعلق نظر آنے کی اداکاری کرنے لگتے جس پر سوہجو مسکرا دیتا۔

ابھی وہ ایل ایل بی کے فائنل امتحان کی تیاریوں میں جٹا تھا کہ انگریز سرکار کے خلاف ”ہندوستان چھوڑ دو تحریک“ شروع ہو گئی۔ وہ ایک عزم کے ساتھ تحریک میں شامل ہو گیا۔ یوں ایل ایل بی کا معاملہ کھٹائی میں بڑ گیا۔ اُس زمانے میں انگریز کامریڈوں سے بھی سوہجو کا تعلق رہا جو ”برٹش کمیونٹ پارٹی“ کے ممبر تھے اور سندھ میں مول روٹ کی حیثیت سے ملازمت کیا کرتے تھے۔ ان دنوں سوہجو مٹھا

رام ہاسل میں مقیم تھا جہاں ان افراد سے ملاقات رہتی۔

☆☆☆

فروری 1942 میں پنڈ میں ”آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن“ کی کانفرنس ہوئی۔ سوہجو کی سربراہی میں سندھ کے طلبہ نے کانفرنس میں شرکت کے لیے رخصت سفر باندھا۔ انہوں نے یہ راستہ لاہور سفر طے کیا۔ لاہور میں پنجاب اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے دفتر میں چند روز قیام کیا۔ وہیں اُس کی اندر کار کجرا ل (بعد میں کجرا ل نے ہندوستانی سیاست میں بہت نام کمایا اور صدر کا عہدہ حاصل کیا) سے ملاقات ہوئی جس نے سوہجو کو بتایا کہ کمیونٹ پارٹی کی لائن تبدیل ہو رہی ہے۔ جو کمیونٹ جیلوں میں قید ہیں، انہیں انگریز رہا کر دیں گے، اس لیے آپ بھی اپنا احتجاج ملکا کریں۔

سوہجو طالب علموں کو کمیونٹ پارٹی کی پُرانی لائن پر چلا رہا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ جنگ عظیم دوم فاشسٹوں اور سامراجیوں کے درمیان لڑی جانے والی جنگ تھی۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ جنگ عوامی جنگ میں کیسے تبدیل ہو سکتی ہے جس کا تقاضا کمیونٹ پارٹی کر رہی تھی۔

خیر، طلبہ کا وفد ٹھٹھ پہنچا۔ سوہجو نے اپنی درس گاہ شانتی نلتین کی بھی زیارت کی۔ پانی کی تبدیلی کے باعث اُسے ٹائی فائڈ ہو گیا، جس کے سبب سوہجو چندوں کی تاخیر سے پنڈ پہنچا۔ پنڈ میں سجاد ظہیر کمیونٹ پارٹی کے نمائندے کے طور پر موجود تھے، جنہیں نئے پالیسی کے تعلق سے نو جوانوں کو مطمئن کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔

جب سوہجو پہنچا اس وقت تک اسٹوڈنٹس کانفرنس میں قرارداد پاس کی جا چکی تھیں۔ وہاں سجاد ظہیر، میاں افتخار اور مقیب الدین فاروقی تقاریر کر رہے تھے جنہوں نے طے کر لیا تھا کہ تمام کمیونٹ جیلوں سے نکل جائیں گے اور پارٹی لائن بدل کر دوسری جنگ عظیم میں انگریزوں کا ساتھ دے گی۔

اُس موقع پر سوہجو نے یہ موقف اختیار کیا کہ وہ کراچی جا کر اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے مشورہ کرنے کے بعد ہی کوئی فیصلہ کر سکتا ہے۔ ”اگر طلبہ کی اکثریت نے ساتھ دیا تو ہم بھی کمیونٹ پارٹی کا ساتھ دیں گے، ورنہ انگریزوں کے ساتھ لڑنے کی پُرانی لائن پر چلا جائے گا۔“ اُس نے واضح گاف الفاظ میں کہا۔

خیر، پنڈ کانفرنس میں آزادی کے حق کے لیے نعرہ بلند کیا گیا، جس کے بعد ہندوستان کے مسلم اکثریتی علاقوں میں خود مختاری کی تحریک شروع ہو گئی۔ سوویت

پارٹی نے اس لائن کی جزیرو مخالفت کی۔ اس تعلق سے چند برس بعد 1946ء میں "نیوز ٹائمز" نے بھی یہ سوال اٹھایا کہ "کیونٹ معلوم نہیں کیوں، مذہبی نعروں کے تحت ایک ملک کی حمایت کر رہے ہیں۔"

خیر، پندرہ سے واپسی پر سوہجو نے اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے دیگر ارکان کے سامنے کیونٹ پارٹی کی پیش کش رکھی۔ فیڈریشن نے انگریزوں کے خلاف لڑنے کے حق میں فیصلہ دیا۔ لہذا طلباء تحریک میں تیزی لانے کا اعلان کر دیا گیا۔

دوسری جانب حکومت کراچی کے طلباء سے تنگ تھی۔ بالآخر انھوں نے اُن کے بدعاش لیڈر، یعنی سوہجو کی گرفتاری کا فیصلہ کر لیا۔ اُس کے خلاف وارنٹ نکل گیا۔ وہ بھی تیار تھا، فوراً انٹر گراؤنڈ چلا گیا۔ البتہ اس کریک ڈاؤن میں بڑے پیمانے پر طلباء و طالبات گرفتار ہوئے۔

جیل بہت ہی عجیب مقام ہوتا ہے، وہاں تنہائی اور اذیت انسان کو توڑ دیتی ہے اور وہ اپنے نظریاتی فیصلوں کو حقائق تصور کرنے لگتا ہے۔

میری معاملہ جیل میں قید طلباء و طالبات کا بھی تھا جو جیل سے سوہجو کو پیغامات بھیجتے تھے "تمہیں شرم آتی چاہیے، ہم جیل میں ہیں اور تم باہر میٹس کر رہے ہو!" انہیں معلوم نہیں تھا کہ بے چارہ سوہجو باہر کن مشکل حالات میں کام رہا ہے۔

دوسری جانب سوہجو کی گرفتاری کے لیے حکومت اوجھے ہتھکنڈوں پر تڑپا آئی۔ جیل میں طلباء پر تشدد ہونے لگا جس کے پیش نظر بالآخر سوہجو نے گرفتاری دینے کا فیصلہ کر لیا۔

☆☆☆

25 جنوری 1943ء کو اُسے مٹھارام ہوٹل، کراچی کے ٹینس کورٹ سے تقریر کے دوران، شریپندی کے الزام کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔ خیر، بنیادی سبب تو "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک میں اُس کی فعال شمولیت تھی۔ اُس وقت اُس کی عمر 23 برس تھی۔

کورٹ سے اس "بدعاش" کو پڑھ برس کی سزا ہوئی۔ اس زمانے میں ترقی پسندوں کے لیے جیل تربیت گاہ کی مانند تھی، سوہجو کو کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔

جیل کی پہلی باتر ادھسپ رہی۔ گرفتاری کے بعد پولیس مارکیٹ کے ایک تاریک اور گندے لاک اپ میں ایک ہفتہ گزارا۔ گرفتار ہونے والوں میں لڑکیاں بھی شامل تھیں اور کل گرفتار شدگان کی تعداد ستر تھی۔ بیش افراد کو دوسرے دن

رہا کر دیا گیا، لیکن سوہجو کو سات دن تک قید میں رکھا گیا۔ اُسے جیل بھیج دیا گیا جہاں اُسے نہا جو کر غلاط سے نجات حاصل کرنے کا موقع ملا۔

جیل میں نو جوان سوہجو زیادہ وقت مطالعے میں صرف کرتا تھا۔ جیل افسر کا نام اکبر مرزا تھا جو بہت دلچسپ انسان تھا۔ اُس نے جب سوہجو کے بیک میں "ٹینس" کی تصانیف دیکھیں تو انہیں غیر قانونی کہتے ہوئے ضبط کرنے کا حکم جاری کر دیا۔

غصیل سوہجو نے جواب میں کہا، "تم اس کا حق نہیں رکھتے، صرف کراچی کا کمشنر کتابوں کو سیز کرنے کا حق رکھتا ہے!"

اُس وقت تو جیل افسر کچھ نہیں بولا، بعد میں سوہجو اپنے دفتر بلوایا اور کہا، "خواہ مخواہ شوڑ کیوں بچاتے ہو۔ کتاب میرے دفتر میں رہی گی۔ جب ایک قسم کرو، تو دوسری جاؤ۔ اس طرح کتاب پڑھنے کا سلسلہ جاری رکھو۔"

اور سوہجو نے ٹینس کو پڑھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ ٹینس کی تصانیف کی کل تعداد 54 ہے، اور ہر کتاب ضخیم اور دراز ہے، پر سوہجو کو کوئی عام انسان تو تھا نہیں، اُس نے مختصر عرصے میں ٹینس کی تمام تصانیف چاٹ ڈالیں۔

جیل ہی میں سوہجو کی ملاقات کا گھریسی لیڈر رہا۔ اس سے ہوئی جن کے تعاون سے متحرک سوہجو نے جیل میں اسٹڈی سرکل کا سلسلہ شروع کیا۔ سکھر جیل میں گزرے دن، میں اُس کے سرکل کے ارکان کی تعداد ساڑھے چار سو تھی۔ تجاؤز کرنی جس میں شامل تمام ارکان کا گھریسی تھے اور ایک سوہجو کیونٹ تھا۔ پھر اُسے حیدر آباد جیل منتقل کر دیا گیا جہاں اُس نے اسٹڈی سرکل کی سرگرمیاں جاری رکھیں۔

جولائی 1944ء میں سوہجو رہا ہوا لیکن یہ تو گرفتار ہونے کے سلسلے کا آغاز تھا۔ بعد کے برسوں میں جیل باتر کا سلسلہ جاری رکھا۔ وہ کل چھ بار جیل گیا۔ یوں اُس نے نو جوانی کے دس بقیہ برس جیلوں میں سڑتے گزارے۔ بعد کے برسوں میں اُسے پانچ برس اپنے گاؤں میں نظر بند بننے کی اذیت بھی سہی پڑی۔

سوہجو "ایچی ٹیشن" کے بجائے "ایچی کشن" وار سیاست کو اہمیت دیتا تھا۔ اُس کے نزدیک جیل جانے کی سیاست زیادہ پینڈہ نہیں تھی۔ سوہجو کا خیال تھا کہ جیل جانے کے کیونٹوں کے سیاسی شعور میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آتی۔ اس کے برعکس اسٹڈی سرگرمیوں زیادہ سودمند ثابت ہوتے ہیں۔

اسی سبب اُس نے حتی الامکان جیل سے بچنے کی کوششیں کیں، جو بڑی حد تک ناکام رہیں۔

☆☆☆

1945ء میں "شاہی کلین" سے فارغ التحصیل اس نو جوان نے کیونٹ پارٹی آف انڈیا میں شمولیت اختیار کر لی۔ دوسروں پر تنقید کرنے والے، احساس برتری میں مبتلا سوہجو کو جلد اپنی عقلی طبیعت اور اس کے نتیجے میں سرزد ہونے والی غلطیوں کا احساس ہو گیا، اور اس نے دوسروں پر تنقید کرنے کا سلسلہ کم سے کم کر دیا۔ اُسی زمانے میں اُس نے "ڈیل کارٹیک" کی مشہور زمانہ کتاب

How to Win Friends and Influence People پڑھی، جس نے اُسے نئے لوگوں سے دوستیاں کرنے کی مہارت عطا کی، جو آنے والے وقتوں میں اُس کے بہت کام آئی۔

اُس زمانے میں جمال الدین بخاری کیونٹ پارٹی کے سیکریٹری تھے۔ جو یہاں کے نہیں تھے، انہیں تحریک اور پارٹی کے امور چلانے کے لیے ہندوستان سے بھیجا گیا تھا اور وہاں بیوی کے ساتھ دفتر میں رہا کرتے تھے۔ وہ بہت سختی اور سیکھے ہوئے انسان تھے، انہوں نے سوہجو کو بڑے بھائی کی حیثیت سے بھرپور راہنمائی کی۔

پہلی جیل باتر کے بعد سوہجو نے خود کو کیونٹ پارٹی سے منسلک اور ڈی یونین مگر کیوں کے لیے وقت کر دیا تھا۔ اُسی زمانے میں سوہجو کی ملاقات سندھ کی معروف شخصیت جی ایم سید سے ہوئی۔ پہلی ملاقات کے موقع پر جی ایم سید نے سوہجو سے کہا تھا، "تم کیونٹ لوگ عوام کے دماغ کو اپیل کرتے ہو مگر میں ہمیشہ عوام کے جذبات کو اپیل کرتا ہوں۔"

سوہجو نے احترام کے ساتھ جواب دیا، "جناب! ہم نہ صرف عوام کے دماغ کو اپیل کرتے ہیں بلکہ اُن کے پیٹ بھی اپیل کرتے ہیں۔"

کامریڈ سوہجو نے 1946ء میں ہونے والی رائل انڈین آری بٹاؤت کی بھرپور حمایت کی تھی جس کی پاداش میں اُسے دوسری بار جیل جانا پڑا۔

سوہجو کو اپنی دھرتی یعنی سندھ سے پیار تھا۔ وہ ہمیشہ رہنا چاہتا تھا۔ دوسری جانب ملکی حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ بالآخر 14 اگست 1947ء ہندوستان دو حصوں میں

تقسیم ہو گیا اور پاکستان مرحض وجود میں آیا۔ اسی زمانے میں سوہجو کو اپنے پیارے دادا کی جدائی کا کرب سہتا ہوا جن کا انتقال سین قیام پاکستان والے روز بڑے ہی عجیب انداز میں ہوا۔ بستر پر دراز اُس کے دادا نے جب توپیں واغشیں کی آوازیں سنیں تو آنکھیں کھول کر دریافت کیا، "یہ آوازیں کسکی ہیں؟"

سوہجو کے بڑے بھائی کیول رام نے کہا، "بابا انگریز جارہے ہیں۔"

دادا نے کہا، "اچھا!" اور اپنی آنکھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر لیں۔

تقسیم کے مسئلے پر کیونٹ پارٹی میں واضح اختلاف پایا جاتا تھا، سوہجو جانتا تھا کہ برصغیر کی تقسیم کے سوا کوئی چارہ کار نہیں۔

خیر، اگست 47ء میں مہاجرین کی آمد شروع ہوئی تھی اور سندھ میں مقیم ہندو خاندانوں نے ہندوستان کے لیے رخت سفر باندھ لیا تھا۔

سوہجو کے اہل خانہ بھی تقسیم کے بعد پاکستان میں رہنے کے خلاف تھے لیکن زمین کے عشق میں مبتلا سوہجو اڑ گیا۔ اُس نے اپنے بھائی سے کہا، "جب تک تمہارا بیوی کلہاڑی اٹھا کر تم سے یہ نہ کہے کہ یہاں سے چلے جاؤ، تم نہیں جانا۔ اور جہاں تک میری بات ہے، میں پاکستان ہی میں رہوں گا۔"

بعد ازاں ایسا ہی ہوا۔ ہندی میں ریاست راجپوتانہ کے چند لٹے پٹے مہاجر لائیں لے کر آگئے اور اُن کے اہل خانہ سے یہاں سے چلے جانے کے لیے کہا۔ سوہجو کے بڑوں نے انہیں سمجھا کہ یہاں کئی گھر خالی پڑے ہیں، آپ وہاں رہ سکتے ہیں۔ وہ بھی شریف لوگ تھے، ساتھ والے گاؤں میں چلے گئے۔

خوش قسمتی سے سندھ میں ہندو مسلم فسادات بڑے پیمانے پر نہیں ہوئے۔ اور جو تھوڑے بہت واقعات ہوئے بھی تھے، سوہجو اُن کے لیے اردو اور انگریزی کے موقر اخبارات کو قصوروار ٹھہراتا تھا۔

ایک دن اُس نے اپنے ساتھی کامریڈ سے کہا، "یہ لوگ ہندوؤں کے خلاف سُرخیاں لگاتے ہیں۔ جن ہندوؤں نے پاکستان کے ساتھ رہنا منظور کیا ہے، انہیں بے وجہ شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، اُن کے بارے میں کہا جاتا کہ یہ بھارت کے ایجنٹ ہیں۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی بھلا؟"

سوجھو کہ اس بات کا ذکر تھا کہ اس جیسے پڑے لکھے شخص کے متعلق، جو ٹیگور کا شاگرد رہ چکا ہو، قیام پاکستان کو سپورٹ کرتا ہو، ہندو مسلم بھائی بھائی کے نعرے لگاتا ہو، عجیب و غریب باتیں کی جارہی ہیں اور یہ سوال اٹھایا جا رہا ہے کہ وہ پاکستان میں رہنے کی ضد کیوں کر رہا ہے۔
خیر، سوجھو نے ہر الزام برداشت کیا لیکن اپنا وطن چھوڑنے سے انکار کر دیا۔

سوجھو نے پاکستان میں رہنے کا فیصلہ ضرور کیا تھا، تاہم اپنے نظریات سے دست بردار نہیں ہوا تھا۔ آزادی کے زمانے میں اُس نے ٹریڈ یونینز میں عملی طور پر کام کیا۔ کراچی سٹی ورکرز یونین سے وابستگی کے زمانے میں اُس کے نام کے ساتھ ”کامریڈ“ کا سابقہ لگا جو آج تک برقرار ہے۔ سوجھو نے بے زمین ہاریوں میں زمین کی مفت تقسیم کے لیے اُن تھک کام کیا۔ قیام پاکستان کے بعد اُس نے ”ہاری لائی تحریک“ کے ذریعے حکومت سے مطالبہ کیا کہ متروکہ اراضی کا ایک مخصوص حصہ بے زمین ہاریوں کو لٹا دیا جائے۔ اس تحریک کو کامیابی کی اور لاکھوں ایکڑ اراضی بے زمین کسانوں میں تقسیم کی گئی۔ مزدور دوست سرگرمیوں کا نتیجہ اعلیٰ گرفتاری کی صورت سامنے آیا۔ نیوی بغاوت کیس میں کے ہانگل، علی احمد اور سوجھو گیکان چندانی کو گرفتار کیا گیا۔ یوں تقسیم کے بعد یہ محبت وطن مزید چار برس جیل میں رہا۔ 17 اپریل 1948ء کو گرفتار ہونے والے سوجھو کو 52ء میں رہائی نصیب ہوئی۔ ”سوجھو گیکان چندانی بدنام کارکن“ پاکستان کے تمام کورس میں جانا پچھتاہیں ہے۔

وہ سوجھو کے لیے بہت ہی اذیت ناک لمحات تھے۔ اُسے طعنہ دیا گیا کہ وہ ہندو ہے، اُس کا وطن لاڈکانہ نہیں ہندوستان ہے! پر اُسے تو لاڈکانہ سے عشق تھا، وہ یہ زمین کیسے چھوڑتا؟

اُس موقع پر چند اعلیٰ عہدے داروں نے اُسے پیش کش کی کہ وہ قیدیوں کے تبادلے میں ہندوستان چلا جائے۔ جواب میں اُس مرمر مجاہد نے کہا۔ ”میں تو یہاں کا پیدا کی ہوں، سنبھل کا باشندہ ہوں، میں کیوں جاؤں؟“

جب اُس نے انکار کر دیا تو اُسے قانونی طریقے سے ہندوستان بھجوانے کے لیے کوششیں شروع کر دی گئیں۔ یہ سوجھو کو کسی طور قبول نہیں تھا۔ اُس نے پاکستان میں تعینات ہندوستان کے سفیر سری پرکاش کو پیغام بھجوایا۔ ”جناب، ہم

یہاں کے باشندے ہیں، یہی ہماری دھرتی ہے، ہمیں زور نہ بھینچا جائے۔“

یہ پیغام ملنے کے بعد ہندوستانی سفیر نے اعلیٰ کے سامنے واضح کر دیا کہ وہ سوجھو کو قبول نہیں کر سکتے، کیوں کہ کسی کو بڑی محبت کر کے ملک کا شہری نہیں بنایا جاسکتا۔ یوں موئن جوڑو کا قلندر موئن جوڑو کے قریب ہی رہا۔

☆☆☆

یہ 53ء کا ذکر ہے۔ سندھ اسمبلی کے انتخابات منع ہوئے۔ ہاری تحریک عروج پر تھی جس میں سوجھو بھی پیش قدمی کیا۔ ہاری کمیٹی کی جانب سے بنائیں امیدوار نکلے ملے کھڑے کیے گئے۔ سوجھو کا الیکشن آفس انتخابی کم کی سرگرمی کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ڈاؤ میڈیکل کالج، کراچی کے ترقی طالب علم ڈاکٹر خواجہ معین اور ڈاکٹر ادیب اکبر رشتہ ساز بن گئے۔ سوجھو کو ہر کئی میل کا سفر طے کرتے اور نکلے ملے کے ان امیدواروں کی الیکشن مہم چلاتے۔

سوجھو ضلع دادو سے ہاری کمیٹی کا امیدوار تھا۔ گوکہ ایک سوجھو مسلمان نہیں تھا لیکن دل چسپ امر یہ ہے کہ مولانا محمد احمد جوتی نے اُس کے پبلنگ ایجنٹ کے طور پر ڈھتے دار نبھائی۔ اس موقع پر کسی نے مولانا سے سوال کیا۔ ”حضرت آپ یہاں کیسے بیٹھے ہیں؟“ انہوں نے جواب دیا۔ ”میں ہندو ہوں!“

اس جواب سے اندازہ لگا جاسکتا ہے کہ سوجھو کے لوگوں کے دل میں ترقی محبت، مکتبہ احترام تھا۔

اگرچہ اُس وقت ہاری تحریک کا شہرہ تھا، تاہم ہاری کمیٹی کے ارکان کو اپنی جیت کا یقین نہیں تھا، اس لیے انتخابات زیادہ زور شور سے جاری بھی نہیں کی گئی۔ حیدر بخش جوتی نے سوجھو اور دیگر ارکان سے کہہ رکھا تھا کہ ہمیں پارٹی کا پروپیگنڈا کرنا ہے، اسی مقصد کے لیے ہم نے الیکشن میں حصہ لیا ہے، خیر، سوجھو نے اپنے حلقے میں 18 ہزار میں سے 6 ہزار ووٹ حاصل کیے، جو انتخابی سیاست میں ایک اچھی ابتدا تھی لیکن اگلے ہی برس پارٹی اور اُس کے تمام ذیلی اداروں پابندی عاید کر دی گئی۔ کمیونسٹ پارٹی اور متحدہ ادارے زمین چلے گئے۔ گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور یوں سوجھو انتخابی سیاست سے دور ہو گیا۔

☆☆☆

اب سوجھو پاکستان میں تھا، اپنے وطن لاڈکانہ میں لیکن وہ تھا تو خطرناک!

وہ کسانوں کو اُس کا سکا تھا۔ سوجھو لاڈکانہ 54ء میں اسے پھر گرفتار کر لیا گیا۔ مارچ 55ء تک وہ قید میں رہا۔ اس زمانے میں وہ حیدر آباد جیل میں قید تھا۔

جیل کے زمانے میں اُس نے نظریاتی سیمینار کی تربیت کے لیے اسٹڈی سرکل کا سلسلہ شروع کیا جس میں ابتدائی کیونز سے لے کر مرحلہ وار موجودہ سرمایہ دارانہ دور تک کے سماج کے ارتقاء پر بحث ہوئی۔

وہاں ”بھوپت“ نامی ایک ڈاکو بھی قید تھا جو یوسف کے نام سے معروف تھا۔ اس نے سوجھو سے اسٹڈی سرکل میں شمولیت کی اجازت مانگی۔ سوجھو برابری پر یقین رکھتا تھا، اس نے ڈاکو کو انسان سمجھتے ہوئے سرکل میں شرکت کی اجازت دے دی۔ ڈاکو عام طور پر غریبوں اور کم زوروں کے مددگار تصور کیے جاتے ہیں لیکن جاگیر دار اپنے جھکندوں سے انہیں انقلاب دشمن بنا دیتے ہیں۔ اسٹڈی سرکل میں سوجھو کی باتوں نے بھوپت کو اتنا متاثر کیا کہ دوسرے صبح سوجھو کے ساتھ چھپ چھپ کر گئے۔ بھوپت نے اُس شخص نے اعتراف کیا کہ وہ اب تک ایک سومات انسانوں کو قتل کر چکا ہے۔ اُس نے تسلیم کیا کہ ریاست جونا گڑھ کے نواب اور راج کوٹ کے مہاراجاؤں نے اُسے بڑی چالاکی سے ترقی پسند تحریکوں کے خلاف استعمال کیا۔

سوجھو کی علمی کوششوں نے جن افراد کی زندگیاں بدل گئیں، اُن میں یہ ڈاکو بھی شامل ہے! رہائی کے بعد بھی اس محبت وطن سیاسی کارکن کو تین ماہ تک گاؤں میں نظر بند رکھا گیا۔

سوجھو نے اُس زمانے میں شہر قائد میں قیام کیا۔ کراچی اُن دنوں ترقی پسندوں کا مرکز تھا اور سیاست، صحافت اور مزدور تحریک روشن خیولوں کے شہر کے بنیادی حوالے تھے۔ اسی سبب سوجھو نے اپنے خاندان کے ساتھ کراچی کا رخ کیا۔ وہاں اس مجاہد نے نیپ (نیشنل عوامی پارٹی) کو منظم کرنے کا ذمہ سنبھالا۔ اسی زمانے میں اخبار ”نہیں سندھ“ سے بھی وابستگی رہی، جس کا دفتر میکلوڈ روڈ پر تھا۔ جلد ہی سندھ کے اسی کامریڈ نے کراچی کے مزدور حلقوں میں نمایاں مقام حاصل کر لیا، یوں کل کا پرجوش اسٹوڈنٹ لیڈر آج کا قابل احترام مزدور لیڈر ہو گیا۔

سوجھو بندر دھڑ نیپول کارپوریشن کی عمارت کے بالمقابل ایک مندر کے احاطے میں رہا کرتا تھا جہاں اکثریت ہندوؤں کی تھی۔

سوجھو گیکان چندانی کی تصانیف کی تفصیلات کچھ یوں ہیں۔ ”لکھن بھار اینڈ“ (کب بہار آئے گی) اُن کے افسانوں کا مجموعہ ہے، جس کا اردو میں ”انقلاب کی موت“..... کے نام سے ترجمہ ہوا۔ ”تاریخ جاوہر لال نہرو“ (تاریخ کے فراموش کردہ اوراق) مضامین کا مجموعہ ہے۔ ”تاریخ گالھاسی تھی“، گالھاسی کا مجموعہ ہے، جس کا اردو میں ”تاریخ یونٹی ہے“ کے عنوان سے ترجمہ ہوا۔ ”وڈی وٹ حمام“ (وہ بڑے لوگ تھے) سوانحی خاکوں کا مجموعہ ہے، جس کا اردو میں ”سندھ کے انقلابی راہنما“ کے نام سے ترجمہ ہوا۔

55ء میں سوجھو نے باقاعدہ پاکستان نیشنل پارٹی (نیپ) کے لیے کام شروع کیا۔ اس عرصے میں دیگر جمہوریت پسند سیاسی جماعتوں کی سرگرمیوں میں بھی پیش قدمی رہا۔ جب ڈھاکہ میں مولانا بھاشانی نے ”نیپ“ بنائی تو سوجھو نے وہاں ہونے والے اجلاس میں بھی شرکت کی۔ وہ ”ون یونٹ“ کے خلاف تحریک میں بھی آگے آگے رہا۔ الغرض جہاں سیاسی و انسانی حقوق کی بات ہوتی، سوجھو وہاں موجود ہوتا۔

59ء میں عام انتخابات کی اطلاع تھی۔ حساب کتاب سے عوامی لیگ اور مولانا بھاشانی کی فتح کے امکانات روشن اور استحکام شکت کو یہ قول نہیں تھا۔ مارشل لا لگنے کے واضح امکانات تھے اور ایسا ہی ہوا!

58ء میں شری پندی کے الزام میں سوجھو کو پھر گرفتار کر لیا گیا۔ دس ماہ حیدر آباد جیل میں گزرے، پھر شاہی قلعے کے اندر جیل میں گم کر دیا گیا۔ چوبیس چوبیس گھنٹے اُسے تاریک کوٹھڑی میں رکھا جاتا تھا۔ 59ء میں لاہور ہائی کورٹ سے رہائی تو مل گئی لیکن اگلے پانچ برس اس کیونٹ نے اپنے گاؤں میں نظر بند رہے ہوئے گزارے۔

☆☆☆

نظر بندی کا دورانیہ 59ء سے 64ء تک محیط تھا! سوجھو بنیادی طور پر کاشت کار تھا۔ اُس کا پورا خاندان زراعت سے جڑا ہوا تھا۔ اُن کے پاس 1300 ایکڑ زمین تھی۔ اُس زمانے میں بڑے بھائی نے سوجھو سے کہا۔ ”اب تو تم گاؤں ہی میں ہو، کیوں نہ تم راکس فیشری کی دیکھ بھال کی ذمہ داری سنبھال لو!“

سویہو نے ہائی جبرلی۔ ان دونوں چاول کو پیاری لگ گئی تھی اور پیداوار تقریباً ختم ہو چکی تھی۔
جدید سوچ کے حامل سویہو نے اس میدان میں بھی تجربات کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے چاول کی ایک نئی قسم ”اری 8“ کے بیج حاصل کیے اور کاشت کاری شروع کر دی۔ لوگوں نے بہت شور مچایا کہ ”لڑکا نئے تجربات کر کے زمین کو تباہ کر دے گا“

بھائی نے بھی سوال کیا، لیکن سویہو کو خود پر بھروسہ تھا۔ اُس نے خوب محنت کی، دراصل محنت تو اُس کی گٹھی میں تھی۔ اور جب ایک ایکٹر سے 2400 کلو گرام چاول پیدا ہوا، تو تنقید کرنے والے ششدر رہ گئے۔ کہاں روایتی بیج سے 400 کلو گرام فی ایکڑ کی پیداوار ہوتی تھی اور کہاں اب 2400 کلو گرام چاول پیدا ہوئے۔

سویہو یہیں نہیں رکا۔ اس کی ہمہ پسند طبیعت نے چاول کی کاشت کے لیے مختص زمین پر گندم کاشت کرنے کے لیے اُکسایا۔ بغاوت تو اُس کی سرشت میں تھی، اس نے میکسیکو سے درآمد کردہ بالکل نیا بیج ”میکسی پاک“ کا تجربہ کیا۔ توقع کے عین مطابق پھر بریالفت ہوئی۔

ایک ساتھی نے کہا ”باؤ، اس بیج میں طاقت نہیں!“
”کیوں اپنے بھائی پر ظلم کرتے ہو؟“ ایک کسان نے استہزاء سے لہجہ میں کہا۔
”بھائی نے زراعت ہے، سیاست نہیں!“ ایک ہاری نے جھنجھکیا۔

لیکن سویہو خاموشی سے مصروف رہا۔ اور اس بار بھی اس کی محنت رنگ لائی۔ فصل زبردست ہوئی۔
انقلابی سویہو کاشت کاری میں بھی تیل کی جگہ ٹریکٹر لایا، روایتی بیج کی جگہ نیا اور ترقی یافتہ بیج متعارف کروایا اور زمین پر روایتی فصلوں کے بجائے نئے کامیاب تجربے کر کے روایتی کاشت کاری کا تصور بدل ڈالا۔

☆☆☆

60 کی دہائی میں روس اور چین کے جھگڑے نے کیونٹوں کو تقسیم کر دیا تھا۔ اختلاف سیاسی بلکہ نظریاتی میدان تک پھیل گیا اور دنیا بھر کی کیونٹ پارٹیاں دو دھڑوں میں تقسیم ہو گئیں۔ سویہو اس جھگڑے میں پڑنے کے خلاف تھا۔ 62ء میں ہندوستان اور چین میں جنگ چھڑ گئی۔ دوستوں نے سویہو کو شورش دیا کہ ”ہندوستان کے خلاف اختیار میں بیان دے دو، نظر بندی ختم ہو جائے گی، لیکن نظریاتی

جدوجہد پر یقین رکھنے والے اس مرد مجاہد نے سستے ہتھیار سے اجتناب برتا۔

سویہو کچھ عرصہ کیونٹ پارٹی کا عہدہ دار بھی لیکن وہ خود کو یہ طور کارکن ہی مطمئن محسوس کرتا تھا، اس ایک موقع پر جب اسے سربراہی قبول کرنے کی پیش کش گئی، تو اس نے انکار کر دیا۔ سویہو نے قائم مقام سیکریٹری بھی عہدہ چھوڑ دیا۔ شرف علی کو سیکریٹری بنا دیا گیا جن کی گرفتاری کے بعد نازش امرہوی نے کیونٹ پارٹی کی سیکریٹری کا عہدہ سنبھالا۔ پھر جمال نقوی اور جام سامنے آئے جن کے طریق سے سویہو کو اختلاف رہا۔ نظریاتی سویہو نے جب دیکھا کہ دیگر افراد پارٹی کے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے ہیں اور مزہ اور کسانوں کی تحریک کا حلیہ لگا ڈیا ہے، تو اُس نے اپنے ساتھیوں کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن اُس وقت کسی اُس کی بات پر توجہ نہیں دی جس کے بعد میں بہت مٹتی مٹتی سامنے آئے۔

1970ء میں پیپلز پارٹی اور نیپ کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے۔ سویہو نے دونوں ترقی پسند جماعتوں کے اختلافات سے اوپر اُٹھتے ہوئے عوام کی فلاح و بہبود کے مشترکہ کاوشیں کرنے کا مشورہ دیا کہ اس لڑائی سے محنت کھڑے کھڑے کو نقصان پہنچ رہا تھا۔ اس ضمن میں سویہو نے میر صاحب پر بنجیو سے بھی بات کی، اس سلسلے میں عملی کوششیں بھی کی گئیں لیکن کوئی خاص نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

مستوط ذوا کا کے بعد ترقی پسندوں کی حمایت کرنے والی جماعت یعنی پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہوئی، جس کی کامیابی میں ترقی پسند سوچ کے حامل طلباء نے کلیدی کردار ادا کیا۔ دیگر ترقی پسند جماعتیں بھی پیپلز پارٹی کے ساتھ تھیں لیکن اقتدار میں آنے کے بعد بائیں بازو کی امیدیں پوری نہیں ہوئیں۔

ذوالفقار علی بھٹو نے اقتدار میں آنے کے بعد سویہو کیان چندانی کو اپنی پارٹی میں شمولیت کی دعوت دی، تاہم سویہو نے انکار کر دیا۔

کھر اور بے پاک آدمی، جس کا دامن کرپشن کے الزام سے پاک ہو، بیوروکریسی کے لیے ہمیشہ ناپسندیدہ ہوتا ہے۔ سویہو پیپلز پارٹی کے دور اقتدار میں بھی وہ تین ماہ جیل میں رہا۔ اُس پر لسانی فسادات کروانے کا الزام عاید کیا گیا تھا اور پہلی بار سویہو کیونٹ کے بجائے ہندو کا لیبیل لگا کر گرفتار کیا

مس۔ تھا۔

یہ بہت ہی تکلیف دہ الزام تھا۔ رہائی ملی تو فوراً بلوچستان کا رخ کیا کہ وہاں کیونٹوں کے لیے حالات نسبتاً بہتر تھے۔

کیونٹوں میں اُن کی میر غوث بخش بڑنجو سے ملاقات ہوئی جو اس زمانے میں بلوچستان کے گورنر تھے اور کیونٹ کے بلدیہ ہاؤس میں رہائش پذیر تھے۔ جب انہیں اطلاع ملی کہ سندھ میں حکومت ہر کیونٹوں کو گرفتار کرنے کے درپے ہے، تو انہوں نے احکامات جاری کر دیے کہ سندھ سے بھاگ کر بلوچستان آنے والے کسی سیاسی ورکر کو گرفتار نہ کیا جائے۔

کیونٹ میں قیام کے دوران سویہو گلیان چندانی کی گرفتاری کا امکان نہیں تھا کہ حکومتی مشینری گورنر کے احکامات کے سامنے بے بس تھی۔ اُس موقع پر ملک کے منتخب وزیر اعظم نے بڑنجو صاحب سے گفتگو کیا۔ ”تم نے ایک ہندو کو اپنے گھر نہادے رکھی ہے۔“

اس پر انہوں نے جواب دیا۔ ”میں نے ہندو کو نہیں، اپنے بھائی سویہو کو پناہ دی ہے!“

دو ماہ تک یہ مجاہد بلوچستان میں رہا۔ اُس عرصے میں اُس نے ”منگت“ کے لیے مضمون لکھا جس میں دلائل دیے کہ پیپلز پارٹی اور نیپ کو اتحاد کر لینا چاہیے تاکہ جمہوریت مستحکم ہو۔

دوسری جانب بڑنجو صاحب نے بھٹو اور سویہو کی ملاقات کروادی جس کے بعد اس کی گرفتاری کا معاملہ ٹل گیا۔ 77ء میں ایک بار پھر ملک آمریت کی لپیٹ میں آ گیا اور ترقی پسندوں کو توڑنے کے لیے ریاستی سطح پر منظم کوششوں کا آغاز ہوا، جس کے نتیجے میں بائیں بازو کے کارکنان کو خاصا نقصان پہنچا۔ وہ وقت کھن تھا لیکن ضعیف العمر سویہو نے رجائیت پسندی کے ساتھ خود کو سنبھالے رکھا۔

1988ء میں انتخابات میں دوستوں نے سویہو کو اقلیتی نشست پر کھڑا کر دیا۔ سویہو نے عجیب انداز سے ہم کا آنا کر کیا اور فرہ نگایا۔ ”یہاں امیر ترین ہندو بھی اچھوت ہے!“

روشن فکر لوگوں نے اُس کی ہمہ کے لیے بہت کام کیا۔ وہ ایک ایک ہندو ووٹر کے پاس سویہو کے لیے ووٹ مانگنے گئے۔ سویہو کا مقابلہ ایک لکھ پتی تاجر بھگوان داس چاول سے تھا۔

بے شک وہ پاکستان کی انتخابی سیاست کی ایک عجیب و غریب انکشن ہم تھی، جسے مسلمان چلا رہے تھے، ایک ہندو

خدارا © خدارا شوگر مریض ذرا عقلمندی سے کام لیں

کیونکہ ساری زندگی عارضی دینی گلیاں ہی کھاتے رہنا آخر کہاں کی عقلمندی ہے؟ آج کل تو ہر انسان صرف شوگر کی وجہ سے بے حد پریشان ہے۔ شوگر موزی مرض انسان کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا، بے جان اور ناکارہ بنا کر اعصابی طور پر کمزور کر دیتی ہے۔ حتیٰ کہ شوگر کی مرض تو انسانی زندگی ضائع کر دیتی ہے۔ شفاء متجانب اللہ پر ایمان رکھیں۔ ہم نے جذبہ خدمت انسانیت سے سرشار ہو کر ایک طویل عرصہ زیرِ سرچ، تحقیق کے بعد دینی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک ایسا خاص قسم کا ہریل شوگر نجات کورس ایجاد کر لیا ہے۔ جسکے استعمال سے آپ شوگر سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ مگر آپ شوگر کی مرض سے پریشان ہیں اور نجات چاہتے ہیں تو خدارا آج ہی گھر بیٹھے فون کر کے بذریعہ ڈاک VP دی پی شوگر نجات کورس منگوالیں۔ اور ہماری سچائی کو آزمائیں۔

المسلم دار الحکمت (جسٹرز)

(دینی طبی یونانی دواخانہ)
ضلع وشہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0308-6627979
0547-521787

آپ ہمیں صرف فون کریں
شوگر کورس آپ تک ہم پہنچائیں گے

کے لیے!

نتیجہ... ایسے ایسے علاقوں سے بھی سوہجو کو ووٹ پڑے جہاں کوئی سوہجو جانتا بھی نہیں تھا۔ پاکستان ٹیلی ویژن نے سوہجو کی کامیابی کا اعلان کر دیا۔ اُس موقع پر نواز شریف نے اُسے فون کر کے مبارکباد دی۔ دوسری طرف سے... لیفٹیرینٹ شوہید نے بھی مبارکباد دیتے ہوئے اسے چیلنجر پارٹی میں شامل ہونے کی پیشکش کر دی۔ سوہجو نے جواب دیا۔ ”میں کسی پارٹی میں شامل نہیں ہوں گا، میں پوری اسمبلی میں اقلیت کا واحد رکن ہوں۔ میں تجھے طبقے کے لیے کھڑا ہوا ہوں، سو میں ایوان میں محروموں کے نمائندے کا کردار ادا کروں گا، خواہ وہ کتنی بھی ہوں، ہندو ہوں یا مسلمان!“

سوہجو جیت گیا، اب وہ اسمبلی میں جانے کو تھا۔ لیبرل اور ترقی پسند حلقے اُس کی اسمبلی میں موجودگی سے بہت ہمدرد تھے لیکن کسی نے تجویز ہی کہا، پیسا بوتا ہے! سوہجو کے مخالف امیدوار نے انتخابی نتائج کے بعد خوب پیسا خرچ کیا، جس نے ہمیشہ کی طرح کام کر دکھایا۔ الیکشن کمیشن نے دوبارہ گنتی کروائی۔

پیسے کی طاقت ووٹوں کی طاقت پر غالب آگئی، نتائج میں بڑے پیمانے پر گھٹا کیا گیا اور دوبارہ گنتی کے بعد بڑی ہی بے حسی سے سوہجو کی ہار کا اعلان کر دیا گیا۔ اور یوں پاکستان کی تاریخ کی عجیب و غریب الیکشن مہم کا بڑے ہی بھونڈے ڈھنگ سے اختتام ہو گیا۔

☆☆☆

تقسیم سے قبل سوہجو سندھ مسلم کالج میں زیر تعلیم تھا، پر ملکی حالات کی تبدیلی اور پھر گرفتاری نے اُسے قانون کی تعلیم اُچھوری چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ وکیل بننے کی خواہش دل میں تھی۔ سو 70ء میں پھر کرسٹی لی اور مومن لاکالج، لاہور کا کٹہرہ سے وکالت کی ڈگری حاصل کی۔ کچھ عرصے اس کالج میں پڑھایا بھی، پرنسپل کے فرائض بھی انجام دیے۔ پھر وکالت کے میدان میں قدم رکھ دیا۔ اس محنت کش نے ایک طویل عرصے تک اس پیشے سے خود کو جوڑے رکھا۔

نظریاتی آدمی صرف جدوجہد پر یقین رکھتا ہے، سو سوہجو نے غریبوں کے مقدمات بلا معاوضہ لڑے، جب تک دم ختم رہا، وکالت کا سلسلہ جاری رکھا، جوں بچوں عمر بڑھتی گئی، کامیاب سوہجو اس شعبے سے کنارہ کش ہوتا گیا۔

☆☆☆

ادیب سوہجو گیان چندانی کی کہانی بھی سیاست دان

سوہجو کی کٹھاک کی طرح طویل اور بڑبڑ ہے۔

یہ کہانی درحقیقت نظریات پر کامل یقین رکھنے کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔ سوہجو کو بچپن ہی سے اس بات پر پختہ یقین تھا کہ کوئی بھی ادب اُس وقت تک بڑا ادب نہیں بن سکتا، جب تک وہ زندگی سے وابستہ نہ ہو!

مطالعے میں گردن تک غرق سوہجو کے ادبی سفر کا باقاعدہ آغاز بچپنی گرفتاری سے ہوتا ہے۔ چیل کے زمانے میں اس بابت کچھ کرنے کی خواہش نے اُسے متحرک رکھا۔ برصغیر کے ترقی پسندوں نے ابتدا ہی سے خود کو ادب سے جوڑ رکھا تھا کہ ذرائع ابلاغ نظریات کی ترویج میں کلیدی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں اور پیغام کی رسائی میں اضافے کا موجب بنتے ہیں۔ دیگر انقلابیوں کی طرح سوہجو نے بھی شعر کہی، مضامین لکھے اور فکشن کے شعبے میں دلچسپی لی۔

قیام پاکستان سے قبل کراچی میں پروگریسو رائنرز ایسوسی ایشن (PWA) کام کر رہی تھی۔ سوہجو نے اس کی سرگرمیوں میں فعال کردار ادا کیا۔ اسی ادارے نے 1944ء میں ”ریگستانی پھول“ کے نام سے ترقی پسند افسانوں کا ایک مجموعہ شائع ہوا تھا جس میں سوہجو کی دو کہانیاں بھی شامل ہوئیں۔

1944ء میں رہائی کے بعد ساتھیوں کے ساتھ یہ نمم شروع کی کہ سندھی ادیبوں کو طبع زاد کہانیاں لکھنے کی ترغیب دی جائے۔ سجاد ظہیر کے مشورے پر جمال الدین بخاری، گوہند مامی، رام بھوجا انٹرن اور سوہجو سندھی ادیبوں کا ایک پلیٹ فارم بنانے میں جُٹ گئے۔ اسی خیال کے تحت سوہجو نے کیونسٹ مینی فیسٹو کا سندھی میں ترجمہ کیا۔

تقسیم سے دو ماہ قبل اپنے دوستوں کے ساتھ اُس نے ”سندھی ادبی سنگت“ قائم کی اور اُسے کامیابی سے چلاتا رہا۔ سوہجو کے کتب گھر سے وابستہ افرادی رائے بھی کہ ادب انسان کو طاقوتی قوتوں کے خلاف لڑنے میں مدد دیتا ہے۔ تقسیم کے بعد ادبی سنگت کے ہندو ارکان ہندوستان چلے گئے جس سے تنظیم کو دھچکا پہنچا۔

جب 1953 میں سندھ اسمبلی میں الیکشن میں عوامی حماد میدان میں اُتری، تو سوہجو نے اس کا مشورہ لکھا، جس کا انگریزی اور علاقائی زبانوں میں ترجمہ بھی کیا۔

جی ایم سید نے کراچی سے ایک رسالہ ”نہیں دنیا“ شروع کیا تھا، جس میں نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ انہوں نے سوہجو کو اس نظریاتی مشق کا حصہ بنے

کے لیے راضی کر لیا۔ 58-57 میں سوہجو نے ”نہیں دنیا“ کی ایڈیٹری بھی کی۔ اُس زمانے میں اس نے کراچی میں قیام کا فیصلہ کیا۔ یہ روز نامہ روشن فکری، خبر افروزی اور انسانیت کا پرچار کرتا تھا۔ بعد میں مارشل لا کے عتاب نے اخبار کی صورت جاری اس سلسلے کو تباہ کر دیا۔

معیاری ادب سے بڑے سوہجو کو شوق مطالعہ نے ابتدا ہی سے فکشن سے متعلق کر دیا تھا۔ نوجوانی میں اس نے افسانہ نگاری کے میدان میں قدم رکھا۔ سوہجو کے ایک افسانہ ”کلہن بہار اندو“ (بہار کب آئے گی) کو ادبی حلقوں میں بہت سراہا گیا۔ سوہجو کے پہلے افسانوی مجموعے کا عنوان بھی یہی تھا۔ یہ مجموعہ نوجوانوں پر مشتمل تھا۔ بعد میں لاہور سے تعلق رکھنے والے ایک صاحب اسلم ریل نے ان کہانیوں کو اردو کے قالب میں ڈھالا، جو ”انقلابی کی موت“ کے عنوان سے شائع ہوئیں۔ اس مجموعے میں ایک انقلابی ابراہیم مالا باری کی زیت کی بابت لکھی ہوئی ایک کہانی بھی شامل ہے، جسے افسانوی رنگ نے ایک شاہ کار کر دیا ہے۔ سوہجو کا افسانہ ”رجساں“ بھی بہت مقبول ہوا جس میں کمسنی میں شادی کی جاہلانہ سماجی رسم کے خلاف آواز اٹھائی گئی۔ گوکہ سوہجو نے زیادہ افسانے نہیں لکھے لیکن ناقدین اس کا شمار جدید سندھی افسانہ نگاروں کی اولین صف میں کرتے تھے۔

ان افسانوں کا بہت اثر ہوا۔ ہم عصر، خصوصاً نوجوان بہت متاثر ہوئے۔ سوہجو افسانوں تک محدود نہیں رہا، اس نے ”نپولین جو موت“ (نپولین کی موت) نامی ایک ڈراما بھی لکھا۔

کہتے ہیں کہ شاعر فطرت کے بے حد قریب ہوتا ہے اور سوہجو جو درد کا قلندر بھی فطرت سے نوا ہوا تھا، پھر یہ کس طرح ممکن تھا کہ وہ شاعری کے شعبے میں طبع آزمائی نہ کرتا۔ سوہجو نے اپنے خیالات کو شاعرانہ شکل بھی دی، پر اُس کی شاعری کا بڑا حصہ کم ہو چکا ہے۔

سوہجو گیان چندانی کی ایک بچپان کا لم کھاری بھی ہے۔ اس ریل جلیل نے 1990ء میں کالم لکھنے شروع کیے۔ سیاست اور تاریخ اُس کا موضوع تھا، یوں اس خطے میں آنے والی تبدیلیوں پر گہری نظر رکھنے والے اس نظریاتی محنت کش کے کالموں نے سیاسی و تاریخی اہمیت اختیار کر لی۔ سوہجو کا مقصد دنیا کے سیاسی انقلابیوں اور سماجی تحریکوں پر روشنی ڈالنا تھا۔ ساتھ ہی ان کالموں میں سندھ پر پڑنے والے اُن کے

اثرات کا بھی جائزہ لیا گیا۔

جب کالم مقبول ہوئے، تو دوستوں نے انہیں کتابی شکل دینے کا تقاضا کیا۔ مشورہ سوہجو کے دل کو لگا۔ یوں ”تاریخ کٹھائے تھی“ نامی کتاب منظر عام پر آئی، جس کا اردو میں ”تاریخ بولتی ہے“ کے عنوان سے ترجمہ ہوا۔

اس ادیب نے سوانحی خاکے اور مضامین بھی لکھے، جن میں چند ”ڈوڈی وٹ حمام“ (وہ بڑے لوگ تھے) نامی کتاب کی صورت بھیجا جا ہوئے۔ اس درویش نے اپنی والدہ کی سوانح ”آئرو“ کے نام سے لکھی۔

پھر دوستوں نے 80 سالہ سوہجو کو اپنی آپ بیتی لکھنے کے لیے تحریک دی۔ اپریل 2002ء سے اگست 2005ء تک ایک سندھی رسالے ”سوہجو“ میں سوہجو کی خودنوشت قسط وار شائع ہوئی، جس کا عنوان ”روشنی جی پندہ میں“ یعنی ”روشنی کے سفر“ میں تھا۔

گوکہ کے اس قد آور ادیب کے کام کو ادب و سخن معاشرے میں اس طرح نہیں سراہا گیا جس طرح اس کا حق تھا، پھر بھی چند ادب دوست اداروں نے اس کے کام کو تسلیم کیا۔ اس ضمن میں اُسے پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز کی جانب سے 2004ء میں کمال فن ایوارڈ سے نوازا گیا۔ سوہجو کی تخلیقات کا محور سماجی انصاف، جمہوریت اور اخلاقیات کی ترقی رہا ہے۔ اپنے نظریے سے گہری کٹ منٹ کے پیش نظر سوہجو کو 2007ء میں حبیب جالب اس ایوارڈ سے نوازا گیا۔

☆☆☆

زندگی کے آخری برسوں میں اس انقلابی کو سخت گھریلو مسائل نے گھیرے رکھا۔ کبیر سنی میں دماغ کی رگ پھٹنا ایک خوف ناک سانحہ تھا، پر سوہجو نے اعتماد اور قوت ارادی کے ساتھ اس لیے کا مقابلہ کیا، اور خود کو ادیب سے باندھ لیا۔ اس حادثے کا ایک سبب عمر تو دوسرا گھریلو مسائل تھے۔ اس سبب اُس نے وکالت ترک کر دی، پر اس ضمن میں مشورے دینے کا مفید سلسلہ جاری رکھا۔

اوپر والے نے سوہجو کو دو بیٹیوں اور تین بیٹیوں سے نوازا۔ پہلی اولاد ایک صاحب زادی تھی، جو 43ء میں پیدا ہوئی اور چند برس بعد انتقال کر گئی۔ بڑا بیٹا نکھیا ڈاکٹر تھا، جو بد قسمتی سے نوجوانی ہی میں گردے کے عارضے میں مبتلا ہو کر یرقان کا شکار ہو گیا۔ اُس زمانے میں بوڑھے سوہجو نے اپنے بیٹے کے علاج معالجے کے لیے بہت زور مارا۔ دن رات ایک کر دیے۔ تقریباً پاگل ہو گیا تھا۔ علاج پر لاکھوں روپے خرچ



عورت پھول ہے، خوشبو ہے، سُبک چاندنی ہے، خدا کا بہترین تحفہ ہے۔ اسی لیے تو کھا گیا ہے کہ وجود زن سے ہے کائنات میں رنگ مگر وہ عورتیں..... جذبہ انتقام میں اندھی ہو چکی تھیں۔ انسانیت کی تذلیل بن چکی تھیں۔ قیدیوں کو کیسی کیسی عجیب و غریب ایذاں دیتی تھیں مگر جب ان کے مظالم کا اختتام ہوا تو بھی وہ باز نہ آئیں، اور خود پر ظلم کرنے پر اتر آئیں۔

دوسری جنگ عظیم کا ایک دل و ہلا دینے والا قصہ

فروری 1945ء میں فٹلا کے تمام امریکی جگی دستے جزل ڈگس کی کمان میں دیے جاتے تھے مگر امریکی فضائیہ کے بمبار طیارے ہنز لائیٹ کے علاقے میں نو تعمیر شدہ ہوائی اڈے استعمال کر رہے تھے۔ ان اڈوں سے پرواز کرنے والے بی 24 بمبار طیارے چینی سمندروں پر جنوب میں یورینیو سے سلیس تک اور شمال میں فارموسا اور روکوپو کے جزائر پر بمبار کر رہے تھے۔ ان حملوں کا مقصد سمندری اور خشکی کے راستوں سے جاپانیوں کی فوجی سپلائی اور سامان رسد کا راستہ منقطع کرنا تھا۔ 15 جنوری کو، بی 24 بمبار طیاروں کا ایک اسکواڈرن اپنے مشن پر روانہ ہوا جنہیں فارموسا پر بمباری کرنا تھی۔ گرین گوز نامی طیارہ اس فارمیشن کے آخر میں تھا

ہوئے۔ حالات کی ستم ظریفی دیکھیے، سو بھوکا بی لائبریری آٹھ لاکھ میں حکمرانہ ثقافت حکومت سندھ کو فروخت کرنی پڑی۔ اُس لائبریری میں پاکستان، بھارت، سندھ، فلسفہ، مذہب، ادب، الغرض دنیا بھر کا بہترین مواد تھا۔ اس بجا ہندے اسپتال کے نیکڑوں چکر لگائے، پرتھکا نہیں۔ بد قسمتی سے کوششیں بار آور جات نہیں ہوئیں۔ بیڑ کا انتقال ہو گیا۔ بڑھاپے میں جوان بیٹے کی موت نے جیسے کمر توڑ دی۔

دوسرا بیڑ کا نام نزل داس رکھا، جس نے بہ طور انجینئر نام نکایا۔ اور بی بی وی کے ادارے میں اپنا کیریئر بنایا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا، لوگوں پر اس درویش کی حقیقت آشکار ہوتی گئی۔ عوام نے اس بزرگ کا ایک ولی کی طرح احترام کرنا شروع کر دیا۔ لوگ فیض حاصل کرنے کے لیے چھپتے پڑے۔ ہمہ وقت اُس کے گرد ہجوم رہنے لگا۔ کبھی کوئی دوست دروازے پر دستک دیتا، کبھی کوئی ریسرچر آجاتا۔ میڈیا والے بھی مانگ اور کسرالے وقت بے وقت آن پہنچتے۔ کبھی کبھار یہ درویش سوچتا۔ ”ایک وقت تھا، جب میں بہت کچھ کہنا چاہتا تھا، پر لوگ سنا نہیں جاتے تھے، پر اب، جب میں زیادہ کہنے کے قابل نہیں رہ گیا، تب لوگ لپک لپک کر میرے پاس آ رہے ہیں۔“

سندھی ہوں یا غیر سندھی، سب آج اس پیارے بزرگ سے محبت اور احترام سے پیش آتے ہیں۔ لوگ در پر آتے ہیں، ہاتھ جوڑتے ہیں، پیر چھوتے ہیں، برس بھوٹا نہیں ایسا کرنے سے منع کرتا۔ اُس نے تساری زندگی شخصیت پرستی کے خلاف جدوجہد کی۔

آج سو بھوکو سندھ میں ”پنڈت“ کا درجہ حاصل ہے، پر یہ پنڈت بھی کسی پنڈت سے متاثر ہے۔ شاعر میں اُسے نیگور اور نذر الاسلام کا کام بہت پسند ہے۔ سندھی شاعری میں شاہ لطیف اور شیخ ایاز نے اُسے متاثر کیا، اردو میں فیض، جوش اور جالب کی شاعری نے دل کو چھوا۔ لہجہ بچر میں دوستوئسکی نے گہرے اثرات مرتب کیے۔ میکسم گورکی بھی بہت بھایا۔ فرانس کی کیونٹ پارٹی کے سیکریٹری جنرل مارس تھوریز کی شخصیت نے بھی سو بھوکو بہت متاثر کیا۔ سو بھوکے پسندیدہ انقلابی بی بی جوش ہیں، جنہوں نے بکھرے ہوئے کیونٹوں کو یکجا کرنے کا فریضہ انجام دیا۔ سو بھوکو شاہنشاہیت کی جدوجہد سے بھی متاثر ہے۔

اب سو بھوکو کسی پارٹی سے منسلک نہیں، نہ ہی کسی

لیکن ہتان کی بندرگاہ پر بمباری کرتے ہوئے یہ طیارہ اپنی فارمیشن کھینچا اور بھٹکا ہوا اس ساحل کے استے قریب پہنچ گیا جہاں دشمن کی توپیں اس کے استقبال کے لیے تیار تھیں۔ اٹھارہ سو فٹ کی بلندی پر طیارے کا زمینی توپوں کی زد سے بچ لکھنا ممکن نہیں تھا۔ ایک گولہ طیارے کے دائیں بازو پر لگا اور طیارہ ایک جھٹکے لیتے ہوئے قلابازیاں کھاتا ہوا تیزی سے زمین کی طرف آنے لگا۔ طیارے کے پائلٹ نے این موزونے اپنے حواس قابو میں رکھتے ہوئے طیارے کو سنبھالنے کی بھرپور کوشش کی اور بالآخر وہ ساحل کی ریت کی ایک پٹی پر کریش لینڈنگ کرنے میں کامیاب ہو گیا جہاں بد قسمتی سے لاتعداد جاپانی فوجی اس کے استقبال کے لیے تیار تھے۔ طیارے کو چاروں طرف سے جاپانی فوجیوں نے گھیر لیا۔

دس افراد پر مشتمل اس طیارے کے عملے کو گرفتاری کے فوراً بعد ہی ہتان بھیج دیا گیا جہاں جاپانی بحریہ کے اٹلی جنس آفیسر تین دن تک ان سے پوچھ پچھ کرتے رہے اور بالآخر انہیں بتایا گیا کہ انہیں جزیرے کے اندرونی حصے میں واقع ایک جنگلی کیمپ میں بھیجا جا رہا ہے جہاں وقتاً فوقتاً ان سے پوچھ پچھ کی جائے گی۔

اسی روز ایک جاپانی محافظ نے انہیں بتایا تھا کہ انہیں اکاسا کی جنگلی کیمپ نمبر تین میں بھیجا جانے والا ہے۔ اسی شام انہیں کیمپ نمبر تین کی طرف روانہ کر دیا گیا تھا۔ دو تین گھنٹوں تک ٹرک نہایت تیز رفتاری سے سفر کرتا رہا۔ شدید سردی کے باعث قیدی ایک دوسرے سے جڑے بیٹھے تھے تاکہ ایک دوسرے کے جسموں سے حرارت حاصل کر سکیں لیکن سردی کی شدت میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا، اس کے ساتھ ہی ٹرک کی رفتار بھی کم ہو گئی۔ پختہ سڑک ختم ہو چکی تھی اور اب ٹرک برفانی میدان میں بچکولے کھاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ چاندنی میں تاحہ نگاہ برف کی سفید چادر پھیلی ہوئی نظر آرہی تھی۔

جہاز کا مشین گن سارجنٹ رچرڈ باس ٹرک کی دیوار سے ٹیک لگائے مسکرا بیٹھا تھا۔ سردی کی شدت سے اس پر کچی سی طاری تھی۔ اس نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے اس جاپانی کی طرف دیکھا جو مترجم کی حیثیت سے ان کے ساتھ جا رہا تھا۔

”کیا یہاں ہمیشہ ایسی ہی سردی ہوتی ہے؟“
”یہ ناؤ سن مونس ہے۔ اس وقت ہم سب سمندر سے

چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر سفر کر رہے ہیں جبکہ اکاسا کی صرف چھ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ یہ علاقہ جہاں سے ہم اس وقت گزر رہے ہیں، سردیوں میں برف سے ڈھکا رہتا ہے لیکن موسم بہار میں بارشوں کے ساتھ ہی یہاں کی برف پگھلنا شروع ہو جاتی ہے۔“ مترجم نے بتایا۔

تقریباً دو گھنٹے مزید بچکولے کھانے کے بعد وہ کھٹارا ٹرک ایک تو درست پگھلی لے کر رک گیا۔ رچرڈ نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔ جگہ جگہ نصف آرک لائٹس کی تیز روشنی میں اکاسا کی جنگلی کیمپ نمبر تین کی خاردار تاروں کے جھکے کا گیت نظر آ رہا تھا۔ ٹرک کے رکتے ہی ایک ہولائیٹس سے نکل کر ان کی طرف بڑھا، وہ دوسرے پیرکٹ گرم کمپنٹروں میں لپٹا ہوا تھا۔

جہاز کا ریڈیو آپریٹر مارٹر پہلا شخص تھا جس کی آنکھیں تیز روشنی میں کچھ دیکھنے کے قابل ہو گئیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ اپنے ساتھیوں کی طرف مھوم گیا۔

”عورت!“ اس کے لہجے میں بے پناہ حیرت تھی۔
”دیکھو، وہ محافظ ایک عورت ہے، حیرت انگیز! یہ کیمپ عورتوں کی نگرانی میں ہے۔“

موزون اور رچرڈ وغیرہ بھی اب ٹرک کی کھڑکیوں سے باہر جھانک رہے تھے، امپیریل آرمی کی یونیفارم میں ملیں تقریباً ایک ورجن عورتیں گیٹ کے قریب راقطنیں سنبھالے مستعد کھڑی تھیں۔
”اوہو!“ جہاز کے انجینئر چک کر روک کر سینی بھائی ”معلوم ہوتا ہے ہمیں جنگلی کیمپ کے بجائے بھول کر کرسی ٹائٹ کلب میں بھیج دیا گیا ہے۔“

ان کے ساتھ آنے والے مسلح جاپانی مترجم نے انہیں ٹرک سے اترنے کا حکم دیا۔ وہ جیسے ہی نیچے اترے، دو محافظ لڑکیوں نے بڑی مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں راقطنوں کی زد میں لے لیا اور وہ خاردار تاروں کے گیٹ سے گزرتے ہوئے کمپاؤنڈ کے وسط میں پہنچ گئے۔ اس لمحے

چند اور محافظ لڑکیوں نے انہیں اپنے نرغے میں لے لیا۔ تیز روشنی میں ان کی آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ جب کوئی لڑکی اپنی جگہ سے حرکت کرتی تو اس کی راقطن کے آگے لگی ہوئی ٹنگین، روشنی میں بجلی کی طرح چمک اٹھتی۔ موزونہ انہیں دیکھ کر دل ہی دل میں مسکرا اٹھا۔ اسے یہ تو معلوم تھا کہ جاپانیوں نے عورتوں کو کبھی فوج میں بھرتی کرنا شروع کر دیا تھا۔ ضروری تربیت کے بعد صرف انتظامی امور ان عورتوں

کے سپرد کیے گئے تھے جہاں ان کے لیے زیادہ خطرہ نہیں تھا لیکن جنگلی قیدیوں کے کسی کیمپ کی نگرانی عورتوں کے سپرد کر دینا، موزونہ کے نزدیک حماقت کے سوا کچھ نہیں تھا۔

موزونہ بھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک عورت دائرے میں کوئی محافظ لڑکیوں کے قریب سے گزرتے ہوئے آگے آگئی۔ اسے دیکھ کر ہر قیدی کے منہ سے بے اختیار مہر اسانس نکل گیا۔

اس کیمپ میں کسی ایسی حسین عورت کی موجودگی کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

وہ قیدیوں کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے سیاہ ریشمی بال ہوا کے جھوکوں سے لہرا رہے تھے۔ اس کے جسم پر امپیریل آرمی میجر کی وردی تھی جو کمر پر خاصی چست تھی۔ پیردوں میں برفانی جوتے تھے جو پنڈلیوں تک آ رہے تھے۔ پتلون کے پانچے نہایت سلیقے سے جوتوں کے اندر اڑے ہوئے تھے۔

قیدیوں کے ساتھ آنے والے جاپانی مترجم نے اپنی زبان میں اس عورت سے کوئی بات کی پھر قیدیوں کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

”یہ اوکاٹسو سان ہیں۔ تم لوگ اس کیمپ میں اپنے قیام کے دوران انہیں اسی نام سے خطاب کرو گے۔ اس کیمپ میں تمہارا قیام کتنا طویل ہوگا؟ اس سلسلے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا، ہماری زبان میں ”سان“ میڈم کو کہتے ہیں۔ تم لوگ اگر جاہلو تو اپنی آسانی کے لیے انہیں سان کے بجائے میڈم بھی کہہ سکتے ہو۔ اوکاٹسو سان میجر ریک کی مالک اور اس کیمپ کی انچارج ہیں۔ اوکاٹسو کے بعد اس کیمپ کی نگرانی کی ذمہ داری یا کوسان اور ہاروسان پر جائیداد ہوتی ہیں۔ انہیں ان کے احکامات کی بے پناہی وچا پیل کرنا ہوتی۔ اس کیمپ کے محافظوں میں کوئی مرد شامل نہیں، سارا انتظام ان لڑکیوں کے سپرد ہے لیکن تم انہیں مردوں سے کم نہیں پاؤ گے۔“

مترجم چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر کیمپ کی محافظ لڑکیوں کے بارے میں بتانے لگا۔

”اکاسا کی اس کیمپ کی محافظ لڑکیوں کی تعداد صرف تین ہے جن کی انچارج میڈم اوکاٹسو ہیں جو کیمپ سے متعلق معاملات میں ہر لحاظ سے خود مختار ہیں، البتہ بعض معاملات میں وہ صرف اور صرف فارموسا، ہائی کمان کو جواب دہ ہیں۔“ مترجم کے مطابق بہت عرصہ پہلے یہ کیمپ

مرد فوجیوں کی نگرانی میں تھا لیکن جنرل میک آر تھر کے فلیٹین واپس آنے کے بعد مرد فوجیوں کو ساحل کی حفاظت کے لیے بھیج دیا گیا ہے۔ مترجم نے اس فلیٹین کا اظہار بھی کیا کہ جنرل میک آر تھر کو اس علاقے میں زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہوگی۔ ”ایک بات اور.....“ مترجم نے قیدیوں کو متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

”ان میں پانچ لڑکیاں شادی شدہ ہیں اور ان کے شوہر بحریر میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس طرح ان لڑکیوں کو شہنشاہ کی خاص توجہ بھی حاصل ہے۔ ایک بات اور ذہن نشین کر لو کہ یہ لڑکیاں تمہارے مردوں سے زیادہ خطرناک ہیں۔ انہیں تم سے شدید نفرت ہے اور کسی سے نفرت کرنے کی اس سے بڑی وجہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان کے شوہر، بھائی، باپ اور شتے وارث لوگوں کے ہاتھوں... مارے جاتے ہیں یا مارے جا رہے ہیں۔ میں آخری مرتبہ تم لوگوں کو تنبیہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہاں سے تمہارے فرار کی کوئی کوشش کامیاب ثابت نہیں ہوگی۔ یہ بات بھی نوٹ کر لو کہ جب تک تم لوگ یہاں ہو، یہ سب تمہیں چین سے بیٹھے نہیں دیں گی۔“

مترجم نے اپنی تقریر ختم کر کے میڈم اوکاٹسو کی طرف دیکھا اور اوکاٹسو نے پسندیدگی کے انداز میں اس کی طرف دیکھا اور ایک ہاتھ سے جانے کا اشارہ کیا۔ مترجم اسے سلامی دے کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ میڈم اوکاٹسو اس وقت تک اس کی طرف دیکھتی رہی جب تک وہ گیٹ کے قریب کھڑے ہوئے ٹرک پر سوار نہ ہو گیا۔ پھر وہ قیدیوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

ارشیا اینو..... اس کے خوبصورت ہونٹوں سے سرسراہٹ ہوئی سی آواز نکلی۔

مترجم کی وارنٹک کے باوجود جہاز کا پائلٹ لیفٹیننٹ ٹونان اس کی طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔

”بے بی! میں تمہاری زبان نہیں سمجھتا لیکن اگر تمہیں کسی محبوب کی تلاش ہے تو وہ میرے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔“

لیکن جب میڈم اوکاٹسو نے انگلیش میں جواب دیا تو ٹونان اور اس کے ساتھی تانے میں رہ گئے۔ خصوصاً ٹونان کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا تھا۔

”میں تمہاری زبان بول اور سمجھ سکتی ہوں۔“ میڈم نے اس کے چہرے پر نظر میں جاتے ہوئے کہا ”تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں کہ میں نے جو الفاظ کہے تھے، اس کا مطلب ہے، بد مذہب کو!“

جملہ ختم کر کے میڈم اوکاٹو نے ایک ہاتھ اٹھا کر مخصوص اشارہ کیا۔ لیفٹیننٹ نونان کے پیچھے کھڑی ہوئی دو محافظ لڑکیوں نے نونان کو بازو سے پکڑ کر تھپتھپتے ہوئے اس کے ساتھیوں سے الگ کر لیا، اس سے پہلے کہ نونان کچھ سمجھ سکتا، وہ دونوں لڑکیوں نے راتفل کے بٹ پوری قوت سے اس کی پنڈلیوں پر مارے، نونان چیخا ہوا زمین پر گرا۔ پنڈلیوں پر گئی ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ کوشش کے باوجود اٹھنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ محافظ لڑکیوں نے راتفلوں کے بٹ مار کر اسے چت لٹا دیا اور اس کے بازوؤں پر کھڑی ہو گئیں۔ نونان برف پر پشٹ کے نل لپٹا، بڑی طرح چیخ رہا تھا، اس دوران ایک اور لڑکی دوڑتی ہوئی آئی اور تقریباً ڈیڑھ انچ موٹی لکڑی کا ٹکڑا اس کے دانتوں میں پھنسا دیا۔ نونان اب بھی چیخ رہا تھا۔ اس کی آواز اب عجیب سی نوعیت اختیار کر چکی تھی۔ دانتوں میں لکڑی ہونے کی وجہ سے اس کا منہ ڈیڑھ انچ کے قریب کھلا ہوا تھا۔

اور پھر..... وہ سب کچھ اس قدر سرعت سے ہوا تھا کہ موزو اور اس کا ساتھی کوئی اندازہ نہ لگا سکے۔ میڈم اوکاٹو نے اپنی ہپ باکٹ سے چاقو نکال لیا اور نے تلے قدم اٹھاتے ہوئے نونان کے قریب پہنچ گئی۔ چند لمحوں میں وہ نونان کے چہرے کو دیکھتی رہی پھر ایک پیر اٹھا کر نونان کے سینے پر رکھ دیا۔ وہ پھٹی پھٹی سی آنکھوں سے میڈم اوکاٹو کے چہرے کو دیکھ رہا تھا جو آہستہ آہستہ اس پر جھک رہی تھی۔ تب پھر دفعتاً ہی وہ تیزی سے حرکت میں آئی اور چاقو کا..... پھل اس کے گلے منہ میں داخل کر دیا۔ نونان بڑی طرح جھلنے لگا مگر میڈم اوکاٹو نے اس کی سینے پر اپنا پورا بوجھ ڈال رکھا تھا۔ اس کا چاقو والا ہاتھ تیزی سے حرکت کر رہا تھا۔ چاقو کی تیز نوک نے نونان کی زبان کو جڑ سے کاٹ دیا تھا۔ نونان کے حلق سے خرخراہٹ کی آواز کے ساتھ خون کا فورہ بہہ نکلا۔

میڈم اوکاٹو اچھل کر اس کے پاس سے ہٹ گئی اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے تقریباً پانچ انچ کے گوشت کے ٹکڑے کو جو نونان کی زبان کی، ہوا میں لہراتے ہوئے چینی ”پانز آئی.....!“

یہ خوشی کا نعرہ تھا۔ اس نے نونان کی طرف دیکھا، اس کے منہ سے بہنے والا خون، چہرے، گردن اور زمین پر چری ہوئی برف کو سرخ کیے دے رہا تھا۔ اس کے حلق سے خرخراہٹ کی عجیب سی آواز سن رہی تھی، دانتوں میں لکڑی پھنسی ہوئی ہونے کی وجہ سے وہ نہ تو خون کو نگل سکتا تھا اور نہ ہی تھوک سکتا تھا۔ لیفٹیننٹ نونان کے ساتھی خاموش کھڑے تھے، یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے، ان کے پیچھے کھڑی ہوئی محافظ لڑکیوں کی راتفلوں کی سنگینیں ان کی گردنوں کو چھو رہی تھیں۔ انہیں یقین تھا کہ اگر کسی نے اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش کی تو اس کا انجام بھی نونان سے مختلف نہیں ہوگا۔

رچرڈ کی متعین بھیجی ہوئی تھیں، اس نے سختی سے دانت بردانت جھار کھینچے تھے، سفاکی کا یہ مظاہرہ دیکھ کر اس کے روٹنے کھڑے ہو گئے اور خون میں لت پت نونان کی طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔

”میں اس کتیا کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اسے..... اسے ایسی اذیت ناک موت ماروں گا کہ جا پانیوں کی آنے والی کئی نسلیں تک یاد رہیں گی۔“

رچرڈ کے دائیں بائیں کھڑے ہوئے اس کے ساتھیوں نے اس کی یہ بڑبڑاہٹ سن لی اور اسی لمحے انہوں نے رچرڈ کو پائپز تسلیم کر لیا، اس کے جڑوں کے ابھرے ہوئے سنسلا اور لہجے کی کرختگی کا احساس کر کے موزو، اسٹیوارڈ اور لائیڈ وغیرہ نے بھی تسلیم کر لیا کہ رچرڈ اس گروپ کا واحد آدمی ہوگا جو کبھی انہیں اس عذاب سے نجات دلا سکے گا۔

میڈم اوکاٹو نے جو رچرڈ کی بڑبڑاہٹ نہیں سن سکی تھی، اپنا خون آلود ہاتھ اور چاقو کا خون نونان کے کپڑوں سے صاف کیا۔ نونان کی زبان ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی، وہ قیدیوں کی طرف دیکھتے ہوئے خوں خوار لبی کی طرح غرائی۔

”میں اس کپ میں آنے والے قیدیوں کو ہمیشہ اسی قسم کی وارننگ دیتی ہوں۔ اس طرح کوئی بے ہودہ خیال ان کے ذہن میں جگہ نہیں پاسکتا۔“

ہوئی۔ لکڑی کے چارستون کھڑے کر کے ان پر چھت قائم کر دی گئی تھی۔ چاروں طرف سے کھلا ہونے کے باعث سردی سے بچاؤ کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ نیچے چکی زمین بھی اور انہیں اوڑھنے یا بچانے کے لیے مکمل وغیرہ بھی فراہم نہیں کیے گئے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد آرک لائٹس بجھا دی گئیں، چند منٹ کے بعد ہی ان کی آنکھیں تاریکی میں کچھ دیکھنے کے قابل ہو گئیں تھیں۔ ان کے ارد گرد ای سم کے پندرہ اور ساتباں تھے جن میں موجود قیدی اپنے آپ کو سردی سے بچانے کے لیے ایک دوسرے میں گھسے کی کوشش کر رہے تھے۔

لیفٹیننٹ نونان ختم ہو چکا تھا۔ اس کی لاش برف پہ پڑی تھی۔ اب وہ صرف نورہ گئے تھے۔ ٹرک سے اتر کر ان لڑکیوں کو دیکھ کر ان میں سے جن لوگوں نے یہ سوچا تھا کہ وہ کسی جنگی کیمپ کے بجائے نائنٹ کلب میں آ گئے ہیں، جہاں خوبصورت لڑکیاں ان کی دلجوئی کو موجود ہیں، انہیں اپنا خیال بدلنا پڑا۔ اب وہ سب یہ سوچنے پر مجبور تھے کہ اس کیمپ کے بارے میں انہوں نے جو داستانیں سن رکھی تھیں، ان میں ذرا بھی مبالغہ آرائی نہ تھی۔ ان کے خیال میں یہ موت کا کیمپ تھا جہاں قدم رکھتے ہی موت نے ان کا استقبال کیا تھا اور ان کے ایک ساتھی کو چاٹ لیا تھا۔ موت جو خوبصورت لڑکیوں کی صورت میں ان کے گرد منڈلا رہی تھی۔

صبح صبح سے پہلے رچرڈ کی آنکھ کھلی تھی۔ ایک نظر چاروں طرف دیکھتے ہی یہ بات سمجھ میں آ گئی تھی کہ یہ کیمپ موت کے نام سے کیوں مشہور تھا۔

ایک لمحے کو تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ سترہویں صدی کے کسی عقوبت خانے میں پہنچ گیا ہو۔ ہر ساتباں میں چھ سے دس تک قیدی تھے اور ان کی حالت دیکھ کر یہ مشکل ہی یہ فیصلہ کیا جاسکتا تھا کہ وہ بھی انسان کے ذمے میں آتے ہیں۔ بچے پڑانے غلامت آلود کپڑوں میں لپٹے ہوئے وہ لوگ ڈھانچوں سے زیادہ مختلف نہیں تھے۔ وہ لوگ اپنی اپنی جگہوں سے اٹھ کر متحرک ہو گئے تھے۔ ان کے جھسوں اور بچنے پڑانے کپڑوں سے اٹھنے والی بدبو سے رچرڈ کو اگائی آ گئی۔

ایک ساتباں کی طرف دیکھتے ہی رچرڈ چونک گیا۔ اس ساتباں کے ڈھانچا نما قیدی اپنے دوساتھیوں کو برف پر کھینچے ہوئے کپاؤنڈ کے وسط میں لے جا رہے تھے، وہ

لاٹیں تھیں۔ ان قیدیوں کے وہ ساتھی تھے جو گزشتہ رات زندگی کی اذیت سے نجات پا گئے تھے۔ رچرڈ یہ خوفناک منظر دیکھ رہا تھا کہ کسی طرف سے کاٹک کی آواز سنا دی دینے لگی۔ تمام قیدی اپنی اپنی جیرکوں کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ رچرڈ نے اپنے ساتھیوں کو جگا دیا اور وہ بھی دوسرے قیدیوں کی تقلید کرتے ہوئے اپنے ساتباں کے نیچے لائن لگا کر کھڑے ہو گئے۔ اس طرف محافظوں کے ہٹ کی طرف سے دو محافظ لڑکیاں ٹرائی دھکیلتی ہوئی اس طرف بڑھتی نظر آئیں۔ رچرڈ اور اس کے ساتھی دو نمبر بیرک میں تھے، لڑکیاں پہلی بیرک کے سامنے رک گئیں۔ ایک لڑکی راتفل منہ لے کھڑی رہی جبکہ دوسری لڑکی ٹرائی پر رکھے ہوئے پتیلے میں سے کوئی چیز ڈونگے سے نکال نکال کر اس بیرک کے قیدیوں کے سامنے برف پر ڈھیر کرنے لگی پلیٹ یا کسی برتن کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ وہ آنکھ قیدی تھے سب اس کھانے پر ٹوٹ پڑے تھے۔

دوسرے دن سوموار تھا۔ اس روز کیمپ میں ڈاک آیا کرتی تھی اور قیدیوں کے لیے یہ دن جتنے کا بدترین دن ہوتا تھا۔ کیمپ کی محافظ لڑکیاں اپنے نام آنے والے خطوط پڑھنے کے بعد ڈبعل کے اظہار پر زیادہ دیر نہیں لگاتی تھیں۔ یہ خطوط مختلف شہروں میں مقیم ان کے رشتے داروں کی طرف سے آتے یا شوہروں کی طرف سے جو کسی نہ کسی کی موت کی اطلاع ضرور ہوتی۔

”اور جب انہیں اپنے کسی رشتے دار کے مرنے کی اطلاع ملتی ہے تو یہ واقعی خونخوار بلیاں بن جاتی ہیں۔“

افسٹری آفیسر نے بتایا۔ دوسرے دن صبح سویرے ہی موزو اور اس کے ساتھیوں نے محافظ لڑکیوں کے روٹے میں تبدیلی محسوس کر لی اور ان کے سامنے برف پر کھانا بھیر دیا گیا۔ وہ غالباً چاول تھے جو کسی اور چیز میں ملا کر پکائے گئے تھے مگر ان چاولوں سے اس قدر بدبو اٹھ رہی تھی کہ اگر وہ کوئی لقمہ اٹھا کر منہ میں ڈال بھی لیتے تو اسے لگتا ان کے لیے دھبہ ہوتا، اس کے برعکس پڑانے قیدیوں نے زمین پر سے چاول کا ایک ایک دان صاف کر دیا تھا۔

موزو ویکپ کے دوسرے سرے پر بکڑی کے ان ہٹس کی طرف دیکھ رہا تھا جو کیمپ کی انچارج میڈم اوکاٹو اور دیگر محافظ لڑکیوں کے لیے مخصوص تھے، باہر سے دیکھنے پر

یہ ظاہر وہ ہٹ بھی اچھی حالت میں نظر نہیں آ رہے تھے مگر مونرو کو یقین تھا کہ وہاں زندگی کی ہر آسائش موجود ہوگی۔
دو پہر میں میڈم اوکاٹھو پتے ہٹ سے باہر نکلے، یہ ہٹ اس کے دفتر کے علاوہ ہاٹ گاہ کا کام بھی دے رہا تھا، وہ چند لمحے دروازے کے سامنے کھڑی بیٹھ گئی تھی اس کے اطراف میں دیکھتی رہی پھر بڑے بے تلتے قدم اٹھاتی ہوئی کیاؤنڈ کے وسط میں آکر رک گئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں چڑے کا کوزا تھا اور دوسرے ہاتھ میں میگ فون، جسے منہ سے لگا کر وہ چیختے ہوئے بولی۔

”امر کی کوتاہی! میری بات غور سے سنو۔ آج کی ڈاک سے ہمیں اطلاع ملی ہے کہ ہمارے بے شمار جوان امریکی بھیڑیوں کے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں لیکن میں تم لوگوں کو یقین دلانا چاہتی ہوں کہ ان جاپانیوں کی قربانی رائیگاں نہیں جانے کی اور ہم ان کے ایک ایک قطرہ خون کا بدلہ لیں گے۔“

اس کی تقریر ختم ہوتے ہی محافظ لڑکیاں ہاتھ والی دو گاڑیاں پیچتی ہوئی کیاؤنڈ کے وسط میں لے آئیں۔ یہ ”تھہ گاڑیاں“ گدھا گاڑیوں سے مختلف نہیں تھیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ انہیں گدھوں کے بجائے لڑکیاں پیچ رہی تھیں۔ کیاؤنڈ کے وسط میں پہنچ کر محافظ لڑکیوں نے گاڑیاں چھوڑ دیں ایک گاڑی میں میڈم اوکاٹھو اور دوسری میڈم یوکاٹھو سواری ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں بھی چڑے کا کوزا نظر آ رہا تھا۔ محافظ لڑکیوں نے دو قیدیوں کو ایک سائبان سے گھسیٹ کر نکال لیا اور انہیں کھینچے کا حکم دیا۔ وہ دونوں ڈھانچوں سے مختلف نہ تھے۔ ان کے لیے اپنے جسموں کا بوجھ گھینٹنا مشکل ہو رہا تھا لیکن وہ گاڑیاں کھینچنے پر مجبور تھے۔ وہ چوٹی کی رفتار سے گاڑیاں پیچ رہے تھے۔

دفن گاہ میں زمانے کی آواز ابھری۔ میڈم اوکاٹھو کے کوزے نے اس کی گاڑی کھینچنے والے قیدی کی پشت سے کھال اوجھیر دی تھی۔ یہ گویا میڈم یوکاٹھو کے لیے مسئلہ تھا۔ اس نے بھی اپنی گاڑی میں جے ہوئے قیدی پر کوزے برسائے شروع کر دیے۔ چابک پڑتے ہی قیدیوں کی رفتار بڑھ گئی۔ دونوں گاڑیاں پہلو پہلو برف پر دوڑنے لگیں۔

میڈم اوکاٹھو اور یوکاٹھو پگلوں کی طرح پیچ پیچ کر اپنی گاڑیوں سے جے ہوئے قیدیوں پر کوزے برسا رہی تھیں۔ وہ اس طرح پیچ رہی تھیں جیسے اس ریس سے پوری طرح محفوظ ہو رہی ہوں۔

دفن گاہ میں میڈم اوکاٹھو کی گاڑی والے قیدی کا برف پر پھسل گیا، اس میں اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ اپنے آپ کو گرنے سے بچا سکتا، وہ اونڈھا پڑا تھا کہ دوسری گاڑی کا پھپھاسا اس کے اوپر سے گزر گیا۔ قیدی کے گرنے سے گاڑی اُٹلتے اُٹلتے پیچ گئی۔ اس صورت حال نے میڈم اوکاٹھو پر جنون سا طاری کر دیا۔ وہ گاڑی سے پیچے کود آئی، اس نے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے کوزے کے دتے سے قیدی کی پسلیوں پر ضرب لگائی مگر وہ اپنی جگہ سے ہلاکت نہیں۔ میڈم نے اس کے جسم پر پھو کروں کی بارش کر دی مگر بے سود۔ قیدی کے جسم میں حرکت تک نہیں ہوئی۔

بالا خر میڈم اوکاٹھو پیچتی ہوئی وہاں سے ہٹ گئی۔ اس طرح یہ کھیل ملتوی ہو گیا۔

اگلے سو موٹر گاڑیوں پر چمپک کے قیدیوں کو یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ آج کی ڈاک سے کیمپ کے محافظ عورتوں کو یہ اطلاع مل گئی تھی کہ فیلا میں جاپانی فوجوں نے جنرل میک آر تھر کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے اور ایک اور محاذ پر میڈم اوکاٹھو کا پاجنس رجمنٹ کی کمان کر رہا تھا، امریکی فوج نے اس کا مکمل صفایا کر دیا تھا۔

اس مرتبہ اپنے وحشیانہ کھیل کے لیے میڈم اوکاٹھو نے مونرو اور اس کے ساتھیوں کا انتخاب کیا۔ اوکاٹھو اور یوکاٹھو نے تلتے قدم اٹھاتی ہوئی ان کے سائبان کے سامنے رک گئیں اور انہیں باہر نکلنے کا حکم دیا۔ وہ سب اپنے سائبان کے سامنے کھڑے ہو گئے اور میڈم اوکاٹھو اس طرح ان کا جائزہ لینے لگی جیسے قسائی بکروں کو دیکھ کر اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہو کہ کون سا اس کے لیے زیادہ منافع بخش ثابت ہو سکتا ہے۔ بالا خر میڈم نے رچرڈ اور سیکنڈ ریڈیو آفیسر برزرام کو لائن سے الگ کر لیا۔

”تم دونوں قدامت و قدامت میں ایک جیسے لگتے ہو، اپنی اپنی قیسیں اُتار دو۔“ میڈم نے حکم دیا۔ انہوں نے قیسیں اُتار دیں۔ وہ خاصے تندرست اور تومند تھے، میڈم کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔

”تم جیسے تومند اور مضبوط آدمیوں کی ضرورت تھی۔ پچرانے قیدیوں میں اب اپنے آپ کو سنبھالنے کی سکت بھی نہ رہی لیکن میں کہہ سکتی ہوں کہ آج کے مقابلے میں مزہ آ جائے گا۔“

محافظ عورتیں انہیں رائفلوں کے ہٹ مارتے ہوئے کیاؤنڈ کے وسط میں لے آئیں اور ایک بار پھر درندگی اور

بربریت کا ایک نیا مظاہرہ ہونے لگا۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ دونوں اس قابل بھی نہ رہے کہ اپنے قدموں سے چل سکتے، میڈم اوکاٹھو اور یوکاٹھو کے لیے اب ان میں کوئی دلچسپی کی بات نہ تھی۔ وہ دونوں اس کھیل کے اختتام کا اعلان کر کے رخصت ہو گئیں۔

رچرڈ کے چہرے، سر اور جسم کے ہر حصے سے خون بہہ رہا تھا اس نے سر جھٹکتے ہوئے برزرام کی طرف دیکھا جو اس سے بھی بدتر حالت میں تھا۔ وہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ ممکن ہے موسم کی بگ بگ ان کے زخموں کو انفیکشن سے بجالے لیکن اس کے ساتھ ہی انہیں توانائی کی ضرورت تھی جس کا حصول یہ ظاہر ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ رچرڈ سوچ رہا تھا کہ اگر مناسب خوراک کا انتظام نہ ہوا تو زیادہ سے زیادہ ایک مہینے کے اندر اندر وہ بھی پرانے قیدیوں کی طرح ڈھانچوں میں تبدیل ہو کر رہ جائیں گے اور اپنی جگہ سے حرکت کرنے کے قابل نہیں رہیں گے۔ انہیں خوراک حاصل کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔

لیکن سوال تو یہ تھا کہ خوراک کہاں سے آتی ہے؟ امریکیوں سے نفرت کیمپ کی محافظ عورتوں کے انتقامی جذبے میں شامل تھی۔ رچرڈ یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اگر انہیں زندہ رہنے کے لیے مناسب خوراک حاصل کرنا ہے تو اسے انہی عورتوں میں سے کسی ایک کو قابو میں کرنا پڑے گا۔

☆☆☆

دودن گزر گئے اور پھر بالا خر خصل اتفاق سے اسے وہ موقع مل گیا جس کا وہ منتظر تھا۔ اس روز حسب معمول ان کے سامنے کتوں کی طرح کھانا ڈالا جا رہا تھا۔ رچرڈ اپنی جگہ پر خاموش کھڑا محافظ لڑکی کو تیل میں سے چاول نکال نکال کر ان کے سامنے زمین پر ڈالتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ جب اس کی باری آئی تو برف پر لڑکی کا پیر پھسل گیا اور چاولوں سے بھرا ہوا مگار چرڈ کے پیر پر پلٹ گیا۔

”گومن ناسائی!“ لڑکی اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

لڑکی کے چہرے پر ندامت کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ محذرت کے ان سیدھے سادے الفاظ نے رچرڈ کے دماغ میں ایک جھماکا سا پیدا کر دیا۔ اور وہ یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اگر کیمپ کی خواتین اور محافظ لڑکیوں میں سے کسی کی ہمدردی حاصل کی جاسکتی ہے تو وہ یہی ہو سکتی ہے۔ کیمپ کے پچرانے قیدیوں سے رچرڈ کو اس محافظ لڑکی کا نام بھی

معلوم ہو گیا۔ وہ نام تھی، اس کا تعلق ہٹان کے ایک ایسے کلب سے تھا جہاں جاپانی فوجی افسر تفریح کے غرض سے جاتے تھے۔

رچرڈ تین دن تک گہری نظروں سے اس کی نقل و حرکت کا جائزہ لیتا رہا، وہ اس سے تنہائی میں بات کرنے کے لیے کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا، بالا خر اسے یہ موقع مل ہی گیا۔ اس روز ناما محافظوں والے ہٹس کے قریب ایک شیڈ میں اسٹاک کا جائزہ لے رہی تھی کہ رچرڈ بھی نہایت خاموشی سے ریٹنگا ہوا شیڈ میں داخل ہو گیا۔

”ناما.....!“

رچرڈ نے دھیرے سے اس کا نام لے کر پکارا، اس کے لہجے میں بے پرواہی تھا، اس ایک لفظ سے وہ ناما کو یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ وہ اس کی ہمدردی کا مستحق ہے۔

ناما اپنا نام سن کر چونک گئی۔ اس نے تیزی سے گھوم کر پیچھے دیکھا، رچرڈ کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھوں میں عجیب جھک ابھر آئی۔ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر رچرڈ کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور محتاط قدموں سے آگے بڑھتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔

سب کچھ رچرڈ کی توقع سے کہیں زیادہ آسان ثابت ہوا تھا، ناما، رچرڈ اور اس کے ساتھیوں کو چوری چھپے اضافی راشن فراہم کرنے لگی، کبھی وہ انہیں چاول پہنچا دیتی اور کبھی ڈبل روٹی وغیرہ۔

مارچ کا مہینا ختم ہوتے ہی برسات کا موسم شروع ہو گیا۔ اس سائبان کے علاوہ قیدیوں کے پاس سر چھپانے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ بارش کی تیز بو بھار میں وہ رات دن بھٹکتے اور سردی میں ٹھسٹے رہتے۔

اپریل کے وسط میں میڈم یوکاٹھو کا اطلاع ملی کہ اس کا شوہر اپنی ناوا کے محاذ پر امریکیوں کے ہاتھوں مارا جا چکا ہے۔ وہ ایک بلکر میں مشین گن سے فائر کر رہا تھا کہ دشمن کی توپ کا گولہ بلکر کے اندر آکر گر کر اور مشین گن کے ساتھ اس کے پیچھے پڑنے لگا۔

یوکاٹھو نے میڈم اوکاٹھو سے ”خکار“ کی اجازت مانگی جو بلا جھجک مل گئی۔ اس مقصد کے لیے یوکاٹھو نے لیفٹیننٹ مونرو کا انتخاب کیا تھا۔

قیدیوں کو کچھ علم نہ تھا کہ ان پر کیا قیامت ٹوٹنے والی ہے، وہ تو صرف ایک رات پہلے ناما نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی اور اشاروں کی زبان میں رچرڈ کو بتا دیا تھا کہ

اپنے شوہر کی موت کا انتقام لینے کے لیے یوکا کیا منصوبہ بنا رہی ہے۔

دوسرے دن صبح دو محافظ لڑکیاں مونزو کو گھسیٹتی ہوئی میدان کے وسط میں لے گئیں اور مونزو کو کچھ سوچنے کا موقع دینے بغیر خونخوار بلیوں کی طرح اس پر جھپٹ پڑیں۔ مونزو کی ٹیٹھیں تار تار ہو گئیں۔ لڑکیوں کے نوکیلے ناخنوں سے اس کے چہرے اور جسم پر گہری خراشیں آگئی تھیں جن سے خون رسنے لگا۔ ایک لڑکی نے اس کے گلے میں جھکوتی ہوئی ٹیٹھیں بھجھک کر دوہرے چمک دی پھر وہ دونوں رائفلیں تان کر دوہرے کھڑی ہو گئیں۔ اب یوکا کی باری تھی، وہ قہر برساتی لگا ہوں سے دھمکتی ہوئی آگے بڑھی، اس کے اشارے پر دو محافظ لڑکیوں نے مونزو کے بازو پشت پر جکڑ لیے، یوکا کے پاس اس وقت کسی قسم کا کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ اس نے مونزو کی طرف جھکتے ہوئے اچانک ہی اپنی انگلیاں اس کی ایک آنکھ میں گاڑیں۔ مونزو بلبلاتا تھا۔ یوکا نے ہاتھ کو زوردار جھٹکا دیا۔ مونزو کی آنکھ کا ڈیلا (Eye ball) گویا ابل کر اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ چند سیکنڈ بعد وہ مونزو کی دوسری آنکھ بھی نکال چکی تھی۔

مونزو اس گروپ کا طاقت ور ترین آدمی تھا۔ پہلی آنکھ نکلنے وقت اس کے منہ سے بس ایک چیخ نکلی تھی، اس کے بعد پھر اس نے آف تک نہ کی۔ جبکہ یوکا اس سے کسی خاص رد عمل کی توقع کیے ہوئے تھی، اسے یقین نہ آیا کہ مونزو اس طرح خاموشی سے یہ اذیت برداشت کر جائے گا۔ اس کی قوت برداشت نے یوکا کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ اس نے ایک محافظ لڑکی سے رائفل چینی اور چھینے ہوئے رائفل کی سنگین سے مونزو کے بازوؤں اور ٹانگوں پر وار کرنے لگی۔ سنگین آٹار کر رائفل چمک دی اور قسانی کی طرح مونزو کے جسم سے گوشت کے ٹکڑے کاٹ کر پھینکنے لگی۔ مونزو کے جسم سے خون بہہ رہا تھا لیکن اس کے منہ سے اب تک کوئی آواز نہیں نکلی تھی۔ اس نے اپنے ہونٹ سختی سے بچھڑ رکھے تھے۔ اس کا ایک بالائی دانت نچلے ہونٹ میں پھوست تھا جس سے خون بہہ رہا تھا۔ یوکا اب بھی بربریت کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ مونزو چیخے کر گیا۔ یوکا کا جنون اس وقت کم ہوا جب اسے احساس ہوا کہ وہ ایک لاش پر سنگین چلا رہی ہے۔

اس واقعے کے ایک ماہ بعد سارجنٹ میٹ ٹیلر نے کیپ کے خاددار تاروں کو پچاند کر فرار ہونے کی کوشش کی

مگر اسے بھی اسی طرح اذیتیں دے دے کر ہلاک کر دیا گیا کیپ کے قیدی لڑا اٹھے۔ اس کے چند روز کے بعد جہاز کے کن پورٹر نے میڈم اوکاسو پر حملہ کر دیا، اس کا شاید دماغ چل گیا تھا۔ دو محافظ لڑکیوں نے اسے سنگینوں کے پکڑے دے دے کر میڈم اوکاسو سے الگ کیا اور میڈم اوکاسو نے ایک بھی لوطہ ضائع کیے بغیر پورٹر کے سر میں گولی اتار دی۔

جنون کے شروع میں جب تک میں اوکی ناوا کے سقوط کی بازگشت سناتی رہی تو رچڑ کے دل میں بھی امید کی کرن جگمگا اٹھی، اسے یقین تھا کہ اوکی ناوا کے بعد اب فارموسا کی باری آئے گی۔ اس میں چند مہینے بھی لگ سکتے تھے اور اس دوران انہیں صبر و استقامت کا مظاہرہ کرتے ہوئے سب کچھ برداشت کرنا تھا۔

پھر وہ ہوا جس کا رچڑ کو خطرہ تھا۔

کیپ کے چکن سے راشن کی چوری کا راز پوشیدہ نہ رہ سکا۔ میڈم اوکاسو نے چکن کی عمرانی شروع کر دی اور ایک روز نامہ راشن جاتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑی گئی۔ پہلے تو ناوا سے ویسے ہی پوچھ گچھ کی جاتی رہی لیکن اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ راشن کس کے لیے چرایا کرتی تھی پھر اسے گھسیٹ کر میدان کے وسط میں لے آ گیا اور تمام قیدیوں کے سامنے اس پر تشدد کرتے ہوئے اصل بات معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی رہی۔ ناوا کا جسم خون سے تر ہو رہا تھا۔ وہ چیخ رہی تھی مگر اس کی زبان نہیں کھل سکی۔ بہر طور اسے بے ہوشی کی حالت میں وہاں سے ہٹا دیا گیا اور اس کے بعد ناوا کی صورت دکھائی نہیں دی۔ اس کے ساتھ ہی رچڑ اور اس کے ساتھیوں کو اضافی راشن کی فراہمی کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ دوسری طرف امریکی فضائیہ کے بمبار طیارے جاپانیوں کی پیش قدمی لائیں کاٹ چکے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کیپ میں بھی راشن کی قلت پیدا ہو گئی۔ مزید برآں جنون کی چھلانگیوں نے بھی ان کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ برف پگھلنے کے بعد کیپ میں بڑی ہولی لاشوں سے مزین آٹھنے لگی۔ اگست کے شروع میں قیدیوں کی حالت انتہائی خستہ ہو چکی تھی۔ رچڑ بلا خراس تھپتھپے پر پہنچا کہ بے بسی کی موت مرنے کے بجائے انہیں کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ اس روز میڈم اوکاسو کے ہٹ کے قریب سے گزرتے ہوئے وہ ٹھنک گیا۔ اندر سے آنے والی کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو نے اس کے سوچنے بچھنے کی تمام قوتیں سلب کر ڈالیں اور وہ

رہکتا ہوا دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ دروازہ مقل نہیں تھا۔ وہ نہایت آہستگی سے اندر دیکھ گیا، اندر پہنچنے کے بعد ہی اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا تھا لیکن اب سوچنے کا وقت گزر چکا تھا۔ میز پر مختلف قسم کے کھانے لگے ہوئے تھے جن کی خوشبو اس پر حرم طاری کر رہی تھی لیکن میڈم اوکاسو بھی ہٹ میں موجود تھی۔ اس کا منہ دوسری طرف تھا۔ رچڑ نے دروازہ مقل کر دیا اور رہکتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ معمولی سی آہٹ سن کر میڈم اوکاسو تیزی سے گھوم گئی، رچڑ کو دیکھ کر اس کا چہرہ ایک لمحے کو خستہ ہوا اور دوسرے ہی لمحے اس نے دیوار پر ٹکے ہوئے ہوش کی طرف چلا ٹک لگا دی۔ ہوش سے ریوا اور نکلتے ہوئے اس نے پیری کیٹھوکر سے کھانے کی میز الٹ دی۔

ہوش سے ریوا اور پہنچنے ہی اس نے یکے بعد دیگرے تین فائر کر دیے مگر بدحواسی میں اس کی کوئی بھی گولی نشانے پر نہیں لگی تھی۔ اسے بڑی شدت سے یہ احساس ہو رہا تھا کہ میڈم اوکاسو کی بدحواسی دیکھ کر رچڑ کے ذہن میں شاید یہ شیطانی خیال ابھر اہو کہ اگر وہ اوکاسو کی انا کو مجروح کر سکتے تو.....

شاید یہی سوچ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک بن کر ابھر آئی تھی۔ میڈم اوکاسو نے ایک اور فائر کیا مگر نشانہ اس مرتبہ بھی خطا گیا۔ اس کے ساتھ ہی رچڑ نے چلا ٹک لگا دی۔ دنیا کی سفاک ترین عورت میڈم اوکاسو بے بس چڑیا کی طرح رچڑ کی گرفت میں تھی۔ رچڑ پر جنون سا طاری تھا۔ فائرنگ اور میڈم کی چیخوں کی آواز سن کر محافظ لڑکیاں ہٹ کے باہر جمع ہو چکی تھیں اور زور زور سے دروازہ دھڑ دھڑایا جا رہا تھا مگر رچڑ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس پر تو جنون طاری تھا۔ اس نے میڈم اوکاسو کو نیچے گرا کر اس کے منہ میں کپڑا ٹھوس دیا تھا۔ انتقام کا جذبہ اب بھی شدید تھا۔

اس نے میڈم کے جسم پر گھونسلوں اور ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ ممکن ہے وہ اسے جان ہی سے مار ڈالتا لیکن اس لمحے محافظ لڑکیاں دروازہ توڑ کر اندر آئیں۔ وہ رچڑ کو بڑی مشکل سے گرفت میں لینے میں کامیاب ہو سکی تھیں۔ میڈم اوکاسو کے چہرے پر لاتعداد خراشیں تھیں۔ ہونٹوں سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ دو محافظ لڑکیوں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا تو وہ ہونٹوں کا خون پونچھتے

ہوئے عمرانی۔

”تم امریکی کتے! تمہاری یہ جرأت۔ تمہیں اس جرم کی اتنی بھیاں کس مزاحمتوں کی کہ تمہاری چیخوں سے آسمان تک کانپ اٹھے گا۔“

میڈم اوکاسو، میڈم یوکا اور میڈم باردا دکامات جاری کرتی رہی۔ رچڑ کو ہٹ سے باہر لایا گیا۔ تین محافظ لڑکیوں نے اپنی رائفلیں اس کی پشت سے لگا رکھی تھیں۔ کیپ کے آخری سرے پر خاددار تاروں کے قریب اسے روک لیا گیا۔ اس جگہ کے قریب ہی جھنگ کے دوسری طرف گندگی کا ایک جوڑ تھا۔ رچڑ کے ہاتھ میں ایک ہیکپا دے کر گڑھا کھودنے کا حکم دیا گیا۔ تین رائفلوں کے سائے میں وہ گڑھا کھودتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس کے سامنے پانچ گھنٹے تک گڑھا کھودتے رہے، ان میں جو بھی ذرا سستی دکھاتا، میڈم یوکا کا ہنراس کی کھال اوجھڑا ڈالتا۔

توفٹ کی گہرائی میں پہنچنے کے بعد پانی نکل آیا، اس کے باوجود وہ گڑھا کھودتے رہے۔ بدیوار پانی تیزی سے گڑھے میں بھر رہا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد جب پانی پنڈلیوں تک پہنچ گیا تو انہیں ریتوں کے ذریعے باہر نکال لیا گیا۔

قیدیوں کو دو محافظوں کی عمرانی میں ان کی ہیرک میں واپس پہنچا دیا گیا اور میڈم یوکا کے حکم پر چار محافظ لڑکیاں جھنگ کے دوسری طرف جوڑ کے بدیوار پانی سے پالٹیاں بھر بھر کر اس گڑھے میں اٹھنے لگیں۔ ان کا یہ کام تقریباً ایک گھنٹے جاری رہا۔ پھر اطلاع پا کر میڈم اوکاسو بھی اپنے ہٹ سے نکل کر وہاں پہنچ گئی۔ رچڑ کی ٹیٹھیں چھڑا کر اس کے جسم سے الگ کر دی گئی اور پھر اسے اور اس کے ساتھیوں کو دھکیلے ہوئے گڑھے کے قریب لے آیا گیا۔ اس وقت تک تقریباً چار فٹ پانی جمع ہو چکا تھا۔

میڈم اوکاسو چند لمحے خونخوار نگاہوں سے رچڑ کی طرف دیکھتی رہی پھر مٹی خیر انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔ ”لگتا ہے تم بہت اچھا کھانا کھاتے ہو امریکی کتے! آج میں نے تمہارے لیے ایک بہت خاص ڈش تیار کرانی ہے۔ اسے ہماری زبان میں لٹغای کہا جاتا ہے۔“

میڈم اوکاسو بات کرتے ہوئے رچڑ کے قریب آ گئی تھی۔ آخری الفاظ منہ سے نکالتے ہی اس نے رچڑ کو دھکا دیا۔ رچڑ فل بازی کھاتا ہوا گڑھے میں گر گیا۔ پانی اس کی کمر تک پہنچ رہا تھا۔ ابھی وہ پوری طرح سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ کمر اور ٹانگوں پر سوہیاں کی چھتی ہوئی محسوس کرنے



دشمن

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

انسان اور جانور میں ایک خاص فرق ہوتا ہے جسے آدمیت کہتے ہیں۔ آدمیت معراج ہے انسان کی۔ وہ بھی خود کو اس مقام پر لے آیا تھا۔ اس نے ثابت کر دکھایا کہ انسان ظلم سے نہیں ترحم کے جذبے سے مالا مال ہوتا ہے۔

شبنم کی خشکی جیسے فسون ساز جذبیوں کی روداد

تھی، یہی سبب تھا کہ دور برے تک بھی گھاس پر چبھی ہوئی۔ وہ بستر سے اٹھا اور کافی کا برتن چولہے پر چڑھا کے کھڑکی کی طرف آگیا۔ صبح دیر سے نمودار ہو رہی تھی، ابھی سبب تھا کہ دور برے تک بھی گھاس پر چبھی ہوئی۔ وہ بستر سے اٹھا اور کافی کا برتن چولہے پر چڑھا کے کھڑکی کی طرف آگیا۔ صبح دیر سے نمودار ہو رہی تھی،

لگا۔ وہ پانی میں ہاتھ ڈال کر کمر سہلانا لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا دل مچھل کر قلع میں آگیا۔ کوئی چیز اس کے جسم سے چپکی ہوئی تھی جسے اس نے نوح لیا پھر اپنے ہاتھ میں تقریباً پانچ انچ لمبی جو تک دیکھ کر اسے اپنے سینے میں اپنا سانس رکھتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ ایک جو تک اس کے پیٹ پر چپک گئی تھی جسے کوشش کے باوجود وہ نونچے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا اور پھر تو اسے محسوس ہوا جیسے پیٹ سے نیچے جسم کے ہر حصے پر پشتر چل رہے ہوں۔

جو تکیں اب اس کی کمر اور پیٹ پر رینگتی ہوئی جسم کے ہر حصے پر پھنچ رہی تھیں اور وہ بڑی آزادی سے اس کا خون پوس رہی تھیں۔ رچڑچڑھتا ہوا گڑھے کی دیواری کی طرف لپکا اس نے اوپر چڑھنے کی کوشش کی مگر چپکی مٹی پر اس کے ہاتھ پھسلے رہے۔ اس نے بے بسی سے اوپر دیکھا، اس کے سامنے گڑھے کے کنارے پر کھڑے نیچے دیکھ رہے تھے۔ ہر چہرہ خوف و دہشت کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹا گزر گیا۔ رچڑچڑھنے اپنے جسم سے جو تکیں نوجھتا پانی میں ناچتا رہا۔ اس نے ایک بار پھر اوپر دیکھا۔ اس مرتبہ اسے کوئی محافظ لڑکی دکھائی نہیں دی تھی۔ البتہ اس کا ایک ساتھی گڑھے کے کنارے پر لیٹا اپنا ہاتھ نیچے لارہا تھا۔ رچڑچڑھنے پوری قوت کے ساتھ مچھل کر اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی۔ ان کی انگلیاں مٹس ہوئیں مگر دونوں میں سے کوئی بھی کسی کے ہاتھ پر گرفت نہ جماسکا۔ بالآخر تیسری کوشش میں وہ مائز کا ہاتھ پکڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے ایک اور ساتھی کو بر نے فوراً ہی زمین پر لیٹ کر اس کا دوسرا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے مچھل تان کر گڑھے سے باہر نکال لیا۔

ہوا اور کھوپ کے باعث اس کے جسم پر جو تکوں کی گرفت کچھ ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ رچڑچڑھنے اور اس کے ساتھی اس کے جسم سے جو تکیں نوح نوح کر پھینکتے رہے۔

”سگ..... کیا ہوا.....؟“ یہ..... یہ غوغا کر لیاں یہاں سے کیوں چلی گئیں؟“ رچڑچڑھنے حواس بحال ہونے کے بعد اپنے ساتھیوں کو دیکھا۔

”پ..... کیا نہیں۔“ مارٹ بولا ”کچھ دیر پہلے ایک کار گیٹ پر آ کر رک گئی تھی، نیچے اترنے والے ایک جاپانی فوجی نے چنچ کر انہیں بلایا تھا شاید اس کے ساتھ کچھ اور بھی تھے، تمام لڑکیاں دوڑتی ہوئی کار کے قریب چلی گئیں۔ وہ لوگ اب بھی گیٹ کے پاس جمع ہیں۔“

©

تھا، ولسن نے ایک اونٹنی کبل اوڑھ لیا تھا۔ مختصر سے کچن میں چلا ہوا چولہا بھی کیمین کی سردی کم کرنے میں ناکام ثابت ہو رہا تھا۔

ولسن ذرا دیر تک کھڑا کھڑکی کے باہر دیکھتا رہا پھر دوسرے کمرے میں آ گیا۔ یہاں دیوار پر ایک بندوق لٹک رہی تھی، اس نے بندوق اتاری اور میز پر رکھ دی جہاں پہلے سے کارٹوسوں کا ایک ڈبا بھی رکھا ہوا تھا، وہ باہر جانے کے لیے اب تیار تھا۔ دفعتاً شوں... شوں کی سنسنائی آواز کیمین میں ابھری ساتھ ہی ایک مخصوص خوشبو پھیلی، چولہے پہ رکھی کافی تیار تھی۔

گرما گرم کافی پینے کے بعد اس نے میز پر سے بندوق اٹھالی، شت باندھ کر اس کی چال اور نشانے کا اندازہ کیا پھر اس کے اندر کارٹوس بھرنے لگا، ٹھوس چھڑوں والے کارٹوس بندوق میں بھرنے کے بعد باقی کارٹوس اس نے جیب میں ٹھوس لیے اور باہر آ گیا۔

خون کو برف بنا دینے والی سردی نے اس کا استقبال کیا، وہ سرتاپا ہٹس کر رہ گیا۔ وہ تیز قدموں سے چلا ہوا اس چھپر تلے آ گیا جدر اس کی جیب کھڑی تھی۔ وہاں پہنچ کر اس نے ہر چیز کا بہ غور معائنہ کیا، سب ٹھیک تھا۔ رسیاں، بندوق، لکڑی کا بلاک، غرضیکہ ہر وہ شے جو شکار میں مستعمل ہو سکتی تھی، اس کے پاس شکار کا لائنس بھی تھا جسے اس نے اپنے سیٹ کے ساتھ ہی منسلک کر رکھا تھا تاکہ دور سے ہی دکھائی دے جائے۔

وہ اپنی جیب میں سوار ہوا اور اسے اشارت کر کے احاطے سے باہر لے آیا۔ اس وقت اس نے ایک اور جیب کی آواز بھی سنی۔ یہ جیب ہنری ہی کی ہو سکتی تھی۔ وہ بھی اس کی طرح شکار پر روانہ ہو رہا تھا۔ ہنری اس سے کچھ فاصلے پر رہتا تھا۔ اس وقت کھڑکی کھری تھی کہ ولسن کو اپنی جیب کی فلیش لائٹ روشن کرنا پڑی تھی۔ اس نے پیچھے سے آئی ہوئی دو روشنیاں دیکھیں۔ یہ روشنیاں ہنری کی جیب کی ہو سکتی ہیں۔ اس نے کچھ سوچ کر اپنی جیب کی رفتار بڑھا دی۔ وہ ہنری کے ساتھ مل کر شکار نہیں ٹھیکنا چاہتا تھا۔

کچھ دور آنے کے بعد کھجٹ گئی۔ اب اتنی روشنی... ہو گئی تھی کہ اس نے اپنی جیب کی ہیڈ لائٹس بجھا دیں۔ وہ شکار یوں کے ایک کیمپ کے برابر سے گزرا۔ شکاریوں نے اسے دیکھ کر ہاتھ ہلانے لیکن اس نے اپنی جیب کی رفتار کم نہیں کی۔ وہ ان کی طرف جواں ہاتھ ہلاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

کچھ دور جانے کے بعد وہ سڑک بلند ہوتی تھی۔ اس کی جیب کے برابر سے اور بھی گاڑیاں گزریں، جو یہ ظاہر کر رہی تھیں کہ اب یہ سڑک اچھی خاصی مصروف ہو گئی ہے۔

ولسن اپنی جیب دوڑاتا ہوا بلند پرلے آیا جہاں ایک کیمپ لگا ہوا تھا اور اس کیمپ کے باہر تین آدمی بیٹھے ہوئے آگ تپ رہے تھے۔ یہاں چلنے والی ہوا اچھی خاصی سرد تھی۔ ولسن نے اپنی جیب ان شکاریوں کے قریب لاکر روک دی اور خود جیب سے آتر کر ان کے پاس پہنچ گیا۔

”اس سال تم جلدی نہیں آگے ولسن! کیا بات ہے؟“ ایک شکاری نے اس کی طرف کافی بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ”ہنری کا کیا حال ہے، کیا وہ بھی آچکا ہے؟“

”ہاں، وہ بھی زیادہ دور نہیں ہے۔“ ولسن نے بتایا اور گرم کافی کی چسکیاں لینے لگا۔ وہ تین بیس برس کی عمر کا ایک خوب رو آدمی تھا۔ اس کے بال سیاہ تھے اور جسم کم بناوٹ مضبوط تھی۔

”اس بار صورت حال کیا ہے ڈک؟“ اس نے شکاری سے دریافت کیا۔

”پنیر نے آج سویرے سویرے ایک بارہ ٹنگے کو مارا ہے۔“ اس آدمی نے بتایا۔ جس کا نام ڈک تھا۔ ”اب وہ اس کی کھال اتارنے میں مصروف ہے۔“

ولسن نے اس طرف نگاہ کی جدر ڈک نے اشارہ کیا تھا۔ وہاں سے کچھ فاصلے پر ایک درخت کی شاخ سے بارہ ٹنگے کی لاش لٹکی ہوئی تھی اور دو آدمی کیمپ کی طرف آرہے تھے۔ ان دونوں کے لباس پر خون کے دھبے تھے، خون، ان کے ہاتھوں پر بھی تھا جواب تم چکا تھا۔ وہ دونوں بھی آگ کے پاس آکر بیٹھ گئے۔ ان میں ایک پنیر تھا اور دوسرا گریت۔

تین نچے وادی والی سڑک سے کسی گاڑی کے آنے کی آواز سنا دی۔

”میرا خیال ہے کہ ہنری بھی آپہنچا ہے۔“ پنیر نے کہا۔ ”کیا تم دونوں اس سال ایک ساتھ شکار کھیلنے کا پروگرام بنا رہے ہو؟“

”نہیں، ابھی تک تو میں نے ایسی کوئی بات نہیں سوچی ہے۔“ ولسن نے جواب دیا۔

ہنری بھی اوپر پہنچ چکا تھا اور اس نے اپنی جیب کیمپ سے کچھ فاصلے پر لاکر کھڑی کر دی تھی۔ اب وہ جیب سے آتر کر ان لوگوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔

وہ ایک مضبوط جسامت کا آدمی تھا جس کے سر کے بال اڑے ہوئے تھے، اس کے جڑے بہت بھاری تھے، وہ دیکھنے ہی سے ایک سخت گیر آدمی معلوم ہوتا تھا۔ الاؤ کے پاس آکر اس نے خود ہی اپنے لیے ایک پیالی میں کافی اٹلی اور آگ کے قریب بیٹھ گیا۔ ان کے درمیان کچھ دیر تک خاموشی رہی پھر ہنری نے بڑی احتیاط کے ساتھ اپنی بندوق ایک طرف رکھ دی۔ ولسن نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ایسا لگتا ہے جیسے تم آدھی رات کو ہی چل پڑے تھے؟“

”سیدھی سی بات ہے۔“ ہنری نے کافی کے دو گھونٹ بھرنے کے بعد بیانی ایک طرف رکھ دی۔ ”اس شرط میں تمہارا ہی فائدہ ہے، اس نے تمہاری زندگی اجیرن کر دی ہے۔ تمہارا باغ آج اڑا ڈالا تمہارے تنوں کو ہلاک کیا اور گیراج میں بھی توڑ پھوڑ مچا دی تھی۔ اگر میں اسے ہلاک کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہوں تو اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے کیونکہ میں جانتا ہوں، اسے مارنا اب تمہارے بس کا روگ نہیں ہے۔ وہ تم سے کہیں زیادہ جالاک ہے۔“

”نہیں میں اسے مار لوں گا کیونکہ میں اس کے حملوں کی ترکیبیں سمجھ گیا ہوں۔“

”مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے ولسن اسے مارنا ہی نہیں چاہتا۔“ ڈک نے پائپ سلگاتے ہوئے کہا۔ ”اگر میں اسے مارنا چاہتا تو کب کا مار چکا ہوتا۔“

”یہ بات نہیں ہے۔“ ولسن نے کہا۔ ”وہ میرے سامنے آئے بھی تو... تمہارا کیا خیال ہے کہ میں اتنے نقصانات کے بعد اس کے وجود کو برداشت کر سکتا ہوں؟ پچھلے سال اس نے میرے گھوڑے کے پیٹ میں اپنا سینک اتار دیا تھا جس کے نتیجے میں مجھے گھوڑے کو گولی مارنا پڑی۔“

پھر اس نے آسمان کی طرف دیکھا جہاں بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تیرتے پھر رہے تھے، کہیں کہیں پر یہ بادل ایک دوسرے سے مل بھی گئے تھے۔ ”ہاں! اس موسم میں وہ ہمیشہ باہر نکلتے ہیں اس بار بھی ضرور آئے گا۔“

”وہ تمہیں ستانے پر تلا ہوا ہے ولسن! جانوروں کی وحشی بڑی گندی ہوتی ہے۔“ پنیر نے کہا۔ ”اور میں سمجھتا ہوں کہ تم اور وہ ایک دوسرے کے سخت جانی دشمن ہونے کے باوجود کسی کو مارنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔“

پنیر کی بات سن کر ولسن کا چہرہ سرخ ہو گیا لیکن وہ صرف پہلو بدل کر رہ گیا تھا۔

”مجھے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔“ ہنری نے کہا۔ ”شاید تم اسی لیے میرے ساتھ شکار نہیں کھیتے، تمہیں ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں میں اسے گولی نہ مار دوں، شاید اسی لیے کہ تم نہیں چاہتے ہو کہ تمہارے دشمنوں کی ہلاکت میرے ہاتھوں ہو، کیوں؟“

”نہیں، مجھے اس بات کا ڈر نہیں ہے، چاہے تم کچھ بھی کر رہو۔“

وہ دونوں کچھ دیر تک ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے پھر ولسن نے اپنی سگریٹ سلگائی۔ دو چار گہرے گہرے کش لینے کے بعد اس نے ہنری کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”میں کل صبح سویرے شکار کے لیے چل دوں گا، تم جو مناسب سمجھو کرو۔“

”میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔“ ہنری نے کہا۔ ”تم مجھے روک نہیں سکتے۔“

”آخر تم میرے ہی ساتھ کیوں جانا چاہتے ہو؟“ ولسن نے جڑ بڑھ کر پوچھا۔

”میں تمہیں ایکشن میں دیکھنا چاہتا ہوں۔“ ہنری نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”تمہیں شکار کرتے ہوئے دیکھ کر مجھے خوشی ہوگی کیونکہ تم ایک ماہر شکاری ہو لیکن میں اتنا ضرورتاً دینا چاہتا ہوں کہ تم چاہے کتنی ہی کوشش کر لو لیکن اس بارہ ٹنگے کو میں ہی ہلاک کروں گا تم مجھ سے اس بات پر شرط بھی لگا سکتے ہو۔“

”میرا خیال ہے کہ تمہیں بارہ ٹنگے کو مارنے سے زیادہ مجھے شکست دینے میں دلچسپی ہے، کیوں؟“

ہنری نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے ہونٹوں کو دانتوں سے دبا کر رہ گیا تھا۔

☆☆☆

ان لوگوں نے وہ دن اس کیمپ میں گزارا، رات ہونے پر دوبارہ الاؤ روشن کر دیا گیا۔ شکاری اس الاؤ کے گرد بیٹھ کر اپنے اپنے شکار کے قے ستانے لگے۔ دوسری صبح ان لوگوں کو شکار کے لیے روانہ ہو جانا تھا۔ اس رات بھی خاصی سردی تھی۔ الاؤ کے پاس کبل اوڑھ کر لینے کے باوجود ان میں سے ہر شخص سردی سے کانپ رہا تھا۔

دوسری صبح ہنری کی آنکھ کھلی تو روشنی ابھی نمودار نہیں ہوئی تھی لیکن ولسن الاؤ کے پاس بیٹھا ہوا کافی پی رہا تھا۔ وہ شکار پر روانہ ہونے کے لیے بالکل تیار تھا۔ ہنری اس کے پاس آ گیا۔

”کیوں؟“ اس نے لسن کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔
”ہاں، میں نے کافی ختم کر لی ہے اور اب یہاں سے جا رہا ہوں۔“ اس نے کافی کی پیالی ایک طرف رکھ دی اور کھڑا ہو گیا۔

ہنری اس وقت تیار نہیں تھا، اس لیے وہ چیخا چلا تارہ گیا جبکہ لسن بڑے آرام سے اپنی جیب کی طرف آیا، جیب میں بیٹھا اور ایک جھٹکے سے اسے اشارت کر دیا۔
دو گھنٹے کے سفر کے بعد وہ ایک ایسی جگہ پر پہنچ چکا تھا جہاں گھاس اور پودے بہت کم دکھائی دے رہے تھے، ارد گرد چٹانیں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس نے اپنی جیب ایک طرف کھڑکی کی، بندوق اٹھائی اور ایک بڑے سے پتھر کے عقب میں جا کر بیٹھ گیا۔ وہ اس علاقے سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔ اب سے پانچ برس پہلے اس نے اسی جگہ سے اس بارہ سکھے پر گولی چلائی تھی لیکن وہ بارہ سکھا اس کے حملے سے بچ نکلا تھا۔ اس کے بعد یہ ہر سال کا معمول بن گیا تھا۔ وہ ہر سال یہاں آتا اور اس بارہ سکھے کی تلاش میں ناکام ہو کر واپس چلا جاتا۔

پہلی گولی چلانے کے بعد سے اب تک اس کے اور اس بارہ سکھے کے درمیان ایک قسم کی جنگ جاری تھی اور اس کی ابتداء اس بارہ سکھے ہی نے کی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ لسن سے انتقام لینے کے لیے بے چین ہو رہا ہو، وہ انتہائی ذہانت سے اس کی جیب کا تعاقب کرتے ہوئے اس کے کالج تک پہنچ گیا تھا۔ اس نے ان برسوں میں لسن کو بے شمار نقصانات پہنچائے تھے، وہ کسی بلا کی طرح لسن کے پیچھے پڑا ہوا تھا اور لسن اسے ہلاک کرنے کی کوشش میں ناکام تھا۔ وہ اگر دکھائی بھی دیتا تو گولی چلانے سے پہلے ہی کسی چھلاوے کی طرح لگا ہوں سے اوجھل ہو جاتا۔

وہ بہت دیر تک اس پتھر کے عقب میں بیٹھا بارہ سکھے کا انتظار کرتا رہا۔ لسن کا تجربہ تھا کہ وہ بارہ سکھا اس کی اطراف میں دکھائی دیا کرتا تھا۔ اس وقت موب نکل چکی تھی اور دن کی روشنی میں دور دور تک بے آسانی دیکھا جاسکتا تھا۔ ہوا چٹانوں سے ٹکرا کر ہلکا سا شور پیدا کر رہی تھی۔ لسن نے ہنری کے بارے میں سوچا۔ وہ اس وقت نہ جانے کہاں ہوگا، ہو سکتا ہے وہ بھی میرے پیچھے ہی چل پڑا ہو اور اس وقت کہیں آس پاس ہی موجود ہو اور اس کی طرح بارہ سکھے کو نشانہ بنانے کی ناک میں بیٹھا ہوا ہو، لسن کو معلوم تھا کہ وہ

اس بارہ سکھے کو نشانہ بنانے کے بعد یہ سوچ کر خوش ہوتا رہے گا کہ اس نے میرا شکار جھین لیا۔ وہ بنیادی طور پر اسی مزاج کا آدمی تھا، ہونہر۔

ایک ہی جگہ بیٹھے بیٹھے اس کے اعصاب اکڑنے لگے تھے۔ لیکن وہ ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس غفلت میں اس کی تو بین تھی، اس کی ذرا سی غفلت سے وہ بارہ سکھا اس کی زد میں آکر پھر نکل سکتا تھا۔ یہ اس کے اور بارہ سکھے کے درمیان جنگ تھی اور وہ انسان ہونے کے حوالے سے اس جنگ میں شکست برداشت کرنے کو تیار نہ تھا۔ اسے ہر حال میں اس بارہ سکھے پر اپنی برتری ثابت کرنا تھی، یہی اس کی نگاہوں کے سامنے ایک متحرک دھماکا سا اُبھرنا شروع ہوا۔ بہت دیر سے دھیرے دھیرے وہ نمایاں ہونے لگا۔ لسن مستعد ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے جان لیا کہ وہ دھماکا دراصل وہی بارہ سکھا ہے، جو اپنے خفیہ ٹھکانے سے نکل کر کسی طرف جا رہا ہے۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے اس کی رفتار بہت کم معلوم ہو رہی تھی لیکن لسن کو اندازہ تھا کہ وہ تیز طرار جانور اس وقت کتنی احتیاط کا مظاہرہ کر رہا ہوگا۔ وہ کچھ ایسا ہی ذہین تھا۔

لسن نے اوپر دیکھا۔ نیلے آسمان پر بادل دکھائی نہیں دے رہے تھے، لیکن ہوا ابھی تک سرد تھی۔ اس نے دوبارہ اپنی نگاہیں اس بارہ سکھے کی طرف بجا دیں۔ وہ اب بہت قریب آچکا تھا۔ شکار اپنی احتیاط پسندی کے باوجود دھیرے دھیرے نشانے پر آتا جا رہا تھا۔

اس نے اپنی انگلی ٹریگر پر رکھ لی پھر اس وقت کچھ سوچ کر وہ اپنی گردن ہلانے لگا۔ اس نے جھپٹی بارائے فاصلے سے بارہ سکھے پر گولی چلائی تھی لیکن اس کا نشانہ خلا گیا تھا۔ اس بارہ سکھے کی قسم کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کا نشانہ اتنا سچا ثابت ہو کہ وہ چالاک جانور دوسری سانس ہی نہ لے سکے لیکن اس کے لیے اسے اتنے فاصلے تک آنے کا موقع دینا ضروری تھا جہاں سے اس پر درست نشانہ لگایا جاسکے۔ اس نے کچھ اور اوپر جانے کا فیصلہ کر لیا۔

اس نے بندوق اپنے شانے سے لٹکائی اور دھیرے دھیرے اوپر چڑھنے لگا۔ بہت آہستگی کے ساتھ لیکن بدقسمتی سے اس کا تجربہ ٹھیک تھا اور ایک پتھر اس کی ٹھوک سے لڑھکتا ہوا نیچے جا گرا۔ اس پتھر کی آواز نے بارہ سکھے کو جوتا کر دیا پھر اس سے پہلے کہ لسن سنبھل کر اپنی بندوق شانے سے

اُٹھتا بارہ سکھا چھلاوے کی طرح غائب ہو چکا تھا۔ لسن غصے کی شدت سے اپنے دانت چبیس کر رہ گیا۔ جانور نے ایک بار پھر اسے شکست دے دی تھی، وہ دل شکست سا ہو کر نیلے سے نیچے اُترنے لگا۔

یہی اس نے بندوق چلنے کی آواز سنی، وہ اس آواز کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ یہ اس پر کچھ فیصلہ بندوق کی آواز تھی اور اس قسم کی بندوق ہنری کے پاس تھی۔ اس نے دوبارہ اپنی بندوق اپنے شانے سے لٹکائی اور اس طرف دوڑنے لگا۔ چہرے سے وہ آواز سنائی دی تھی۔ اس کی ٹھوکوں سے پتھر اُڑھو اُڑھو لڑھکنے لگے لیکن وہ دوڑتا چلا گیا۔ کچھ دور جانے کے بعد اس نے ہنری کو دیکھا جو اپنی بندوق ہاتھ میں اٹھائے ہوئے کھڑا تھا لیکن اس بارہ سکھے کا کوئی پتا نہ تھا۔

”میں نے اسے زخمی کر دیا ہے لسن!“ ہنری نے بتایا۔ اس کی آواز میں غور و خورش کا تاثر تھا۔ ”وہ کبھی گیا تھا مگر پھر اُٹھ کر دوڑ گیا۔ ہم اس کے خون کے نشانات کے ذریعے اس تک پہنچ سکتے ہیں، تم آؤ میرے ساتھ ہم دونوں اس کا تعاقب کرتے ہیں۔“

لسن اسے گھور کر رہ گیا۔ آخر وہی ہوا جس کا اسے اندیشہ تھا اس بارہ سکھے کو مارنے کی خوشی ہنری کے حصے میں آئی تھی۔ اس لیے اس کے لہجے میں خیر کا احساس تھا۔ اس نے سمیت حاصل کر لی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ ہنری سے بچ جائے۔ اس شخص کا تقاریر ابھرا ہے کبھی بھی پسند نہیں آیا تھا لیکن اس نے کچھ نہیں کہا۔ اس کے بجائے وہ ہنری کے ساتھ خون کے نشانات کے سہارے دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگا۔ کچھ دور جانے کے بعد انہیں ایک جگہ خون کا بڑا سا دھبہ دکھائی دے گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ بارہ سکھا چند لمحوں کے لیے یہاں رکا تھا۔ اس کے بعد وہ آگے بڑھ گیا تھا۔ خون کے نشانات چھوٹے چھوٹے دھبوں کی صورت میں آگے چلے گئے تھے۔

وہ دونوں آگے بڑھتے رہے۔ اس وقت ہوا اور بھی سرد ہو گئی، اس کے ساتھ ہی آسمان پر بادلوں کے سفید سفید گالے تیرنے لگے جو اس بات کی علامت تھے کہ برف باری شروع ہونے والی ہے۔ ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ پہاڑیوں کی دوسری جانب برف باری شروع ہو گئی ہو۔ کچھ دور جانے کے بعد ایک بارش شروع ہو گئی، اس علاقے کی بارش بھی اس انداز کی ہوا کرتی تھی۔ اچانک اور شدید۔ وہ دونوں بارش میں سمیٹے ہوئے آگے بڑھتے رہے، حالانکہ آسمان پر

ہر طرف گہرے بادل چھا گئے تھے، اس کے باوجود اتنی روشنی تھی کہ وہ زخمی بارہ سکھے کا تعاقب کرتے رہے لیکن دوپہر تک وہ بارہ سکھا کہیں دکھائی نہ دیا۔ بارش نے اس کے خون کے نشانات بھی بڑی حد تک صاف کر دیے تھے لسن شخص اندازے پر چلا جا رہا تھا۔

”اب چھوڑ دو بھی اس کو۔“ ہنری جھلا کر بولا۔ ”آخر ہم کب تک اس کا تعاقب کرتے رہیں گے، لعنت بھیج دو اس پر۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ لسن نے کہا۔ ”ہم نے جب کھیل شروع کیا ہے تو اس کو انجام تک بھی پہنچانا ہے۔“ بارش کے پھیڑوں نے انہیں پریشان کر دیا تھا۔ ان کے پورے کپڑے شرابور ہو گئے تھے۔ اسی لمحے سرد اور برقی ہوائے انہیں منجمد کرنا شروع کر دیا تھا۔ ہنری تو باقاعدہ کانپ رہا تھا اگر ان لوگوں کے پاس گرم کپڑے نہیں ہوتے تو اس موسم میں وہ خود بھی برف کا حصہ بن کر رہ جاتے۔

”آخر تم میری جان لینے پر کیوں تلے ہوئے ہو؟“ ہنری نے دانت کھٹکاتے ہوئے کہا۔ ”دیکھتے نہیں، میرا کیا حال ہو رہا ہے؟“

”میں دیکھ رہا ہوں... لیکن میرے ساتھ چلنے کی تمہاری اپنی مرضی ہے۔ تم چاؤ تو اب بھی واپس جاسکتے ہو۔ میرا خیال ہے کہ اگر تم راستے میں کہیں رکے نہیں تو شام ہوتے ہوئے کچپ تک جاؤ گے۔“ اس نے اپنے چہرے سے پانی صاف کرتے ہوئے کہا۔

”تم نے ہمیشہ جانوروں کو زخمی کر کے چھوڑا ہے، کبھی انہیں مار نہیں کہو۔“

لسن کے اس رویہ پر ہنری اسے گھور کر رہ گیا۔ وہ دونوں خاصا دور نظر آئے تھے۔ لیکن اس زخمی بارہ سکھے کا کوئی پتا نہیں تھا۔ لسن کے خیال میں وہ زخمی ہو جانے کے بعد انہیں شکست دینے کا تجربہ کر چکا تھا۔ لیکن کچھ دور چلنے کے بعد انہیں ایک پہاڑی سلسلہ دکھائی دے گیا، یہاں چھوٹے چھوٹے ٹکڑے غار بنے ہوئے تھے۔ بہت ممکن تھا کہ وہ بارہ سکھا انہی میں سے کسی غار کے اندر موجود ہو۔

”میرا خیال ہے کہ وہ بارہ سکھا انہی غاروں میں سے کسی میں موجود ہے۔“ لسن نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔

”جہنم میں جانے بارہ سکھا۔“ ہنری نے کہا۔ ”میں تو اس بارش سے تنگ آچکا ہوں اور اب واپس جا رہا ہوں،

میں تہجاری طرح پاگل ہیں کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔“
”تمہاری مرضی۔“ ولسن نے بے پروائی سے کہا۔
”مجھے کچھ سامان دیتے جاؤ، ہو سکتا ہے کہ مجھے اس علاقے
میں رات گزارنا پڑ جائے۔“

ہنری نے اسے رات گزارنے کے لیے اپنے قیلے
میں سے کچھ چیزیں نکال کر دیں اور خود پاؤں پٹختا ہوا وہاں
چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ولسن ایک اونچے گھنے درخت
کے نیچے آکر بیٹھ گیا۔ بارش اگرچہ ابھی تک اسی زور و شور
سے ہو رہی تھی، لیکن اس گھنے درخت کے پتوں اور اس کی
شاخوں نے بارش کے پانی سے بڑی حد تک بچاؤ کر رکھا
تھا۔ درخت کے نیچے بیٹھ کر اس نے ان غاروں کی طرف
نگاہیں جما دیں جن کے اندر اس کے خیال میں دُھجی جانور
پناہ لے سکتا ہے۔ اسے پورا یقین تھا کہ وہ بارہ سنگھابھی انہی
میں سے کسی ایک غار میں چھپا ہوگا۔

شام ہوتے ہوتے بارش رکی تھی، لیکن ہوا ابھی تک
سرد تھی اور وہ بارہ سنگھابھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ ولسن نے اس
مقام پر پڑاؤ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اس نے ادھر ادھر سے
درختوں کی شاخیں جمع کیں پھر آگ روشن کرنے کی کوشش
کرنے لگا۔ گیلی لکڑیوں نے آگ پکڑنے میں بہت دیر لگا
دی تھی لیکن جب الاؤ روشن ہو گیا تو ولسن اپنے ہاتھ پاؤں
تاپنے لگا۔ اس نے اپنا بیگ ہوا لیگا بھی اُتار کر خشک ہونے
کے لیے آگ کے قریب رکھ دیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ خود بھی
آگ کے قریب ہی لیٹ گیا۔ اس طرح اس کے بدن کو
حرارت ملنے لگی تھی وہ بہت دیر تک لیٹا ہوا دلوں کی آوازیں سنتا
رہا۔ بارش اگرچہ رکی تھی لیکن پادل ابھی تک گرج رہے
تھے اور اس شام میں ان کی گرج ایسی لگ رہی تھی جیسے بہت
دور تھا۔

کچھ دیر بعد وہ کھڑا ہوا اور بارہ سنگھے کے نشانات کی
تلاش شروع کر دی۔ تھوڑی سی محنت کے بعد اسے خون کے
پلکے پلکے سے دھے ایک غار کی طرف جاتے ہوئے دکھائی
دے۔ بہت ممکن تھا کہ خون کے یہ دھے پہلے بہت گہرے
ہوں لیکن اس موسلا دھار بارش نے انہیں ہلکا کر دیا تھا۔ اس
کے باوجود اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی تھی کہ وہ بالکل ٹھیک جگہ
پر پہنچا تھا۔ ان دھبوں کو دیکھ کر وہ اپنے غامضی پڑاؤ کی
طرف واپس آ گیا۔

دوسری صبح اس کی آنکھ معمول کے مطابق بہت جلدی
کھل گئی۔ حیدر ہونے کے بعد اس نے سب سے پہلے الاؤ

کی طرف دیکھا الاؤ رات ہی میں کسی وقت سرد ہو گیا تھا۔
بارش اب مکمل طور پر بند ہو چکی تھی۔ اس نے جلدی جلدی
کچھ اور لکڑیاں جمع کیں اور آگ روشن کر دی۔ اس
بار لکڑیوں نے آگ پکڑنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی، اس
کے پاس کافی کا پورا سامان موجود تھا۔ اس نے جلدی جلدی
کافی بنا کر پی اور ایک بار پھر بارہ سنگھا کی تلاش میں روانہ
ہو گیا۔ اس وقت صبح نمودار ہونے والی تھی اور اس کی ہلکی ہلکی
روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اس روشنی میں اسے
احساس ہو گیا کہ وہ غار اس کی توقع سے کہیں زیادہ فاصلے پر
تھا حالانکہ شام کے وقت وہ زیادہ دور نظر نہیں آ رہا تھا۔
بہر حال اسے تو ہر حال میں اس بارہ سنگھے تک پہنچنا تھا۔
چاہے فاصلہ کتنا ہی طویل کیوں نہ ہو۔

وہ پڑاؤ کی آگ بجھا کر روانہ ہوا تھا لیکن اس کے
سینے کے اندر ایک دوسری آگ جل رہی تھی۔ یہ غیرت اور
غصے کی آگ تھی اس بارہ سنگھے کے خلاف، جس نے اسے
بہت نقصان پہنچایا تھا۔ وہ اس کے اعصاب پر کسی بھلا کی طرح
سوار تھا۔ ولسن کو اچھی طرح یاد تھا کہ جب اس نے اپنی جیب
کیراج والے کو دکھائی تھی تو اس نے کہا تھا۔ ”کیا بات ہے
ولسن؟ کیا کسی باتھی سے ٹکر ہوئی تھی؟ اس کی مرمت پر تو اچھا
خاصا خرچ آئے گا۔“

ولسن نے ایک نظر اپنی جیب پر ڈالی جس کی ہینڈ لائش
ٹوٹی ہوئی تھیں اور اس کے پچھلے حصے کو بھی اچھا خاصا نقصان
پہنچا تھا۔ اس کم بخت بارہ سنگھے نے اس کی جیب کی یہ حالت
کر دی تھی۔ اس وقت ولسن کی ہندوق کمرے میں رکھی تھی۔
اس سے پہلے کہ وہ ہندوق اٹھا کر لاتا۔ وہ بارہ سنگھا اپنا انتقام
لے کر فرار ہو چکا تھا۔ اس نے ایک ٹائیکو پھاڑ دیا تھا، پریڈی
ایٹر میں مولوٹ کر دیا تھا اور گاڑی کی ہینڈ لائش پکڑنا چور کر دی
تھیں۔ اس کے علاوہ سامنے والا شیشہ بھی کچی کچی ہو گیا
تھا۔ کیراج والے نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اس نے اپنی جیب
کسی پاگل ہاتھی کے سامنے ڈال دی تھی۔
ولسن کے اعصاب پر تھاؤ کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔
اپنی جیب کی تباہی کے ساتھ اسے اپنے باغیچے کی تباہی بھی یاد
آئی تھی۔ اس باغیچے کو اس نے بڑی محنت سے تیار کیا تھا۔
اس میں مختلف قسم کے پودے لگائے تھے لیکن اس بارہ سنگھے
نے اپنے انتقام کے جوش میں اس کے باغیچے کو بھی تباہ کر دیا
تھا اور وہ بھی اس بُری طرح کہ دوبارہ بھرکاری پر ولسن کے
پورے دوسو ڈالر خرچ ہو گئے تھے۔

اس وقت اسے اپنی حماقت پر غصہ آنے لگا تھا۔ اسے
احساس ہو گیا تھا کہ ان علاقوں میں کسی کو تنہا نہیں رہنا
چاہیے، تنہا رہنے سے بڑے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔
ایک ایسا آدمی آخر کتنے کام کر سکتا ہے۔ اس کے ساتھ کوئی
اور ہوتا تو اس پر جتنی تباہی آتی تھی اتنی بھی نہیں آتی۔ اگر وہ
باہر گیا ہوا ہوتا تو دوسرا آدمی چیزوں کی حفاظت کے لیے
موجود رہتا۔ اس بد معاش بارہ سنگھے نے تو اس کی زندگی بچ
کر کے رکھ دی تھی۔ کبھی ولسن کو ایسا محسوس ہوتا جیسے اس
بد معاش بارہ سنگھے کے اندر کسی شیطان کی روح حلول کر گئی
ہے جو اسے بتاتی رہتی ہے کہ ولسن اس وقت کیا کر رہا ہے؟
اور کہاں ہے؟

اسے یاد آیا کہ ایک بار پچھلوں کی بہت اچھی فصل ہوئی
تھی ان پچھلوں کو اس نے پچھر کے نیچے چھپا دیا تھا اور ان
پچھلوں پر اتنی مقدار میں گھاس پھوس ڈال دی تھی کہ باہر سے
دکھائی دینا مشکل تھا لیکن بارہ سنگھے نے سونگھنے کی قوت سے
پچھلوں کا پتہ چلا لیا تھا اور اس نے راتوں رات پچھلوں کے اس
ذخیرے کو کھسک کر دیا۔ ولسن اپنا دل پکڑ کر رہ گیا تھا۔ اتنا
ذبردست نقصان یقیناً اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔
اس نے بارہ سنگھے کو گالیاں دینا شروع کر دیں۔

وہ پہاڑی ابھی بہت دور تھی۔ سفر کرتے کرتے اس
کے اعضا میل ہونے لگے۔ وہ جیسے جیب آگے بڑھاتا جا رہا
تھا۔ ویسے ویسے سردی کی شدت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔
ایک بار تو اس کا دل جا ہلکا کہ وہ اس بارہ سنگھے پر لعنت بھیج کر
واپس ہو جائے، اس نے جہاں اپنی جیب کھڑی کی تھی،
وہاں پینچے اور جیب لے کر اپنے کالج لوٹ جائے کسی کو بھی
اس بات سے مطلب نہیں تھا کہ اس نے بارہ سنگھے کا شکار۔
کر لیا ہے یا نہیں۔ اس سے پوچھنے کے لیے کوئی بھی نہیں آتا۔ وہ
خواتواہ اپنی جان کو عذاب میں ڈالے ہوئے تھا پھر اسے خود
ہی اپنے اس خیال پر شرمی محسوس ہونے لگی۔ واپسی کا تو یہ
مطلب ہوتا کہ اس نے ایک حقیر سے جانور سے ہار مان لی
ہے اور یہ اس کی تو بین تھی کیونکہ وہ ایک انسان ہی تھا اور
شکاری بھی۔ لیکن جب اس نے واپسی کا ارادہ کیا تو ٹھیک
اسی وقت وہ بارہ سنگھا اسے دکھائی دے گیا۔

ولسن کو امید نہیں تھی کہ وہ اس طرح اچانک نظر
آجائے گا۔ اسے بہت دیر تک اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں
آیا تھا وہ بارہ سنگھا گھاس پر لیٹا ہوا تھا۔ ان دونوں کے
درمیان سرفٹ سے بھی کم فاصلہ تھا۔ وہ دونوں اتنے قریب

آنکھیں

آنکھیں کبھی کبھی گزرا ہوا زمانہ بھی
دکھادی ہیں۔ جو وہ چکا وہ پھر سے ہونے لگتا ہے
جو گزرا گیا وہ پھر سے گزرنے لگتا ہے۔ جس سانچے
پر ہم روکے ہوں، اس پر پھر رونے کوئی جانتا
ہے۔ یہ آنکھوں کا کمال ہے کہ ایک خاص وقت
میں ایک خاص منظر دکھا دیتی ہیں اور پھر پرانے
نغمات یاد آ جاتے ہیں۔ لیکن کیا کیا جائے.....
آنکھوں کی تمام کوششیں خاموش ہو جاتی ہیں۔
عہد جنوں ہی نہیں ہوتا، لوگ مطلب اور منفعت کی
دنیا میں گم ہو جاتے ہیں۔ کون آتا ہے، درد کے
صحرا میں۔ اور عہد جنوں بھی تو ایک یادگار ہی تو
دے گیا..... ایک جنازہ اس نے ہمیں شرمندہ تو
نہیں کرتا۔ ہم شرمندہ ہی کیوں ہوں..... چلو ہم
آنکھیں بند کر لیتے ہیں..... لیکن.....

رہ گئی کان میں صدائے جرس

کارواں کا غبار آنکھوں میں

اقتباس: حرف حقیقت از واصف علی واصف

مرسلہ: ملک ثاقب شادخوی، ایبٹ آباد

سے ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح دیکھ سکتے تھے۔ بارہ
سنگھے نے اسے دیکھ کر اپنی گردن اٹھالی۔ اس کی آنکھیں
حلقوں میں گردش کر رہی تھیں۔ ولسن نے اپنے شانے سے
ہندوق اٹاری۔ اس وقت اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا
تھا۔ اتنے عرصے کے بعد اپنے شکار کو سامنے دیکھ کر اس پر
ایک حیران کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ بارہ سنگھے نے
ہندوق دیکھ کر اٹھنے کی کوشش کی، لیکن وہ اٹھ نہ سکا۔ اس پر
نفاہت طاری تھی۔ ولسن نے ہندوق سے نشاندہ بناتے ہوئے
اس کی طرف دیکھا۔ بارہ سنگھا بھی اب بالکل بے حس و
حرکت تھا۔ اس کی نگاہیں ولسن پر لگی ہوئی تھیں اور اس کے
انداز میں ایسا وقار تھا کہ ولسن کے ہاتھ کا پھٹنے لگے۔ بالآخر خود

دشمن ایک دوسرے کے سامنے آ ہی تھے۔ بارہ سنگھا گولی چلنے کا انتظار کرتا رہا لیکن نہ جانے کیوں ولسن کی ہمت جواب دینے لگی تھی اس نے اپنی بندوق کی نال بھگائی اور بڑھ حال سا ہو کر ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔

ولسن بھی اس بات کو محسوس کر رہا تھا کہ وہ اس حالت میں بارہ سنگھے پر بھی گولی نہیں چلا سکے گا۔ دشمن پر وار کرنے کا مزہ تو اسی وقت ہے، جب دشمن بھی کچھ کر گزرنے کی طاقت رکھتا ہو جبکہ وہ بارہ سنگھا زخمی اور کمزور ہو گیا تھا۔ دوسری طرف بارہ سنگھے نے بھی یہ بات محسوس کر لی تھی کہ اس کا دشمن شاید اس وقت تک اس پر گولی نہیں چلائے گا جب تک اس کے زخم نہیں بھر جاتے۔

ولسن کو اس بارہ سنگھے کی حرکتیں یاد آنے لگیں۔ وہ اس وقت ولسن کے کانچ پر حملہ کیا کرتا تھا، جب ولسن کہیں گیا ہوا ہوتا تھا۔ یہ گویا ایک قسم کا چیلنج تھا، جو وہ اپنے بے زبان حملوں سے دے رہا تھا، اس نے بھی ولسن پر حملہ نہیں کیا تھا، اور اب ولسن کا بھی یہ فرض تھا کہ وہ کم از کم اس وقت اس پر حملہ نہ کرے۔

وہ کچھ دیر تک اس بد معاش بارہ سنگھے کو دیکھنے کے بعد اپنے بڑاؤ پر واپس آ گیا۔ واپس آتے آتے ایک بار پھر ان وادیوں میں رات آنے لگی تھی۔ اس نے اپنی چھوٹی کھڑائی کے ذریعے درختوں سے لکڑیاں حاصل کیں اور آگ روشن کر لی۔ اس نے وہ رات بھی اس بڑاؤ میں گزاری تھی۔

دوسری صبح وہ بارہ سنگھا کی طرف جانے کے بجائے کسی اور ارادے سے آبادی کی طرف چل پڑا۔ آبادی کی طرف جاتے ہوئے جو سب سے پہلا مکان اسے دکھائی دیا وہ جیک کا تھا۔ جس سے ولسن کی انتہی خاصی جان پہچان تھی۔ اس نے جیک سے پک آپ مانگ مرہم پنی کا سامان لے لیا۔ تین چار مل بھی مانگ لیے۔ اس کے بعد یہ تمام چیزیں اس نے پک آپ میں ڈالیں۔ جیک کا شکر یہ ادا کیا اور بارہ سنگھے کی طرف سفر شروع کر دیا۔

وہ بارہ سنگھا اس جگہ موجود تھا، ولسن کو دیکھ کر اس نے اپنی گردن اٹھائی اور ایک طرف ڈال دی۔ ولسن نے اپنے ساتھ لایا ہوا سامان گاڑی سے اتار لیا۔ سب سے پہلے اس نے آگ روشن کر دی۔ کچھ دیر تک چلتی ہوئی آگ کے پاس بیٹھا رہا پھر آہستہ آہستہ بارہ سنگھے کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے اپنے ساتھ لائی ہوئی رسی کا پھندا بارہ سنگھے کی طرف اٹھال دیا۔ وہ اس کے ساتھ بڑی دیر تک وجود جھک رہا تھا۔ تقریباً

یون گھنٹے کے بعد وہ اس کی ٹانگوں اور سیکڑوں کو باندھنے میں کامیاب ہو سکا تھا۔ لیکن اس نے اسے باندھنے کے سلسلے میں بھی بہت احتیاط سے کام لیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ بارہ سنگھے کے زخم کو کسی قسم کی تکلیف ہو پھر اس نے بڑی احتیاط کے ساتھ اس کے زخم کا معائنہ شروع کر دیا۔

بہری کی چلائی ہوئی گولی بارہ سنگھے کی گردن کے نیچے سے گئی تھی۔ اگر کچھ اور دیر لگتی تو بارہ سنگھے کی موت یقینی تھی۔ اس کے زخم سے خون بہہ بہہ کر اب کھر ٹھکی صورت میں جم چکا تھا اور زخم کے ارد گرد جوشن آگئی تھی۔

ولسن نے بڑی احتیاط کے ساتھ اس کے زخم کو صاف کیا اور اس پر دوائی لگا کر مضبوطی کے ساتھ پٹی باندھ دی۔ اس عمل کے دوران بارہ سنگھے نے تکلیف اور غصے سے اچھلنے کودنے کی کوشش کی تھی لیکن ولسن نے اسے بڑی مضبوطی سے باندھا ہوا تھا۔ اس لیے وہ سوائے جھنجھٹ کرنے کے اور کچھ نہیں کر سکا۔ اس عمل میں ولسن کو بڑی خوشی حاصل ہو رہی تھی۔ یہ اس کے لیے بڑی بات تھی کہ وہ اپنے دشمن کا علاج کر رہا تھا۔

اس کام سے فارغ ہو کر وہ بارہ سنگھے کے پاس سے ہٹ کر ایک طرف لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد اسے نیند آ گئی۔ ٹھیک دو گھنٹے بعد جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کی چلائی ہوئی آگ بجھ چکی تھی اور وہاں شامل ٹھنڈک یہ بتا رہی تھی کہ کچھ دیر میں یا تو بارش ہونے والی ہے یا پھر برف باری... اس نے ارد گرد سے پھر لکڑیاں جمع کیں اور آگ روشن کر دی اس بار اس نے یہ آگ بندھے ہوئے بارہ سنگھے کے قریب روشن کی تھی تاکہ اس کے بدن کو بھی حرارت ملتی رہے۔

دوسری صبح اس نے بارہ سنگھے کی پٹی تبدیل کر دی۔ وہ کسی ماہر ڈاکٹر کی طرح بڑی توجہ اور محنت کے ساتھ اس کے زخم کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ اس دوران برف باری بھی شروع ہو چکی تھی۔ اس نے چار لکڑیاں ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر زمین میں گاڑ کر اور ایک پچھر سا بنادیا۔ پچھر کو بنانے کے لیے اس نے درختوں کی شاخوں سے کام لیا تھا۔ یہ پناہ گاہ پوری طرح برف اور سردی کو روک تو نہیں سکتی تھی پھر بھی کسی نہ کسی حد تک بارہ سنگھے کے لیے بچاؤ کا سامان ہو ہی گیا تھا۔

ولسن کو احساس تھا کہ اس کا احسان لیتے ہوئے اس معزور جانور کی انوکھی طرح زخمی ہو رہی ہوگی۔ وہ کتنا بے چین ہو رہا ہو گا۔ اگر اس کے بدن میں طاقت جوتی تو وہ

شاید اسے بھیا یک زخم کے باوجود بھاگ لیتا، لیکن اس وقت وہ بالکل بھجور تھا۔ خون کے اخراج نے اسے کمزور کر دیا تھا۔ اس نے وہ بھی اپنی میلی آنکھیں کھول کر ولسن کی طرف دیکھتا پھر اپنی گردن جھکا لیتا۔ ولسن کی توجہ اور علاج سے اس کی حالت کچھ سنبھلنے لگی تھی۔ پہلے اس کی سانسوں میں بڑی بے تاعدگی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ تکلیف دہ سانس لے رہا تھا۔ کبھی کبھی تکلیف کی شدت سے وہ زور زور سے کھانسنے بھی لگتا تھا لیکن اب اس کی سانسوں میں رابطہ آ گیا تھا اور اس نے کھانسنے بھی تم کر دیا تھا۔ ولسن کے لیے یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔

ولسن نے قریبی چشمے سے ایک پائٹی پانی لیا اور بندھے ہوئے جانور کے پاس آ گیا۔ وہ پکڑا پکڑا ہو کر اس کے زخم کے آس پاس خون کو صاف کر رہا تھا۔ اس موقع پر بھی بارہ سنگھے نے کھلانے اور نجات حاصل کرنے کی کوشش جاری تھی لیکن مضبوطی سے بندھی ہوئی رسیوں نے اسے ایسا نہیں کرنے دیا تھا۔ اس کے بدن کو پوچھ کر ولسن نے پانی کی پائٹی اس کے منہ کے سامنے رکھ دی۔ بارہ سنگھا کچھ دیر تک آہستہ آہستہ ہوسے ولسن کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے پائٹی میں اپنی گردن ڈال دی۔ وہ بڑے آرام سے پانی پی رہا تھا۔

اس رات اگرچہ برف باری نہیں ہوئی تھی لیکن ہوا سرد چل رہی تھی اور ولسن کو گرم کپڑوں اور چلتے ہوئے آتش دان کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی تاکہ وہ اپنے بدن کو سکون پہنچا سکے لیکن وہ یہاں کھلے مقام پر اس بارہ سنگھے کے سامنے لیٹا ہوا تھا۔ اسے گرم کپڑوں کی ضرورت تھی لیکن اس کے پاس صرف دو ہی کپڑے تھے اور یہ دونوں کپڑے اس نے بارہ سنگھے کو اوڑھ دیا تھے اور خود صرف ایک کوٹ میں سٹرا ہوا کنگیارا تھا۔

کئی دن اسی طرح گزر گئے، وہ اپنے ساتھ کھانے پینے کی جو چیزیں لایا تھا، وہ بھی ختم ہونے لگی تھیں۔ ان کے ذائقے تبدیل ہو گئے تھے مگر ولسن کو اس کی پروا نہیں تھی۔ وہ اپنے آپ کو مصروف رکھنے کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔ وہاں چھوٹے چھوٹے کاموں کا ایک ایسا سلسلہ تھا جو ختم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ آگ کے لیے لکڑیاں چننا، آگ روشن کرنا، بارہ سنگھے کے زخم کی دیکھ بھال، اس کے لیے محفوظ پناہ گاہ کی تعمیر اور بھی نہ جانے کیا کیا۔ ان مصروفیات نے موسم کی تبدیلی کی طرف سے اس کا حوصلہ بٹانے رکھا تھا۔

اس صبح بارہ سنگھا کچھ زیادہ بے قرار تھا۔ اس کا زخم اسے تکلیف پہنچا رہا تھا۔ ولسن نے کسی سرجن کی طرح اس کے زخم کا آپریشن کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ ضروری دوا میں، روٹی پٹیاں اور چاقو لے کر بارہ سنگھے کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ میں چاقو دیکھ کر بھی بارہ سنگھے نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ وہ اپنے زخم کی تکلیف میں اُلجھا ہوا تھا۔ ولسن نے زخم کے ارد گرد کے حصے کو کالہ بولک کے محلول سے دھوا پھر اس کے زخم میں چاقو کے ذریعے ایک چیرہ لگا دیا۔ بارہ سنگھے کا خون اس کے زخم سے نکل کر اس کے ہاتھوں اور کپڑوں کو سرخ کر گیا تھا۔ اس وقت بارہ سنگھا بھی اپنا سر زور زور سے جھٹکتے لگا تھا۔ ولسن نے ایک ہاتھ سے اس کا ایک کان بڑی مضبوطی کے ساتھ پکڑ رکھا تھا۔ پھر اس نے زخم میں دوا میں بھرنا شروع کر دیں، زخم میں دوائی ڈالنے کے بعد اس نے روٹی رکھ کر پٹی لپیٹ دی اور بارہ سنگھے کے پاس سے ہٹ کر ایک طرف لیٹ گیا۔ اس وقت بھی بارہ سنگھا تکلیف میں مبتلا تھا۔ اس کا زخم دواؤں سے جل رہا تھا۔

ولسن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایک بارہ سنگھے کے لیے اپنی جان کو کیوں ہلکان کر رہا ہے؟ وہ اس بارہ سنگھے کو چھوڑ کر چلا کیوں نہیں جاتا؟ اس کی بجائے یہ زندہ رہے یا مر جائے، پھر دوسرے ہی لمحے دوسرا خیال اس کے ذہن میں آتا۔ بارہ سنگھا اس کا بہادر دشمن تھا اور وہ ایک شکاری ہونے کے ناتے اپنے بہادر دشمن کے ساتھ ایسی بڑبڑی کی حرکت نہیں کر سکتا تھا۔

پانچ دن اور گزر گئے۔ ان پانچ دنوں میں ولسن ایک لمحے کے لیے بھی خالی نہیں رہا تھا۔ ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مصروف رہا تھا۔ اسے اب غذا بھی بہت احتیاط سے استعمال کرنا پڑ رہی تھی اور اس کی نیند بھی پوری نہیں ہو پاتی تھی، جس کی وجہ سے اس کی آنکھیں ہر وقت چلتی رہتی تھیں لیکن اسے اس بات کی خوشی تھی کہ وہ بارہ سنگھا اب رو بہ صحت تھا۔ اس کا زخم بھر لگا تھا۔ اس کی نقابت بھی رفتہ رفتہ دور ہوتی جا رہی تھی۔ پانچویں دن دوپہر کے وقت اس نے دور سے لوگوں کے ہاتھیں کرنے کی آوازیں سنیں۔ کھلے علاقوں میں آوازیں بڑی آسانی سے ہوا کے دوش پر سفر کرتی ہوئی اچھا خاصا فاصلہ طے کر لیتی ہیں۔ وہ جلدی سے ایک قریبی ٹیلے پر چڑھ کر آنے والوں کو دیکھنے لگا۔ وہ تین آدمی تھے۔ جو اس ٹیلے کی طرف چلے آ رہے تھے۔ ولسن نے ان کو پہچان لیا۔ ان میں ایک بہری تھا۔ ان کو لوگوں نے بھی ولسن کو دیکھا تھا۔

بارہ سگھے کوشکار اور وہ دوبارہ کوشش کر کے کھڑا ہو گیا۔
دو قدم آگے چلا۔ رکا پھر کئی قدم آگے بڑھ گیا۔ کچھ دور
جانے کے بعد اس نے مڑ کر دکن کی طرف دیکھنا شروع کر
دیا۔ جیسے اس کا شکر یہ ادا کر رہا ہو۔

”چلو اب بھاگ جاؤ۔“ ولسن نے تالی بجائی۔ بارہ
سگھا اچھلتا کودتا ہوا اپنی پرانی رفتار سے آگے بڑھنے لگا۔
اس کی توانائی واپسی آئی تھی۔

ولسن ان لوگوں کی طرف مڑا۔ ہنری نے اپنی
بندوق اور پرکری تھی اور دوڑتے ہوئے بارہ سگھے کو نشانہ
بنانے والا تھا۔

”یہ کیا کر رہے ہو ہنری؟“ ولسن جھپٹ کر اس کے
پاس گیا۔

”میں اسے گولی مار رہا ہوں۔“ ہنری نے جواب دیا۔

ولسن نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے بندوق چھین لی
اور اسے ایک طرف پھینک دیا۔ ہنری نے دوڑ کر بندوق
اٹھانا چاہی، لیکن ولسن نے اسے ایک طرف دھکا دے دیا۔

ہنری ایک طرف لڑھک گیا تھا۔ اس کے گرتے ہی ولسن نے
اس کی بندوق اٹھالی اور اسے ایک قرعہ، بڑے سے پتھر پر
جنونوں کی طرح مارنے لگا۔ کچھ دیر بعد بندوق کے پرچے

اڑ گئے تھے۔ اس کا دست ٹوٹ چکا تھا۔ پھر اس نے ٹوٹی ہوئی
بندوق کو اچھال کر ایک طرف پھینک دیا۔ اس وقت اس کے
چہرے پر بے پناہ سکون تھا جیسے اس نے کوئی بڑا کارنامہ

انجام دے لیا ہو۔

”اب تم اسے گولی نہیں مار سکو گے ہنری۔“ وہ ہنری
کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ جو اس دوران میں کھڑا ہو کر
اپنا پاس جما ڈھاڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ولسن کے لیے غصے

کی آگ دکھ رہی تھی۔

”ہم انسان ہیں ہنری۔“ اس نے ہنری کی طرف

دیکھا۔ ”انسان اور جانور میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے۔ وہ
جب جانور ہو کر دشمنی کے سلسلے میں اپنی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ
کر سکتا ہے تو کیا ہم انسان ہو کر ایسا نہیں کر سکتے؟ وہ تو خیر

کچھ نہیں سوچ سکتا، لیکن خدا نے ہمیں تو عقل دی ہے نا۔“

اس نے آگے بڑھ کر ہنری کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”ناراض مت ہو، آؤ میں تمہارے لیے ایک پیالی اور بنا
دیتا ہوں۔ تھوڑی سی کافی پینی ہوئی ہے۔ آؤ... آخر ہم
دوست ہیں نا...“

وہ دوڑتے ہوئے اس کے پاس آگئے۔
”ہم نے تو یہ سمجھا تھا کہ تم سر جکے ہو۔“ ہنری نے
اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ کیا چکر ہے؟ تم یہاں کیا
کر رہے ہو؟“

ولسن نے کچھ نہیں کہا۔ وہ سب الاؤ کے گرد آکر بیٹھ
گئے۔ اسی دوران ان کی نگاہیں بارہ سگھے پر پڑیں۔ لیکن ان
میں سے کسی نے بھی ولسن سے اس کے بارے میں کوئی سوال

نہیں کیا۔ ولسن نے ان کے لیے کافی بنانا شروع کر دی تھی۔
کافی تیار کر کے اس نے ان تینوں کی طرف کافی کی پیالیاں
بڑھا دیں۔ وہ تینوں خاموشی سے کافی پینے لگے۔ وہ کبھی کبھی

اس بارہ سگھے کی طرف بھی دیکھ لیتے تھے لیکن ابھی تک وہ
لوگ اس کی طرف سے بے پرواہی نظر آ رہے تھے۔ بالآخر
کافی ختم کر لینے کے بعد ہنری کھڑا ہو گیا۔ وہ اس بارہ سگھے

کی طرف جانا چاہتا تھا۔

”اس طرف مت جانا ہنری!“ ولسن نے اسے منع کر
دیا۔ ”وہ ابھی زخمی ہے، تمہیں دیکھ کر بھڑک جائے گا۔“

”تو کیا ہوا؟“ ہنری نے کہا۔ ”میں نے ہی اسے
زخمی کیا تھا اور مجھے دیکھنے کا پورا حق حاصل ہے۔ اس کے
علاوہ تم اس کے لیے اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہو؟“

”میں نے کہہ دیا نا کہ تم اس کی طرف مت جانا۔“
ولسن جبریز ہو کر بولا۔ اس نے اپنی نگاہیں ہنری کے چہرے

پر جما دی تھیں۔ وہ دونوں بہت دیر تک ایک دوسرے کی
طرف دیکھتے رہے۔

”واہ، کیا روپ ہے تمہارا۔“ ہنری نے ہاتھ نچا کر
کہا۔ ”میں نے تو یہ سمجھا تھا کہ تم ہمارا شکر یہ ادا کرو گے۔ ہم
تو یہ سمجھ کر نہیں دیکھنے آئے تھے کہ تم کسی پریشانی میں تو مبتلا

نہیں ہو گئے ہو اور یہاں تمہارا حال یہ ہے کہ ایک جانور کو ہم

پر ترجیح دے رہے ہو۔ تم نے تو کمال ہی کر دیا۔“

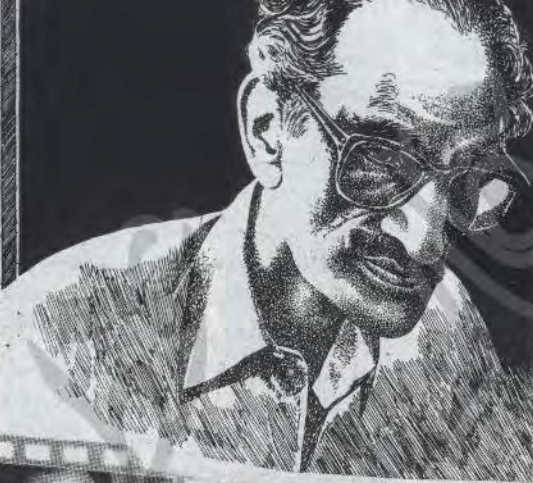
”میں کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دے رہا۔ بس ایک
اصول کی بات کر رہا ہوں۔“ ولسن نے کہا پھر وہ الاؤ کے
پاس سے اٹھ کر بارہ سگھے کے پاس آ گیا اور اس نے بارہ

سگھے کے گرد بندی ہوئی رسیاں کھولنا شروع کر دیں۔ وہ

بڑے آرام کے ساتھ یہ کام انجام دے رہا تھا، چند لمحوں کے

بعد بارہ سگھے کے گرد بندی ہوئی رسیاں کھل گئیں، اور وہ

دوبارہ آزاد ہو گیا۔ آزاد ہونے کے بعد اس نے کھڑے
ہونے کی کوشش کی مگر اس کی ٹانگیں مڑ گئیں۔ ولسن بڑی
تشویش بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے



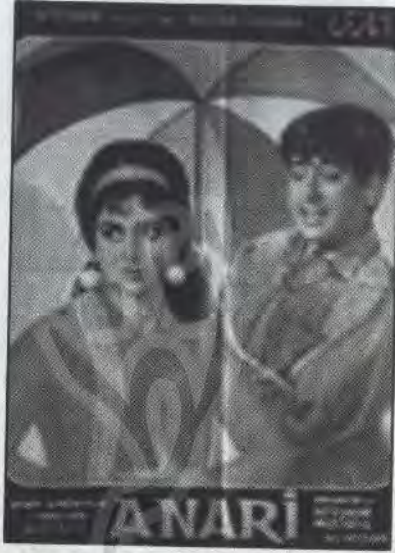
علی شفیق آٹا خاکی کی یادداشتیں

یہ اپنی سی منہ نہیں اور رنگن کی یاد
تنبہ یوں کا نہ رہے اور ہم ہیں دوست
آنکھ میں آ رہی ہے کئی مفلوک کی ہول
مہرت میرا ہے دہرے اور ہم میں دوست

ایف در روزگار خال خال ہی نظر آتے ہیں جو نصف صدی سے
عام و ادب، صحافت و قلم کے میدان میں سرگرم عمل ہو رہے ہیں اور
اپنے روزِ اول کی طرح تازہ دم بھی۔ ان کے ذہن و قلم کی پرواز
میں کوئی کمی واقع ہو، وہ ان کا قلم کبھی قہقہے کا شکار نظر آئے
آفاق صاحب ہمارے ایسے ہی جوان فکر و بلند حوصلہ بزرگ
ہیں۔ وہ جس شخص سے بھی وابستہ رہے، اپنی نمایاں حیثیت کے
فشان امی کی پیشانی پر ثبت کر دیتے۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی
سے وابستہ گئے دوران میں انھیں اپنے عہد کی ہر قابل ذکر شخصیت سے
ملنے اور اُن کے بارے میں آگاہی کا موقع بھی ملا۔ دید شنیہ اور میل
ملاقات کا یہ سلسلہ خاصا طولانی اور بہت زیادہ قابل رشک ہے
آپ نے ہم بھی ان کے وسیلے سے اپنے زمانے کی نامور شخصیات سے ملاقات
کر لی اور اس عہد کا نظارہ کر لیا جو آج خواب معلوم ہوتا ہے۔

ادب و صحافت سے قلمی دنیا تک دراز ایک داستان درویشاں سرگزشت

پانی بھی قدرت نے عجیب و غریب چیز بنائی ہے۔
اگر پانی نہ رہے تو قحط پیدا ہو جاتا ہے۔ زمین بخر ہو جاتی
ہے۔ ان مصائب سے نجات حاصل کرنا انسانوں کے اختیار
دوسری طرف یہی پانی جب موسلا دھار بارش میں نہیں ہوتا۔



بندے ایسے بھی ہوتے ہیں مگر ہم دنیا دار لوگ انہیں پہچان بھی نہیں سکتے۔

☆☆☆

قحط اور خشک سالی کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ ہم درختوں کی دیکھ بھال نہیں کرتے، سرکاری ادارے اور دوسرے ضرورت مند سنگدلی سے درخت کاٹ دیتے ہیں اور ان کی جگہ نئے اور خوبصورت کارآمد درخت لگانے پر اتنی توجہ نہیں دیتے۔

درختوں سے یہ ظاہر ہر طرف سبزہ ہو جاتا ہے جو آنکھوں کو بے حد خوش نما اور ذہن کو تازہ کر دیتا ہے۔ درخت پانی برسانے کے لیے بھی ضروری ہیں۔ جن ملکوں اور علاقوں میں درختوں کی دیکھ بھال کی جاتی ہے، وہ خوشنما اور فائدہ مند ہوتے ہیں۔ درخت انسان کو مفت میں آکسیجن جیسی گیس دن رات فراہم کرتے ہیں۔ جو لوگ آکسیجن کی کمی پیدا ہو جانے کی وجہ سے اسپتالوں میں بھاری بل استعمال کرتے ہیں ان سے پوچھیے کہ آکسیجن کس قدر ضروری اور زندگی کے لیے اہم چیز ہے۔ جس جگہ درخت زیادہ ہوتے ہیں ہاں پولوشن (کثافت) بھی کم ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ ترنی یافتہ اور مہذب ملکوں میں آپ کو ہر طرف سبزہ نظر آتا ہے۔ مٹی، گندہ یا کوڑا کرکٹ نظر نہیں آتا۔ یہی

بہت مشکل ہے۔ ضرورت مند اندھا ہوتا ہے۔ سارے شہر نے ایسے عالم کی تلاش شروع کر دی۔ آخر بہت تلاش کے بعد ایک بزرگ کے بارے میں معلوم ہوا۔ لوگ ایک وفد کی صورت میں ان کی رہائش گاہ پر پہنچے۔ دیکھا کہ ایک جھوٹری نما کھینچا ہے جس میں سامان برائے نام ہے۔ چند پڑائے لباس دیواروں سے لٹکے ہوئے ہیں۔ ایک بزرگ بان کی چار پائی پر بیٹھے قرآن کی تلاوت کر رہے ہیں۔ یوں لگتا تھا جیسے ان کا دنیا سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہے۔

ضرورت مندوں کے وفد نے کبڑی کھٹکھٹائی تو وہ بزرگ چونکے۔ انہوں نے صرف ایک بنیان اور ایک لنگوٹی پہنی ہوئی تھی۔ اس کے سوال ان کے پاس کوئی اور لباس نہ تھا۔ وہ لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا کہ آپ لوگوں نے مجھے تلاش کرنے میں اتنی محنت اور کاوش کی، اب فرمائیے کہ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟

لوگوں نے رو رو کر انہیں تمام صورت حال سے آگاہ کیا اور درخواست کی کہ اللہ کے برگزیدہ بندے ہونے کی حیثیت سے ان کی کچھ مدد کریں۔ بزرگ کچھ دیر سوچتے رہے پھر جھوٹری کے اندر گئے اور وہاں سے لنگوٹی تبدیل کر کے باہر آئے۔ انہوں نے وہ نئی لنگوٹی ان صاحبان کے سامنے ڈال دی اور کہا ”یہ لنگوٹی اٹھا کر تیر تہتی ہوئی مٹھوپ میں ڈال دو۔“

لوگوں نے ایسا ہی کیا۔ اچھی چند منٹ ہی گزرے تھے کہ اچانک بادل گرگڑانے لگے اور کالی گھٹاؤں نے آسمان کو ڈھانپ لیا۔ ایک دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ جل جل ایک ہو گیا۔ دہلی کی گلیاں نہروں میں تبدیل ہو گئیں۔ ایک گھنٹے تک سینہ برستا رہا اور قحط کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔

بزرگ نے اٹھ کر اپنی پھیٹی پرانی لنگوٹی اٹھا کر پتھر ڈی اور پھر اس کو تبدیل کرنے کے لیے جھوٹری کے اندر چلے گئے۔ دیکھنے والے اس اونچی کرامت سے حیران تھے۔ بزرگ نے جیسے ہی اپنی پرانی لنگوٹی تبدیل کی حالات چمکون ہو گئے، بارش قطعاً رک گئی۔ لوگوں کی حیرت دیکھ کر انہوں نے کہا ”بھئی، آج کل ہمارا ان سے بگاڑ ہے، ناراض ہیں ہم سے، ہماری لنگوٹی بھلا خشک کیسے رہنے دیں گے۔“ تو دیکھا آپ نے کہ اللہ کے نیک اور قریب ترین

پانی کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ پانی کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ وہ بھوک کا مقابلہ کر سکتا ہے لیکن پیاس پر قابو پانا اس کے بس میں نہیں ہے۔ اس طرح ہم نے پانی کے تین مختلف روپ دیکھے جن میں سے ہر ایک کی ضرورت افادیت اور رنگ و روپ علحدہ ہے۔

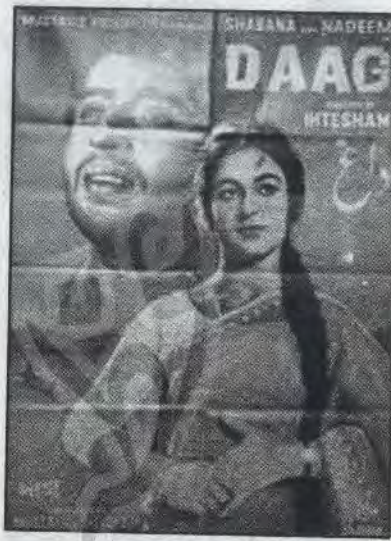
دنیا میں زلزلوں اور دوسری تباہیوں کی طرح قحط بھی ایک انسان کو بے بس اور بے قابو کرنے والی ہیبت ناک آفت ہے جس سے نجات دلانے کا فرض بھی صرف اللہ تعالیٰ ہی ادا کر سکتا ہے۔ اس طرح وہ مختلف اوقات میں ہم انسانوں کو یاد دلاتا رہتا ہے کہ واقعی کائنات کی سب سے بااختیار اور طاقتور ہستی اللہ کی ذات کے سوا کوئی اور نہیں۔

یہ تو ایک تنہید سمجھ لیجیے۔ اس کا احساس پچھلے چند مہینوں میں ہوا تھا جب ملک میں قحط جیسے حالات پیدا ہو گئے تھے۔ بارش کا قطرہ تک نصیب نہ تھا یہاں تک کہ انسان اپنے ہونٹ ترک کرنے کو بھی ترستا تھا۔ قحط کو سوا کھا بھی کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ عموماً دیہاتی یا کم تعلیم یافتہ انسان استعمال کرتے ہیں۔ جب وہ کہتے ہیں کہ اللہ اللہ کیسا سوکھا پڑا ہے اس سال۔

گزشتہ سال پاکستان کے بعض حصوں میں بھی قحط پڑ گیا تھا۔ انسان ایسی صورت میں اللہ سے پانی برسانے کی دعا کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ سب اس کے اختیار میں ہے کہ کب اور کتنی بارش برسائے۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ اگر بے وقت زیادہ بارش ہو جائے تو وہ بھی فصلوں کے لیے نقصان دہ ہے۔ غرضیکہ پانی اللہ کی ایک رحمت بھی ہے، زحمت بھی۔

جب پاکستان میں قحط کے آثار پیدا ہوئے تو لوگوں نے دعائیں شروع کر دیں۔ صاحب علم اور صاحب کمال بزرگوں کو ڈھونڈ کر ان سے بارش کے لیے دعائیں کراتے تھے مگر لا حاصل۔ ایک زمانے میں حکمران وقت ساری قوم سے التجا کرتے تھے کہ یا اللہ! بارش برساتا کہ ہم اس جان لیوا مصیبت سے نجات حاصل کر سکیں۔ لیکن ہمارے سیکولر حکمران شاید اس بات کے قائل ہی نہیں ہیں یا پھر انہیں ان دعاؤں کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عام لوگوں کے مصائب سے وہ عموماً بے خبر اور بے بہرہ رہتے ہیں۔ کچھ آئمہ کرام نے اپنے طور پر نماز استسقاء پڑھوائی لیکن مطلب حاصل نہ ہوا۔

اس ضمن میں ہمیں دو بزرگوں کی کہانیاں یاد آئیں۔ اشفاق احمد صاحب نے یہ واقعہ لکھا ہے کہ ایک بار دہلی میں



مشرقی پاکستان کی شبانہ وندیم کی کامیاب فلم داغ

برعکس پاکستانی ہمیشہ سے معروف بھارتی فن کاروں کو دیکھتے اور پسند کرتے تھے۔ بھارتی حکومت نے بھارتی فلموں کو فروغ دینے کے لیے بیرون ملک میں ان فلموں کی نمائش کا اہتمام کیا۔ بڑے بھارتی فن کاروں کے ساتھ سفارت خانے کے لوگ موجود ہوتے تھے جو اخبارات میں پریس کانفرنس کے ذریعے انہیں مقبول بناتے تھے۔ پھر جب چند خود غرض مفاد پرست پاکستانی تقسیم کاروں نے چند کامیاب بھارتی پاکستانی فلموں کی مقبولیت دیکھ کر ایک جانے بوجھے منصوبے کے تحت بھارتی فلم سازوں نے بھارتی فلموں کے چرے بنائے تو پاکستان اور غیر ملکیاں میں بھارتیوں کو کبھی یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ آپ انارڈی پاکستانی فن کاروں کی جگہ بھارتی فلمیں کیوں نہیں دیکھتے، یہاں تک کہ غیر ملکیوں کو بھی ہندی اردو میں ڈب کر کے بھارتی فلمیں دکھائی گئیں۔ ان کا ٹیکس، رقص و نمٹات غیر ملکیوں کو بھاگے۔ تو یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ پاکستان میں بھی فلمیں بنتی ہیں کیونکہ وہ سنیما گھروں کے علاوہ بیڑ پوز بھی بھارتی فلمیں دیکھنے اور پسند کرتے ہوئے بناتے تھے۔

اس کے برعکس ہمارے بڑے بڑے اعلیٰ عہدے دار مجالس میں فخارت سے پوچھا کرتے کہ آخر آپ لوگ بھارت جیسی اچھی فلمیں کیوں نہیں بناتے؟ انہیں پاکستانی

موسم، جو مخلوق کے کام مقرر کر دیے ہیں وہ بلا تاخیر اپنی جگہ پر پہنچتا ہے۔
اللہ تعالیٰ نے ہر مخلوق کی زندگی کا عرصہ بھی مقرر ہے۔ ایک عام انسان کی زندگی 60 سے 70 تک ہے لیکن بعض اوقات وہ ایک سو سے زائد سال بھی زندگی گزارتا ہے لیکن اس کی زندگی کے اطوار و عادات تبدیل ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کی زندگی کے عرصے میں اس کی عمر بھی اتنی ہی ہوتی ہے۔ انسان صحت کے اصولوں پر عمل کرے اور صرف وہ کھائے جو قدرت نے اس کے لیے مقرر کر دیے ہیں تو وہ اور صحت مند زندگی حاصل کر سکتا ہے ورنہ کم عمری میں وفات پا جاتا ہے۔ انسان کا بچہ 19 تک ماں کے پیٹ پر رہتا ہے۔ اس حساب سے اس کی اوسط عمر 125 سال چاہیے مگر وہ الاہل کھا کر اور غیر قدرتی زندگی گزار کر مختصر کر لیتا ہے۔ مثال کے طور پر انسان کے لیے قدرتی سبزی، ترکاری اور پھل کھانے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ انسان گوشت، مچھلی، مرغی اور ہر قسم کی چیزیں کھا لیتا ہے۔ پھر بیمار ہو جاتا ہے۔ قدرتی طریقہ علاج کرنے والے کہنا ہے کہ جانوروں کے لیے قدرت نے جو غذا بنائی اس سے انحراف نہیں کر سکتے۔ مثال کے طور پر شیر کی گوشت ہے۔ اگر شیر کو دس دن بھی بھوکا رکھا جائے تو وہ باگھاس نہیں کھائے گا اور گھوڑے کی غذا گھاس پھوس ہے۔ اگر گھوڑے کو دس دن بھی بھوکا رکھا جائے تو وہ گوشت کھائے گا۔ اسی طرح ہر چرند، پرند اور مخلوق کے لیے اللہ تعالیٰ نے غذا کا تعین کر دیا ہے جس کی وجہ سے وہ قدرتی زندگی کر سکتے ہیں۔ مگر حضرت انسان دنیا کی ہر چیز کا کھانا ڈال کر اور چٹ پٹی بنا کر کھاتے ہیں۔ بعض تو میٹھا کھا جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ مینڈک، سانپ اور بلی انسان کی غذا بن جاتے ہیں۔ زندہ بھی اور پکا کر بھی۔ یہ انسانی غذا انہیں ہے جدید سائنس کے مطابق انسان کو وہی چیز ایسی صورت میں کھانے جو اس کے لیے مخصوص ہے وہ بہت سی بیماریوں سے بچ جائے گا اور قدرتی عمر پائے گا۔ یہ بھی قدرت کی کافرائیاں ہیں، اس کے ہونے نظام کو توڑنا مشکل ہے۔ لیکن حضرت انسان مخلوق ہیں کہ وہ ان اصولوں کی پیروی نہیں کرتے۔ طرح شیطان نے آدم کو بھوکا یا تھا آج بھی اسی کا مصروف ہیں۔ انہوں نے انسان کے دل میں یہ خیال

وجہ ہے کہ ان لوگوں کی صحت بھی بہتر ہوتی ہے اور زیادہ دیر تک زندہ رہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ درخت اور سبزہ انسانی صحت اور زندگی کے لیے ضروری ہے۔

اشفاق احمد نے لکھا ہے کہ ایک بار ان کے ننھے پوتے نے ان سے پوچھا کہ دادا، اللہ تعالیٰ نے اتنے بہت سے درخت کیوں آگاد دیے ہیں، ان کا فائدہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ دیکھو بچو، درخت سے زیادہ بے غرض چیز اور کوئی نہیں ہوتی۔ بس قدرت نے جہاں درخت لگا دیا وہ ساری زندگی اپنی جگہ کھڑا رہتا ہے۔ نہ وہ بھی کبھی جاتا ہے، نہ کراچی، نہ دراو پلنڈی، اس کی ڈیوٹی جہاں لگا دی جاتی ہے وہ مرتے دم تک وہیں کھڑا رہتا ہے۔ کسی اور جگہ جانے کی ضد نہیں کرتا۔

درختوں کی بے غرضی کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہوتا ہے کہ وہ ہمیں طرح طرح کے پھل دیتا ہے۔ آم، کیلے، کیو، غرضیکہ بے حساب قسم کے درخت ہوتے ہیں جو ہمیں سال کے مختلف حصوں میں مزے دار صحت مند پھل دیتے رہتے ہیں لیکن وہ خود نہیں کھاتے ہیں۔ نہ ضد کرتے ہیں کہ ہم اتنے آم پیدا کرتے ہیں مگر ہم نے کبھی لذیذ آم نہیں کھایا۔ کسی بھی پھل دار درخت نے کبھی اپنا پیدا کیا ہوا پھل نہیں کھایا۔ وہ صرف ہم انسانوں کے لیے ہر چیز پیدا کرتا ہے اور خوش رہتا ہے کہ میں نے انسانوں کی خدمت کی۔

درختوں اور پھلوں سے دو انیاں بھی بنتی ہیں جو کئی خطرناک امراض میں فائدہ مند ہیں۔ دیکھا جائے تو درخت انسان کو صرف فائدہ ہی پہنچاتا ہے مگر انسان خوش نمائی کے سوا اس کو کسی اور چیز کے لیے اہم نہیں سمجھتے۔

ایک بچے نے اپنے ابا سے پوچھا کہ ابو، درخت تو ہر خزاں کے موسم میں سوکھ کر لکڑی بن جاتے ہیں، ان کے پتے جھڑ جاتے ہیں اور یہ بالکل ٹھنڈا ہوتا ہے لیکن یہ کیا بات ہے کہ انسان جب ایک بار بوڑھا ہوتا ہے تو پھر دوبارہ جوان نہیں ہوتا حالانکہ درختوں پر بدلتے موسم میں پھر سے پتے آ جاتے ہیں؟

ابو نے کہا "بیٹا، اللہ تعالیٰ نے ہر مخلوق کی زندگی اور موت اور خصوصیات کا نظام بنادیا ہے۔ اپنی جگہ سے نہیں ہٹ سکتے، اسی طرح انسان کے مقدر میں بھی یہ ہے کہ ایک بار بوڑھا ہونے کے بعد وہ جوان نہیں ہو سکتا۔

اللہ تعالیٰ کا کمپیوٹر دنیا بھر کے کمپیوٹرز سے زیادہ اور وقت مقررہ پر کام کرنے والا ہے۔ اس نے جو فصلیں، جو

☆ ☆ ☆
پاکستان کی فلمی صنعت کی بدقسمتی یہ رہی ہے کہ تعلیم یافتہ لوگوں نے نہیں آپ انگریزی خواں کہتے ہیں نہ تو خود بھی پاکستانی اردو فلم دیکھی اور نہ اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کی۔ قحطی ہے کہ ہماری حکومت نے فلمی صنعت کو بھی کوڑ اور انتہائی کارآمد حرجے کو بھی استعمال ہی نہیں کیا۔ جبکہ بھارت میں شروع دن سے فلمی صنعت کی ترقی پر زور دیا گیا۔ ترقیاتی ادارے قائم کیے گئے اور ایسا ماحول پیدا کیا گیا کہ اچھے اور تعلیم یافتہ خاندانوں کے بچے بھی اس طرف راغب ہوئے۔ فرق کا اندازہ اس بات سے لگائے کہ ہمارے نامور ترین فن کاروں نے بھی اپنے بچوں کو فلموں سے دور رکھا جبکہ بھارت میں بڑے فلمی فن کاروں کی تیسری چوتھی نسل بھی اس صنعت سے وابستہ ہے۔ سرمائے کی کمی نہ تھی، ہر باسرمایہ دار فلموں کے لیے سرمایہ فراہم کرنے کو تیار تھا۔ فلمیں بے حد کامیاب ہو رہی تھیں۔ بھارت نے سنیما گھروں کے علاوہ اپنے سفارت خانوں میں بھی خصوصی لوگوں کو مخصوص شو میں فلمیں دکھائیں اور ان کے دل موہ لیے۔

پاکستان اس وقت پیر پتیا پر تھا، یہاں دلپ کمار، دیو



شرقی پاکستان کی چھ اور رحمان کی کامیاب فلم جہاں بایے شہنائی چودری صاحب تمہاری فلم اگر بن بھی گئی تو کم از کم دوسال میں بنے گی۔

وہ گھبرا گئے ”مگر آفاقی کیوں؟“

”اس لیے کہ دادا ان دنوں مصروف ہیں۔ دو فلمیں بن رہے ہیں۔ اس کے علاوہ دو اور فلم سازوں سے انہوں نے وعدہ کر لیا ہے بلکہ ایڈوائس بھی شاید لے لیا ہے۔ ویسے بھی دادا بہت آہستہ، آرام سے کام کرتے ہیں۔ اب سوچ لو کتنا عرصہ گزرے گا۔“

شائق پریشان تو ہوئے مگر انہیں امید تھی کہ ان کا کام جلد شروع ہو جائے۔ وہ ہر روز صبح دادا کے گھر حاضری ضرور دیا کرتے تھے۔ تین ماہ بعد شائق نے خوش خبری سنائی کہ کل رات ہماری میٹنگ ہے، اگلے روز دادا نے پوچھا ”گورو کوئی کہانی سوچی؟“

ہم نے کہا ”دادا، سوچنے کا موقع تو نہیں ملا مگر روی مصنف گوگوں کا ایک ناول بہت موزوں رہے گا۔“

دادا خوش ہو گئے ”تو پھر وہ ناول تلاش کرنا چاہیے۔“

ہم نے کہا ”دادا وہ انگریزی میں مختصر سانا ناول ہے۔ انڈیا میں اس پر ’افسر‘ کے نام سے فلم بھی بنی ہے جس میں

جب وفد سے ملاقات ہوئی تو وہ بہت اصرار لے۔ کافی پانی بھر حال دریافت کیا۔ انہیں چھوٹی بتائے تھے کہ وہ بولے ”معاف کیجئے گا، مجھے اس چارج سنبھالے ابھی صرف چار ماہ ہوئے ہیں۔ مسائل سے بے خبر ہوں۔ البتہ اگلی ملاقات میں کامیاب ہوں گی۔“

اس سے آپ فلمی صنعت کی اہمیت کا اندازہ لے سکتے ہیں جہاں ہر چند ماہ بعد وزیر اور سیکریٹری بدل جاتے ہیں اس کو فلموں کے بارے میں کسی چیز کا علم نہ ہوتا تھا۔ افسران کا رویہ بیان کر دیا ہے جن لوگوں نے اس کے کرتے پڑتے فلمیں بنائیں ہمارے افسر اور وزیر ان تک نہیں جانتے تھے۔

ہدایت کار نذر الاسلام بھی ایسے ہی ہنرمند تھے جن میں شامل تھے۔ وہ ملکیت میں ملے بڑھے۔ پاکستان کے بعد ڈھاکہ آ گئے۔ وہ بنیادی طور پر فلم انڈیا سے تھے۔ ان کی رسائی اور فلمائے کا انداز سب سے قابلِ دید تھا۔

ڈھاکہ میں چند ہنگامے فلمیں بنانے کے بعد وہ آ گئے۔ اور ایسے آئے کہ لاہور کی خاک میں دفن ہوئے۔ نذر الاسلام لاہور کے لیے ایک نئے ہدایت کار انہیں یہاں کوئی نہیں جانتا تھا مگر جب انہوں نے ہدایت کاری شروع کی تو سب کو حیران کر دیا۔

وہ دبلے پتلے، کم گو، زیادہ سوچنے اور کم بولنے والے انسان تھے۔ ملاقات تو سب سے خفیہ مگر بے تکلفی شروع ہوئی۔ شائق نے ان سے ایک بار انہوں نے خود چھوٹے بچوں کے بارے میں بتایا کہ اس قدر رشور کرتے کہ میں پردوں کے پیچھے چھپ کر سوچتا ہوں۔

نذر الاسلام صرف نام کے دادا ہی نہیں تھے، ہنر اور بلند خیالی کے اعتبار سے بھی دادا کہلانے والے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ ایک عام فلم کو اپنے اسکرین اور سینما روی کی جدیلی سے ایک خصوصی فلم بنا دیتے تھے۔ سوچنے کا انداز، ان کے طریقہ کار کے مطابق تھا۔ آپ کی مشہور فلمیں احساس، زندگی، بندش اور آئینہ دیکھ کر موضوع اور کردار وہی ہیں لیکن اپنے انداز کی وجہ انہوں نے ایک مختلف فلم بنادیا ہے۔

انہیں شوکت حسین رضوی کی طرح سین اور جیلا جانے کا شوق تھا۔ وہ اپنے مناظر کو خوبصورتی سے

فلموں کی الف بے کا بھی علم نہیں تھا۔ ایک ایسی ہی مختصر صدر کے پرنسپل سیکریٹری نے کھانے کے دوران میں ڈیپو زیڈ احمد سے سوال کیا کہ آخر ہماری فلمیں ابھی مکمل کیوں ہوئی ہیں، کیا ہمارے ملک میں اچھے فنکار اور تحقیق کار نہیں ہوتے؟

احمد صاحب نے سگار سلگایا اور پوچھا ”پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے آج تک کتنی پاکستانی فلمیں دیکھی ہیں؟“

جواب ملا ”ایک بھی نہیں۔ میں ایسے افسرانِ لوگ ”دوسرے درجے“ کی فلمیں دیکھ کر اپنا وقت ضائع نہیں کرتے۔“

مرحوم ڈیپو زیڈ احمد ایک منہ پھٹ اور صاف گو آدمی تھے۔ مسکرا کر بولے ”عزیز احمد صاحب، ہم کون سی اچھی چیزیں بناتے ہیں۔ ہماری سڑکیں دو یا تین ماہ بعد ہی ٹوٹ جاتی ہیں۔ ہماری تعلیم نا کارہ ہے، ہماری بلڈنگیں اور پبلک چھ مینے میں زبیں بوس ہو جاتے ہیں۔ ہمارے دفاتر میں جس طرح سے کام ہوتا ہے وہ تو آپ ضرور جانتے ہیں۔ اپنی خرابیوں کی جگہ اگر ہم ہندوستان سے سائنس دان، انجینئر اور اچھی تعمیر والے لوگ بلا لیں تو کیا حرج ہے۔ ہر چیز ٹھیک ہو جائے گی اور پھر آپ اپنی بیورو کو دیکھیے، کس قدر سست، نا اہل اور رشوت خور ہے، ان کی جگہ ہم انڈیا سے اچھے لوگ کیوں نہ منگا لیں اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال کا ہر جگہ چرچا ہے، ساری دنیا ان کو جانتی اور مانتی ہے، ہم اگر ہندوستان سے جواہر لال جیسا وزیر اعظم بلا لیں تو ہر طرف واہ واہ ہو جائے گی۔ دراصل ہمارے ہاں کوئی بھی چیز کام کی نہیں ہے۔ انڈیا سے مقابلہ کرنے کا یہ واحد طریقہ ہے۔“

عزیز احمد صاحب کے علاوہ مختل میں سارے بڑے بڑے عہدے دار چپ ہو گئے۔ احمد صاحب کے سوالوں کا جواب کسی کے پاس بھی نہ تھا۔

ایک بار فلم سازوں کے وفد کے ساتھ ہم اسلام آباد گئے، ان دنوں جنرل یحییٰ نے نئے آئے تھے اور ہر ایک کو ”ٹھک“ کرنے کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ پاکستانی فلمی وفد کو ملاقات کی درخواست کے جواب میں دوسری خط بھی نہیں موصول ہوتا تھا۔ لیکن اب یحییٰ خان کا دور تھا اور سارے سرکاری افسر سہمے ہوئے تھے۔

مجید مفتی صاحب ایک اعلیٰ پائے کے قابل افسر تھے۔ انہیں فلم اور ثقافت کا ٹکھ سوپ دیا گیا تھا۔

وہ اپنے مناظر کو خوبصورتی سے

دیو آئند تھا۔ یہ بہت دلچسپ اور طنزیہ کہانی ہے۔ لگتا ہے گوگل نے آج کے پاکستانی معاشرے اور افسر شاہی کے بارے میں لکھی ہے۔

یہ کہہ کر ہم نے انہیں ناول کی کہانی سنا دی۔
دادا کچھ سوچتے رہے پھر شائق سے کہا ”تم اس ناول کو تلاش کرو۔“

شائق نے تلاش شروع کر دی۔ چھ مہینے بعد کراچی سے وہ ناول آ گیا جو ہم نے ان کے حوالے کیا۔

دو دن بعد انہوں نے کہا ”آفاقی صاحب، یہ تو وہی کہانی ہے جو آپ نے سنا لی تھی۔“

ہم نے کہا ”ہم نے تو آپ کو بتا دیا تھا کہ ناول کا خلاصہ صرف اتنا ہی ہے۔“

”اس میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ میرے خیال میں آپ ایک اور کہانی سوچئے۔“

ہم نے کہا ”دراصل آپ کس قسم کی کہانی چاہتے ہیں، کوئی آئیڈیا تو دیجئے تاکہ اس ایک ٹیم پر سوچا جائے۔“

وہ مسکرائے ”دادا، مجھے ایک چھوٹی سی، میٹھی سی، محبت کی کہانی چاہیے جیسی کہ آپ لکھتے ہیں۔ مار پیٹ وغیرہ اس میں بالکل نہ ہو۔ خون خرابا نہ ہو، سب بیکار ہی بیکار ہو۔“

شائق نے لقمہ دیا ”ایسی کہانی لکھنا تو آفاقی صاحب کا بائیں ہاتھ کا کام ہے۔“

ہم نے کہا ”مگر ہم دائیں ہاتھ سے لکھتے ہیں۔“
”دادا تو پھر سوچئے نا چھوٹی سی، میٹھی سی کہانی۔ مجھے معلوم ہے ایسی کہانی آپ ہی لکھ سکتے ہیں۔“

شائق نے کھانا کھلایا۔ کافی پلائی اور انہیں رخصت کر دیا۔ اگلی مینٹنگ کے لیے پندرہ دن کا وقفہ مقرر ہوا۔

ہم نے کہا ”دیکھو شائق، ہم اس طرح کہانی نہیں لکھتے۔ نہ ٹیم، نہ کردار، نہ کہانی؟“

”آفاقی بھائی سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ انہوں نے ہمیں تسلی دی۔

پندرہ دن بعد ہم ایک بہت لمبی پھلکی رومانی اور طنزیہ کہانی سوچ کر گئے۔ جیسے جیسے ہم نے انہیں کہانی کا خلاصہ سنایا۔ وہ بہت غور سے سنتے رہے، پھر بولے ”کہانی بہت اچھی ہے۔ میٹھی اور رومانٹک ہے مگر دادا میں نے سوچا کہ ہمیں کوئی انقلابی فلم بنانی چاہیے۔“

”انقلابی فلم؟“

”جی، میرا مطلب ہے کوئی غریب کسان ہو، ساہوکار

اس کو لوٹا ہے اور معاوضہ نہیں دیتا۔ وہ بے چارہ ساہوکار سے کیسے لڑ سکتا ہے۔ ساہوکار کے بندوں نے اسے کل اور راتوں رات اس کی قبر بنادی۔ فلم کا نام میں نے ”سوچا ہے، مطلب یہ کہ ہمارے ملک میں غریبوں کی ذرا بھی دراصل قبریں میں گزرتی ہے۔ کیوں دادا، کیا ضرور ہے؟“

اب ہم تنگ آچکے تھے۔ ہم نے کہا ”ڈیڑھ سال پہلے ابھی تک کہانی کا موضوع اور کہانی تک نہیں لی۔“

کہتے تھے کہ میٹھی میٹھی بیکار کی کہانی چاہیے، اب آپ ہیں کہ باغی اور ایکشن کہانی ہونی چاہیے۔“

”دراصل آفاقی بھائی آج کل ایسی ہی فلموں دور ہے۔ میرے خیال میں تو آپ ویسٹرن فلمیں دیکھ کر آئیڈیا سوچیں۔“

”میرے خیال میں تو آپ بشیر نیاز کے ساتھ بنائیں۔ آپ دونوں ایک دوسرے کو خوب سمجھتے ہیں۔“

”ارے ارے، آپ تو ناراض ہو گئے۔ چھوڑیے اپنی پسند کی کوئی کہانی لکھ دیجئے۔“

”مگر میری پسند شاید آپ کو پسند نہ آئے۔ دیے آج کل میں نے ایک کہانی پر کام شروع کر رکھا ہے۔“

یہ سن کر شائق بے چارے کا تو منہ تر گیا۔
دادا کے جانے کے بعد شائق نے بہت شکایت کی کہ

رضا مند ہوئے تو آپ نے گڑبڑ کر دی۔
ہم نے کہا ”شائق، بچے! ہم نے تم سے پہلے ہی کہ دادا کو کاٹ کر تپے تو بشیر نیاز بولے۔ وہ دونوں دوسرے کو سمجھتے ہیں۔ کتنی اچھی فلمیں بنائی ہیں انہوں نے دیکھئے فلم میں دو دامخوں اور دو سوچوں کا یکساں ضروری ہے۔ ہدایت کار اور مصنف میں وقتی ہم آہنگی ہونی چاہیے۔ اس کے بغیر اچھی فلم نہیں بن سکتی۔“

شائق بولے ”اتنی مشکل سے تو اب اسے فری پینڈنگ اب نہ جانے ملے نہ ملے۔“

”دیکھو شائق، دادا بہت اچھے آدمی ہیں مگر ان کی اور ہدایت کاری دوسروں سے مختلف ہے۔ تم خود ہی بتاؤ۔“

”آئیڈیہ“ جیسی ایک معمولی کہانی کو انہوں نے اپنے خیال سے کیسے سجایا۔ ان کی ہر فلم واقعی ایک شاہکار ہوتی ہے۔ تم جانتے ہو کہ شاہکار بنانے میں بہت خون جگر صرف ہے اور کتنا عرصہ لگتا ہے۔“

شائق کی وہ فلم جی نہیں بلکہ اس کی ایک فلم

جی۔ لیکن نذر الاسلام صاحب نے کئی بہت یادگار فلمیں بنا کر بہت نام پیدا کیا۔ ان کی یہ فلمیں بھلا کون بھول سکتا ہے؟ دلچسپ بات یہ ہے کہ انہوں نے ہر موضوع پر فلمیں بنائیں اور ہر فلم اپنی نوعیت کی الگ تھی۔ کیونکہ نذر الاسلام ایک مختلف قسم کے انسان تھے۔ انہوں نے جس موضوع پر فلمیں بنائیں اسے کامیاب بھی کر لیں۔ سوائے ان کی آخری فلم ”خوابش“ کے جس سے انہیں بہت زیادہ امیدیں وابستہ تھیں۔ اس زمانے میں وہ دل کے مریض تھے۔ یہ فلم انہوں نے بیماری کے عالم میں ہی بنائی تھی۔ وہ بہت کچھ دار آدمی تھے لیکن پیسے کی ہمیشہ ضرورت رہتی تھی۔ ایک دولت مند نوجوان نے اس شرط پر ان سے فلم بنوائی کہ سب سے اہم کردار اس کا ہوگا۔ عام حالات میں شاید وہ اس سے بات بھی نہ کرتے۔ مگر بیماری اور ضرورت کے ہاتھوں تنگ آ کر انہوں نے یہ فلم بنائی۔ خدا جانے کس طرح بیماری کے عالم میں یہ فلم بنائی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انہیں اس فلم سے بہت امید تھی۔ ان کے خیال میں یہ ان کی بہترین فلم تھی۔

فلم مکمل ہو گئی تو اس کا ایک خصوصی شو کیا گیا جس میں ہم بھی مدعو کیا گیا۔ ہمارے خیال میں یہ فلم دادا کی فلم معلوم ہی نہیں ہوتی تھی مگر دادا اس سے بہت مطمئن تھے۔ فلم شروع ہوئی تو ہم کچھ دیر بعد ہی مایوس ہو گئے۔ یہ دادا کی فلم ہی نظر نہیں آتی تھی۔

فلم ختم ہوئی تو ہم دادا سے ملے بغیر ہی کھک گئے۔ دراصل ہم نے ان سے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا اور نہ بولنا چاہتے تھے۔ مگر حیرت یہ کہ دوسرے لوگ انہیں مبارک باد دے رہے تھے۔ حیرت ہوئی کہ کیسے کم فہم لوگ ہیں۔ پھر خیال آیا کہ شاید دادا کو خوش کرنے کے لیے سب ایسا کر رہے ہیں۔

فلم ریلیز ہوئی اور حسب توقع فلاپ ہو گئی۔ ہم دادا کے گھر گئے تو ڈیڑھ سی میں ان کا جنازہ رکھا تھا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کیسے کیسے جیتی ہمارے ملک میں پتھر کے ٹکڑے بچھ کر رکھا دیے جاتے ہیں۔

دادا میں یہ خوشی تھی کہ دوسروں کے اچھے کام کی بھی بہت تعریف کرتے تھے۔ جب ہماری فلم ریلیز ہوئی، ایک طرف لے کر بیٹھ جاتے اور اپنی رائے دیتے۔ اپنا نکتہ نظر بیان کرتے تھے۔ ان کی فلموں پر بھی ہم دونوں دیانت داری سے اپنے خیالات بیان کرتے تھے۔ افسوس کہ ان کی آخری فلم کے بارے میں یہ رسم جاری نہ رہ سکی کیونکہ وہ دنیا میں

جی۔ لیکن نذر الاسلام صاحب نے کئی بہت یادگار فلمیں بنا کر بہت نام پیدا کیا۔ ان کی یہ فلمیں بھلا کون بھول سکتا ہے؟ دلچسپ بات یہ ہے کہ انہوں نے ہر موضوع پر فلمیں بنائیں اور ہر فلم اپنی نوعیت کی الگ تھی۔ کیونکہ نذر الاسلام ایک مختلف قسم کے انسان تھے۔ انہوں نے جس موضوع پر فلمیں بنائیں اسے کامیاب بھی کر لیں۔ سوائے ان کی آخری فلم ”خوابش“ کے جس سے انہیں بہت زیادہ امیدیں وابستہ تھیں۔ اس زمانے میں وہ دل کے مریض تھے۔ یہ فلم انہوں نے بیماری کے عالم میں ہی بنائی تھی۔ وہ بہت کچھ دار آدمی تھے لیکن پیسے کی ہمیشہ ضرورت رہتی تھی۔ ایک دولت مند نوجوان نے اس شرط پر ان سے فلم بنوائی کہ سب سے اہم کردار اس کا ہوگا۔ عام حالات میں شاید وہ اس سے بات بھی نہ کرتے۔ مگر بیماری اور ضرورت کے ہاتھوں تنگ آ کر انہوں نے یہ فلم بنائی۔ خدا جانے کس طرح بیماری کے عالم میں یہ فلم بنائی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انہیں اس فلم سے بہت امید تھی۔ ان کے خیال میں یہ ان کی بہترین فلم تھی۔

فلم مکمل ہو گئی تو اس کا ایک خصوصی شو کیا گیا جس میں ہم بھی مدعو کیا گیا۔ ہمارے خیال میں یہ فلم دادا کی فلم معلوم ہی نہیں ہوتی تھی مگر دادا اس سے بہت مطمئن تھے۔ فلم شروع ہوئی تو ہم کچھ دیر بعد ہی مایوس ہو گئے۔ یہ دادا کی فلم ہی نظر نہیں آتی تھی۔

فلم ختم ہوئی تو ہم دادا سے ملے بغیر ہی کھک گئے۔ دراصل ہم نے ان سے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا اور نہ بولنا چاہتے تھے۔ مگر حیرت یہ کہ دوسرے لوگ انہیں مبارک باد دے رہے تھے۔ حیرت ہوئی کہ کیسے کم فہم لوگ ہیں۔ پھر خیال آیا کہ شاید دادا کو خوش کرنے کے لیے سب ایسا کر رہے ہیں۔

فلم ریلیز ہوئی اور حسب توقع فلاپ ہو گئی۔ ہم دادا کے گھر گئے تو ڈیڑھ سی میں ان کا جنازہ رکھا تھا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کیسے کیسے جیتی ہمارے ملک میں پتھر کے ٹکڑے بچھ کر رکھا دیے جاتے ہیں۔

دادا میں یہ خوشی تھی کہ دوسروں کے اچھے کام کی بھی بہت تعریف کرتے تھے۔ جب ہماری فلم ریلیز ہوئی، ایک طرف لے کر بیٹھ جاتے اور اپنی رائے دیتے۔ اپنا نکتہ نظر بیان کرتے تھے۔ ان کی فلموں پر بھی ہم دونوں دیانت داری سے اپنے خیالات بیان کرتے تھے۔ افسوس کہ ان کی آخری فلم کے بارے میں یہ رسم جاری نہ رہ سکی کیونکہ وہ دنیا میں

جی۔ لیکن نذر الاسلام صاحب نے کئی بہت یادگار فلمیں بنا کر بہت نام پیدا کیا۔ ان کی یہ فلمیں بھلا کون بھول سکتا ہے؟ دلچسپ بات یہ ہے کہ انہوں نے ہر موضوع پر فلمیں بنائیں اور ہر فلم اپنی نوعیت کی الگ تھی۔ کیونکہ نذر الاسلام ایک مختلف قسم کے انسان تھے۔ انہوں نے جس موضوع پر فلمیں بنائیں اسے کامیاب بھی کر لیں۔ سوائے ان کی آخری فلم ”خوابش“ کے جس سے انہیں بہت زیادہ امیدیں وابستہ تھیں۔ اس زمانے میں وہ دل کے مریض تھے۔ یہ فلم انہوں نے بیماری کے عالم میں ہی بنائی تھی۔ وہ بہت کچھ دار آدمی تھے لیکن پیسے کی ہمیشہ ضرورت رہتی تھی۔ ایک دولت مند نوجوان نے اس شرط پر ان سے فلم بنوائی کہ سب سے اہم کردار اس کا ہوگا۔ عام حالات میں شاید وہ اس سے بات بھی نہ کرتے۔ مگر بیماری اور ضرورت کے ہاتھوں تنگ آ کر انہوں نے یہ فلم بنائی۔ خدا جانے کس طرح بیماری کے عالم میں یہ فلم بنائی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انہیں اس فلم سے بہت امید تھی۔ ان کے خیال میں یہ ان کی بہترین فلم تھی۔

فلم مکمل ہو گئی تو اس کا ایک خصوصی شو کیا گیا جس میں ہم بھی مدعو کیا گیا۔ ہمارے خیال میں یہ فلم دادا کی فلم معلوم ہی نہیں ہوتی تھی مگر دادا اس سے بہت مطمئن تھے۔ فلم شروع ہوئی تو ہم کچھ دیر بعد ہی مایوس ہو گئے۔ یہ دادا کی فلم ہی نظر نہیں آتی تھی۔

فلم ختم ہوئی تو ہم دادا سے ملے بغیر ہی کھک گئے۔ دراصل ہم نے ان سے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا اور نہ بولنا چاہتے تھے۔ مگر حیرت یہ کہ دوسرے لوگ انہیں مبارک باد دے رہے تھے۔ حیرت ہوئی کہ کیسے کم فہم لوگ ہیں۔ پھر خیال آیا کہ شاید دادا کو خوش کرنے کے لیے سب ایسا کر رہے ہیں۔

فلم ریلیز ہوئی اور حسب توقع فلاپ ہو گئی۔ ہم دادا کے گھر گئے تو ڈیڑھ سی میں ان کا جنازہ رکھا تھا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کیسے کیسے جیتی ہمارے ملک میں پتھر کے ٹکڑے بچھ کر رکھا دیے جاتے ہیں۔

دادا میں یہ خوشی تھی کہ دوسروں کے اچھے کام کی بھی بہت تعریف کرتے تھے۔ جب ہماری فلم ریلیز ہوئی، ایک طرف لے کر بیٹھ جاتے اور اپنی رائے دیتے۔ اپنا نکتہ نظر بیان کرتے تھے۔ ان کی فلموں پر بھی ہم دونوں دیانت داری سے اپنے خیالات بیان کرتے تھے۔ افسوس کہ ان کی آخری فلم کے بارے میں یہ رسم جاری نہ رہ سکی کیونکہ وہ دنیا میں

جی۔ لیکن نذر الاسلام صاحب نے کئی بہت یادگار فلمیں بنا کر بہت نام پیدا کیا۔ ان کی یہ فلمیں بھلا کون بھول سکتا ہے؟ دلچسپ بات یہ ہے کہ انہوں نے ہر موضوع پر فلمیں بنائیں اور ہر فلم اپنی نوعیت کی الگ تھی۔ کیونکہ نذر الاسلام ایک مختلف قسم کے انسان تھے۔ انہوں نے جس موضوع پر فلمیں بنائیں اسے کامیاب بھی کر لیں۔ سوائے ان کی آخری فلم ”خوابش“ کے جس سے انہیں بہت زیادہ امیدیں وابستہ تھیں۔ اس زمانے میں وہ دل کے مریض تھے۔ یہ فلم انہوں نے بیماری کے عالم میں ہی بنائی تھی۔ وہ بہت کچھ دار آدمی تھے لیکن پیسے کی ہمیشہ ضرورت رہتی تھی۔ ایک دولت مند نوجوان نے اس شرط پر ان سے فلم بنوائی کہ سب سے اہم کردار اس کا ہوگا۔ عام حالات میں شاید وہ اس سے بات بھی نہ کرتے۔ مگر بیماری اور ضرورت کے ہاتھوں تنگ آ کر انہوں نے یہ فلم بنائی۔ خدا جانے کس طرح بیماری کے عالم میں یہ فلم بنائی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انہیں اس فلم سے بہت امید تھی۔ ان کے خیال میں یہ ان کی بہترین فلم تھی۔

فلم مکمل ہو گئی تو اس کا ایک خصوصی شو کیا گیا جس میں ہم بھی مدعو کیا گیا۔ ہمارے خیال میں یہ فلم دادا کی فلم معلوم ہی نہیں ہوتی تھی مگر دادا اس سے بہت مطمئن تھے۔ فلم شروع ہوئی تو ہم کچھ دیر بعد ہی مایوس ہو گئے۔ یہ دادا کی فلم ہی نظر نہیں آتی تھی۔

فلم ختم ہوئی تو ہم دادا سے ملے بغیر ہی کھک گئے۔ دراصل ہم نے ان سے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا اور نہ بولنا چاہتے تھے۔ مگر حیرت یہ کہ دوسرے لوگ انہیں مبارک باد دے رہے تھے۔ حیرت ہوئی کہ کیسے کم فہم لوگ ہیں۔ پھر خیال آیا کہ شاید دادا کو خوش کرنے کے لیے سب ایسا کر رہے ہیں۔

نہیں رہے تھے۔ ☆☆☆

ہدایت کار نذر الاسلام کا تعلق تو کلکتہ سے تھا لیکن وہ ڈھاکہ چلے آئے تھے۔ وہ فلم ایڈیٹر تھے اور یہی خوبی ان کی ہدایت کاری میں نمایاں نظر آتی۔ کلکتہ اور ڈھاکہ میں قیام کرنے کی وجہ سے وہ جنگل کے علاوہ اردو سے بھی بہ خوبی واقف تھے۔ ان کا اردو تلفظ بہت اچھا تھا۔

ڈھاکہ آ کر پہلے تو انہوں نے فلم ایڈیٹنگ میں نام پیدا کیا اور پھر بحیثیت ہدایت کار پہلی فلم ”کاجل“ بنائی تھی جس نے درمیانے درجے کی کامیابی حاصل کی تھی۔ فلم ”پیاسا“ بنائی۔ اس وقت تک پاکستان بن چکا تھا۔ یہ خیال رہے کہ نذر الاسلام جو کہ ایک تعلیم یافتہ ہنرمند تھے، کلکتہ میں بھی



مشرقی پاکستان کی اداکارہ شبانہ

کامیابیاں حاصل کر سکتے تھے لیکن قیام پاکستان سے پہلے ہی انہوں نے ڈھاکہ میں قیام کرنا پسند کیا۔ پاکستان بننے کے بعد وہ کراچی میں آباد ہو گئے۔ کراچی شہر انہیں بہت پسند آیا تھا لیکن فلم کا مرکز تو لاہور تھا۔ کراچی ہی میں ان کی ملاقات فلم ساز نصرت محسنی سے ہوئی تھی۔ محسنی صاحب ان کی صلاحیتوں سے اتنا متاثر ہوئے کہ بعد میں انہوں نے نذر الاسلام سے بہت شاہکار فلمیں بنوائیں۔

کراچی میں ان کی ملاقات مرد درویش الیاس رشیدی



مشرقی پاکستان کی اداکارہ انورہ

سے ہوئی۔ الیاس رشیدی کو اللہ نے ایک ہمدرد اور دردمند دل دیا تھا۔ وہ ہر ضرورت مند کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ پاکستان کی فلمی صنعت کے معماروں میں وہ نمایاں تھے۔ جس ہدایت کار کو کام نہ ملتا اسے کام دلانا الیاس بھائی اپنا فرض سمجھتے تھے۔ جس فلم سازی کی فلم فلاپ ہونے کے بعد کوئی اس کو سرمایہ دینے کو تیار نہ ہوتا تھا اسے الیاس بھائی کسی نہ کسی سے سرمایہ ضرور دلا دیتے تھے۔ انہوں نے اپنی ان خدمات کے لیے کبھی کسی سے ایک پیسہ تک وصول نہیں کیا بلکہ اپنی گرہ سے خرچ کر دیتے تھے۔ فلمی صنعت میں ان کا بہت احترام تھا اور ہمیں یاد نہیں کہ کبھی کسی نے الیاس بھائی کی بات نالی ہو۔ ہم انہیں مذاق میں خدائی نویدار کہا کرتے تھے اور وہ ہنستے رہتے تھے۔ جب نذر الاسلام جیسے ہدایت کار کو کام نہ ملا تو الیاس بھائی نے ان کی خاطر خود فلم ”احساس“ بنائی۔ یہ ایک معیاری اور کامیاب فلم تھی۔ اس طرح پاکستان میں دادا کو الیاس بھائی نے متعارف کرایا جو آگے چل کر پاکستان کا بہت بڑا ہدایت کار ثابت ہوا۔ فلم احساس 1972ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ ہماری فلم ”آس“ 1973ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ ناموں کی مناسبت کی وجہ سے اکثر لوگ ان دونوں کو غلط ملط کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے ”آئینہ“ بنائی جو ایک ہی سینما میں ایک سو بیس سے زائد چلی اور اس کے بعد بھی چلتی رہی۔

آئینہ میں درحقیقت نذر الاسلام اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ انڈیا میں بھی اس فلم کے چرچے بنائے گئے مگر دادا کی فلم ”آئینہ“ ان سب سے برتر تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ ایک شاہکار فلم تھی جو ہر ذوق کے لوگوں کو پسند تھی۔ روین گھوش کی موسیقی نے اس میں چار چاند لگا دیے تھے۔ شبنم اور ندیم نے اپنے کردار نہایت حقیقی انداز میں ادا کیے تھے۔ یہ ہدایت کاری، موسیقی، عکاسی اور

ادا کاری کے حساب سے ایک منفرد اور انوکھی فلم لگتی تھی۔ پاکستان میں یہ فلم سازی کا بائبل نیا تجربہ تھا۔ آئینہ میں مرکزی کردار شبنم اور ندیم نے ادا کیے تھے۔ اور ان کرداروں میں جان ڈال دی تھی۔ اس کی کاسٹ میں خالد سلیم موٹا بھی شامل تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ آئینہ دنیا کی کسی بھی فلم کے مقابلے میں بڑے فخر سے پیش کی جاسکتی ہے۔ نذر الاسلام کی دوسری کامیاب فلموں میں امیر، شیشہ کا گھر، خواہش، لواسنوری، زندگی، نہیں ابھی نہیں، ہندش، میڈم باوری، کالا بازار، آگن، چکر، ٹرسٹ وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں سے اکثر بے حد کامیاب فلمیں ہیں۔ نذر الاسلام کے موسیقار ہمیشہ روین گھوش ہوتے تھے۔ مرکزی کرداروں میں وہ شبنم اور ندیم کو ترجیح دیتے تھے۔ یوں تو انہوں نے باہرہ شریف اور دوسرے فنکاروں کے ساتھ بھی کام کیا لیکن روین کی موسیقی، شبنم اور ندیم کی جوڑی، بشیر ناز کی تحریر اور خود ان کی ہدایت کاری ان کی فلموں کا بیس رہا ہے۔

ان کی پیش رفتیں اعلیٰ درجے کی تھیں لیکن آئینہ نے جو مقبولیت اور شہرت حاصل کی وہ کسی اور فلم کو حاصل نہ ہوئی۔ اس کے فلم ساز رؤف حمسی تھے جو ذاتی طور پر بھی نذر الاسلام کے مداح تھے۔ آئینہ وہ فلم تھی جو چار سو ہفتے جو کہ برصغیر کی فلمی تاریخ میں ایک ریکارڈ ہے۔ اس سے پہلے قیام پاکستان سے قبل نکلتے کے ایک ہی سینما میں فلم ”تسنت“ ایک سال تک چلی تھی۔ لیکن ”آئینہ“ نے اس کا ریکارڈ بھی توڑ دیا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ ”آئینہ“ ہر لحاظ سے تسنت سے بدرجہ بہتر فلم تھی۔ یوں سمجھئے کہ ”آئینہ“ نذر الاسلام کا بنایا ہوا تاج محل تھی۔

اس فلم میں ہمارے ایک قریبی دوست (اب مرحوم ہو چکے ہیں) کنور آفتاب کے چھ سات سالہ بیٹے نے بھی محض نذر الاسلام کے اصرار پر کام کیا تھا۔ کنور آفتاب اس زمانے میں پی ٹی وی میں ایک بڑے افسر تھے۔ ان کا یہ چنا شاد رخ اب ماشاء اللہ جوان اور شادی شدہ ہو چکا ہے۔ آئینہ کی کہانی کا بنیادی پہلو یہ تھا کہ ایک دولت مند باپ (رحمان) کی بیٹی شبنم ایک غریب نوجوان ”ندیم“ کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہے لیکن باپ سخت مخالف ہے۔ بیٹی نے باپ کی مخالفت کے بعد شادی کر لی اور دونوں میاں بیوی بہت خوش ہیں۔ مشکلات بھی راستے میں آتی ہیں لیکن ان کی زندگی خوشیوں سے بھر پور ہے۔ روین گھوش کی موسیقی

اس فلم کی روح تھی تو ندیم اور شبنم کی ادا کاری ان کی جان تھی۔ اس فلم کو تقریباً ہر شعبے میں ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ یہ فلم 1977ء میں نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی اور اس نے سارے ملک میں سنسنی پھیلا دی تھی۔ یہاں تک کہ انڈیا میں بھی اس کے گانے اور کہانی کے بہترین حصے استعمال کیے گئے مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔

انڈیا میں اسے ”پیار جھلکا نہیں“ کے نام سے اور ایک بار پھر نکاح کے نام سے بنایا گیا تھا۔ مگر یہ دونوں فلمیں نذر الاسلام نے نہیں بنائی تھیں۔ یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ دادا انچا جانتے تھے۔ وہ خاموشی سے سب کی باتیں سننے اور مسکراتے رہتے تھے لیکن جب کوئی بات سننا چاہتے تھے تو ٹھیک لگا لیتے تھے۔ ان کی قوت سماعت کا راز آج سماعت میں تھا۔

ان کا انتقال بیماری کے بعد 11 جنوری 1994ء کو ہوا تھا۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مر تھا۔

☆☆☆

برصغیر میں جو رومانی کہانیاں لوگ کہانیوں کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں ان میں ”دلا بھٹی“ کو ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ عموماً رومانی لوگ کہانیاں فرضی یا خیالی واقعات پر مبنی ہوتی ہیں لیکن ”دلا بھٹی“ سچے واقعات پر مبنی کہانی ہے جس میں رنگ آمیزی پیدا کرنے کے لیے کچھ مبالغہ آمیزی بھی کر دی گئی۔

دلا بھٹی کو اگر آپ اس زمانے کے ”راہزن ہڈ“ کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ وہ ایک انتہائی بہادر اور بے خوف انسان تھا۔ ریاست نظام پور میں ان کا قیام تھا۔ وہ امیروں کو لوٹ کر غریبوں میں تقسیم کر دیا کرتا تھا۔ غریب اس کو دعائیں دیتے تھے لیکن قانون اس کا مخالف تھا اور اس کی تلاش میں رہتا تھا۔ دلا بھٹی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اکبر اعظم کے زمانے میں تھا۔ شاہی فوجوں نے بالا خراس کو گرفتار کر لیا اور اس کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ حکومت کی نظر میں وہ ڈاکو اور لٹیرا تھا لیکن عوام کے نزدیک وہ ان کا ہمدرد اور مددگار تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دلا بھٹی کو آج تک کوئی بھولا نہیں ہے۔

دلا بھٹی کے موضوع پر دوبار فلمیں بنائی جا چکی ہیں اور دونوں بار یہ فلمیں بے حد کامیاب ثابت ہوئیں۔ دلا بھٹی کے بارے میں پاکستان میں دو فلمیں بنائی گئیں۔ پہلی بار یہ فلم 1956ء میں بنائی گئی تھی اور یہ ایک



مشرقی پاکستان کی فلم مالا کا بچہ نگر

ہر دلعزیز فلم قرار پائی تھی۔ اس کے بعد دوسری بار کچھ ترمیم کرنے کے بعد 1984ء میں بنائی گئی اور پہلی فلم کی طرح مقبول ہوئی۔ دونوں فلموں کے فلم ساز آغا جی اے گل تھے۔

پہلی دلا بھٹی کے مصنف عالم سیاہ پوش تھے جو پنجابی کے مانے ہوئے شاعر اور مصنف تھے۔ ان کے قلم نے اس فلم کو بہت سہارا دیا تھا۔ اس فلم میں یوسف خاں تھے۔

فلم ساز آغا جی اے گل نے دوبارہ فلم ”دلا بھٹی“ بنائی جس کو پہلے سے بہتر بنانے کی کوشش کی گئی تھی اور یہ بھی بہت کامیاب ثابت ہوئی تھی۔

دوسری بار جو فلم دلا بھٹی بنائی گئی اس کے ہدایت کار جہرمند ایڈیٹر ایم اکرم تھے۔ اس فلم کے مرکزی کردار سدھیر اور صبیحہ خانم تھے۔ ان دونوں کی ادا کاری نے اس فلم کے حسن میں چار چاند لگا دیے تھے۔ طفیل ہوشیار پوری اس کے شاعر تھے۔ اس فلم میں دس نغمات تھے اور سب کے سب بہت مقبول ہوئے تھے۔ آشا پوسلے اور آصف جاہ نے اس فلم میں کامیڈی کردار کیے تھے۔ اس فلم کی کامیابی میں موسیقی کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔

دلا بھٹی کے دوسرے ایڈیشن نے سارے ملک میں دھوم مچا دی تھی۔ اس فلم کے موسیقار بھی جی اے چشتی تھے۔ انکم ڈار اس فلم کے عکاس تھے۔ اس فلم کے فلم ساز آغا جی اے گل، فلم ساز کے علاوہ تقسیم کار اور سینماؤں کے مالک بھی تھے۔ اس فلم کی کامیابی کے لیے ان کا نام ہی کافی تھا۔ کہتے ہیں کہ دلا بھٹی کی شہر لاہور کے میانی صاحب کے قبرستان میں موجود ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دلا بھٹی کے بارے میں سالانہ ایک دن بھی منایا جاتا ہے لیکن بد قسمتی سے یہ کوئی نہیں جانتا کہ دلا بھٹی کی قبر کہاں ہے؟ پاکستان میں دلا بھٹی کوئی زندگی دینے میں مرحوم آغا

گل کے ادارے اور نوجوانوں نے بہت نمایاں حصہ لیا۔ انہوں نے پہلی بار فلم دلا بھی 1956ء میں بنائی تھی۔ اس فلم کے موسیقار بابا چشتی اور نغمہ نگار طفیل ہوشیار پوری تھے۔ اس فلم کے شریک ہدایت کار خلیل الرحمن تھے جنہوں نے انور کمال پاشا کی نگرانی میں یہ فلم بنائی تھی اور یہ بے حد کامیاب ثابت ہوئی تھی۔ ہدایت کاری اور اداکاری کے علاوہ بابا چشتی کی تحریر موسیقی کا بھی نمایاں ہاتھ تھا۔

فلم کی کہانی کا آغاز ایک بچوں کے اسکول سے ہوتا ہے ان ہی میں دلا بھی بھی بھی شامل ہے۔ آغاز ہی میں دکھایا گیا ہے کہ وہ ایک بڑے بے خوف اور صاف گو بچہ ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔ ہاتھ پاؤں کا بھی مضبوط تھا اس لیے دوسرے بچے اس سے جھگڑا کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔

دلا بھی جوان ہو کر ایک جوان رعنا اور دلیر نوجوان بن جاتا ہے۔ غریبوں پر دولت مند جو ظلم کرتے ہیں وہ اس نا انصافی کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا علاج اس نے یہ اختیار کیا کہ لوٹ مار اور ڈاکا زنی شروع کر دی۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ وہ سرمایہ داروں سے دولت چھین کر غریبوں میں تقسیم کر دیا کرتا تھا۔ حکومت کے لیے یہ ناقابل برداشت جرم تھا اور وہ اس کو راز بن اور ڈاکو قرار دے کر اس کی گرفتاری کے لیے سرگرداں رہتے تھے۔ دلا بھی کو دھوکا اور فریب سے گرفتار کر لیا گیا۔ حاکم کے منتظمین فریب دے کر دلا بھی کو تاج گانے کی محفل میں بلاتے ہیں اور بے ہوشی کے عالم میں گرفتار کر لیتے ہیں، ورنہ وہ خون خرابے کے بغیر ہاتھ نہ آتا لیکن دلا بھی کے حامی اس کو آزاد کرانے کے لیے بھیجیں بدل کر جاتے ہیں۔ آصف جاہ اور رقبہ رشتی حکومت کا داؤد خود ان پر ہی آزماتے ہیں اور سرکاری کارندوں کو دھوکہ دے کر دلا بھی کو آزاد کر لیتے ہیں۔

اس واقعے سے ناراض ہو کر حاکم وقت دلا بھی کے پاس ایک سرکاری نمائندہ بھیجتا ہے اور پیغام بھجوایا کہ وہ حکومت کی قوت سے نہیں لڑ سکتا۔ بہتر ہے کہ خود کو سرکاری کارندوں کے حوالے کر دے تو اس کو معافی مل جائے گی۔ دلا بھی نے حاکم وقت کو سامنے کے لیے یہ حرکت کی کہ اس کے کارندے کی داڑھی موٹھیں موٹھیں اس کو حاکم کے پاس بھیج دیا اور پیغام بھیجا کہ دلا بھی اپنے دشمنوں کا یہ حشر کرتا ہے۔

حاکم وقت کا بیٹا یوسف خاں جو بچپن میں دلا بھی کے

ساتھ بڑھتا تھا، اس نے حاکم وقت کو پیش کش کی کہ وہ دلا بھی کو گرفتار کر سکتا ہے۔ بچپن کے یہ دوست ایک دوسرے کی صورت بھول چکے تھے۔ یوسف خاں کا بچپن کا نام حیدری تھا۔ اس نے دلا بھی کے بارے میں تمام معلومات حاصل کیں کہ وہ کس گاؤں میں آتا ہے۔ کسی لڑکی سے محبت کرتا ہے۔

حیدری جب اس گاؤں میں پہنچا ہے تو کنوئیں پر لڑکیاں پانی بھر رہی ہیں جن میں حسین وکیل نوران بھی شامل ہے جو دلا بھی سے پیار کرتی ہے۔ حیدری نوران سے پانی پلانے کی درخواست کرتا ہے جو اس کو پانی پلانے کے لیے حیدری اس کو اپنا دل دے بیٹھتا ہے۔ گاؤں میں دستوں کے مطابق گھوڑا بازی کا مقابلہ ہو رہا ہے جس میں حیدری بھی شریک ہو جاتا ہے۔ لڑائی ہلکے دوران دو دوئوں کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ دوئوں بچپن میں ساتھ بڑھتے رہے ہیں۔ بچپن کے دوئوں دوست ایک دوسرے سے ٹک کر خوش ہوتے ہیں اور بچپن کے زمانے کی یادیں دہراتے ہیں۔

حیدری دلا بھی کو بتاتا ہے کہ اس گاؤں کی ایک دیشیڑ کو پسند کرنے لگا ہے۔ دلا بھی کہتا ہے کہ تم جس لڑکی کی طرف اشارہ کر دو گے وہ تمہاری ہو جائے گی۔ حیدری اگلے روز اشارے سے کنوئیں پر پانی بھرتی ہوئی نوران کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ دلا بھی دم بخود رہ جاتا ہے۔ ایک طرف محبت اور دوسری طرف دوستی۔

دلا بھی حیدری کو اپنی ماں سے ملواتا ہے جو اس کو بہت پسند کرتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں اس گاؤں کی ایک دیشیڑ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ دلا بھی کی ماں یہ سن کر سناکت رہ جاتی ہے لیکن دلا بھی جو اپنے قول کا پکا ہے، محبت کو خود اپنی قربانی دے کر نوران کی شادی حیدری سے کر دیتا ہے۔

ادھر دارالگوٹم میں وزیر حیدری کے باپ کے خلاف بغاوت کر کے خود حاکم بن جاتا ہے۔ وہ دھوکے سے باب اور حیدری دونوں کو گرفتار کر لیتا ہے۔

نوران بھی قید خانے میں ہے مگر وہ کبوتر کے ذریعے دلا بھی کو خط بھیجتی ہے۔ یوں تو اس فلم کے سبھی گانے پھر تھے مگر چشتی صاحب کے اس گانے نے برصغیر میں دھوم مچادی اور گراموفون کمپنی نے انہیں گولڈن ایوارڈ سے نوازا۔

گانے کے بول یہ تھے۔

چشتی میرے دھولانوں پہنچا دیں کبوتر
یہ گانا طفیل ہوشیار پوری کا لکھا ہوا تھا اور سارے برصغیر میں گایا جاتا تھا۔

اس گانے کے بارے میں ایک لطیفہ بھی ہے۔ فلم ہٹ ہو چکی تھی۔ لاہور کا نشاط سنیما کچھا بھرا ہوا تھا۔ فلم کا شورش ہونے والا تھا کہ موسیقار چشتی نٹے میں چور اپنے پورے خاندان کو لے کر سنیما پہنچ گئے اور سب کو سنیما میں بٹھانے کی فرمائش کی۔ منیجر نے انہیں سمجھایا کہ ہاؤس فل ہو گیا ہے۔ آپ کل ایونگ شو دیکھ سکتے ہیں مگر چشتی صاحب ”سن“ ہو گئے تھے۔ انہوں نے سنیما پر ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا کہ میں فلم دکھاؤ ورنہ میرا گانا ”کبوتر“ فلم سے نکال دو۔

یہ فلم کا آخری شو تھا۔ سنیما کے سامنے ایک جمجمہ تھا۔ آخر آغا جی اے گل کو چکا کر اطلاع دی گئی۔ انہوں نے کہا کہ کچھ لوگوں کو کل کے لیے دو دو ٹکٹ دے دو اور ان سے معذرت کر کے چشتی صاحب کی فرمائش پوری کر دو۔ اس طرح چشتی صاحب نے اپنے گھروالوں کو یہ فلم دکھائی۔

یہ چشتی ملتے ہی دلا بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ محل پر حملہ کر دیتا ہے۔ حیدری بادشاہ کو آزاد کر لیتا ہے۔ وزیر میرے مرنے پر پھینکا ہے۔ نوران سامنے آ جاتی ہے اور اس منجر سے رشتی ہو جاتی ہے۔ دلا بھی نوران کو دشمنوں سے بچاتے ہوئے مارا جاتا ہے اور اس طرح محبت، دوستی اور قربانی کی یہ فلم ختم ہوتی ہے جس نے ایک نیا ریکارڈ قائم کیا تھا۔

دلا بھی ایک پھر ہٹ پنجابی فلم تھی جس میں آغا جی اے گل اور انور کمال پاشا نے مقصد کے ساتھ ہر طرح کی تفریح بھی بھردی تھی۔ یوں تو ساری دنیا کے لوگ بہادر لوگوں کی قدر کرتے ہیں لیکن پنجاب کے لوگ بڑے اور بہادر لوگوں کو ہیرو کا درجہ دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی دلا بھی کا نام لوگوں کے دلوں میں نقش ہے۔ پنجاب کا ہر شخص دلا بھی اور اس کے کارناموں سے واقف اور اس کا مداح ہے۔

آغا گل کے صاحب زادوں شہزاد گل اور سجاد گل نے فلم سازی میں بہت نام پیدا کیا۔

اس فلم میں سدھیر اور صوبہ خانہ نے بہترین اداکاری کی تھی جسے لوگ آج بھی یاد کرتے ہیں۔ سدھیر نے غریبوں کے دوست اور ہمدرد کی حیثیت سے بہت اچھا کام کیا تھا۔ وہ ان کے عروج کا زمانہ تھا اور اس زمانے میں اداکاروں میں سنوٹوش کمار اور سدھیر جی کا نام لیا جاتا تھا۔ سدھیر نے زیادہ

تر پنجابی فلمیں کیں اور وہ ایکشن فلموں کی کامیابی کی وجہ سے ”جنگجو“ بہتر مشہور تھے۔ فلم ”آخری نشان“ کی کامیابی کے بعد وہ پنجابی فلموں کے سب سے مقبول ہیرو تھے۔

بابا چشتی کا بیٹا ہوا تھا۔ واسطی رب دا تو جاویں وے کبوتر
ایسا نغمہ تھا جس کی گونج سارے ہندوستان میں گونج رہی تھی۔ بعض بھارتی فلم سازوں نے اس کے حقوق خرید لیے تھے۔ محبوب اسٹوڈیوز میں بھی اس فلم کے پرنٹ موجود تھے لیکن بعض وجوہ کی بنا پر یہ ادارے ”دلا بھی“ نہ بنا سکے۔ بابا چشتی کو کمپنی نے اس زمانے میں تین لاکھ رانٹلی دی تھی جو آج کل تین کروڑ کے برابر ہے۔ یہ ناقابل یقین تھی مگر یہ گانا بھی لوگوں کے دلوں میں اتر گیا تھا اور آج تک وہ اسے بھولے نہیں۔

ایم ایس ڈار نے ہدایت کاری کی حیثیت سے بہت اچھا کام کیا تھا۔ سدھیر اس فلم میں ایک ننگے کے طرح فٹ تھے۔ اس فلم کی سب سے نمایاں خرابی یہ تھی کہ اس کی بکیر نظر تک نہیں آتا حالانکہ گانے نے دھوم مچادی تھی۔

ایک خاص بات کا تذکرہ کرنا بھی ضروری ہے کہ سنوٹوش کمار اور صوبہ خانہ جوڑی مقبول ترین تھی لیکن سدھیر کے ساتھ بھی صوبہ خانہ نے یادگار فلمیں پیش کی ہیں جن میں گام، چھوٹی نیلم، سسی، سوئی وغیرہ بے حد کامیاب فلمیں تھیں۔ علاوہ الدین اس وقت بہت بڑے اداکار نہیں بنے تھے لیکن انہوں نے بہت اچھا کام کیا تھا۔ ان کے علاوہ چاچا غلام اور شیخ مختار نے بھی بہت اچھا کام کیا تھا۔ آصف جاہ اس زمانے میں بہت مقبول کامیڈین تھے۔ عام طور پر نیلوی پہلی فلم ”دلا بھی“ کو ہی کہا جاتا ہے، اس فلم کے دو گانے آشا پٹیل اور آصف جاہ پر فٹائے گئے تھے۔

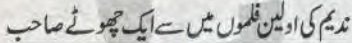
فلم میں آشا پٹیل کو ایک شادی شدہ ہوتے ہوئے بھی محبت کرتے دکھایا گیا۔ شوہر کی غیر موجودگی میں وہ آصف جاہ کو اپنے گھر بلاتی ہے اور جب شوہر اچانک گھر پہنچ جاتا ہے تو وہ اس کو مزاحیہ انداز میں چھیڑتی ہے۔ اس زمانے میں اس قسم کے مناظر پر پابندی عائد تھی اور اس کو میوہ سمجھا جاتا تھا۔ اس پر فلم بینوں نے اعتراض بھی کیا تھا۔ جس پر آغا گل بعض فلمی صحافیوں سے ناراض بھی ہو گئے تھے۔ آج کی تو بات ہی کیا ہے۔ اب اس سے کہیں زیادہ قابل اعتراض مناظر عام طور پر دکھائے ہیں لیکن تو فلم بینوں کو اعتراض ہوتا ہے، نہ صحافیوں کو اور نہ ہی فلم سنر بورڈ کو۔

☆☆☆

اے ایم اسٹوڈیو شیپر سے کافی دور تھا۔ پھر بھی اسٹنٹ
چھپوں کی تلاش میں میکلوڈ روڈ گئے اور دیے ہی بچے کی تلاش
کر کے لائے تو فلم کی شوٹنگ شروع ہوئی۔ ہم نے کئی بار
انہیں بتایا کہ ہمارے ہاں آرٹس مقررہ وقت ہی دیتے
ہیں۔ اگر وقت مقررہ میں کا ختم نہ ہو تو فلم سازی مشکلات
میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ہماری فلموں کا بجٹ کم ہوتا ہے۔
اس لیے پیسے بچائیں مگر ان کا کہنا تھا کہ اگر فلم کے لوازمات
مکمل نہ کیے جائیں تو فلم بنانے کا فائدہ۔ اعلیٰ فلم کے لیے تو

کچھ عرصہ بعد حلی میں ایک اور پھول نکلا۔ دیا اور محمد علی نوسلو دسی آمد پر بہت خوش تھے اور پیدائش سے پہلے ہی اس کی آمد کے انتظامات شروع کر دیے گئے۔ ہر طرف خوشیوں اور پھولوں کا کارن تھا مگر کنی نہیں جانتا تھا کہ مستقبل ان کے لیے کام پیغام لے کر آیا ہے۔ دیا بیگم اس بے (ندیم) کو جنم دے کر دنا سے رخصت ہو گئیں۔

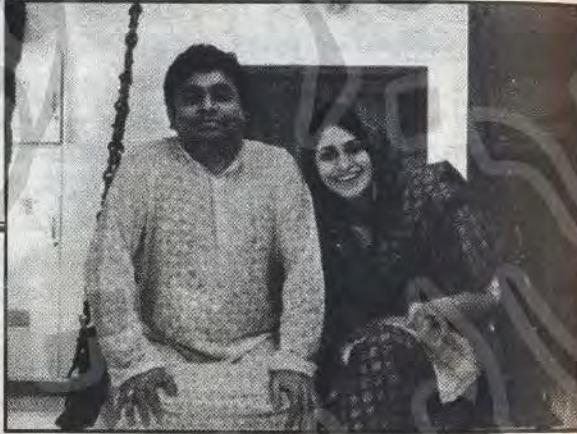
جب اس نے ندیم سے بات کی تو اس نے کہا کہ میں
 ہمارا راز دکر سکتا ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ تم میری فرضی بیوی
 بن کر میرے والد کے سامنے آ جاؤ۔ اس طرح ہم دونوں
 کے مسائل حل ہو جائیں گے۔ اس طرح جہیں منور سعید سے
 پیشہ کے لیے چھکارا مل جائے گا۔ امیر اس پر آمادہ نہ تھے مگر



مگر یہ سب خوشیاں عارضی ثابت ہوئیں جب نواب صاحب پر حقیقت چلی کہ ان کے بیٹے نے ان کے ساتھ دھوکا کیا ہے اور جس لڑکی کو وہ اپنی بہو سمجھتے ہیں وہ ایک غیر لڑکی ہے جس کا ان کے بیٹے سے کوئی تعلق نہیں ہے تو نواب صاحب نے سخت ناراضی کا مظاہرہ کیا اور امر سے کہا کہ وہ اپنے گھر واپس چلی جائے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو بھی بہت بُرا بھلا کہا۔

سفیر موسیقی

سید عدنان ذاکر علی



ہر انسان خامیوں اور خوبیوں کا مرقع ہے۔ جس بھی مخفی قوت کو مہمیز کیا جائے..... وہ ابھر کا سامنے آجائے گی۔ اسی لیے تو عمل کو حاصل حیات کہا گیا ہے۔ جیسا عمل ہوگا اسی کے مطابق مخفی قوت ابھرے گی۔ وہ بھی ایک عام سا بندہ تھا مگر اپنی ذہنی استطاعت کو صحیح طور پر استعمال کرنا جانتا تھا اسی لیے تو آج چہار سو اس کے نام کا ڈنکا بج رہا ہے۔ اس کی بنائی ہوئی دھنیں ہر ایک کا دل موہ لیتی ہیں اور یہ کمال اسے تب حاصل ہوا جب وہ ہندو سے مسلمان بنا۔

برصغیر کے ایک معروف موسیقار کی زندگی کا خاکہ

یہ 1991ء کا ذکر ہے۔ جنوبی ہندوستان کے مشہور فلم میکر رتم گوپتی اگلی فلم کے لیے ایک نئے موسیقار کی تلاش تھی۔ یہ خاصی حیران کن بات تھی کیونکہ اس سے پہلے مشہور تامل موسیقار الیاراجا کے ساتھ رتم کی دس سالہ رفاقت چلی آرہی تھی اور دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہو چکے تھے۔ یہ بات طے تھی کہ اگر رتم فلم بنائے گا تو موسیقی کے لیے الیاراجا ہی کو منتخب کرے گا۔ دونوں ہی تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال تھے اور ہر اس کی فلم انڈسٹری

خوبصورتی سے ادا کرتے ہیں۔ ممتاز اس فلم کی بھرپور تحسین اور انہوں نے بہت اچھا کام کیا تھا۔ یہ ان کی بہترین فلموں میں شمار کی جاسکتی ہے۔

اس فلم کے موسیقار روہین گھوش تھے۔ روہین کی موسیقی کا انداز منفرد تھا۔ انہوں نے پاکستانی فلموں کے لیے کی یادگار موسیقی بنائی ہے۔ وہ نذر اللہ اسلام کے پسندیدہ موسیقار تھے انکی بنائی ہوئی طرزیں آج بھی بالکل نئی معلوم ہوتی ہیں۔

امبر کے نقفات بہت پسند کیے گئے تھے لیکن درج ذیل چار گانے بہت زیادہ مقبول ہوئے تھے۔ کلیم بھٹی اور تسلیم فاضلی کے لکھے ہوئے گانوں کو روہین گھوش نے ایک منفرد رنگ دیا تھا۔ گلوکاروں میں مہدی حسن، اے نیر اور نیرہ نور کے گائے ہوئے گانے زیادہ نمایاں تھے۔ ان کی تفصیل یہ ہے۔

- 1۔ جس دن سے دیکھا ہے تم کو منم
- گلوکار مہدی حسن۔ یہ گانا ندیم پر فلما یا گیا تھا۔
- 2۔ ٹھہرا ہے سارا
- ہم تم ہیں جہاں..... گلوکار مہدی حسن۔
- 3۔ ملے دو سا بھی، بھلی دو کلیاں
- دیوانہ دل ہے، دیوانہ موسم..... گلوکار، اے نیر۔
- 4۔ یا کل بے وقوف آدھر آ
- آ گیا..... گلوکار، نیرہ نور۔ یہ گانا ندیم اور ممتاز پر فلما یا گیا تھا۔

- 5۔ ہاں جی..... میں نے پی ہے، تمہاری قسم
- گلوکار، مہناز۔

اس فلم کے بہترین موسیقار کی حیثیت سے روہین گھوش کو ایوارڈ دیا گیا تھا۔ تکنیکی اعتبار سے یہ ایک خوبصورت فلم تھی۔ افضل چوہدری نے بہت اچھی فوٹو گرافی کی تھی۔ افضل چوہدری کا تعلق ڈھاکا سے تھا لیکن انہوں نے لاہور میں بھی کئی فلموں کی بہت اچھی عکاسی کی تھی۔

نذر اللہ اسلام کی روایت کے مطابق انہوں نے بہت اچھی ہدایت کاری اور کہانی کو اس انداز سے پیش کیا کہ فلم میں شروع سے آخر تک اسکرین سے نظر نہیں ہٹتی اور یہی ایک ہدایت کاری صلاحیتوں کا ثبوت ہے۔

آج جو لوگ تکنیک کے اعتبار سے بھارتی فلموں کو ترجیح دیتے ہیں اگر وہ نذر اللہ اسلام کی فلمیں دیکھیں تو ان کی رائے تبدیل ہو جائے گی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پاکستانی فلمی صنعت عروج پر تھی۔

جاری ہے

نواب کی خوشیاں ایک بار پھر غموں میں بدل گئیں۔ انہوں نے دوبارہ شراب نوشی کا سہارا لیا اور سب سے قطع تعلق کر کے بیٹھ گئے۔

ندیم نے امبر کے گھر جا کر تمام حقیقت بیان کر دی اور کہا کہ وہ ایک اعلیٰ خاندانی اور تعلیم یافتہ لڑکا ہے۔ اس نے جو کچھ بھی کیا وہ محض حالات اور جذبات سے مجبور ہو کر کیا۔ امبر کے والد کا دل پیچ گیا اور انہوں نے ندیم سے کہا کہ اگر اس کے والد بذات خود آکر امبر کا ہاتھ مائلیں تو وہ اس معاملے پر غور کریں گے۔

ندیم واپس علی یار خان کے پاس گیا۔ ان سے معافی مانگی۔ تمام صورت حال سے آگاہ کیا۔ انہیں بتایا کہ امبر ایک بہت بڑے خاندان کی اکلوتی بیٹی ہے۔ علی یار خان بیٹے کا قصور معاف کر کے امبر کو اپنائیں گے تو حویلی کی خوشیاں پھر لوٹ آئیں گی۔

علی یار خان بیٹے کی باتیں سن کر کچل گئے اور اس کے ساتھ امبر کے گھر جا کر اس کو اپنی بہو بنانے پہنچ گئے، وہ اس کی خوبیوں سے پہلے ہی آگاہ ہو چکے تھے۔ اس طرح ماں باپ کی رضامندی سے امبر اور ندیم کی شادی ہو گئی۔ نواب علی یار خان کی حویلی میں ایک بار پھر خوشیاں لوٹ آئیں۔

امبر کی کہانی نذر اللہ اسلام کی فلم ”احساس“ سے بہت متاثر نظر آتی ہے۔ بہت سے کردار بھی احساس ہی جیسے ہیں۔ اس کا سبب غائب ہے کہ اس فلم کی کہانی نذر اللہ اسلام نے بذات خود لکھی تھی اور وہ ذہنی طور پر فلم احساس سے متاثر تھے۔ فلم کے مکالمے بشیر نیاز نے حسب معمول بہت اچھے لکھے تھے۔ اس فلم کے بہترین مکالموں کے لیے انہیں 1978ء کا نگار ایوارڈ بھی دیا گیا تھا۔

”امبر“ کی کہانی تو معمولی سی کہانی تھی لیکن نذر اللہ اسلام نے ہدایت کاری اور دوسرے شعبوں میں محنت کر کے اس کو ایک خوبصورت فلم بنادیا تھا۔ بہتر تھا کہ اگر ”احساس“ کے کچھ عرصے بعد امبر بنائی جاتی۔ کہانی کو دلچسپ اور بھرپور انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ فلم میں ڈرامائی مناظر کے ساتھ کامیڈی مناظر بھی بہت دلچسپ تھے۔

فلم کا سب سے بھرپور ڈرامائی کردار محمد علی کا تھا۔ ایک ہلکی پھلکی فلم میں محمد علی نے اپنے ڈرامائی کردار سے فلم کو ایک طاقتور ڈرامائی فلم بنادیا تھا۔ ندیم نے مزاحیہ کردار بہت دلچسپ اور حقیقی انداز میں پیش کیا تھا۔ ندیم کو ہمیشہ سے یہ آسانی رہی ہے کہ وہ ڈرامائی اور ہلکے پھلکے کردار یکساں

میں ان کا نام ٹریڈ مارک کا درجہ رکھتا تھا۔ الیا راجا ایک اعلیٰ پائے کا موسیقار تھا۔ اس کے کام پر باقاعدہ تھیسس (Thesis) لکھا جا چکا ہے۔

اختلافات اس وقت شروع ہوئے جب الیا راجا نے پریس کانفرنس میں رتھ کے بارے میں نامناسب باتیں کیں جن کا تعلق رتھ کی آخری فلم دلاپتی (تامل) سے تھا۔ فلم کی موسیقی ظاہر ہے کہ الیا راجا نے ہی ترتیب دی تھی اور اسی دوران دونوں کی بات پر اچھے پڑے تھے۔ قصہ مختصر کہ رتھ نے الیا راجا سے تعلق توڑ لیا اور اپنی نئی فلم کے لیے کسی نوجوان لیکن باصلاحیت موسیقار کی تلاش شروع کر دی۔

ایک دن وہ ایوارڈز کی ایک تقریب میں شریک تھے جو کہ ایڈورٹائزنگ کے شعبے سے متعلق لوگوں نے متعقد کی تھی۔ وہیں پر اس کے کزن شادراتری لوک نے، جو کہ اشتہاری فلموں کا تخلیق کار تھا۔ اسے ایک 24 سالہ نوجوان سے ملوایا۔ یہ تامل نوجوان شادرا کے لیے کافی سارے اشتہار کمپوز کر چکا تھا۔ اور Leo Coffee کے اشتہار کے لیے وہ اس تقریب میں ایوارڈ بھی حاصل کر چکا تھا۔ یہ نوجوان رتھ کی طرح عظیم تخلیق کار سے بہت متاثر تھا۔ چنانچہ اس نے رتھ کو اپنے ریکارڈنگ اسٹوڈیو آنے کی دعوت دی جو مدراس میں ہی واقع تھا۔

صرف چھ مہینے بعد ہی رتھ اس نوجوان کے اسٹوڈیو میں آچنچا جہاں اس نوآموز موسیقار نے رتھ کو اپنی تخلیق کردہ کچھ ڈھنیں سنائیں۔ ایک خاص ڈھن جو اس نوجوان نے اپنے بچپن کے دوست بھارت بالا کے ساتھ مل کر بنائی تھی رتھ کو بہت پسند آئی تھی۔ مجموعی طور پر بھی اس نوجوان کا کام قابل تعریف تھا۔ رتھ نے اسی دن اس نوجوان کو اپنی اگلی فلم کے لیے جیثیت موسیقار منتخب کر لیا۔

جس اسٹوڈیو میں اس تامل فلم کا معاہدہ طے پایا، وہ آج Panchattan Recording کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ وہ نوجوان موسیقار اے۔ آر۔ رحمان تھا اور فلم نئی روجا۔

☆☆☆

دنیا جسے آج اے آر رحمان (اللہ رکھ رحمان) کے نام سے جانتی ہے، وہ پیدائشی مسلمان نہیں تھا۔ والدین نے اس کا نام دیپ رکھا تھا۔ اس کا تعلق ایک تامل ہندو گھرانے سے تھا جو مدراس (موجودہ چنائے) میں رہ رہا تھا۔ مدراس کا ساحلی شہر جنوبی ہند کے صوبے تامل ناڈو کا دارالحکومت ہے

اور تامل فلم انڈسٹری کا مرکز بھی۔ اس کے علاوہ یہاں ملیالم اور تیلگو فلموں کا کاروبار بھی عروج پر ہے۔ سبھی کی فلم انڈسٹری (بالی ووڈ) کی طرح تامل فلم انڈسٹری بھی نہایت منافع بخش صنعت ہے۔ 6 جنوری 1967ء کو پیدا ہونے والا دیپ تین بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے۔ اس کے والد آر کے مشیر ملیالم فلموں کے ایک قابل موسیقار تھے اور غالباً اپنی صلاحیتیں دیپ کو ورثہ میں ملیں۔

دیپ کے گھر میں لائیکچر کی ایک تدریس تصویرنگی ہوئی تھی۔ آر کے مشیر لائیکچر کے بہت بڑے پرستار تھے۔ انہیں یہ گمان بھی نہ تھا کہ آنے والے وقتوں میں یہی عظیم گلوکارہ ان کے بیٹے کے کمپوز کردہ گیت بھی گائے گی۔

ایک قابل ذکر واقعہ اس وقت پیش آیا جب دیپ صرف چار سال کا تھا۔ اس کے والد کے ایک موسیقار دوست سدرٹھم مامڑان سے ملنے آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے دیپ کو ہارمونیم بجاتے دیکھا۔ اتنی کم عمر میں مہارت سے ہارمونیم بجاتے دیکھ کر وہ بہت حیران ہوئے۔ امتحان کے طور پر انہوں نے ہارمونیم کی keys پر کچھ آڈال دیا اور دیپ سے کہا کہ اب بجا کر دکھاؤ۔ حیرت انگیز طور پر دیپ نے بڑی مہارت سے بجا کر دکھایا وہ صاحب بہت متاثر ہوئے اور اپنے دوست آر کے مشیر کو تاکید کی کہ اس کی تربیت پر خصوصی توجہ دے۔

دیپ کا بچپن زیادہ اچھا نہیں گزرا۔ وجہ اس کے والد کی بیماری تھی۔ ایک قیاس آرائی یہ ہے کہ ان کے حریفوں نے حسد میں آکر برعکاس اور کالے جادو کا سہارا لیا تھا جس کی وجہ سے آر کے مشیر ایک ناقابل تشخیص بیماری میں مبتلا ہو گئے۔ دیپ کا زیادہ تر بچپن ہسپتالوں میں گزرا۔ کیونکہ اس کے والد گھر کے واحد فکیل تھے لہذا ان کی بیماری کی وجہ سے گھریلو حالات بدتر ہو گئے۔

ڈاکڑ اپنی ہی کوشش کرتے رہے لیکن بیماری سمجھ میں نہ آسکی۔۔۔۔۔ ہندو پنڈتوں اور عاملوں سے روحانی علاج اور دعائیں کرائی گئیں، عیسائی مشنریوں سے بھی رابطہ کیا گیا لیکن کچھ افادہ نہ ہوا۔ جب تک مسلمان پیر اور روحانی معالج آئے تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ دیپ تیزی ہو گیا۔

یہ دیپ اور اس کے گھرانے پر بڑا اثر اوقات تھا۔ والد کی موت کے بعد دیپ ٹوٹ سا گیا تھا۔ اتنی کم عمر میں اس پر بیوہ ماں اور تین بہنوں کا بوجھ آ پڑا تھا۔ گھر کے مالی حالات بھی اچھے نہ تھے۔ دیپ سوچتا تھا کہ ساری مشکلات اور

کالیف اس کے گھرانے کے نصیب میں کیوں ہیں؟ اس کا خدا پر سے ایمان اٹھ گیا۔ اس کا دل کہتا تھا کہ خدا کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اگر خدا ہوتا تو اس کوڑے وقت میں ان لوگوں کی مدد کے لیے ضرور آتا۔ غرضیکہ دیپ نفسیاتی الجھنوں کی شکار ہو گیا تھا۔

گھر چلانے کے لیے کچھ تو کرنا تھا لہذا انہوں نے اپنے والد کے مشیر کے آلات موسیقی کرائے پر دینا شروع کر دیے۔ اس کے علاوہ دیپ کی والدہ نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اپنے والد کے دوستوں کی صحبت میں رہ کر موسیقی سیکھے۔ اس وقت دیپ کی والدہ کو یہ گمان بھی نہ تھا کہ یہ مشورہ اس گھرانے کی قسمت بدل دے گا۔

دیپ نے ماں کی تاکید کے مطابق تامل موسیقاروں کی صحبت میں رہنا شروع کر دیا۔ یہ لوگ اس کے والد کی عمر کے بچے لیکن دیپ کی تیزی اور پھر اس کی قدرتی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے انہوں نے اس پر خصوصی توجہ دی۔ اب دیپ مقامی موسیقاروں کے گروپ میں شامل ہو گیا تھا اور مختلف فنکشن میں فراہم کرنے لگا تھا۔

زندگی ایک مخصوص ڈگر پر چلنے لگی تھی۔ گھر کے حالات کچھ سنبھل گئے تھے۔ لیکن دیپ کی تخلیقی صلاحیتیں کچھ حدت کا مطالعہ کر رہی تھیں۔ وہ مقامی موسیقاروں کے ساتھ گگے بندھے روٹین کا کام کرتے کرتے پور ہو چکا تھا۔ سب سے پہلا کام تو اس نے یہ کیا کہ اپنا تعلیمی سلسلہ دوبارہ شروع کیا۔ گو کہ اب بھی وہ اتنا ریگور طالب علم نہ تھا کیونکہ اکثر اسے میوزیکل گروپ کے ساتھ دوروں پر جانا پڑتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ گیارہویں گریڈ میں وہ مدراس گرجن کالج سے ڈراپ ہو گیا۔

یہی وقت تھا جب قدرت نے دیپ کو آگے بڑھنے کا موقع فراہم کیا۔ اس کو الیا راجہ کے ٹروپ کے ساتھ لندن مشہور Trinity College of Music

سے میٹرن کلاسیکل میوزک میں ڈگری حاصل کی۔ اس دوران اس کو بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ مشرقی اور مغربی موسیقی کا استخراج، جو آگے چل کر اس کا ٹریڈ مارک کہلایا۔ اسے سیکھنے کو ملا، اس کے علاوہ اس نے مختلف مغربی سازوں اور آلات موسیقی سے واقفیت حاصل کی جن کا استعمال مشرقی موسیقاروں میں تو ذرا کم ہی کرتے تھے۔

لندن سے واپسی پر دیپ اپنے مستقبل کے حوالے

سے بہت پُر امید تھا۔ جو تربیت اس نے لندن میں موسیقی کے حوالے سے حاصل کی تھی اور وہ تجربہ جو اسے ایک مختلف دنیا کو قریب سے دیکھنے پر حاصل ہوا تھا۔ اس نے دیپ کو بے حد پُر اعتماد بنا دیا تھا۔

ایک ممتاز ڈگری کی بدولت مختلف اشتہاری کمپنیوں نے دیپ کو اپنی مصنوعات کے لیے جنگجو کمپوز کرنے کی دعوت دی۔ دیپ نے انہیں قیمت جان کر معاہدے شروع کر دیے۔ انہی دنوں اس گھرانے پر پھر ایک امتحان آ پڑا۔ دیپ کی چھوٹی بہن ایک پراسرار بیماری میں مبتلا ہو گئی۔ یوں لگتا تھا کہ کوئی ذہن ہاتھ دھو کر اس پر نصیب گھرانے کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ مختلف ہسپتالوں میں علاج ہوتا رہا لیکن اس کی حالت بدستور گزرتی رہی۔ حتیٰ کہ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا۔ تمام گھرانے غم سے نڈھال تھے اور مایوس ہو چکے تھے۔ کسی عزیز نے دیپ کی والدہ کو ایک مسلمان پیر صاحب کا بتایا جو پیر قادری کے نام سے مشہور تھے۔ ان کا سلسلہ نسب شیخ عبدالقادر جیلانی سے ملتا تھا۔ پیر یضہ کوان پیر صاحب کے پاس لے جایا گیا۔ دیپ ان نیک بزرگ کے چہرے پر پھیلے نور سے بہت متاثر ہوا تھا۔ بزرگ نے مرئیضہ کے اہل خانہ کو تسلی دی اور اللہ کا نام لے کر مرئیضہ کا علاج شروع کیا۔ خدا نے اس گھرانے پر رحم کیا اور دیپ کی بہن کو ڈھنسا نصیب ہوئی۔ گھر والوں کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ انہوں نے بزرگ کا شکر ادا کیا اور نہایت عقیدت کا اظہار کیا۔

اس موقع پر بزرگ نے وہ باتیں بتائیں جو آگے چل کر دیپ کے لیے مشکل راہ ثابت ہوئیں۔ انہوں نے انسان اور زندگی کا فلسفہ بیان کیا۔ انہوں نے سمجھایا کہ اللہ ہی ہے جو ہر چیز پر قادر ہے۔ وہی زندگی اور موت عطا کرنے والا ہے، وہی عزت اور ذلت دینے والا ہے۔ وہی پیاروں کو تندہی دینے والا ہے۔ لہذا شکر ہے اس ذات کا ادا کرنا چاہیے جس نے سب کو پیدا کیا۔ ان باتوں نے دیپ، اس کی والدہ اور بہنوں کو بہت متاثر کیا۔ اتنا کہ انہوں نے زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ کر لیا۔

مذہب تبدیل کرنے کا فیصلہ کوئی چھوٹا فیصلہ تو نہیں ہوتا۔ جی ہاں! تمام گھر والوں نے اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ دیپ جو پہلے ہی حق کی تلاش میں تھا، آج کہتا ہے۔ ”میں بھی اسی اپنے اس فیصلے پر پچھتاوا نہیں ہوا۔ جب تک میں دیپ تھا، میری ذات ایک خول میں بندھی اور میں احساس کمتری کا مارا ہوا تھا۔ مذہب اسلام نے مجھے ایک نیا

جہنم دیا ہے۔“

دلیپ شروع سے ہی عظیم موسیقار نو شاد علی کا پرستار رہا تھا۔ وہ اپنی والدہ کے ساتھ اس عظیم موسیقار کی خدمت میں حاضر ہوا اس اور اسلام قبول کرنے کے فیصلے سے آگاہ کیا۔ دلیپ کی والدہ چاہتی تھیں کہ دلیپ موسیقی کو بطور پیشہ اپنالے لہذا انہوں نے نو شاد صاحب سے بیٹے کے حق میں دعا کی درخواست کی۔ نو شاد صاحب ماں بیٹی کی درخواست پر ان کے گھر تشریف لائے جہاں پیر قادری صاحب نے دلیپ اور اس کے اہل خانہ کو نو شاد صاحب کی موجودگی میں مشرف بہ اسلام کیا۔

دلیپ کا اسلامی نام رحمان رکھا گیا۔ بعد میں نو شاد صاحب کے مشورے سے ہی اس میں اللہ رکھا کا اضافہ کیا گیا۔ نو شاد صاحب سے آج تک رحمان کو کبھی لگاؤ ہے۔ اب بھی وہ اس عظیم موسیقار کی صحبت میں رہ کر موسیقی کے اسرار و رموز سیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ نو شاد صاحب خود بھی رحمان کی موسیقی کے اوپر دسترس اور اس کی فطری صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہیں۔

دلیپ کے اسلام قبول کرنے کا واقعہ سن 1991ء کا ہے۔ یہ فیصلہ دلیپ اور اس کے گھر والوں نے گہری غور و فکر کے بعد سچے دل سے کیا تھا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، اسے آر رحمان مسلسل فن کی بلندیوں کا مانی ہے عبور کرتا چلا آیا ہے۔ اتنا اطمینان، سکون اور حق کو پالنے کی خوشی ان لوگوں نے پہلے کبھی نہ محسوس کی تھی۔ آج ساری دنیا میں رحمان کے چاہنے والے موجود ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو رحمان کی مرتب کردہ دھنیں سنتے ہوئے دنیا سے بیگانہ ہو جاتے ہیں۔ اپنے غم بھلا دیتے ہیں اور زندگی کے ایک نئے رخ سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ اکتی محو کر موسیقی تخلیق کرنا کسی عام انسان کا کام نہیں، یہ تو اللہ کی دین ہے۔

رحمان اپنی کامیابیوں کا کریڈٹ پورے آرکسٹرا کو دیتا ہے۔ رحمان کا ڈرمس Drummer، شیواشی، جو رحمان کے بچپن کا دوست بھی ہے۔ دنیا کے چند بہترین ڈرمرز میں سے ہے۔ Flutist نوین بھی رحمان کی... کامیابیوں میں شریک رہا ہے۔ جیسے بارسنی بجانے کے فن پر حیرت انگیز عبور حاصل ہے۔ فلم Bombay کا حسین میوزک نوین کا فن شاہکار مانا جاتا ہے۔ رحمان موسیقی کا سارا کام رات کے ستائے میں انجام

دیتا ہے۔ اس کے خیال میں رات کا سکون اس کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے کیونکہ موسیقی بنانا ایک مکمل طور پر تخلیقی کام ہے۔ شامت ان بچارے فلم میکرز اور ہدایت کاروں کی آگاہی ہے۔ جن کی فلم کے لیے رحمان گانے بنا رہا ہوتا ہے۔ عام طور پر ہدایت کار فلم کی جوتیشن کے مطابق گانے بنواتے ہیں لہذا ان کا جو نتیجہ سامنے آتا ہے وہ بہر حال حیرت انگیز ہوتا۔ رات کے وقت کام کرنے کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ کیریئر کے آغاز میں جب رحمان دن کے نازل اوقات میں کام کرتا تھا تو دن بھر کی مصروفیت کے باعث رات گئے سونا نصیب ہوتا تھا اور یوں اس کی صبح کی نماز چھوٹ جاتی تھی۔ اب وہ عشاء کی نماز ادا کر کے اپنے کام کا آغاز کرتا ہے اور رات بھر یکسوئی کے ساتھ اپنے پیشے سے انصاف کرتا ہے۔ اس دوران کوئی ملاقاتی، نہ کوئی فن کار اس کو ڈسٹر ب کرتی ہے۔ علی الصبح نماز پڑھ کر وہ سو جاتا ہے۔ دوپہر میں جاگتا ہے۔ اخبار پڑھتا ہے، گھریلو فرائض انجام دیتا ہے۔ لیکن کے ساتھ وقت گزارتا ہے اور رات کو بچھرائے نئے عزم کے ساتھ اپنے ریکارڈنگ اسٹوڈیو کا رخ کرتا ہے جو اس کے گھر سے ہی ہوتی ہے۔

رحمان کی بیوی کا نام سائرہ ہاؤس۔ اللہ نے اس جوڑے کو دو بیٹیوں سے نوازا ہے جو ابھی اسکول میں پڑھتی ہیں۔ رحمان پر اکثر یہ تنقید کی جاتی رہی ہے کہ وہ بہت سستی سے کام کرتا ہے۔ ایک فلم کی موسیقی بنانے میں بعض اوقات مہینوں لگا دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رحمان خود اپنے کام کا سب سے بڑا نقاد ہے۔ جب تک وہ خود کی دھن سے مطمئن نہیں ہو جاتا، آگے نہیں بڑھتا۔ اس کے علاوہ دیگر موسیقاروں کی طرح ایک ساتھ بہت ساری فلمیں سائن نہیں کرتا۔ وہ کم لیکن معیاری کام کرتا ہے۔

فی الوقت رحمان ایک فلم کی موسیقی تخلیق کرنے کے عوض 8 سے 10 کروڑ روپے لیتا ہے جبکہ اس کو اپنی پہلی فلم ”روجا“ کے صرف 25 ہزار روپے ملے تھے! 2004ء کے اکتانہ کم سروے کے مطابق بھارت کی انڈسٹریل انڈسٹری کے سب سے زیادہ کمائے والے افراد میں رحمان تیسرے نمبر پر ہے۔ سوڈن برجائے اور سبشاش کھنیا بالترتیب پہلے اور دوسرے نمبر پر ہیں۔ لیکن رحمان یہ ساری رقم اپنے ریکارڈنگ اسٹوڈیو کو جدید سے جدید بنانے میں لگا دیتا ہے۔ رحمان بھارت کا پہلا فرد تھا جس نے اپنے اسٹوڈیو کے لیے جدید ترین کمپیوٹر Apple Macintosh

سے درآمد کیا۔

☆☆☆

رحمان کی پہلی فلم ”روجا“ دراصل تامل زبان میں بنائی گئی تھی۔ فلم کا ابتدائی حصہ مدراس کے گرد و نواح میں اور باقی حصہ کئیر کے خوبصورت پہاڑیوں پر فلمبند کیا گیا تھا۔ تقریباً دو سال بعد فلم کا ہندی ورژن ریلیز ہوا۔ لیکن اس سے پہلے ہی فلم کے گیت پورے بھارت میں دھوم مچا چکے تھے۔ تامل زبان سمجھنے والے بیشتر لوگ جنوبی بھارت میں مرکوز ہیں۔ تامل فلمیں بھی زیادہ تر جنوبی ہند میں ہی بزنس کرتی ہیں۔ لیکن جب روجا کی آڈیو ریکارڈ میں ریلیز ہوئی تو ایک طوفان اٹھ اٹھا۔ لوگ حیران تھے کہ ایک نوآموز موسیقار اپنی پہلی ہی فلم میں ایسی لازوال دھنیں کیسے تخلیق کر سکتا ہے؟ جو لوگ تامل زبان کا ایک لفظ بھی نہیں جانتے تھے، وہ بھی یہی گیت سن کر جھوم اٹھے تھے۔ انہوں نے ایسی موسیقی پہلے ہی نہیں سنی تھی۔ اپنی پہلی ہی فلم پر رحمان کو بہترین موسیقی کا فیصلہ ایوارڈ بھی دیا گیا۔

ہدایت کار منی رتم اور پروڈیوسر کے بالا چندر کو بھی موسیقی کے اس طرح ہٹ ہو جانے کی توقع نہ تھی۔ فلم میں ساؤتھ انڈیا کے باصلاحیت اداکار اور بدھاسوی نے ایک محب وطن سرکاری افسر کا کردار ادا کیا تھا۔ روجا کا مرکزی کردار مدھو نے ادا کیا تھا جو ان دنوں نوآموز اداکارہ بھی۔ اس فلم کے تقریباً تمام گیت ہی مشہور ہوئے۔

- 1- یہ حسین وادیاں (ایس بی بالا۔ چترا)
- 2- چھوٹی سی آشا (من منی)
- 3- روجا جان من (اس گانے کے دو ورژن بنائے گئے تھے۔ ایک ہری ہرن کی آواز میں اور دوسرا ایس بی بالا بریمیک کی آواز میں)
- 4- رگنی رگنی (بابا سہگل۔ شوبھا شیشی)

فلم کے گیت بی۔ کے۔ شرانے لکھے تھے۔ منی رتم کو رحمان کا کام اتنا پسند آیا تھا کہ اس نے اپنی آئندہ فلموں کے لیے بھی اسی کی خدمات حاصل کرنا چاہیں۔ دراصل روجا کا میوزک ہٹ ہوتے ہی رحمان کو مختلف فلم میکرز کی طرف سے آفرز آنا شروع ہو گئی تھیں۔ اس میں سے بیشتر تامل فلم میکرز ہی تھے۔ رحمان جانتا تھا کہ فلموں میں گانے صرف خانہ پری کے لیے ڈالے جاتے ہیں۔ لہذا وہ صرف ان فلساذوں کے ساتھ کام کرنے کا خواہشمند تھا جو موسیقی کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے اور جن پر رحمان کو بھروسہ تھا کہ وہ اس کی

محنت کو رانگیاں نہیں جانے دیں گے۔ اس نے سوچ کچھ کر چند فلمیں منتخب کیں اور یوں اس کا کیریئر چل پڑا۔ عزت، شہرت اور دولت اب اس کے لیے مسئلہ نہیں رہی تھی۔ قدروانوں کے ساتھ ساتھ اب اس کے دھن بھی پیدا ہو گئے تھے۔ یہ وہ انتہا پسند ہندو تھے جو نہیں چاہتے تھے کہ ایک مسلمان شخص بھارتیوں کے دلوں پر راج کرے۔

☆☆☆

1992ء میں ہونے والے بمبئی فسادات نے منی رتم کے حساس ذہن کو بہت متاثر کیا تھا۔ خصوصاً بامری مسجد کا سانحہ صرف مسلمانوں کے لیے ہی نہیں بلکہ تمام اقوام کے لیے لمحہ فکریہ تھا۔ چنانچہ منی رتم نے اس موضوع پر فلم بنانے کا سوچا۔ وہ ہمیشہ سے ہی اپنی فلموں کے لیے اچھوتے موضوع ڈھونڈنے کے لیے مشہور ہے۔ اس کے علاوہ اس کی فلموں میں انسانی فطرت کی بڑی خوبصورت عکاسی کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لچھڑا مانا جاتا ہے۔

یہ فلم Bombay تھی۔ فلم کا ہیرو ایک مرتیہ پھر تامل سپر اسٹار اور بدھاسوی تھا اور ہیروئن منیشا کوثر لکھی۔ اردناب مکمل طور پر فلموں سے کنارہ کش ہو چکا ہے اور امریکا میں بزنس کرتا ہے۔

Bombay کے گیت معروف نغمہ نگار محبوب نے لکھے تھے۔ جبکہ موسیقی کے لیے منی رتم نے ایک بار پھر رحمان کا انتخاب کیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ رحمان ہی اس حساس موضوع سے انصاف کر سکتا ہے۔ رحمان نے بھی اس اعتماد کا حق ادا کر دیا۔ اس نے محبوب کے ساتھ مل کر نہایت خوبصورت گیت تخلیق کیے تھے۔

- 1- کہنا ہے کیا (چترا۔ کورس)
- 2- حاما (Remo Fernandes)
- 3- تو ہی رے (ہری ہرن۔ کوتیا کرشنامورتی)

حاما کا تامل ورژن رحمان نے خود گایا تھا۔ فلم Bombay کے گانے رحمان کے تخلیق کردہ بہترین گانوں میں سے ہیں اور آج بھی سننے اور پسند کیے جاتے ہیں۔

انہی دنوں ایک تامل فلم ”جنتلین“ بھی ریلیز ہوئی تھی جس میں رحمان نے کافی تیز میوزک بنایا تھا۔ آنے والی فلموں میں بھی رحمان نے کچھ ایسے ڈانس نمبرز تخلیق کیے جو نوجوان نسل کو یوں بنا گئے۔ فلم ”ہم سے بے مقابلہ“ کے گانے Take it easy urvashi اور نکالا

مقابلہ بہت مشہور ہوئے تھے۔ جن ڈانس کلیں میں مانگیل جینکس کے گانے بجا کرتے تھے۔ وہاں اب اے آر رحمان کی موسیقی گونجنے لگی تھی۔ برصغیر کے نوجوان جو پہلے مشرقی موسیقی سننے میں شرمندگی محسوس کرتے تھے اب بڑے فخر سے رحمان کے کمپوز کردہ گانوں پر پھر کتے تھے۔

فلم ہم سے ہے مقابلہ میں تامل فلموں کے مشہور گویا گرافر پر بھروسہ کیا گیا تھا۔ اس نے رحمان کے گانوں پر کمال کارفرم کر کے سب کو حیران کر دیا۔ پھر تو جیسے ان دونوں کی جوڑی مشہور ہو گئی اور لوگ کہنے لگے کہ رحمان کے انوکھے میوزک کے ساتھ پر بھروسہ یو ای انصاف کر سکتا ہے۔ خود پر بھروسے بھی رحمان کے گانے پھر اپنا کر کے کو ایک چیلنج قرار دیا۔

1995ء میں ہی رحمان نے مشہور تامل فلم سیکر زام گوپال ورما کی دو فلمیں سائن کیں۔ یہ فلمیں ریگملا اور دوڑ تھیں۔ رام گوپال ورما جیسے جنوبی تخلیق کار کے ساتھ کام کر کے رحمان نے وہ مشہور گانے تخلیق کیے جو آج بھی پسند کیے جاتے ہیں۔ انہی فلموں سے رحمان نے آشا بھوسلے کو فلمی موسیقی میں دوسرا جنم دیا جو اس وقت تک گمنا کی کا شکار ہو چکی تھی۔

فلم ’دوڑ‘ ایک بھلی پھلکی کامیڈی فلم تھی جس میں بچے دت اور ارمیلانے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔ رحمان نے عام ڈگر سے ہٹ کے گانے تخلیق کیے تھے۔

1- او بھوسلے (سری نو اس)
2- شاہا بائے ربا (سواران لٹا۔ سونو گم)
”ریگملا“ وہ پہلی فلم تھی جس میں عامر خان نے اپنی بھر پور اداکارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا تھا۔ منا کا پادریل کردار اس کو شہرت کی بلندیوں پر لے گیا۔ اس کے علاوہ کاسٹ میں جیٹی شروف اور ارمیلان بھی شامل تھے۔ رام گوپال ورما نے تمام فنکاروں سے بہترین کام لیا تھا۔ ریگملا کے تمام ہی گانے پسند کیے گئے تھے۔

1- تھانجا (آشا بھوسلے)
2- ریگملا رے (آشا بھوسلے)
3- یارو دن لوڈرا (ادت نرائن۔ چترا)
4- ہائے رامایا کیا ہوا۔ (ہری ہرن۔ سواران لٹا)

☆☆☆

1996ء میں مشہور تامل اداکار اور فلم سیکر کل ہاسن نے رحمان کو اپنی فلم ”ہندوستانی“ کی موسیقی کے لیے منتخب کیا۔ کل ہاسن اور نیشا کوثرانے فلم میں مرکزی کردار ادا کیے تھے۔

رحمان نے پھر تجربے کے اور بالکل مختلف قسم کا کام پیش کیا۔
1- ٹیلینٹون دھن (کویتا کرشنا مورتی۔ ہری ہرن)
2- لکا لکھا دیا (واستدرا داس۔ سواران لٹا)
3- مایا مچندرا (سواران لٹا۔ ایس پی بالا)

اسی سال رحمان کی ایک اور فلم بننے ریلیز ہوئی۔ اور دوسوا می اور کا بول نے اس فلم میں مرکزی کردار ادا کیے تھے۔ رحمان نے بہت خوبصورت گیت پیش کیے تھے۔

1- آوارہ بھنورے۔ (سہاسا ڈیپانی)
2- اک گلیا (چترا۔ شکر مہادیون)
3- چندارے (چترا۔ ہری ہرن)

☆☆☆

رحمان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ نا تجربہ کار آوازیں استعمال کرنے سے نہیں بچتا تھا ہے۔ کئی نو آموز گلوکاروں کو رحمان نے چانس دیا اور وہ راتوں رات شہرت کی بلندیوں پر جا پہنچے۔ آج کے مشہور بلیک سکر سونو گم کو فلمی دنیا میں روشناس کرانے کا سہرا بھی رحمان کے سر جاتا ہے۔ نامور گائیک ہری ہرن کو بھی رحمان نے فلم ’روجا‘ کے ذریعے فلمی موسیقی میں روشناس کرایا تھا۔ سکھو بندر تھکے نے فلم دل سے کا گیت ’چل چھیاں چھیاں‘ گایا اور راتوں رات شہرت کی بلندیوں پر جا پہنچا۔ آج وہ رحمان کے فروپ کا ایک اہم رکن ہے۔

آج بھی تمام بلیک سکرز رحمان کے لیے گانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ انہیں اپنی تمام مصروفیات ترک کر کے گانوں کی ریکارڈنگ کرانے مدراس جانا پڑتا ہے۔ جہاں ’پچیتن ریکارڈان‘ میں وہ بہترین وقت گزارتے ہیں۔

رحمان وقتاً فوقتاً اپنی آواز میں بھی گانے گاتا رہا ہے۔ تامل زبان میں بھی اور ہندی میں بھی۔ اس کا ہندی تلفظ سو فیصد درست نہیں ہے لیکن یہی چیز گیت کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی ہے۔ رحمان نے اپنی آواز میں پہلا مکمل گانا ’مصطفیٰ‘ مصطفیٰ گایا تھا جو فلم ’دونادل‘ والوں کی میں شامل تھا۔ اس کے بعد رحمان نے دندے ماترم، اور فلم دل سے کا ٹائٹل ساگ بھی خود گایا تھا اور یہ گانے بھی بہت پسند کیے گئے تھے۔

☆☆☆

1997ء میں بھارت کی آزادی کے پچاس سال پورے ہو رہے تھے۔ ایک دن رحمان کے بچپن کے دوست بھارت بالا جوا ایک معروف پروڈکشن کمپنی کا مالک بھی ہے

رحمان سے رابطہ کیا۔ اس کا خیال تھا کہ دونوں کو مل کر بھارت کی گولڈن جوبلی کے لیے کچھ خاص کام کرنا چاہیے۔ رحمان اس خیال سے سونفید مشتق تھا۔ دونوں کی حب الوطنی کسی شک و شبہ سے بالاتر تھی۔

معروف ریکارڈر کمپنی Sony Music انہوں نے اس سلسلے میں لاتعداد فنکاروں پر غور کیا لیکن نظر انتخاب اسے آر رحمان پر پڑھی۔ رحمان اور بھارت بالا کے پاس اپنے خواب کی تکمیل کا یہ سنہری موقع تھا۔ لہذا انہوں نے کام شروع کر دیا۔

یہ اہم دندے ماترم تھا جس میں رحمان نے پہلی مرتبہ بن الاقوامی سطح پر کام کیا تھا۔ اسی اہم کے لیے رحمان نے معروف پاکستانی فنکار نصرت فتح علی خان صاحب کے ساتھ بھی ایک گانا ریکارڈ کیا اور خان صاحب کے بے مثال فن سے بے حد متاثر ہوا۔

دونوں کا آئندہ بھی کام کرنے کا ارادہ تھا لیکن خان صاحب کی زندگی نے وفاتہ کی۔

استاد نصرت فتح علی خان صاحب کی عظمت کے پیش نظر رحمان گیت کی ریکارڈنگ کے لیے خود پاکستان آیا تھا۔ لاہور میں ایک رات کے قیام کے دوران اس نے خان صاحب کے ساتھ ریکارڈنگ میں حصہ لیا اور اگلی دوپہر کی فلائٹ سے واپس مدراس روانہ ہو گیا۔ یہ رحمان کا اب تک پاکستان کا واحد دورہ ہے۔

دوستی نامی گیت رحمان اور خان صاحب نے مل کر گایا تھا اور اس کے علاوہ اسکول کی بچپن کی آواز کو رس کی صورت شامل ہیں۔ اس خوبصورت گیت میں امن اور محبت کا پیغام دیا گیا تھا۔ گانا کچھ یوں ہے.....

چند سورج لاکھوں تارے ہیں جب تیرے ہی سے سارے
کس بات ہے ہوتی ہیں پھر کھریں
کتنی ہیں کلیریں اس زمین پر، پھر نہ چھوڑو کچھ
تج میں دو دلوں کے یہ دیواریں.....

ایم کی ریلیز کے لیے 15 اگست 1997ء کی تاریخ مقرر کی گئی تھی۔ جشن آزادی کی رات کو جب رحمان نے نئی دہلی کے مشہور گاندھی چوک پر اہم گانا ٹائٹل ساگ مانا تجھے سلام‘ پیش کیا تو موقع پر موجود لاکھوں افراد سمیت سارا بھارت دیوانہ ہو گیا تھا۔ اس اعلیٰ سطح کے فنکارانہ پیشکش میں بھارت

کے صدر اور وزیراعظم بھی موجود تھے۔ کبھی کے دل میں رحمان کے لیے بے تحاشا محبت اور عقیدت کا اضافہ ہو گیا تھا۔

اس کے اگلے ہی دن استاد نصرت فتح علی خان صاحب کا لندن میں انتقال ہو گیا تھا۔ ان کی زندگی کی آخری پر فارمٹس رحمان کے ساتھ ہی تھی۔ وہ بھی رحمان کی فنی صلاحیتوں سے بے حد متاثر ہوئے تھے اور آئندہ بھی اس کے ساتھ کام کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ رحمان اعتراف کرتا ہے کہ قوالی کا فن اس نے نصرت صاحب سے ہی سیکھا تھا۔

☆☆☆

1997ء میں ریلیز ہونے والی رحمان کی پہلی فلم ہدایت کار، پر یاد رن کی ”کتنی نہ سنی“ تھی۔ اس فلم میں پو جا بھٹ، انیل کپور اور جیٹی شروف نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔ فلم گوک باکس آفس پر ناکام رہی لیکن رحمان کے گیت ایک مرتبہ پھر پسند کیے گئے۔

فلم ’شوکن فلٹر لیڈر‘ کے ہیرو تیلے بنائی گئی تھی اور پروڈیوسر کی انا ڈی پن کی وجہ سے اس خوبصورت فلم کو اس کا جائز حق نہ ملا۔ کمزور بکس آفس کی وجہ سے فلم کا بیج نہیں ابھار گیا تھا۔ فلم کے نمایاں گیت یہ تھے۔

1- میرے یار اولدا (چترا۔ ایس پی بالا۔ ہری ہرن)
2- شکر یہ تیرا شکر یہ (ایس پی بالا۔ کورس)
3- مل گئی وہ منزلیں (الکایا ٹک۔ کمار سانو)
4- تو ہی تو (چترا۔ ایم شرما)
5- تم ہو میری نگاہوں میں (ہری ہرن)
6- میرے دل کا وہ شہزادہ (آشا بھوسلے)

1997ء میں ریلیز ہونے والی دوسری فلم ’وشوا ودھاتا‘ تھی۔ یہ فلم بھی نامناسب پہلی کی وجہ سے فلاب رہی۔ عائشہ جھلکا، جیٹی شروف، شرد کپور اور پو جا بھٹا نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔ فلم کا میوزک بہر حال پسند کیا گیا تھا۔

1- کل نہیں تھا وہ کیا ہے۔ (انورا وھاسری رام)
2- جان تم ہو میری (علیشا چٹانے، ہری ہرن)
3- نظروں کے ملنے سے (کویتا کرشنا مورتی۔ ہری ہرن)
فلم ’دوڑ‘ کو کہہ 1995ء میں شروع کی گئی تھی لیکن وہ بھی اسی سال یعنی 1997ء میں ریلیز ہوئی۔

☆☆☆

تامل ہدایت کار شکر نے اپنی اگلی فلم ’Jeans‘ کے لیے اے آر رحمان کو موسیقی بنانے پر مامور کیا۔ یہ

چند سال قبل اپنی 80 ویں سالگرہ کے موقع پر تنہا شکر

پوری کرنے کے لیے تو سونی میوزک کو شروعات ہی دو ملین

27

2۔ اے نازمین (ابھی جیت)

1999ء کا سال رحمان کے لیے بہت اچھا ثابت ہوا کیونکہ اس کی پانچوں فلموں کے گیت بہت پسند کیے گئے تھے۔ اور اس کے پرستاروں میں بے پناہ اضافہ ہوا تھا۔ اسے بین الاقوامی سطح پر بھی پذیرائی ملی تھی اور اس کے کام کو دیگر بھارتی موسیقاروں سے بہتر قرار دیا گیا تھا۔

☆☆☆

2000ء کا ابتدائی حصہ تو رحمان نے لندن میں گزارا جہاں وہ Bombay Dreams کے لیے موسیقی بنانا تھا۔ یہ معاہدہ چونکہ پہلے ہی طے پا گیا تھا۔ لہذا اس کو بھارت میں تمام کام چھوڑ کر آنا پڑا۔ لندن سے واپس آتے ہی اس نے لچند فلم میکر شیم پینگل کی فلم زبیدہ پر کام شروع کیا۔ یہ ایک شہزادی کی کہانی تھی جس کا مرکزی کردار کرشمہ کپور نے ادا کیا تھا۔ منوج باجانی اور دیکھانے بھی فلم میں عمدہ اداکاری کا مظاہرہ کیا تھا۔ جاوید اختر نے فلم کے نہایت خوبصورت گیت لکھے تھے۔ اور رحمان نے باکمال موسیقی سے انہیں سجایا تھا۔

- 1- وجیہ دھن سے گاؤں (کویتا کرشنا مورتی)
- 2- سے نا (اکالیا لنگ، ادت نرائن)
- 3- سو گیا ہے۔ (لکشمی)
- 4- چھوڑو مریے بیاں (رجیشا رام)
- 5- مہندی ہے (اکالیا لنگ)

اس سال رحمان کی یہ واحد فلم ریلیز ہوئی۔ اس سال رحمان نے دہلی میں لائیو کنسرٹ کیا۔ رحمان کے پرستار اس شو میں اس اس کے بہترین گانوں سے لطف اندوز ہوئے اور ساری رات جاری رہنے والا یہ کنسرٹ ایک یادگار ثابت ہوا۔

☆☆☆

2001ء کے آغاز میں ہی ہدایت کار کیلاش سریندر ناتھ کی فلم لوبو ہمیشہ ریلیز ہوئی۔ کنزور پینٹی اور نا تجربہ کار ہدایت کار کی وجہ سے فلم باکس آفس پر ناکام رہی۔ پاکستان میں تو یہ فلم اب تک آئی ہی نہیں! آئندہ جتنی نے اس فلم کے گیت لکھے تھے جنہیں رحمان نے خوبصورت راگوں سے سجایا تھا۔

- 1- گپ چپ باتیں (سادھنا سرگم، ہری ہرن)
- 2- لوبو ہمیشہ (شوہنی شیو، سونو نگم)
- 3- یار میری بیوفانی (مہا لکشی)
- 4- بول تو دے (جیمس دیسیائی، سونو نگم)

5- سونے کا پلنگ (کویتا کرشنا مورتی، ایلارون، ادت نرائن)

6- ایک لڑکی تھی (کویتا کرشنا مورتی)

عامر خان جو اپنے والد کے نقش قدم پر چلے ہوئے کافی عرصے سے فلم پروڈکشن کے لیے پُر قول رہا تھا۔ آخر کار ایک کہانی منتخب کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ یہ کہانی تقسیم ہند سے بہت پہلے انگریزوں کے دور کی عکاسی کرتی تھی۔ مقامی باشندوں کے بلند حوصلے اور جذبات کو اس فلم میں اجاگر کیا گیا تھا جو حاکموں کے سامنے سر اٹھا کر جینے کی تہمت لگاتے تھے۔ اس فلم کا نام ”لگان“ تھا۔

فلم کی ہدایت آشتوتش گواریکر منجھے ہوئے ڈائریکٹر کے سپرد تھیں۔ اس نے عامر خان کے ساتھ مشورے کے بعد فیصلہ کیا کہ اس تاریخ ساز موضوع کے ساتھ اے آر رحمان ہی انصاف کر سکتا ہے۔ چنانچہ موسیقی کا کام رحمان کو سونپ دیا گیا جبکہ گیت ایک مرتبہ پھر جاوید اختر نے لکھے تھے۔

- 1- متوا (اکالیا لنگ، ادت نرائن، سکھو بندر سنگھ)
 - 2- گھن گھن (اکالیا لنگ، فکر مہادیون، سکھو بندر سنگھ)
 - 3- را دھاکیسے درجے (آشا بھوسلے، ادت نرائن)
 - 4- اوری چھوری (اکالیا لنگ، ادت نرائن)
 - 5- چلے چلو (اے آر رحمان، سری نواس)
- نہایت معیاری فلم ہونے کی بنا پر ”لگان“ کو سال کے بہتر ایوارڈ نصیب ہوئے اور رحمان کی موسیقی بھی بہت پسند کی گئی۔ فلم کو بین الاقوامی سطح پر بھی پذیرائی ملی تھی اور یہ آسکر ایوارڈ کے لیے نامزد ہونے والی بھارتی فلم تھی۔

☆☆☆

2002ء میں رحمان زیادہ تر تامل اور تیلگو فلموں میں معروف رہا۔ Boys اور kandukond an kandukonda وہ فلمیں تھیں جن کا میوزک بے حد پسند کیا گیا۔ اب رحمان کی عمر انگریزی کی بدولت تامل فلمیں پورے بھارت میں دیکھی جانے لگی تھیں ورنہ پہلے ان فلموں کے شائقین بہت محدود تھے۔

سال کے آخر میں رحمان ہندی سنیما کی طرف لوٹ آیا۔ مئی رستم کا اسسٹنٹ ڈائریکٹر شاد علی اپنی پہلی فلم سہیا بنا رہا تھا۔ یہ رستم راج فلم کے میوزک بننے والی فلم تھی جس کا پروڈیوسر بابی بیدی تھا۔ شاد علی نے اپنے پاس مئی رستم کے نقش قدم پر چلے ہوئے رحمان کو ہی موسیقی کے لیے منتخب کیا۔ گیت گزارنے لکھے تھے جو بڑی منفرد نوعیت کے تھے۔

رحمان نے فلم کی موسیقی بڑے جدید انداز میں بنائی تھی جو نوجوانوں میں بے حد مقبول ہوئی۔

- 1- اودھم پتور (کنال گانجا والا، کے کے ہر دین، شان)
- 2- ساتھیا (سونو نگم)
- 3- میرا ملا دے (اے آر رحمان)
- 4- چھلکا دے (رجیشا رام، مہا لکشی، ویٹانی)
- 5- اے اڑی اڑی (عدنان سیخ خان)
- 6- چکے (سادھنا سرگم، نرغی، قادور)
- 7- مانگھیم (سری نواس کشنن)
- 8- نیٹلا کے (سادھنا سرگم، مدھوشری)
- 9- چوری ہے چوری (آشا بھوسلے، کارنگ)

اسی سال رحمان نے امریکا کے شہر لاس اینجلس میں ایک لائیو کنسرٹ بھی کیا۔ دنیا بھر سے آئے ہوئے رحمان کے پرستاروں نے اس محفل موسیقی کا بھرپور لطف اٹھایا۔

☆☆☆

رحمان پر وقتاً فوقتاً الزامات لگتے رہتے ہیں کہ وہ مغربی دھنوں سے انہماز ہو کر گانے تخلیق کرتا ہے۔ الزامات مایک کرنے والوں میں اس کے حامدین نمایاں ہیں۔ ان لوگوں کو ایک سنہری موقع اس وقت ملا جب فلم ”ساتھیا“ کا گانا ”اودھم سیورے“ منظر عام پر آیا۔ مخالفین نے اس کے گانے کو Backstreet boys کے گانے Everybody کا چرچہ فرار دیا حالانکہ دونوں گانے بے غور سننے پر یہ الزام غلط ثابت ہو جاتا ہے۔

ان حامدین میں کئی نمایاں میوزک ڈائریکٹر ز اور گلوکار بھی شامل ہیں جن کو رحمان اپنی موسیقی میں زیادہ گانے کے مواقع نہیں دیتا۔ وہ سب یہ کہہ کر ان کی آوازیں رحمان کی طرز موسیقی کے لیے موزوں نہیں ہیں۔ معروف بلیک سنگر کمار سانو نے رحمان کے لیے صرف ایک گانے فلم ”بھی نہ بھی“ میں گایا ہے۔ اس طرح اچھیت نے بھی صرف ایک گانا فلم ”دل ہی دل میں“ میں گایا ہے۔ یہی دونوں گلوکار اپنے اکثر انٹرویوز میں رحمان کو ایک فلاح موسیقار قرار دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں اچھیت کا بھارت کے معروف جریدے ”فلم فیئر“ کو دیا گیا انٹرویو قابل ذکر ہے جو اپریل 2005ء کے شمارے میں شائع ہوا۔

حال ہی میں موسیقار اسماعیل دربار کا بھی بیان منظر عام پر آیا ہے جس میں اس نے دعویٰ کیا ہے کہ اس کا کام رحمان سے کہیں زیادہ اچھا ہے اور یہ کہ رحمان پچھلے چند

سالوں سے اس میدان میں قطعی ناکام رہا ہے۔ صرف ایک ہٹ فلم ”ہم دے“ کے بعد سے مسلسل ناکام رہنے والے اسماعیل دربار کی طرف سے ایسے بیان کی کسی کو توقع نہ تھی۔ یہ خیالات اس کی اپنی جگہ ہنسائی کا سبب بنے ہیں اور اس نے اپنی رہی سزے عزت کو بھی خاک میں ملا دیا ہے۔ واضح رہے کہ رحمان نے اسماعیل دربار کے ساتھ مشترکہ طور پر حال ہی میں فلم ”کہنا“ میں کام کیا ہے جو کہ ملکا آرشی کی پروڈکشن ہے۔ ہدایت کار سہا اشہنی نے صرف دو گانے اور فلم کا انٹرویو میٹھل میوزک رحمان سے بنوایا جبکہ باقی گانے اسماعیل دربار کے تخلیق کردہ ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ فلم کے وہی گانے زیادہ پسند کیے گئے جو رحمان کے تخلیق کردہ ہیں۔

2003ء میں بھی رحمان زیادہ تر تامل میوزک اور بین الاقوامی معاہدوں سے منسلک رہا۔ اکتوبر میں رحمان کی واپسی فلم تہذیب کے ساتھ ہوئی۔ فلم غیر میگزین کے ایڈیٹر خالد محمد اس فلم کے ہدایت کار تھے۔ نہایت کمزور پینٹی کی وجہ سے فلم کا کسی نے نوٹس تک نہ لیا۔ حتیٰ کہ فلم کا میوزک بھی زیادہ مقبول نہ ہوا حالانکہ رحمان نے بہت عمدہ گانے تخلیق کیے تھے۔

- 1- مہرمان مہرمان (آشا بھوسلے، سکھو بندر سنگھ)
- 2- کھوئی کھوئی آنکھیں (شان)
- 3- I wanna be Free (انویما)

فلم کے گیت جاوید اختر نے لکھے تھے۔ تہذیب کے فوراً بعد فلم ”کلیئر“ کا میوزک ریلیز ہوا۔ یہ فلم معروف کوریو گرافر سورج خان کے صاحبزادے احمد خان نے بنائی تھی اور اسے دو ایک کمار نے پروڈیوس کیا تھا۔ فلم انتہائی غیر معیاری تھی جس کا سبب ہدایت کار کی نا تجربہ کاری تھی۔ فلم کا کوئی مقصد اور موضوع نظر نہیں آتا تھا۔ بیشتر سنیما بین پیشکل انٹرویو تک بیٹھ سکے۔ گیت محبوب نے لکھے تھے۔

- 1- بچے لے (دلیر مہدی، کنال، گانجا والا)
- 2- پیغام (کویتا کرشنا مورتی، شان ان دونوں)
- 3- شہزادے (کنال گانجا والا)

4- روزانہ (Viva- A girls pop band)

- 5- صدیاں (مہا لکشی، ادت نرائن، ہری ہرن)
 - 6- اف اوجہا ہے (آشا بھوسلے، سونو نگم)
- 2004ء کے آغاز میں ہی معروف مصور ایم۔ ایف۔ حسین کی فلم ”نیلا کشی“ ریلیز ہوئی۔ یہ ایک آرٹ



شہنشاہِ جرم

صائمہ اقبال

ایک بدنام زمانہ مجرم کی زندگی کے اتار چڑھاؤ

وہ امریکی ریاست ٹیکساس میں دہشت کی علامت بن کر ابھرا پھر اس کا خوف پورے امریکا پر چھا گیا۔ امریکا کی ہر ریاست میں اسے ظالم ترین انسان کہا جانے لگا مگر قانون اس پر باتہ ڈالنے سے مجبور تھا۔ وہ جرم کرتا ضرور تھا، مخالفین کو عبرت ناک سزا بھی دیتا تھا لیکن اس طرح کہ قانون اس کا کچھ بگاڑ نہ سکے۔ پوری دنیا میں جس مجرم کا چرچا ہے اس کی زندگی کیسی تھی؟

وہ رات خاصی تاریک تھی۔ بادلوں نے چاند کو ڈھانپ رکھا تھا اور تیزی سے گرتے درجہ حرارت نے شہر کے باسیوں کو ان کے گھروں تک محدود کر دیا تھا۔ جونہی رابرٹ جان نے دفتر سے باہر قدم رکھا، ایک سرد جھونکا اس کے بدن سے لکرایا۔ اس نے دبی گھڑی پر نظر ڈالی جس کا مرکزی کانٹا تین کے ہندسے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ ”ڈیگا گوٹر بیون“ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے یوں تو وہ اکثر رات گئے تک اپنے دفتر

- 3- یہ تارا وہ تارا (ادت نرائن)
- 4- یہ جو بیس ہے تیرا (اے آر رحمان)
- 5- آہستہ آہستہ (ساوہنا سرگم۔ ادت نرائن)
- 6- دیکھو نا (اکایا کنک۔ ادت نرائن)

☆☆☆

رحمان کی نا بھلانے والی فلموں میں سے ایک فلم ہدایت کار شیا م بینگل کی Bose - the forgotten Hero ہے۔ یہ فلم تحریک آزادی کے عظیم رہنما سچاں چندر بوس کی مات زندگی پر مبنی ہے۔ رحمان نے بڑی محنت سے فلم کے گانے تخلیق کیے ہیں۔ رحمان ٹائٹل سائیک ’آزادی‘ اس نے اپنی آواز میں ریکارڈ کیا ہے اور یہ بحر انگیز گیت مختلف دی وی جیمیں پر مقبولیت حاصل کرتا رہا ہے۔

شیا م بینگل ان ہدایت کاروں میں سے ہیں جو موسیقار کے کام میں بالکل ڈل نہیں دیتے لیکن اس کے باوجود رحمان نے فلم کے موضوع اور مقصد سے پورا انصاف کیا ہے۔ رحمان کی فلموں میں چند بڑے پراجیکٹ ہیں دیپا مہتا کی فلم ’Water‘، عامر خان کی ’The Rising‘ قابل ذکر ہیں۔ ’The Rising‘ میں..... منگل پانڈے کا کردار ادا کیا ہے جو 1857ء کے غدر کا ایک اہم کردار تھا۔

☆☆☆

رحمان کا سفر ابھی جارہے۔ 24 سال کی عمر میں اپنا کیریئر شروع کرنے والا رحمان اب زندگی کے 39 ویں سال میں داخل ہو چکا ہے۔ اس کی اب تک کی تخلیقات ہی اس کو ایک عظیم موسیقار کہلانے کے لیے کافی ہیں۔ لیکن رحمان کا خیال کہ ابھی اس کا بہترین کام آتا باقی ہے۔ جون 2005ء میں رحمان ورلڈ ٹور پر نکلا تھا۔ جس کے دوران وہ اپنے لیے جوڑے آرکسٹرا کے ساتھ آسٹریلیا، برطانیہ، امریکہ اور ملائیشیا کے علاوہ متعدد ممالک میں کنسرٹ کیا۔ 2012ء کے دوران بھی اس کے کنسرٹ کا کامیاب رہے۔

اتنی کامیابی حاصل کرنے کے بعد بھی رحمان کے مزاج میں عاجزی ہے۔ وہ اپنی ہر کامیابی کا کریڈٹ خدا کی بابرکت ذات کو دیتا آیا ہے نماز پابندی سے ادا کرتا ہے۔ شاید خدا کو اس کی یہی ادائپند ہے اور وہ رحمان کو مسلسل نوازا چلا جا رہا ہے۔

فلم تھی جسے حسب توقع عوام میں پذیرائی نہ مل سکی۔ رحمان نے فلم کے موضوع کے ساتھ پورا انصاف کیا اور نہایت غیر روایتی موسیقی ترتیب دی۔ راحت اندوزی نے بہت خوبصورت اور پراثر گیت لکھے تھے۔ اس فلم میں رحمان نے ایک نوخیز گلوکارہ رینا بھرواج کو موقع دیا جس کی محو رک آواز لوگوں نے بہت پسند کی تھی۔

- 1- دو قدم (سونوگم)
- 2- دھواں دھواں (آشا بھوسلے)
- 3- یہ رشتہ (رینا بھرواج)
- 4- چینا کھ چلا کھ (سکھو پندر سنگھ۔ کورن)
- 5- رنگ ہے (اکایا کنک)
- 6- نورالانور (مرضی۔ قادر)

اس سال رحمان کی دوسری فلم ”Yuva“ تھی۔ یہ منی رتھم کی فلم تھی جو در اس ٹائیکز کے بیڑے بنائی گئی تھی۔ فلم میں لمبی چوڑی کاسٹ لی گئی تھی۔ اے دیوگن، ایشا بھول، دوپک اور اے، کرینہ کپور، ابھیشک بچن، رانی مکر جی فلم کی کاسٹ میں شامل تھے۔ فلم غیر روایتی ہونے کے باوجود باکس آفس پر زیادہ کامیاب نہیں ہوئی۔ گیت محبوب نے لکھے تھے اور رحمان نے منی رتھم کے لیے ایک مرتبہ پھر اپنی بہترین صلاحیتیں وقف کر دی تھیں۔

- 1- اے خدا حافظ (سینہ، کارنھک، کلی علی)
- 2- فتہ (سینہ، تانوی، اے آر رحمان)
- 3- دھکا لگا لگا (کارنھک، محبوب، رحمان)
- 4- کبھی نیم نیم (مدھوشری۔ رحمان)
- 5- ڈول ڈول (شاہین بدر)
- 6- بادل (اکایا کنک۔ عدنان سیج)

لگان میں رحمان کے ساتھ کامیاب تجربے کی وجہ سے آتشو شگوار بیکر نے رحمان کے ساتھ دوبارہ کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ فلم ”سوا دیس“ Swades تھی جس میں شاہ رخ نے Nasa کے ماہر فلکیات کا کردار ادا کیا تھا۔ بنیادی طور پر فلم جذبہ حب الوطنی پر مبنی تھی۔ اس میں پردیس میں رہنے والے بھارتیوں کی جذبات کی عکاسی کی گئی تھی۔ اس فلم کے خوبصورت گیت بھی جاوید اختر نے لکھے تھے جس کے ساتھ اب رحمان کی کافی دینی ہم آہنگی قائم ہو چکی تھی۔

- 1- سائوریا سانوریا (اکایا کنک)
- 2- یوٹی چلا چل (کیلاش کیر۔ ہری ہرن۔ ادت نرائن)

میں بیٹھا کرتا تھا لیکن آج اُسے کچھ زیادہ ہی دیر ہوگئی۔ دراصل شہر میں بڑے جرائم پر ادارہ لکھنے کے دوران اُسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ جب مضمون مکمل کر کے اُس نے سر اٹھایا، تو دفتر تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ صرف اُس کا اسٹنٹ اور ایک ٹائپسٹ وسیع و عریض دفتر میں موجود تھے۔ اگلے ایک گھنٹے تک وہ کل منج شائع ہونے والے اخبار کی ”کانپی“ پر تھکا رہا، جس میں شکاگو میں جرائم کی بڑھتی شرح اور اس کے اسباب کی نشان دہی کرتے ہوئے حکام سے جرائم پیشہ افراد کو فی الفور گرفتار کرنے کا تقاضا کیا گیا تھا۔ اسی عرصے میں ٹائپسٹ اور اسٹنٹ بھی رخصت ہو گئے۔

راہرٹ ایک اصول پسند اور باہمت صحافی تھا۔ صاف گوئی اور بے باکی کے باعث اسے مختلف جرائم پیشہ گروہوں کی جانب سے تو اتار سے دھمکیاں مل رہی تھیں لیکن وہ ڈرنے والوں میں سے نہیں تھا، یہی سبب ہے کہ سر پر منڈلاتے خطرات کے باوجود اُس نے سچ بیان کرنے کی عادت ترک نہیں کی۔

اسٹریٹ لائٹ کے نیچے کھڑے راہرٹ نے چاروں طرف دیکھا۔ اُس کے ارد گرد ستائے اور وحشت کا راج تھا۔ سردی سے بچنے کے لیے اُس نے کار کھڑے کر لیے اور دونوں ہاتھ کوٹ کی جیب میں ڈال کر ٹیکسی اسٹینڈ کی جانب بڑھنے لگا جو لگ بھگ دو سو میٹر کے فاصلے پر تھا۔ اُسے امید تھی کہ اسٹینڈ پر اُسے کوئی نہ کوئی ٹیکسی مل ہی جائے گی۔ راہرٹ تیز رفتور قدم اٹھا رہا تھا۔ شاؤ شاؤ ہی ستائے کو چرتی ہوئی کوئی گاڑی اُس کے پہلو سے گزرتی اور تاریک سڑک پر گم ہو جاتی۔

دفعتاً اُسے اپنے پیچھے بریک چر جانے کی آواز سنائی دی۔ اگلے ہی لمحے گاڑی کا آئین بند ہو گیا۔ اُس نے فوراً پلٹ کر دیکھا۔ اُس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ چارمیں ہم آدمی اُس کے پیچھے کھڑے تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں تین بال بیٹ تھے اور چہرہ پر مکروہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

تین چہرے تو راہرٹ کے لیے بالکل انجانے تھے لیکن ایک شخص کو وہ پہچان گیا۔ اُس کے سناٹا چہرے پر زخم کا نشان تھا اور آنکھیں انگارے اگل رہی تھیں۔ اُن کے درمیان ایک لفظ کا بھی تبادلہ نہیں ہوا کیونکہ اُس کے غیر متوقع ملاقاتیوں کے ارادے واضح تھے۔

اگلے پانچ منٹ تک چاروں بد معاش متبے راہرٹ پر لاتوں اور ٹکوں کی بارش کرتے رہے اور وہ درد کی شدت سے چلاتا رہا لیکن کوئی اُس کی مدد کے لیے نہیں آیا۔ راہرٹ ادھ موہا ہو چکا تھا لیکن چاروں بد معاش تازہ دم تھے اور اب تین بال بیٹ استعمال کرنے کے لیے ترقول رہے تھے۔

بیٹ کی مسلسل ضربیں اس کی روح میں اتر گئیں۔ وہ جلد ہی اپنے حواس کو ہٹو بیٹھا۔ آخری ضرب اُس کے سر پر لگی تھی جو اُسی آدمی نے لگائی جس کے گال پر زخم کا نشان تھا۔ جب بھولہ بان راہرٹ زمین پر گرا، وہ آدمی بڑبڑایا۔

”یہ ہے مجھ سے نکرانے کا انجام!“
اس یقین کے ساتھ کہ راہرٹ کی روح پرواز کر چکی ہے، وہ چاروں گاڑی میں جا بیٹھے۔ کچھ دیر بعد ستائے کو چیرتے ہوئے گاڑی رخصت ہو گئی۔

ایک شریف ٹیکسی ڈرائیور جو دور سے یہ مناظر دیکھ رہا تھا فوراً راہرٹ کی جانب بڑھا۔

حیرت انگیز طور پر اپنی درگت بننے کے بعد بھی راہرٹ کی سانس چل رہی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے اُسے فوراً اسپتال پہنچا دیا جہاں ڈاکٹروں کی سر توڑ کوششوں نے اُسے موت کے منہ سے نکال لیا۔

اس ہیٹ ناک تشدد کا نشانہ بننے کے ٹھیک اٹھ گھنٹے بعد جب راہرٹ کو ہوش آیا، وہ خود کو زندہ باکر حیران رہ گیا۔ واقعی شدید زخموں کے باوجود اُس کا زندگی کی جانب لوٹ آنا کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔

وہ ڈیڑھ گھنٹے اسپتال میں رہا۔ خوش قسمتی سے اس کے زخم تیزی سے مندمل ہو گئے۔ جب صحت یاب ہونے کے بعد وہ اسپتال کا بل ادا کرنے کا ڈنٹر پر گیا، تو وہاں ایک اور حیرت اُس کی منتظر تھی۔
”آپ کا بل تو ادا ہو گیا ہے سر!“ حسین ریپشٹنٹ کے چہرے پر دوستانہ مسکراہٹ تھی۔
”ادا ہو گیا؟“ اُس کے لہجے میں حیرت تھی۔ ”کس نے ادا کیا؟“

”سوری سر، انہوں نے اپنا نام تو نہیں بتایا۔ میرے مسلسل سمجھانے کے باوجود بل پر دستخط بھی نہیں کیے۔“ ریپشٹنٹ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”... لیکن مجھے اتنا یاد ہے کہ وہ صاحب خاصے لمحے چوڑے تھے۔ اچھا بالاس

زینت بن کیے ہوئے تھے اور... غالباً اُن کے ہاتھیں گال پر زخم کا نشان تھا۔ وہ بہت اخلاق سے پیش آئے اور...“
”نیل آنکھوں والی محصور ریپشٹنٹ نہ جانے کیا کچھ کہتی رہی، لیکن حیرت کے سمندر میں غوطہ زن راہرٹ سن نہیں رہا تھا۔ وہ کسی اور ہی دنیا میں تھا۔
”کیوں؟“ بالآخر اُس نے گہرا سانس لیا۔ ”مگر...“
”یعنی طور پر وہ تذبذب کا شکار تھا۔

راہرٹ اگلے کئی برس زندہ رہا لیکن پھر کبھی ”الکپون“ کے نام سے پکارے جانے والے شکاگو کے سب سے بڑے بد معاش نے اُسے ہاتھ نہیں لگایا۔ کبھی نہیں۔ وہ... واقعی ایک عجیب شخص تھا!
☆☆☆

مسافروں سے بھرا بحری جہاز سمندر کا سینہ چیرتے ہوئے تیزی سے بندرگاہ کی جانب بڑھ رہا تھا۔

اس برطانوی جہاز نے دوران سفر کئی مصوئیں برداشت کی تھیں۔ کبھی اسے خونخوار سمندری طوفان کا سامنا کرنا پڑا، کبھی پوری قوت سے برستے آسمان کا قہر سہنا پڑا لیکن مئی 1893ء کی اُس خوش گوار دور پر سمندر کے پانیوں پر بھللاتی سورج کی حسین کریمیں اور مشرق سے چلنے والی صحت بخش ہوائے عرشے پر موجو د مسافروں کے چہروں سے مسکندن دھڑواہٹیں تھیں۔ بونٹی نیو یارک کی بندرگاہ کے ابتدائی آثارِ مودار ہوئے، اُن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

یوں تو جہاز میں یورپ کے دیگر ممالک سے تعلق رکھنے والے باشندے بھی سوار تھے لیکن اکثریت اطالوی باشندوں کی تھی جو آنکھوں میں حسین مستقبل کے چمنے سجائے، اپنا ملب کچھ تاج کرمانات کی سر زمین امریکا کی جانب نکل کھڑے ہوئے تھے۔

اُن مسافروں میں دراز قد، وجہہ گہریٹل کیوں بھی شامل تھا، جس کا تعلق نیپلز سے سولہ کلومیٹر دور جنوب میں واقع ایک قصبے سے تھا۔ پیشے کے لحاظ سے وہ ایک جام تھا۔ گہریٹل تنہا نہیں تھا، اس کی حسین بیوی تھریا بھی ساتھ تھی۔ اس سفر کا مقصد بہتر مستقبل کا حصول تھا۔ اُس زمانے میں یورپ سے ہجرت کی ایک لہر چلی تھی۔ گروہوں کی صورت لوگ بحری جہازوں میں سوار ہو کر امریکا آرہے تھے۔ دھیرے دھیرے اُس وسیع و عریض ریاست میں بٹی بٹیوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی جہاں یہ امید پرست مہاجرین ڈیرے ڈالتے اور اپنے بچنے کے لیے جدوجہد

کھل کر مقرریت بناتے۔
جب جہاز بندرگاہ سے لگا، جھکے ہارے مسافر فرط جذبات سے تاپنے لگے۔ گہریٹل اور تھریا کے چہرے بھی دھک رہے تھے۔

اس خاندان نے بروکلن کے مرکزی علاقے نیوی یارڈ کو رہائش کے لیے چنا۔ گہریٹل ایک تہذیب یافتہ اور مختصی آدمی تھا، اُس کی بیوی بھی انتہائی کھڑ اور شائستہ عورت تھی، وہ دونوں چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے زندگی کی چادر رفو کرنے کا ہنر جانتے تھے اور انہیں یقین تھا کہ وہی زمین پر پاؤں بھانے میں کامیاب رہیں گے۔

اور وہ غلط نہیں تھے۔ جلد ہی گہریٹل کو ”29 پارک ایونیو“ پر واقع ایک باربرشاپ میں ملازمت مل گئی۔ خود کو منوانے اور نئے ماحول سے ہم آہنگ ہونے میں اُسے زیادہ وقت نہیں لگا۔

دھیرے دھیرے اس کفایت شعار خاندان کے حالات میں سدھار آنے لگا۔ زندگی کی گاڑی آگے بڑھنے لگی۔ جب خدا نے اس جوڑے کو اولاد کی نعمت سے سرفراز کیا، چھوٹے سے آشیانے میں خوشیاں رخص کرنے لگیں۔ مجموعی طور پر قدرت نے شریف انٹنس گہریٹل اور تہذیب یافتہ تھریا کو نبیوں سے نوازا۔ دیگر والدین کی طرح اُن کی بھی آرزو تھی کہ اُن کی اولاد خاندان کا نام روشن کرے۔

یہ خواہش پوری تو ہوئی لیکن بے حد عجیب ڈھنگ سے کہ آنے والے برسوں میں لفظ ”نبیوں“ دہشت کی علامت بن گیا جس کا سب اُن کا چوتھا بیٹا الفانسو گہریٹل بنا، جسے آج تاریخ ”الکپون“ کے نام سے یاد کرتی ہے!!

☆☆☆
مستقبل میں مظالم کی نئی تاریخ رقم کرنے والے الفانسو نے 17 جنوری 1899ء کی ایک طوفانی رات بروکلن میں آنکھ کھولی۔

کون سوچ سکتا تھا کہ کل یہ بچہ جرائم کی دنیا کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بدل دے گا۔ اُس وقت تو اُس کے چہرے سے مصوئیت چلتی تھی۔ اُس کی فطارتاں جب گہریٹل گونجتیں، تو ماں باپ کے دل میں خوشیاں اٹھاتی تھیں۔ تھریا اور گہریٹل اسے اپنے لیے خوش قسمتی کی علامت تصور کرتے تھے کیونکہ اس کی پیدائش کے کچھ ہی عرصے بعد ان کے معاشی حالات میں یکدم سدھار آ گیا تھا۔ اسی باعث انہوں نے سستا علاقہ چھوڑ کر نیو یارک

علاقے ”پارک سلو“ میں رہائش اختیار کر لی تھی۔

گوکہ الفانوس ایک عظیم اور تہذیب یافتہ جوڑے کا سپوت تھا لیکن اپنے ماں باپ کے برعکس وہ بلند آہنگ کا مالک تھا۔ خاصا ضدی اور سرکش تھا۔ کم سنی میں وہ اپنی بات منوانے کے لیے زور زور سے رویا کرتا تھا۔ کچھ بڑا ہوا تو اپنی خواہشات پوری کروانے کے لیے سنے ہتھکنڈے تلاش کر لیے۔ اب وہ گھر والوں سے بات چیت بند کر دیتا اور اس طرح جو چاہتا، اُسے حاصل کر لیتا۔

ماں باپ کا خیال تھا کہ اسکول میں داخل کروانے کے بعد اس کے مزاج میں سدھار آجائے گا۔ اس کی توجہ بٹ جائے گی لیکن ایسا ہوا نہیں۔

اس کا شمار مشکلات پیدا کرنے والے بچوں میں ہوتا تھا۔ گوکہ وہ بڑھائی میں اچھا تھا لیکن شرارتی بلا کا تھکا یہ کہنا بہتر ہوگا کہ وہ شرارتی بچوں کے ٹولے کا سرخ تھا۔ ہر وقت متحرک رہتا۔ کچھ نہ کچھ کرتا رہتا۔ اس دوران ہاتھ پائی بھی ہو جاتی۔ یہی سبب ہے کہ اسکول سے اکثر یہ شکایت آتی کہ آپ کا بچہ انتہائی جذباتی ہے، اُس میں برداشت کم ہے۔ گھر پر اپنے صاحب زادے کو سمجھانے کی بھرپور کوشش کرتی اور وہ اپنی ماں سے وعدہ بھی کرتا کہ آئندہ اسے شکایت کا موقع نہیں دے گا لیکن چند ہی ہفتے بعد پھر تھریسا کو اسکول سے ایک لیٹر موصول ہوتا جس میں الفانوس کے کارناموں کی تفصیلات ہوتیں۔

پہلے جس محلے میں گھبرل رہا کرتا تھا، وہاں کی لگیوں میں الفانوس کو زیادہ وقت گزارنے کا موقع نہیں ملا، پارک سلو کے علاقے میں رہائش اختیار کرنے کے بعد ہی وہ حقیقی محنتوں میں باہر کی دنیا سے متعارف ہوا۔ ایسی دنیا جس نے اُسے بدل ڈالا۔

اُسے دوستی کا فیض کافن آتا تھا۔ بولتا بھی خوب تھا۔ لیڈر شپ کی صلاحیت بھی تھی۔ سوجلد ہی وہ فتنہ ساز کے طور پر شہور ہو گیا۔

اس دور کا امریکا آج کے امریکے سے بیکر مختلف تھا۔ اس زمانے میں جرائم کی شرح خاصی بلند تھی۔ بے روزگاری اور مواقع کی کمی کے باعث نوجوان تعلیم حاصل کرنے کی بجائے دادا گیری پر توجہ دیتے۔

الفانوس کی ایسے نوجوانوں کی صحبت میں بیٹھنے لگا جن کے ذہن میں تحریریں منصوبے پیٹنے ہیں۔ لیکن وہ بے چارے خوف کے باعث کوئی بڑے اقدام کرنے کی بجائے

چھوٹی موٹی چوریوں پر اکتفا کر لیتے۔

ایک آدھ واردات میں الفانوس نے بھی ٹولے کے ساتھ شرکت کی لیکن وہ بہت جلد اُس سے اوب گیا۔ اس کی باوی کا سبب چوری شدہ مال سے حاصل ہونے والی منظم رقم تھی جو ٹولے کے ارکان میں تقسیم ہونے کے بعد اپنی حیثیت کھو دیتی۔ اسی باعث اس نے ایک منصوبہ ترتیب دیا۔ ایسا منصوبہ جس میں اُس کے مستقبل کی ابتدائی علامات ملتی ہیں۔

اس نے محلے کے بچوں کے ساتھ ایک گروہ تشکیل دیا جو چھوٹی موٹی چوریوں پر کرتا لیکن ان وارداتوں کا مقصد گروہ کی مالی فائدہ نہیں بلکہ اپنی تشہیر کرنا ہوتا۔ چوری کی کارروائی میں الفانوس حصہ نہیں لیتا لیکن دور کھڑے ہو کر اپنے کردہ کی سرپرستی ضرور کرتا۔ اس کے ساتھی جو بھی شے چوری کرتے، وہ اُس کے حوالے کر دیتے۔ اور پھر الفانوس بڑی شان سے اُسے اُس کے اصل مالک تک پہنچا دیتا۔

”جناب، میرا نام الفانوس کیون ہے۔ کچھ دیر پہلے میں نے چند بد معاش لڑکوں کو آپ کی دکان سے لٹے دیکھا تھا، اُن کے ہاتھ میں ٹافوں کا یہ پیکٹ تھا۔ میں نے ان کا تعاقب کیا اور یہ پیکٹ اُن سے چھین لیا۔ ساتھ ہی ان کی ٹھکانی بھی لگائی۔ اب وہ دوبارہ ایسی حرکت نہیں کریں گے!“

”اوہ... شکر ہے... تم کتنے اچھے ہو... میری طرف سے تم یہ پیکٹ تحفے میں رکھ لو بیٹے!“ دکان دار کے چہرے پر شگفتہ مسکراہٹ ہوئی۔

شاطر الفانوس نے بڑی مہارت سے ڈیڑھ برس یہ سلسلہ جاری رکھا۔

بکھی وہ کسی خاتون کو اُس کا پرس واپس کرتے ہوئے کہتا۔

”میڈم، میں نے اچکوں کو ایسا سبق سکھایا ہے کہ وہ دوبارہ آپ کی طرف نہیں دیکھیں گے!“

اور بھی کسی شخص کو اُس کی گھڑی واپس کرتے ہوئے کہتا۔

”وصان رکھا کریں جناب، یہاں اچکوں کی کمی نہیں... وہ شکر ہے کہ میں نے دیکھ لیا...“

کئی بار وہ بوڑھی خواتین اور ننھے بچوں کو سڑک پار کرواتا ہوا بھی نظر آیا۔ القرض وہ چھوٹا ”راہن بد“ بن گیا تھا۔

گوکہ وہ خود کو نیکو کار ثابت کرنے کی کوششوں میں لگا تھا لیکن تحریروں کو تو اس سے شکایتی خطوط موصول ہو رہے تھے۔ اسکول انتظامیہ اس نوجوان کی بابت طرح طرح کے اندیشوں میں مبتلا تھی۔ اور پھر ایک ایسا واقعہ رونما ہوا، جس کے بعد الفانوس کا تعلیمی سلسلہ تمام ہو گیا۔

فقہ کچھ یوں ہے کہ ایک روز 14 سالہ الفانوس نے اپنی بچہ کے منہ پر زور وار پتھر رسید کر دیا جس کی گونج کلاس روم کے باہر بھی سنی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ ہسپتال کے کمرے میں کمر اتھا لیکن اس کی آنکھوں میں خوف کی رقم بھی نہیں تھی۔ نہ ہی تاسف تھا۔

وہ الفانوس کیون کا اسکول میں آخری دن ثابت ہوا!

☆☆☆

الفانوس کو اسکول سے بے دخل کیے جانے کا رتی بھر انہیں نہیں تھا۔ وہ نرکوں کو درس گا ہوں سے زیادہ اہمیت دیتا تھا جہاں زندگی اپنی حقیقی شکل میں نظر آتی تھی، جہاں کے خوش و روز جینے کا ذہن سکھاتے تھے۔ اور نوجوان الفانوس کھینے کے لیے تیار تھا۔

اسکول کے چھوٹے سے آزادی کے بعد اُس کا زیادہ وقت اسنوکر کلب میں گزرنے لگا لیکن جلد ہی گھر کی بڑھتی ذمہ داریوں کے باعث اس نے بے کاری کے دنوں سے نجات حاصل کر لی اور خود کو چھوٹی موٹی ملازمتوں کے لیے تیار کر لیا۔

چند ڈالرز کے عوض کبھی وہ برٹنگ مشین پر بیٹھا، کبھی اخبارات کے اسٹال پر۔ کیپڈی اسٹور پر بھی کام کیا، تاہم وہ مطمئن نہیں تھا۔ اسے یقین تھا کہ پر آسائش زندگی کا حصول دولت کے حصول کے بغیر ناممکن ہے اور دولت صرف طاقتوروں کے حصے میں آتی ہے۔

الفانوس بھی طاقت حاصل کرنا چاہتا تھا اور اس کا ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ بد معاشوں کے گروہ کا حصہ بن جائے۔

جلدی ہی اس خواہش نے سلگتے ہوئے انگارے کی شکل اختیار کر لی، اس کے لیے وہ کسی بھی حد تک جانے کے لیے تیار تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کے لیے اسے کسی ایسے شخص کا ساہوکار بننا پڑے گا جو بد شہرت کی علامت تصور کیا جاتا ہو، جس کا نام سن کر لوگ تھر تھر کانپتے ہوں۔ اور نیکو کار میں ایک ہی ایسا شخص تھا، جوئی نوریا!

شہر کی تاریک گلیوں میں ہونے والی مختلف وارداتوں کے منظر وہ پہلے ہی جوئی کی نظروں میں تھا۔ جب جوئی نے

دیکھا کہ الفانوس اپنے مقصد پر زیت کا تعین کر چکا ہے، تو اُس نے اس نوجوان کو مین بٹن کے بدنام زمانہ The Five Points گینگ کا حصہ بنالیا۔ یہ گینگ الفانوس کے لیے تربیت گاہ ثابت ہوا۔

اُس زمانے میں الفانوس برکلن میں اپنا اثر بڑھانے میں مصروف ایک شخص فرینکی میل کے بیڑ بار میں ملازمت کر رہا تھا۔ یہ ملازمت اُسے جوئی ہی نے دلوائی تھی۔

جہاں تک فرینکی کا تعلق ہے، وہ جوئی کا بزنس پارٹنر تھا اور انتہائی شاطر اور ظالم آدمی تھا۔ آنے والے برسوں میں اُس نے نیویارک کے سب سے بااثر بد معاش کا مقام حاصل کر لیا لیکن اُس کی زندگی کا اختتام بے حد عجیب انداز میں ہوا، جس کا سبب کوئی اور نہیں، بلکہ الفانوس ہی بنا!

☆☆☆

فرینکی کے بیڑ بار میں کام کرتے ہوئے ہی الفانوس کو وہ زخم ملا، جس کی وجہ سے اُسے تاریخ میں "Scarface" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

واقعہ کچھ یوں ہے کہ ایک شام الفانوس کی نظر بار میں بیٹھی ایک انتہائی حسین لڑکی پر پڑی جو اپنے بھائی اور خاندان کے چند دیگر افراد کے ساتھ وہاں آئی ہوئی تھی۔ کچھ طاقت کا نشہ تھا، کچھ شراب کا اثر، الفانوس میز پر پہنچ گیا جہاں وہ لڑکی بیٹھی تھی اور بے آواز بلند، بڑے ہی ناشائستہ انداز میں اُس کے جسم کی تعریف کرنے لگا۔

ابھی وہ دوشیزہ کی تعریفوں کے ٹیل باندھ ہی رہا تھا کہ اسے اپنے چہرے کے بائیں جانب آگ کی گرگڑ محسوس ہوئی۔

اس سے قبل کہ وہ کچھ سمجھ پاتا، لڑکی کا بھائی چاقو سے اُس کے چہرے پر برہمن خطرناک وار کر چکا تھا۔

ہوش بحال ہوتے ہی زخمی الفانوس آگ بگولا ہو گیا۔

اس سے پہلے کہ وہ جوابی حملہ کرنا فرینکی وہاں آ گیا۔ اس نے الفانوس کو خاموش رہنے کی ہدایت کرتے ہوئے اُس شخص سے درخواست کی: ”براہ مہربانی جناب، بیٹھ جائیں!“

دراصل وہ شخص انتہائی بااثر تھا اور فرینکی ایک جذباتی اطالوی نژاد امریکی کے لیے اپنے تعلقات نہیں بگاڑنا چاہتا تھا۔

”فوراً ان صاحب سے معافی مانگو!“ جب فرینکی کے یہ الفاظ الفانوس کے کانوں سے گمراہے، اُسے یوں لگا،

جیسے کسی نے اس کے زخموں میں نمک بھر دیا ہو۔ بے عزتی کے احساس سے اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے لیکن اس وقت معافی مانگنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

اس واقعے نے اس کی زندگی بدل دی۔ چہرے پر لگنے والا زخم چند ہفتوں میں مندمل ہو گیا لیکن اس کا نشان باقی رہا۔

اس نشان نے اس کی زندگی اجیرن کر دی۔ آنے والے برسوں میں وہ اسے چھپانے کی حتی الامکان کوشش کرتا رہا۔ اگر کوئی ان کی بابت پوچھ بیٹھتا تو الفانسو یہی جواب دیتا کہ وہ دوران جنگ زخمی ہو گیا تھا۔ اسی زخم کے باعث اسے "Scarface" کا لقب ملا، جسے وہ سخت ناپسند کرتا تھا۔

تاہم اس واقعے نے اُسے ایک سبق بھی دیا۔ "جب تک میں جرائم کی چوٹی پر نہیں پہنچ جاتا، میں ایسے ہی ذلیل ہوتا رہوں گا۔" اُس نے دانت پیستے ہوئے خود سے کہا۔ "مجھے سب سے طاقتور انسان بننا ہے، سب سے طاقتور!"

☆☆☆

اس واقعے کے بعد وہ انتہائی ڈرشت ہو گیا۔ ماضی میں وہ فقط ایک بدعاش تھا لیکن اب وہ ایک ظالم اور جاہل شخص کا روپ اختیار کر گیا جو نئے نئے طریقوں سے لوگوں پر تشدد کرتا۔ ضرورت پیش آتی تو ان کی جان لینے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔

اس زمانے میں الفانسو، فرینکی میل کی سرپرستی میں کام کر رہا تھا۔ اس کا استاد، ٹوریو چند ضروری معاملات نمٹانے کا شغریہ تھا۔

دراصل جونی ٹوریو کے ایک رشتے دار کو شکاگو کے مضامعات میں سرگرم ایک گینگ "بلیک ہیڈز" کی وجہ سے شدید مشکلات کا سامنا تھا۔ سفاک جونی نے شکاگو جا کر اس گینگ کے تمام ارکان کو چن چن کر قتل کر دیا، تاہم اس کارنامے کے بعد وہ نیویارک نہیں لوٹا، اس نے شکاگو ہی میں قیام کا فیصلہ کر لیا، جس کے دو اسباب تھے۔

بنیادی سبب تو شکاگو جرائم پیشہ افراد کے لیے انتہائی سازگار ماحول تھا، دوسرا اُس کی خالہ و کنواریہ کا شوہر جنیس کولومبو!

جنیس کولومبو نے جسم فروشی کے کاروبار کو ایک ادوارے کی شکل دینے دی تھی۔ وہ خاطر شخص اپنے مفادات

کے لیے عورتوں کے استعمال میں ماہر تھا اور صرف پیشہ افراد، بلکہ اعلیٰ حکام میں بھی خاص اثر و رسوخ رکھتا تھا۔ شکاگو کے جونی کو کولومبو کے طریقہ کار سے اختلاف تھا، لیکن پیسے کی ریل پیل دیکھتے ہوئے وہ سرپرستی میں کام کرنے لگا۔ نیویارک کی ڈسٹے داروں نے فرینکی کو سوئپ دی تھی جو تیزی سے اپنا اثر و رسوخ برپا تھا۔

1918 میں فرینکی نے جونی سے اچانک راپٹ کر لیا۔ وہ خواہش مند تھا کہ جونی اس کے زیر سایہ کام کرے۔ اسے دو دو جوانوں الفانسو کیپون اور جی کو شکاگو کولومبو کے بڑھتی وارداتوں کی وجہ سے نیویارک پولیس کی نظروں سے آگئے ہیں اور اب پولیس اہل کار پانچوں کی طرح ان کی تلاش کر رہے ہیں۔

جونی دونوں نو جوانوں کی صلاحیتوں سے واقف تھا۔ اسے یقین تھا کہ ان کی شکاگو میں موجودگی اس کے قتل کا فائدہ مند ثابت ہوگی کیونکہ وہ اہل طور پر اس کے دور میں۔ اس نے فرینکی سے تھوڑا وقت مانگا۔ اور اسی دوران الفانسو کی زندگی میں ایک واقعہ رونما ہوا۔

☆☆☆

وہ بدعاش ضرور تھا لیکن اُس کے سینے میں بھی احساس دل تھا جس پر محبت سایہ نکلن تھی۔ دراصل ایک قبل وہ ایک آئرش تھوٹک لڑکی، سے جوزفین کی زلفیں اسیر ہو گیا تھا اور اب ان کا عشق زوروں پر تھا۔ جوزفین شادی کی خواہش مند تھی لیکن الفانسو خیال کا شدید مخالف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جرائم پیشہ افراد خاندان اُن کی کمزوری بن جاتا ہے۔ اسی لیے وہ جوزفین کو تالا رہا لیکن جب اسے پتا چلا کہ جوزفین ہوئی ہے، وہ قسمت کے ہاتھوں مجبور ہو گیا۔ 1918 میں دونوں شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔

جوزفین الفانسو کی بھرمانہ سرگرمیوں سے واقف تھی لیکن اُس کا ارادہ مضربزل نہیں ہوا۔ اسے کہ ایک نہ ایک دن وہ اُسے راہ راست پر لے آئے گی سبب تھا کہ وہ شادی والے روز بہت خوش تھی۔ وہ معصوم نہیں جانتی تھی کہ اُنے والے برسوں میں رشتہ اُس کے لیے عذاب بن جائے گا۔ اسی برس الفانسو کے پہلے بیٹے البرٹ فرانس پیدا ہوا۔

اس روز فرینکی میل اس کے گھر آیا، اس کی آمد کا مقصد بیٹے کی پیدائش پر الفانسو کو مبارکباد دینا نہیں تھا بلکہ یہ بتانے آیا تھا کہ جونی نے اس کی درخواست قبول کر لی ہے۔ وہ شکاگو جانے کی تیاری کرے!

☆☆☆

بیسویں صدی کے اوائل کا شکاگو ایک زندگی سے بھرپور شہر تھا۔ وہاں عیش و عشرت، رنگ و روشنی کا سمندر تھا۔ مسرت رقص کنائیں تھیں۔ شہر کے باسیوں کی خوش لمہای کا پورے ملک میں چرچا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ 1871 میں شکاگو میں لگنے والی "عظیم آگ" سے ایک نیا شہر ابھرا تھا، جہاں طرز تعمیر میں ماڈرن آرکیٹیکچر کے حسین نمونے جابہ جانظر آتے تھے۔ تاہم یہ شکاگو کا حقیقی چہرہ نہیں تھا کیونکہ رنگوں کے پیچھے جرائم کے کھرے سائے تھے۔

اس شراب خانوں، جوئے کے اڈوں، جسم فروشوں کے کھیلوں کی بھرمار تھی۔ نشا وراشیاں کھلے عام فروخت ہو رہی تھیں۔ اس کا بنیادی سبب بدعنوانی تھی۔ شکاگو کی پولیس کا کاروبار دنیا کے کرپٹ ترین پولیس ڈیپارٹمنٹس میں ہوتا تھا۔

پولیس تراسفران لینے ہوئے تھے۔ یہی معاملہ سیاست دانوں کا تھا جو رشوت کو اپنا حق سمجھتے تھے۔ یہی معاملہ سیاست دانوں کے اعدا میں ایک اور شاہراہ پر ابھرتا تھا لیکن سچ یہ ہے کہ جرائم کے معاملے میں اُس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

مورخین 20 سالہ الفانسو کیپون کی شکاگو آمد کو ایک اہم واقعہ گردانتے ہیں کیونکہ اس نے نہ صرف الفانسو کوئی شخص عطا کیا، بلکہ شکاگو کو بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بدل دیا! 1919ء کے اوائل میں جب الفانسو نے نیویارک پہنچا تو اُس وقت وہ تنہا تھا۔ حسین بیوی، معصوم بیٹا اس کے ساتھ نہیں تھے۔ وہ جان بوجھ کر انہیں ساتھ نہیں لایا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ شکاگو جانے کے بعد وہ خاندانی معاملات میں الجھ کر اپنا مقصد بھول جائے۔

الفانسو جہاں شکاگو جانے پر مسرور تھا، وہیں اسے بات کا شدید بدھ تھا کہ اس کے دیرینہ ساتھی جی نے سامان کو چھوڑنے سے انکار کر دیا ہے، تاہم جونی ٹوریو سے سامان ہوتے ہی وہ تمام دکھ بھول گیا۔

اُس کے سامنے اس کا استاد تھا، ایسا شخص جسے وہ جرائم کی دنیا میں قابل تقلید خیال کرتا تھا۔ جونی ٹوریو نے الفانسو کو شکاگو میں قائم اپنے ایک قہر خانے میں ملازم رکھ لیا۔ ساتھ ہی اُسے ہدایت کی کہ وہ

شکاگو کے جرائم پیشہ گروہوں کے بارے میں شدید حاصل کرے۔ دھیرے دھیرے وہ مختلف وارداتوں میں بھی حصہ لینے لگا۔

جلدی الفانسو، جونی ٹوریو کا بڑی گارڈین کیا۔ عوام کے لیے وہ سیکرٹ ہنڈ فنچر کا ڈکھڑا تھا لیکن حقیقتاً وہ جرائم کی دنیا میں تیزی سے ترقی کے مراحل طے کر رہا تھا۔

☆☆☆

شکاگو امریکا کا کرپٹ ترین شہر تھا، رشوت شہر کی اڑکوں میں سرایت کر چکی تھی اور کولومبو رشوت کے استعمال میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ اس کی ریاست جسم فروشی، نشا وراشیاں کی فروخت اور جوئے کے اڈوں پر قائم تھی۔

جونی اپنے خالو جنیس کولومبو سے شدید اختلاف کے باوجود اس کے ساتھ کام کر رہا تھا لیکن پھر 1920ء کے آغاز میں خالو بھانجے کے اختلافات شدت اختیار کرنے لگے۔

دراصل حکومت نے جنوری 1920ء میں شراب کی تیاری، ترسیل اور فروخت پر بھی طور پر پابندی عائد کر دی، جو اگلے تیرہ برس قائم رہی۔ حکومت کی جانب سے شراب کے خاتمے کی ہم وسیع پیمانے پر شروع کی گئی۔ شراب سے بھرے لاکھوں لیکن ضائع کیے گئے۔ ہزاروں بوتلیں توڑی گئیں۔ کنسٹرکشن کے کسٹریا بلوں میں بہا دیے گئے۔ اس اقدام کی اخبارات، ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعے تشہیر بھی کی گئی۔

مخلص حکومتی نمائندے تو شراب کا آخری قطرہ بھی ضائع کر دینا چاہتے تھے لیکن شوخی قسمت، امریکا میں بدعنوان افسران کی کی نہیں تھی جن کی اکثریت شکاگو میں مقیم تھی۔

ایک جانب انتہائی مہنگی غیر ملکی شراب کی بوتلیں دیواروں پر مار کر پھوڑی جا رہی تھیں، دوسری جانب اس سودمند کاروبار کو جاری رکھنے کے نت نئے طریقے تلاش کیا جا رہے تھے۔

اُس وقت شہر کا میئر ولیم بک بل تھا من نامی ایک شخص تھا، جو بدعاشوں سے بڑا بدعاش تھا۔ پیسے کا وہ بیماری کھلے عام رشوت لیا کرتا تھا۔

جونی ٹوریو نے جلد ہی اعزازہ لگایا کہ شکاگو کے افسران کو خرید کر کوئی بھی شخص شراب کی اسگنگ اور غیر قانونی فروخت کے ذریعے کروڑوں ڈالرا کما سکتا ہے۔

جونی ٹوریو زبردست ہمت سے ایک خفیہ لیگ تشکیل دے گا

تھا، جس میں اُسے نو جوان جوئی کو یقین دلایا تھا کہ اگر اُس کا منہ لوٹوں سے بھر دیا جائے تو وہ یہ خوشی اسے bootlegging، یعنی شراب کی غیر قانونی فروخت کی اجازت دے دے گا۔

میزر سے ملاقات کے بعد اُس نے یہ تجویز اپنے خالو کولوسو کے سامنے رکھی، جس نے اُسے یہ کہتے ہوئے زور دیا کہ وہ قحبہ خانہ چلانے میں خود کو مطمئن پاتا ہے اور اس چکر میں نہیں پڑنا چاہتا۔ اس موضوع پر دونوں میں شدید بحث ہوئی لیکن کولوسو سے رشتے داری کے باعث جوئی نے صبر کا گھونٹ پی لیا۔

رشتے داری جوئی کے پیروں کی بیڑی نہیں بنی۔ اپریل 1920 میں کولوسو نے اس کی خالو کوٹوریا کو طلاق دے کر ایک اور اسٹریٹ ڈیل وٹھر سے شادی کر لی۔ یہی شادی کولوسو کے زوال کا سبب بنی۔

ایک ہفتے کے اندر اندر شکاگو میں یہ خبر پھیل گئی کہ کولوسو اپنے گینگ پر گرفت مقرر ہے اور اب وہ مزید حکومت کرنے کا حق دار نہیں۔ کولوسو کے چند خیر خواہوں کو یقین تھا کہ یہ خبریں کوئی اور نہیں بلکہ خود جوئی ٹوریو پھیلا رہا ہے لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس کے سبب اب کے لیے کوئی اقدام کرتے 11 مئی کا سورج طلوع ہو گیا۔

اس روز کولوسو اپنے ہی ہوٹل کی لابی میں مردہ پایا گیا۔ اُسے بے حد زودیک سے گولیاں مار کر قتل کیا گیا تھا۔ ہر شخص جانتا تھا کہ اس قتل کا ذمہ دار جوئی ٹوریو ہے اور ایسا تھا بھی، اس واردات میں نہ صرف القانسو، جو اب ال کیپون کے نام سے پکارا جانے لگا تھا، پوری طرح شامل تھا بلکہ اس کے ڈائریکٹریو نیوارک میں بیٹھے فرینکی کے غیر قانونی کاروبار سے بھی ملتے تھے۔ بد قسمتی سے پولیس کو ان افراد کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ملا۔

آئندہ چند ہفتوں میں جوئی نے کولوسو کے پورے کاروبار پر قبضہ کر لیا۔ اب وہ اپنے سب سے بڑے منصوبے پر عمل کرنے کے لیے آزاد تھا!

☆☆☆

غیر قانونی شراب کی خرید و فروخت کا دھندا شروع کرنے کا خواہش مند جوئی اب بھی طور آزاد تھا۔ اسے القانسو کیپون جیسے وفاداروں ساتھیوں کا تعاون حاصل تھا۔ اس وقت تک ملک بھر میں پھیلے شراب سازی کے پیش کارخانے بند کر دیے گئے تھے۔ جو چھوٹے موٹے

شراب کی فروخت شروع کرنے سے قبل جوئی نے بدعاش میز کو اس کا حصہ اور کوکی کی چند بوتلیں پہنچا دی تھیں!!

☆☆☆

رنگین مزاج شرع کا گواہ تھی وہی تھا۔ وہاں کوکی بااثر افراد میں تھے مختلف جرائم پیشہ گروہ سرگرم تھے جو جوئی کی برقی قوت کے باعث شدید پریشانی میں مبتلا تھے۔

ماضی میں جرائم پیشہ گروہوں نے علاقے بابت رکھے تھے۔ وہ اپنے علاقے میں کام کرتے لیکن جوئی کوکی کی مدد سے پولیس کے لیے تیار نہیں تھا، وہ چاہتا تھا کہ پولیس کے لیے شکاگو پر اس کا راج ہو۔ یہی سبب ہے کہ اس کے دیگر گینگ کے زیر اثر آنے والے علاقوں میں قائم شراب خانوں کے مالکان پر باؤڈالنا شروع کر دیا کہ وہ فقط اس کی فراہم کردہ شراب فروخت کریں۔

اس پراجیکٹ کی ذمہ داری اس نے اپنے دست میں لے لی۔ القانسو کیپون کو سونپی۔ کیپون نے اس کام کے لیے ہندو خور بدعاشوں کی ایک ٹیم تشکیل دی۔ وہ اسلحے سے اس کے ساتھیوں کو لیے شراب خانوں میں داخل ہوتا اور ان کے مالکان سے کہتا ہے ”دوستو، اس وقت صرف جوئی ٹوریو ہی اعلیٰ کوکی کی شراب فراہم کر رہا ہے، براہ مہربانی آپ ہم سے شراب خریدیں، آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔“

جو شراب خانے جوئی کے علاقے میں قائم تھے، ان کے مالکان نے تو بے چوں و چرا اس پیشکش کو قبول کر لیا لیکن دیگر جرائم پیشہ گروہوں کے زیر اثر آنے والے علاقوں میں جو شراب خانوں کے مالکان نے اس دھمکی منہ پیکش کو رد فرمایا تو انہیں جاننا۔

کیپون کے پاس انہیں سیدھا کرنے کے لیے سادہ سا منصوبہ تھا۔ انتہائی کارروائی سے قبل اس نے ایک بار بحران سے رابطہ کیا۔ اس بار لکچر میں دھمکی کا عنصر بے حد واضح تھا۔ چند تومان گئے، لیکن جواب بھی شراب خریدنے کے لیے تیار نہیں ہوئے، ان کے شراب خانوں پر پہلی نوعیت کے دھمکی بھری حملے کیا گیا۔

کیپون کا طریقہ دلچسپ تھا۔ جس شراب خانے پر وہ دھمکیاں کرتا، دوسرے دن چہرے پر ہمدردی سجائے اس کے مالک کے پاس پہنچ جاتا۔ ”ختم بہت دکھ ہے کہ کسی بدعاش نے آپ کی

ملکیت کو نقصان پہنچایا۔ خیر، پروا نہ کریں۔ میں آپ کو احوال دینے کے لیے تیار ہوں، آپ شراب خانہ ٹھیک کروالیں۔ میسے لوٹانے میں جلدی کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور ہاں جناب... اگر شراب خریدی ہے، تو ہم سے خریدیں۔ ہم بہترین شراب فراہم کرتے ہیں!“

یہ طریقہ انتہائی مؤثر ثابت ہوا۔ چند شراب خانوں کے مالکان کو یہ خدشہ تھا کہ جوئی کی اطاعت قبول کرنے کے بعد وہ دیگر جرائم پیشہ گروہوں کی گولیوں کا نشانہ بن سکتے ہیں۔ کیپون کو اس مسئلے کی شدت کا اندازہ تھا اور اس نے اس کا حل بھی سوچ رکھا تھا۔

اس نے اپنے مخالفین کو چن چن کر قتل کرنا شروع کر دیا۔ اور یوں شکاگو میں غیر قانونی شراب کی فروخت کا آغاز ہوتے ہی خون کی ندیاں بہنے لگیں۔ کبھی کبھی تاریکی کی لاش ملتی، کبھی کبھی اکٹڑی سے۔ کبھی کسی شخص کو اس کی گاڑی میں نشانہ بنایا جاتا، کبھی گھر میں داخل ہو کر اسے قتل کر دیا جاتا۔

ان واقعات نے جوئی ٹوریو کے مخالفین میں کھلبلی مچا دی۔

اسی عرصے میں کیپون کو اطلاع ملی کہ دیگر جرائم پیشہ گروہ بھی شراب اسمگلنگ کرنے کے منصوبے ترتیب دے رہے ہیں اور انہیں حکام کی مکمل پشت پناہی حاصل ہے۔ جب اس ضمن میں جوئی نے شکاگو کے بدعاش میز سے رابطہ کیا تو اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ اُسے فقط پیسوں سے غرض ہے۔

”میں تمہارے ساتھ ہوں نوجوان، لیکن کیا کروں، وہ بھی رشوت دینے کے لیے تیار ہیں... ہاں تمہیں انہیں راستے سے ہٹانے کی اجازت ہے، میں تمہاری طرف سے آنکھیں بند کروں گا۔ پولیس تمہیں پریشان نہیں کرے گی۔“

اس دولت پرست انسان نے تہقید لگاتے ہوئے کہا۔

میزر سے ملاقات کے بعد جوئی نے کیپون کو واضح ہدایت کر دی کہ دشمنوں سے کسی قسم کی رعایت نہیں برتی جائے۔

”اگر تمہیں انتہائی حد تک بھی چاہنا پڑے تو جاؤ۔ ان کے دل میں اپنا خوف بٹھاؤ، سمجھ گئے!“ جوئی نے کیپون کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”ایسا ہی ہوگا با!“ کیپون کی آنکھوں میں درشتی تھی!

سبز اور پیل رنگ کو ترجیح دینے والا خوش لباس کیپون
تعدادات کا مجموعہ تھا!

اس پانچ فٹ دس انچ کے صحت مند اطالوی نژاد
امریکی کو عام لوگ ایک خوش اخلاق شخص کے طور پر جانتے
تھے۔ اپنے باپ کے انتقال کے بعد اُس نے پورے
خاندان کو شکاگو بولا لیا تھا۔ اس کے مکان میں پندرہ کمرے
تھے، جہاں اُس کے اہل خانہ نے رہائش اختیار کی۔ کیپون
کے بھائیوں نے بھی اس کے نقوش پا کا تعاقب کرتے
ہوئے جرائم کی دنیا میں قدم رکھ دیا تھا۔ اسے حالات کی ستم
ظریفی ہی کہا جاسکتا ہے کہ ایک شریف انفس جوڑے کے
تمام بیٹے بد معاش نکلے، لیکن شکاگو کے پوش علاقے میں
قائم الکلیون کے گھر میں کبھی کاروباری معاملات زیر بحث
نہیں آئے۔ یوں تو وہ اکثر گھر سے باہر ہی رہتا، لیکن جب
کبھی گھر میں ہوتا، تو ایک اچھے انسان کی طرح پیش آتا۔
البتہ اپنے بیوی سے وہ وفادار نہیں تھا۔ اس کی کئی محبوبائیں
تھیں، لیکن اُس نے اُن عورتوں کو اپنے گھر سے دور رکھا۔

باہر کی دنیا بھی اسے ایک ملن سار انسان کے طور پر
جانتی تھی۔ جب کبھی وہ ریلوئٹرنٹ جاتا تو میٹروں کو خاصی
ٹپ دیتا۔ اگر کوئی شخص اس کے سامنے اپنا مسئلہ بیان کرتا تو
وہ اس کی بھرپور مدد کرتا۔ غریبوں کی دست گیری بھی کیا
کرتا۔ الغرض وہ ایک عجیب آدمی تھا۔
گوکہ الکلیون خاصا اثر و رسوخ حاصل کر چکا تھا، کئی
قتل کر چکا تھا، دشمنوں کے دل میں اپنا خوف بیٹھا چکا تھا،
لیکن تاحال شکاگو کے عام باسی اس کے نام سے ناواقف
تھے۔ اُسے پہچان ایک عجیب واقعہ سے ملی۔

کہانی چھ یوں ہے کہ وہ بھی کالنے کے لیے انگلی
میز می کرنے کا تو قائل تھا لیکن اس کے لیے بھی اس نے دو
طریقے وضع کر رکھے تھے۔ ایک شریفوں والا طریقہ، ایک
بد معاشوں والا طریقہ!

بد معاشوں والا طریقہ تو سادہ تھا، وہ اپنے ساتھ
ریوالور رکھتا تھا۔ شریفوں والا طریقہ یہ تھا کہ وہ ہمیشہ اپنی
جیب میں پولیس شریف کا جعلی بیج بھی رکھتا جس کی مدد سے
چھوٹے موٹے کام نکال لیتا۔ اور یہی بیج شکاگو آنے کے
بعد اس کی پہلی گرفتاری کا موجب بنا۔

یہ 1922ء کی ایک سرورات کا ذکر ہے۔ کیپون نشے
کی حالت میں ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اچانک گاڑی قابو سے

باہر ہو گئی اور ایک ٹیکسی سے جا کر نکلے۔ نشے میں دھت
کف اڑاتا ہوا گاڑی سے باہر نکلا اور ٹیکسی ڈرائیور کو
سے پکڑ لیا۔ جب ٹیکسی ڈرائیور نے سمجھانے کی کوشش
جناب غلطی تو آپ کی ہے! تو اس نے جیب سے
شیرف کا بیج نکال کر وہاں لہرایا۔

”اہق، میں پولیس شریف ہوں۔ اب تم
زندگی جیل میں سڑو گے!“

یہ سلسلہ جاری تھا کہ اصلی پولیس وہاں پہنچ گئی۔
گرفتار کر لیا گیا۔ اس وقت تک وہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔
نے پولیس افسر کو سمجھایا کہ اسے گرفتار کرنا لا حاصل
ہو آسانی رہا ہو جائے گا۔

”دیکھتا ہوں، تم کیسے جیل سے نکلے ہو!“ پولیس
نے دانت پیٹے ہوئے کہا۔

اگلے دن اس واقعے کی تفصیلات خبر کی صورت
میں شائع ہو گئی، الکلیون کی تصویر بھی ساتھ تھی، لیکن
حیرت انگیز طور پر چند روز بعد وہ شکاگو کی سڑکوں پر آزاد
گھوم رہا تھا۔ اُس نے درست یہی کہا تھا کہ اسے گرفتار
ایک لا حاصل عمل تھا۔

1923ء انتہائی خونی ثابت ہوا۔ جونی کے

دشمنوں نے اس کے خلاف ایک مجاز بنالیا تھا، اُن کا ایک
مقصد تھا، جونی کی اجارہ داری ختم کرنا، لیکن شاطر
غافل نہیں تھا۔ وہ بڑی مہارت سے اپنی چالیں چل رہا تھا۔
سفاک کیپون اس کا ہتھیار تھا۔

کیپون نے اپنے گروایہ گھاگ قاتل اکٹھے کر
تھے، جو قتل کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔

اس برس شاید ہی کوئی ایسی رات گزری ہوگی، جب
شکاگو کی تاریک گلیوں میں کوئی قتل نہ ہوا ہو۔ شہر کے گوشے
ہوئے حالات نے امریکا کے اعلیٰ حکام کو کبھی تشویش
جتلا کر دیا لیکن شکاگو پولیس کے کرپٹ اہل کار اس معاملے
میں سدھار کے متعلق نہیں تھے، انہیں تو فقط پیسے سے غرض
تھی، وفارٹ گری کا سلسلہ جاری رہا۔

پھر ایک روز کاروبار کو وسعت دینے کے لیے کیپون
نے گھوڑوں کی دوڑ پر پیسے لگانے کی تجویز پیش کر دی۔
اس ضمن میں تذبذب کا شکار تھا لیکن کیپون نے اسے
دلایا کہ یہ سودا سود مند ثابت ہوگا۔ اور ایسا ہی ہوا، تاہم
بار کیپون نے تشدد کو طور ہتھیار استعمال نہیں کیا۔ وہ
بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ گھوڑوں کی ریس پر پیسے لگانے والے

افراد انتہائی بارسوخ ہوتے تھے۔ اُن میں کئی ایسے لکھ پتی
شامل تھے جو اپنی سیکورٹی کے لیے جونی ہی کو مہمان بہتہ دیا
کرتے تھے۔ ان دولت مندوں کو ٹھکنے کے لیے کیپون نے
روایتی جیل سازوں والا طریقہ اختیار کیا۔

جب بھی گھوڑوں کی ریس ہوتی، اُس کے ساتھی نفس
لباس زیب تن کیے، سگار منہ میں دبائے ریس کورس پہنچ
جاتے۔ وہ مختلف گروہوں کے قریب کھڑے ہو کر بہ آواز
بلند اس موضوع پر بحث کرتے کہ اس بار کس گھوڑے کے
جیتنے کے امکانات ہیں اور انہوں نے کس پر رقم لگائی ہے۔

ایک کہتا۔ ”مسٹر جے، میرا یقین کریں، اندر کی خبر
ہے، اس بار آٹھ نمبر کا گھوڑا جیتے گا!“

دوسرا حیران ہونے کی ادا کاری کرتا۔ ”آپ وثوق
سے کیسے کہہ سکتے ہیں مسٹر اورگن؟“

”میں نے کہا ناں جناب، اندر کی خبر ہے۔“ پہلا
سکراتا۔ ”آپ میرا یقین کریں۔ نیویارک میں بیٹھے افراد
نے بھی اسی گھوڑے پر پیسے لگائے ہیں۔“

”کیا بات کر رہے ہیں جناب!“ دوسرا حیران ہوتا۔
”پھر میں بھی اسی پر رقم لگا دیتا ہوں۔“

وہ مختلف گروہوں کے نزدیک کھڑے ہو کر بڑی
مہارت سے اُن کی ذہن سازی کرتے۔ لوگ بہ آسانی ان
کے جھانسنے میں آجاتے۔ کچھ دیر بعد ہر دوسرا شخص آٹھ نمبر
کے گھوڑے پر پیسے لگا چکا ہوتا۔ نتائج کی بابت غور کرنے کی
ضرورت نہیں، آٹھ نمبر کا گھوڑا ہار جاتا۔

دراصل شاطر کیپون ریس شروع ہونے سے پہلے ہی
گھڑسواروں کو خرید لیا کرتا تھا۔

یہ سلسلہ ایک برس کا میانی سے جاری رہا لیکن پھر
ایک بھائی نے اپنی اسٹوری میں کیپون کا پردہ چاک کر
دیا جس کے بعد اس نے گھوڑوں کی ریس سے اپنی توجہ ہٹا
کر صحافیوں پر مرکوز کر لی۔

ایک بد معاش ہونے کے باوجود کیپون خواہش مند تھا
کہ معاشرہ اسے ایک اچھے انسان کے طور پر دیکھے۔ وہ جانتا
تھا کہ اس ضمن میں اخباری صفحات بے حد سود مند ہیں، وہ
اس کے لیے رائے عامہ ہموار کر سکتے ہیں۔ ساتھ ہی اسے
اس بات کا بھی ادراک تھا کہ اخبارات اُس کا اسٹیج تیار کر
سکتے ہیں۔ گھوڑوں کی ریس کا اسکینڈل اخبارات کی زینت
بننے کے بعد کیپون سمجھ گیا کہ شکاگو پر راج کرنے کے لیے
صحافیوں کو اپنی جگہ میں رکھنا از حد ضروری ہے۔

اُن ہی دنوں کیپون نے ”شکاگو ٹریبون“ کے ایڈیٹر
رابرٹ جان پر ایک جان لیوا حملہ کیا۔ اپنے تئیں تو وہ
رابرٹ کوئل کے چکا تھا لیکن خوش قسمتی سے وہ شخص بچ گیا۔
اس واقعے سے کیپون کی شخصیت کے تضادات کا اظہار ہوتا ہے

کیپون نے پیسے کی طاقت سے کئی صحافیوں کو خرید
لیا۔ جو نہیں کیے، انہیں دھمکیاں دی گئیں، ضرورت پڑنے پر
تقدیر بھی کیا گیا۔

کیپون نے نہ صرف رابرٹ کے اسپتال کا بل ادا
کیا بلکہ آنے والے برسوں میں پھر بھی اُس کی جانب آنکھ
اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا!

☆☆☆

کیپون کا اثر فقط شکاگو تک محدود نہیں تھا۔ نیویارک
میں فرینکی کے بڑھتے رسوخ کے باعث وہ اپنے آبائی شہر
کے معاملات میں مداخلت کرنے کے لیے بھی آزاد تھا۔
اس کے کئی رشتے دار ریاست الیونائی کے علاقے
سیسورویں آباد تھے۔ اس شہر میں بھی وہ خصوصی دلچسپی لے
رہا تھا۔

1924ء میں سیسورویں ہونے والے ٹائون کونسل
کے الیکشن کا شمار امریکی تاریخ کے بدترین انتخابات میں ہوتا
ہے، جس میں دھاندلی کے تمام ریکارڈ توڑ دیے گئے۔

میئر کا انتخاب لڑنے والا شخص کیپون کا منظور نظر
تھا جس نے مستقبل کے حوالے سے اُس سے کئی وعدہ کر
رکھے تھے۔ یہی وجہ کہ کیپون اپنے ہاتھ دساتھیوں کو ٹوک
میں بھر کر سیسورویں بھیج گیا جہاں اُس کے غنڈے ہندوک کی
ٹوک پر دوڑوں کو اُس کرپٹ سیاست داں کے حق میں
ووٹ ڈالنے کے لیے مجبور کرتے رہے۔

الیکشن والے روز کیپون خود اپنے غنڈوں کی
کارروائیوں کی نگرانی کر رہا تھا۔ ساتھ میں اُس کا بھائی
فرینک بھی تھا۔ دونوں کے ہاتھ میں پیسوں تھے اور وہ
چہرے پر زبردستی جائے ووٹروں کو ڈرا دھمکا رہے تھے۔
بھی ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے کیپون کو گہرے
صدے سے دوچار کر دیا۔

کیپون اور فرینک ریوالور لیے پولنگ بوتھ پر کھڑے
تھا کہ پولیس کی دو گاڑیاں سائرن بجاتی ہوئی وہاں پہنچ
گئیں۔

کیپون اور اس کے ساتھیوں نے فوراً پوزیشن سنبھال

لی۔ گولیوں کا تبادلہ شروع ہو گیا۔ پولیس کا پلہ بھاری تھا۔ ایک ایک کر کے کیپوں کے ساتھی گرنے لگے۔ جان بچانے کے لیے کیپوں کو وہاں سے ہٹا کر پڑا۔ تاہم اس کا بھائی فرینک اتنا خوش نصیب ثابت نہیں ہوا۔ فائرنگ کے تبادلے میں فرینک شدید زخمی ہو گیا تھا اور موقع ہی پر دم توڑ گیا۔

اس سانحے نے اس کے سخت دل کو گہری چوٹ لگائی لیکن مزید صدمے اس کے منتظر تھے۔ دوسرے دن کے اخبارات اس پولیس مقابلے کی تفصیلات سے بھرے ہوئے تھے۔ اسے ایک مکروہ شخص کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ دوسری جانب جس شخص کو کیپوں سپورٹ کر رہا تھا، اس نے جیت کے فوراً بعد ایک بیان جاری کر دیا کہ وہ جلد الکیپوں نامی ناسور کو شہر سے نکال باہر کرے گا۔

اس بات پر کیپوں آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے ہیٹ سر پر رکھا سیدھا ناؤن ہال پہنچ گیا جہاں وہ اہم صحافیوں میں گھرا قبضہ لگا رہا تھا۔

اس کے قبضے دم توڑ گئے۔ اب وہ جبراً تھا اسے زمین پر پڑا کر رہا رہا تھا۔ کیپوں کے بھاری کتے نے اس کے اگلے دو دانت توڑ دیے تھے۔

اسی شام کیپوں نے شہر چھوڑ دیا۔

☆☆☆

شکاگو میں لاشیں گرنے کا سلسلہ جاری تھا۔ ہر وہ انسان جو جونی کے خلاف آواز اٹھانے کی جسارت کرتا، موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ کیپوں کی قیادت میں جونی کا گینگ شکاگو کے شمالی حصے میں داخل ہونے کی بھی کوشش کر رہے تھا، تاہم انہیں ایک بائیس سلی خزاں امریکی خاندان کی وجہ سے شدید مزاحمت کا سامنا تھا، جس کا سربراہ ڈین اوٹینین نامی ایک انتہائی باسورخ اور دولت مند آدمی تھا۔

اُس نے رشوت اور طاقت جیسے مہلک ہتھیاروں سے شمالی علاقے پر اپنی دھاک بٹھا رکھی تھی۔ وہاں شراب فروخت کرنے کا اختیار بھی اُسے ہی حاصل تھا۔

گوکہ شکاگو کی پولیس کرپٹ تھی لیکن بڑے حالات کی وجہ سے اب وفاقی اہل کار اس معاملے میں کود پڑے تھے اور وہ شکاگو کے جرائم پیشہ گروہوں کو قابو کرنے کی کوششوں میں مجھے تھے۔

ایک شام اپنے بیڑے بار میں بیٹھے ڈین اوٹینین کو یہ اطلاع ملی کہ وفاقی اہل کار ٹھیک ایک ہفتے بعد اس کے

شراب کے گوداموں پر چھاپا مارنے والے ہیں۔ اس کے لیے پریشان کن نہیں تھی، تاہم اس نے ایک خیال بھجایا۔

اوٹینین نے فوراً ایک آدمی اپنے دشمن نمبر ایک کی ٹوریو کی جانب روانہ کر دیا اس پیشکش کے ساتھ کہ چاہے تو شمال میں شراب کی فروخت کے کاروبار میں پارٹنر بن سکتا ہے۔

پیشکش منکھوک اور حیران کن تھی، تاہم اس حیران کن امر یہ تھا کہ جونی نے اسے قبول کر لیا۔ گوکہ کو ابتدا ہی سے سازش کی بو آ رہی تھی لیکن وہ چپ رہا۔ اگلی شام جونی اور اوٹینین کی ملاقات ہوئی جس میں دونوں نے ایک معاہدے پر دستخط کر دیے۔ اب وہ پارٹنر تھے۔

اوٹینین کی چال کا میاں ب رہی۔ چند روز بعد شمال میں موجود شراب کے گوداموں پر چھاپا پڑ گیا جن کا مالک فقط اوٹینین نہیں تھا۔ جونی ٹوریو بھی اس کاروبار میں طرح طرح شریک تھا۔

چند مہینوں میں جونی کے نام کا وارنٹ جاری ہوا اور وفاقی اہل کاروں نے ایک بھی لمحہ ضائع کیے بغیر گرفتار کر لیا۔

یہ جبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ دوسرے کے اخبارات تفصیلات سے بھرے ہوئے تھے۔

”شکاگو کا بد معاش باوشاہ، سلاخوں کے چھپے تھا۔ گوکہ اوٹینین بھی گرفتار ہوا لیکن وہ پہلے ہی انتقال کر چکا تھا۔ چند ہی روز بعد وہ آزاد گھوم رہا تھا۔ رہائی کے لیے بھی مسئلہ نہیں تھی، تاہم بے عزتی کا احساس کچھ کے لگا رہا تھا۔

بائیس جونی جیلی بار گرفتار ہوا تھا اور اسے اُس کا سبھا جا رہا تھا۔ مخالفین جشن منا رہے تھے۔

اس واقعے نے کیپوں کو آگ بگولا کر دیا۔ اس میں وہ ایک ہی انسان کو اپنا استاد مانتا تھا اور وہ تھا جونی جو اب سلاخوں کے چھپتا تھا۔ اس نے اوٹینین سے لینے کا فیصلہ کر لیا۔ غصیل جونی نے بھی اس انتہائی فیصلے کو تسلیم کر دیا۔

ایک بار پھر نیویارک کے دادا گریفرینکی سے رابطہ کیا جو کرائے کے قاتل کی پوری کھپ رکھتا تھا۔ 110 اکتوبر 1924ء کی صبح پھولوں کی ایک دکان کے

تین افراد نے ڈین اوٹینین کو موت کے گھاٹ اتار دیا!

☆☆☆

سلی خزاں امر کیپوں کے گینگ کو اوٹینین کے قتل سے گہرا صدمہ پہنچا تھا۔ شکاگو کا شمال سوگ میں ڈوب گیا اور اسی سوگ کے آتش فشاں سے انتقام کا لاوا اُبلا۔ اوٹینین کی موت والے روز اُس کے دو قریبی ساتھیوں سٹاک گلو مورین اور شاطر ہمنن اُن کے قسم کھائی کہ وہ جونی اور اُس کے دست راس کیپوں کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

ایک جانب جونی کا گینگ جشن منا رہا تھا، وہیں دوسری جانب شہر کے شمالی حصہ میں چھائی خاموشی میں ایک منصوبہ بندی رہا تھا۔

نیکو اور ہمنن اُن کے جلد بازی میں کوئی غلطی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ ایک ایک قدم چھوٹ چھوٹ کر رکھ رہے تھے۔

اوٹینین کے قتل کے دو ماہ بعد 1925ء کے اوائل میں جونی ٹوریو پر ایک جان لیوا حملہ ہوا۔ حملہ اتنا شدید تھا کہ وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا لیکن خوش قسمتی سے اس موقع پر کیپوں اس کے ساتھ تھا جس نے اپنی جان پر کھیل کر اس کی حفاظت کی۔

جونی کے جسم میں کئی گولیاں اُتر گئی تھیں۔ اسے صحت یاب.... ہونے میں خاصا وقت لگا۔ اس عرصے میں کیپوں، جو اور ہمنن کو پاگل کتے کی طرح تلاش کرتا رہا لیکن وہ دونوں اغڑاؤں سے بچ گئے تھے، تاہم انہوں نے جونی کے خلاف پروپیگنڈا جاری رکھا۔

حملے کے چند روز بعد شکاگو کی دیواروں پر پوسٹر چسپاں ہو گئے جن میں جونی کا مذاق اُڑاتے ہوئے اُس کی اجارہ داری کے خاتمے کا اعلان کیا گیا تھا۔

شکاگو کا سب سے بڑا دادا گیر صحت یاب ضرور ہو گیا لیکن اب وہ اس دھندے سے اوب چکا تھا اور اسے شدت سے احساس ہونے لگا تھا کہ رخصتی کا وقت آن پہنچا ہے۔ اسے اپنی وراثت منتقل کر دینی چاہیے۔

صحت یابی کے جشن والے روز اس نے اٹلی جانے کا اعلان کرتے ہوئے کیپوں کو اپنا جانشین مقرر کر دیا۔ کیپوں اپنے قابل احترام استاد کی جگہ لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے خاصی بحث کی لیکن بالآخر اسے جونی کی محنت اور ضد کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ گینگ کے

نئے لیڈر کا تاج اس کے سر پر رکھ دیا گیا! گوکہ جونی کے پیاری کے دنوں میں شمال میں گھزاور ہمنن خاصے مضبوط ہو چکے تھے لیکن کیپوں کی مرکزی دھارے میں آمد کے بعد کھیل کے اصول بدل گئے۔ گینگ وار میں شدت آگئی جس میں کیپوں کا پلڑا بھاری تھا۔

غیر قانونی شراب کی فروخت میں بھی اجاںک تیزی آگئی۔ ہزاروں گیلن شراب اسمگل کی گئی۔ دیگر شہروں میں شراب کی فراہمی بھی شروع ہو گئی۔ ایک اندازے کے مطابق اُس برس کیپوں نے غیر قانونی شراب کی فروخت کے کاروبار سے سو ملین ڈالر بھیجی خطیر رقم کمائی۔

شراب خانوں کے علاوہ جوئے کے اڈے بھی زور و شور سے چل رہے تھے۔ جسم فروشی کا کاروبار بھی وسعت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ یوں دھیرے دھیرے کیپوں کا اثر بڑھنے لگا۔

شکاگو پر مکمل اختیار حاصل کرنے کے لیے اس نے لاکھوں ڈالر رشوت دی۔ سیاست دانوں اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کو خریدنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ جس کسی نے مخالفت کی اُسے قتل کر دیا۔ اور جب بھی اس کی جانب انگلی اُٹھی، اس نے منٹوں میں ثابت کر دیا کہ جس روز فلاں شخص قتل ہوا تھا وہ تو شہر سے باہر تھا۔

پھر اُسے بد معاش میسر کی بھی بھر پور سپورٹ حاصل تھی جو کیپوں کی طاقت کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کر رہا تھا۔ اس طرح گھزاور ہمنن کی طاقت آہستہ آہستہ کھٹنے لگی۔

کیپوں کی سرگرمیوں کا مرکز شکاگو کا لینکسن ہوٹل تھا جسے ”کیپوں کا قلعہ“ کہا جاتا تھا۔ اس ہوٹل میں کئی خفیہ راستے تھے جن کی مدد سے وہ خاموشی سے ہوٹل میں داخل ہوتا اور چپکے سے نکل جاتا۔

اسے احساس تھا کہ دشمن اس کے خون کے پیاسے ہیں سو اس نے اپنی سیکورٹی بڑھا دی۔ کہنے والے کہتے ہیں، اُس کے ساتھ چلنے والے باڈی گارڈز کی تعداد صدر امریکا کے حفاظتی دستوں میں موجود اہل کاروں سے زیادہ ہوتی تھی۔

کیپوں نے خود کو ایڈر گراؤنڈ نہیں کیا۔ وہ وقت فوقتاً عوام کے سامنے آتا رہا۔ وہ اچھے اچھے ریستورانٹ میں بیٹھ کر تہہ ہوٹل میں ڈنر کرتا، دعوئیں دیتا، ثقافتی تقریبات میں شرکت کرتا۔ لوگوں سے کھلتا ملتا۔ فلائی سرگرمیوں میں حصہ

لیتا۔

اگر کبھی صحافی اس سے تلخ سوالات کرتے تو وہ مسکراتے ہوئے جواب دیتا "دوستو، میں ایک برٹس میں ہوں۔ لوگوں کو وہی دیتا ہوں جو وہ مانگتے ہیں!" اور کبھی کہتا "میں تو عوامی خواہشات پوری کرنے والا ایک تاجر ہوں، بس!"

نیویارک پر بھی اُس کی دہشت طاری تھی جہاں وہ اکثر جایا کرتا لیکن ان دوروں کا مقصد چھٹیاں گزارنا نہیں ہوتا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہاں ہونے والے جرائم میں بھی کیپون براہ راست شریک تھا۔

ایسا ہی ایک واقعہ 1925ء کے وسط میں پیش آیا جب کیپون اپنے دوست فرینکی کی سالگرہ کے جشن میں شرکت کی غرض سے نیویارک گیا اور وہاں اس نے ایک ایسے بااثر سرکاری اہل کار کو قتل کروا جو فرینکی کے لیے مشکلات پیدا کر رہا تھا۔ اُس کے بقول یہ فرینکی کے لیے سالگرہ کا تحفہ تھا!

شاید فرینکی اس تحفے پر خوش ہوا ہو لیکن نیویارک میں کھلبلی مچ گئی۔ اسٹیٹ پولیس حرکت میں آگئی۔ اس کے خلاف وارنٹ جاری ہو گئے لیکن کیپون نیویارک سے فرار ہونے میں کامیاب رہا اور لوانا کی چلا گیا جہاں اس نے خود کو رضا کارانہ طور پر پولیس کے حوالے کر دیا۔

گرفتاری کے وقت اُس نے ایک بیان جاری کیا "میں بے گناہ ہوں، لیکن قانون کا احترام کرتا ہوں، اس لیے خود کو پولیس کے حوالے کر رہا ہوں!"

اس زمانے میں ریاستی اداروں کے درمیان رابطے کا شدید فقدان تھا۔ فیڈرل بیورو آف انویسٹی گیشن بھی خاصا کمزور تھا، یہی وجہ ہے کہ وہ بے آسانی بے گناہ ثابت ہو گیا۔ یہ بڑی کامیابی تھی۔ وہ قاتل کی حیثیت سے شکار گولوا جہاں جشن منایا گیا۔

چند روز بعد کیپون نے ایک دلچسپ حرکت کی۔ اس نے شکار گولے کے ایک معروف رپورٹر اور فوٹو گرافر کو ساتھ لیا اور مرکزی پولیس اسٹیشن پہنچ گیا۔

"جناب میرا نام الفانسو کیپون ہے، اگر میرے خلاف کوئی الزام ہے، تو مجھے گرفتار کر لیں!" اس عجیب و غریب پیشکش پر پولیس اہل کار بے بسی سے مسکرائے تھے۔

پولیس اسٹیشن سے نکل کر وہ کورٹ پہنچ گیا خود کو جج

کے سامنے پیش کر دیا۔ "جناب میرا نام الفانسو..." جج بھی ہنس کر رہ گئے۔ اس دوران فوٹو گرافر تصاویر اُتار رہا، رپورٹر کا قلم چلتا رہا۔ دوسرے دن اخبارات میں یہ سالے دارا ستوری شایع ہو گئی جس نے اُس کی شہرت کو چار چاند لگا دیے۔

سچ تو یہ ہے کہ وہ ایک "سلیپر بی" بن چکا تھا! ☆☆☆

کیپون کی بڑھتی شہرت اور اثر نے اس کے مخالفین کو سچ پا کر دیا تھا۔ وہ ہر صورت اسے ختم کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اُسے قتل کرنے کے لیے ایک خطرناک منصوبہ تیار کیا۔

20 ستمبر 1926ء کو جب کیپون بیوٹھرنی ہوٹل میں بیٹھا سچ کر رہا تھا، جدید اسلحے سے لیس دشمنوں کی پوری فوج نے ہوٹل پر حملہ کر دیا۔

دشمنوں کی تعداد کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ دس گاڑیوں پر سوار تھے۔ ان کے ہاتھوں میں انتہائی مہلک تصوری جانے والی نامی گن تھیں۔

اُس دوپہر ہوٹل پر گولیوں کی بارش ہوئی۔ اُس کی دیواریں چھلنی ہو گئیں۔ اندازاً پانچ ہزار گولیاں برسائی گئیں۔

خوش قسمتی سے اس شام کیپون کو ایک وفادار نو جوان فرینکی رپو کا ساتھ حاصل تھا جس نے گولیوں کی آواز سننے ہی خود کو کیپون پر گرا دیا تھا۔ یوں اس بھیانک حملے میں وہ محفوظ رہا۔

جلدی ہی اُسے پتہ چل گیا کہ یہ حملہ بگومورین نے کروایا تھا جس نے دیگر ریاستوں کے چند بااثر دوستوں کی مدد سے شکار گولے کی شامی حصے میں اپنی حکومت قائم کرنے کی کوششیں کر دی ہیں۔

اس واقعے کے فوراً بعد کیپون نے ایک انتہائی قیمتی گاڑی "کینڈک" خرید لی جس کی باڈی اور تمام شیشے بلیڈ پروف تھے۔ ساتھ ہی اُس میں اسلحہ رکھنے کے لیے کئی خانے بنے ہوئے تھے۔ اس کا کار کا بہت چرچا ہوا۔

بیوٹھرنی ہوٹل کے واقعے کے بعد کیپون کوئی پرسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ دشمنوں کا خاتمہ از حد ضروری تھا۔ اس نے ایک ڈیٹھ اسکوڈ تشکیل دیا جس کا مقصد وہ آدمیوں کے گرد گھیرے رکھنا تھا، ایک ہینن وائس اور دوسرا بگومورین 11 اکتوبر 1926ء کو دوپہر بڑی مہارت سے

کرائے کے قاتلوں نے ہینن وائس کے جسم میں چار گولیاں اتار کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ ایک بڑی کامیابی تھی۔ کیپون کے ساتھی جشن منانا چاہتے تھے لیکن اُس کے منصوبے کچھ اور تھے۔

ہینن کی موت کے بعد اس نے بگومورین کے نام ایک اخباری تقریبی پیغام جاری کر دیا اور دوسرے ہی روز بگومورین کو پیغام بھجوایا "شکار گولے بہت جگہ ہے دوست۔ پیسے کمانے کے بڑے امکانات ہیں۔ لڑنا بے کار ہے، آؤ دوست بن جائیں!"

بگومورین اور انتقام کے جذبے سے منسلک رہا تھا لیکن اس وقت عقل مندی یہی تھی کہ وہ کیپون سے ہاتھ ملالے کیونکہ وہ بہت کمزور ہو گیا تھا اور موجود حالات میں خاموشی اختیار کرنا ہی بہتر تھا!

☆☆☆

بگومورین کیپون کے اس معاہدے سے شکار گولے جرائم کی شرح یکدم بڑھ گئی لیکن کیپون پر شکوک تھا۔ اسے آرام کرنے کا موقع مل گیا تھا۔

اب وہ باقاعدہ ایک کاروباری آدمی کی طرح آفس میں بیٹھنے لگا۔ اس کے دفتر میں داخل ہونے والے کو چند اس احاس نہیں ہوتا تھا کہ اُسے ایک بد معاش چلا رہا ہے۔ اسی زمانے میں اُس نے چار ہزار ڈالر کے عوض پام آئر لینڈ، فلوریڈا میں ایک مینشن خریدا اور اس کی تزئین و آرائش پر ہزاروں ڈالر خرچ کر کے اُسے ایک محل کی شکل دے دی۔

بگومورین کو اُس کے پیش تر دشمن ختم ہو چکے تھے، تاہم اس نے سیکورٹی کے معاملے پر کوئی سمجھوتا نہیں کیا۔ اب بھی اس کے گرد باڈی گارڈز کی فوج ہوتی تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ حالات کسی بھی وقت بگڑ سکتے ہیں۔ اور ایسا ہی ہوا، اُس کا قریبی دوست فرینکی اُس کے خلاف ہو گیا!

دراصل اس وقت تک فرینکی نیویارک کا بے تاج بادشاہ بن چکا تھا، تاہم غیر قانونی کاروبار سے حاصل ہونے والی اس کی آمدنی شکار گولے پر راج کرنے والے کیپون کی آمدنی سے خاصی کم تھی، جس کا اسے قلق تھا۔ اسے یاد تھا کہ یہی کیپون اس کے ہاں ملازمت کیا کرتا تھا اور اب وہ سرکاری نوٹوں میں کھیل رہا ہے۔ اسے اس بات کا بھی دکھ تھا کہ جونی نوو نے اُس کی جگہ کیپون کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ تاہم یہ اختلافات اُن کے تصادم کا سبب نہیں بنے۔ معاملہ خالصتاً مفادات کا تھا۔ جب مفادات ٹکرائے، دو

دوست دشمن بن گئے لیکن پہل فرینکی ہی نے کی۔ دراصل ٹینیسن وہی ہے بھرے ٹرک نیویارک ہی سے گزرتے تھے جن کی حفاظت کی ذمہ داری فرینکی ہی کی تھی۔ اسی وہی کے قتل کیپون لاکھوں ڈالرز کا رہا تھا۔ فرینکی کو قلق تھا کہ اسے کیپون کے منافع سے بہت تھوڑا حصہ مل رہا ہے۔

شراب خریدنے کے خواہش مند دیگر گروہ اس بات سے واقف تھے اور کافی عرصے سے اُسے قاتل کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ کیپون کو چھوڑ کر اُن کے لیے کام کرنا شروع کر دے۔

ہر شخص کی ایک قیمت ہوتی ہے۔ بالآخر فرینکی نے کیپون کی کمزوری پھر اٹھونے کا فیصلہ کر لیا۔

کیپون کے لیے یہ خبر حیران کن تھی کہ بروکلن سے روانہ ہونے والے کئی ٹرک راستے میں غائب ہو گئے ہیں۔ اس نے فوراً فرینکی سے رابطہ کیا جس نے اسے مطمئن کرنے کی پوری کوشش کی لیکن کیپون کے دل میں شک بیٹھ چکا تھا۔

اُس نے بروکلن میں مقیم ایک مشترکہ دوست جیمس ڈی ایمپکو کو خفیہ طور پر فرینکی پر نظر رکھنے کی ہدایت کر دی۔

اُس کا شک سچ ثابت ہوا۔ چند روز بعد جیمس شواہد کے ساتھ اُس کے سامنے موجود تھا۔

"ٹرک کوئی اور نہیں، بلکہ تمہارے قریبی دوست فرینکی ہی غائب کروا رہا ہے!" جیمس نے اسے بتایا۔

کیپون نے سوچ بچار میں وقت ضائع نہیں کیا، اس نے فوراً ہی اپنے دیرینہ دوست کے "ڈو-تھ وارنٹ" پر دستخط کر دیے۔

یکم جولائی 1927ء کو نیویارک میں چند نامعلوم افراد نے ایک تاریک سڑک پر فرینکی پر حملہ کر دیا۔

حملہ آور اپنے کام میں ماہر تھے لیکن ان کا مقابلہ کسی عام انسان سے نہیں تھا وہ فرینکی تھا نیویارک کا سب سے بڑا بد معاش!

حملہ ناکام گیا۔ گوکہ فرینکی کے چند ساتھی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے لیکن وہ اس حملے میں محفوظ رہا۔

اس ناکام حملے کے ٹھیک چھ دن بعد بروکلن کی ایک خاموش، تاریک سڑک پر جیمس کی لاش پڑی تھی۔ اس بات کا تعین بھی نہیں ہو سکا کہ جیمز کو کس نے قتل کیا۔ آیا فرینکی نے اُسے غداری کی سزا دی، یا اپنے خلاف

موت ملانے کے لیے کیپون نے اُسے راستے سے ہٹا دیا۔
فرینکی پر حملے کے بعد نیویارک سے گزرنے والے
کیپون کے اکثر ٹرک غائب ہونے لگے۔ حالات کی
نزاکت کے پیش نظر صبر کا کھوٹ بیٹے ہوئے کیپون نے
فرینکی اور اپنے بڑے تعلقات بحال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔
اُس نے فرینکی کو شکاگو مدعو کیا۔ فرینکی جانتا تھا کہ
کیپون ہی نے اس پر حملہ کروایا تھا لیکن اُس نے دعوت قبول
کر لی۔

شکاگو میں اس کا شان دار استقبال کیا گیا۔ کیپون
ایک اچھا میزبان ثابت ہوا لیکن فرینکی کا ذہن بدل چکا
تھا۔ نیویارک لوٹنے کے بعد اُس نے کیپون کی مہمان نوازی
کو یکسر بھلا دیا۔ ٹرک غائب ہونے کا سلسلہ جاری رہا۔
کچھ عرصے تک کیپون کا روبرار میں نقصان برداشت
کر رہا، لیکن پھر اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ جانتا تھا
کہ اب فرینکی بہت محتاط ہو گیا ہے، اس کے گرد محافظوں کا
پورا ہتھیار ہے۔ سو اُس نے روایتی حملہ کرنے کے بجائے ایک
نئے منصوبہ ترتیب دیا۔

جولائی 1928ء کی ایک صبح اپنے کلب میں موجود
فرینکی کو ایک مشکوک فون کال موصول ہوئی۔ فون کرنے
والے نے فرینکی کو بتایا کہ اُس کی بیوی اور کم سن بیٹی کے
ساتھ ایک بھیاں ایک حادثہ پیش آ گیا ہے، وہ فوراً گھر پہنچتے۔
فرینکی اس چال کو نہیں سمجھ سکا۔ وہ کلب سے نکل کر
سیدھا گاڑی میں سوار ہوا اور گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔
جلد بازی میں اس نے کسی باڈی گاڑ کو بھی ساتھ نہیں لیا۔
گھر کے نزدیک موت اس کی منتظر تھی۔ اُس اُداس صبح وہ
گوپیوں کی بوچھاڑ کا مقابلہ نہیں کر سکا۔ چند ہی گھنٹوں میں
یہ خبر پورے ملک میں پھیل گئی کہ نیویارک کی جرائم کی دنیا کا
بے تاج بادشاہ زندگی کی جنگ ہار چکا ہے۔

جب یہ خبر شکاگو میں پھیلے منصوبہ ساز تک پہنچی، اس
نے سوگ منانے کا اعلان کر دیا۔

آخر فرینکی اس کا برسوں پرانا دوست تھا!

☆☆☆

1929ء کا آغاز شان دار تھا۔ ہر گزرتے دن کے
ساتھ کیپون کی قوت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا لیکن شکاگو کا
مثالی علاقہ تاحال گومورین کے قبضے میں تھا جس کے ساتھ
کیپون نے چند برس قبل امن معاہدہ کر لیا تھا لیکن اب گومورین
نے پُر پزے نے نکلے شروع کر دیے تھے۔

گکو کے گینگ کا نشانہ کیپون کے شراب سے بھرے
ٹرک تھے۔ جنوری میں کیپون کے تین ٹرک بڑا سرار طور پر
لاپتا ہو گئے۔ اس کی سرپرستی میں چلنے والے چند شراب کے
اڈوں پر بھی دتی سموں سے حملہ ہوا۔ یہ سب تو کیپون نے
برداشت کر لیا، لیکن جس روز اُس کے قریبی ساتھی اور باڈی
گاڑ، جیک میگر پر قاتلانہ حملہ کیا گیا، اس کے صبر کا پیمانہ
لبریز ہو گیا اور اس نے اس باب کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند
کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

کیپون نے ایک منظم منصوبہ ترتیب دیا جس کے تحت
14 فروری والے دن ایک ایسے ہولناک واقعے نے منظر
لیا جسے آج "سینٹ ویلنٹائن کے روز ہونے والا قتل عام"
(Saint Valentine's Day Massacre)
کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اس وحشیانہ منصوبے پر عمل درآمد کرنے سے ایک
رات قتل شاطر کیپون نے شکاگو چھوڑ دیا اور فلوریڈا چلا گیا۔
اُس نے اپنی روایتی اطلاع اخباری نمائندوں اور پولیس
حکام کو دے دی تھی۔ یوں اُس نے یہ آسانی 14 فروری
والے روز شکاگو میں اپنی غیر موجودگی کے گواہ پیدا کر لیے۔
ابھی 14 فروری کا سورج طلوع ہوئے زیادہ دیر
نہیں گزری تھی کہ گومورین کو ایک فون کال موصول ہوئی۔
فون کرنے والے نے بتایا کہ وہ ایک علاقائی گینگ کا سرخ
ہے، اُس نے کیپون کا وہی سے پھر ایک ٹرک اغوا کیا ہے
جو وہ گکو کو فروخت کرنا چاہتا ہے۔

سرور گکو نے اُسے صبح ساڑھے دس بجے نانہ کلاک
اسٹریٹ پر واقع اپنے گودام پہنچانے کی ہدایت کر دی۔
اُس کے گینگ کا اڈا تھا۔

اُس نے اپنے قریبی ساتھیوں کو بھی سیر پیغام
دیا کہ وہ ساڑھے دس بجے تک گودام پہنچ جائیں جہاں
وہ مستقبل کے حوالے سے ایک میٹنگ کرنے کا خواہش
مندھا۔

"اُس حق کیپون پر کاری ضرب لگانے کا وقت آ گیا
ہے" اے گکو کے حملہ تھا۔ وہ بے چارہ اس بات سے کسرا
تھا کہ کیپون اگلے چند گھنٹوں میں اُس کے گینگ پر ایک
مہلک حملہ کرنے والا ہے۔ ایسا حملہ جو ہمیشہ ہمیشہ کے
اسے مفلوج کر دے گا۔

گکو کے چھ اہم ترین ساتھی وقت مقرر پر کلاک
اسٹریٹ پر واقع گودام پہنچ گئے۔ وہ شراب سے بھرے
2012

سے بھرے تھے لیکن حقیقتاً موت اُن کی منتظر تھی۔
یہ گکو کی خوش قسمتی تھی کہ اس صبح وہ وقت پر نہیں پہنچ
سکا۔ اس کی گاڑی گودام سے چند میٹر کے فاصلے پر تھی کہ
اس کی نظر سڑک کے کنارے کھڑی ایک گاڑی پر پڑی جس
سے وہ پولیس اہل کار ٹیک لگائے کھڑے تھے۔ ساتھ ہی چند
سادہ لباس اہل کار بھی موجود تھے۔

"شاید خبری ہوئی!" گکو بڑبڑایا اور ڈرائیور کو روک کے
اشارہ کر دیا۔ اسی غلط فہمی نے اس کی جان بچائی کیونکہ گودام
کے باہر کھڑے افراد پولیس اہل کار نہیں تھے۔ وہ تو کرائے
کے قاتل تھے۔

اُس خاموش صبح لگ بھگ پونے گیارہ بجے کے
قریب گودام کے ارد گرد کا علاقہ فائرنگ سے گونج اٹھا۔
فائرنگ اتنی شدید تھی کہ گودام کے قریب بسنے والے خوف
سے لرز اٹھے۔

واقعے کے عین مطابق پولیس کے پہنچنے سے قبل قاتلوں
کی ٹولی وہاں سے فرار ہو چکی تھی۔ اس صبح گودام میں گکو
گینگ کے سات اہم ترین افراد کو دھارے کے ساتھ ایک قطار
میں کھڑا کر کے بھون دیا گیا۔ مرنے والوں کے جسم گولیوں
سے پھلتی تھے۔ شکاگو کی تاریخ کا سب سے بدیت ناک
واقعہ رونما ہو چکا تھا۔

خبر جنگ کی آگ کی طرح پورے ملک میں پھیل گئی۔
دوسرے دن کے اخبارات میں ماسوائے اس واقعے کی
تفصیلات کے کوئی قابل ذکر خبر نہیں تھی۔ گومورین گینگ ختم
ہو چکا تھا۔ گکو سب جانتے تھے کہ یہ قتل کس نے کروائے
لیکن ہر شخص خاموش تھا۔ اور پھر... بھلا وہ کس پر الزام
لگاتے، کیپون تو شہر میں تھا نہیں۔

واقعے کے فوراً بعد صدر امریکا کی ہدایت پر تفتیش
شروع ہو گئی۔ وفاق اس کیس کی نگرانی کر رہا تھا۔ اطلاع
پہنچانے والے کے لیے ایک ہزار ڈالر کے انعام کا اعلان بھی
کیا گیا تھا لیکن واقعے کے عین مطابق کوئی سامنے نہیں آیا۔

کسی بھی ممکنہ رد عمل سے بچنے کے لیے کیپون نے
ایک دلچسپ چال چلی۔ اُس نے پولیس میں موجود اپنے
دوستوں کی مدد سے خود کو گرفتار کروا دیا۔ ایسا کرنے کی وجہ
وہ تھی... وہ جیل کو انتہائی محفوظ خیال کرتا تھا۔

اب وہ جیل میں تھا جہاں وہ دس ماہ ایک راجا کی
طرح رہا۔ اُسے ہر قسم کی سہولت میسر تھی۔ اُس کے ہیرک
میں ٹائون لگا ہوا تھا۔ ریڈیو اور ٹی وی بھی تھا۔ ملاقات کی
2012

بھر پور آزادی تھی۔

بالآخر چند ماہ جھک مارنے کے بعد حکومت کی جانب
سے یہ فیصلہ صادر کر دیا گیا کہ کیس حل نہیں ہو سکا۔ اور یہ
منتوقع تھا، شکاگو کی پولیس تو کیپون کی جیب میں تھی۔

☆☆☆

کیپون بادشاہ بن چکا تھا۔ اب کوئی اُس کے
تہ مقابل نہیں تھا۔ ماسوائے تین سلی نژاد امریکیوں پر
مستقل منشیات فروشوں کے ایک گروہ کے، جن میں جو
جوئیئر نامی ایک ایسا شخص بھی شامل تھا، جو بھی کیپون کا کن
میں ہوا کرتا تھا۔

ویلنٹائن کے روز ہونے والے قتل عام کے تین ماہ
بعد کیپون نے ایک تقریب کا اہتمام کیا جس میں منشیات
فروشی کا دھندا کرنے والی اس کلوں کو بڑے ہی دوستانہ
انداز میں مدعو کیا گیا۔ جوئیئر اور اُس کے ساتھی اس
جھانے میں آ گئے۔

جب وہ تقریب میں پہنچے، کیپون بڑے ہی دوستانہ
انداز میں پیش آیا، رضا کارانہ طور پر اپنا رپو لیو اُن کے
حوالے کر دیا۔ سکی کے باشندے مطمئن تھے۔ اُن تینوں
نے بھی مسکراتے ہوئے نئی دوتی کے نام پر اپنے ہتھیار ہال
کے باہر ہی چھوڑ دیے۔

رخص دوسروں کی محفل کا آغاز ہوا۔ شراب پانی کی طرح
بھائی گئی۔ ہر شخص مطمئن و مسرور تھا۔ ہر شخص جام کے جام
حلق میں اُٹھل رہا تھا، ماسوائے کیپون کے!
جب کیپون نے دیکھا کہ تینوں سکی باشندے نشے
میں دھت ہیں، اس نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔
اگلے ہی لمحے جو جوئیئر اور اُس کے ساتھی فرش پر پڑے
ہوئے تھے۔

منٹوں میں اُن کا نشہ ہرن ہو گیا۔ بیس بال بیٹ سے
کیپون نے اُن کی اتنی درگت بنائی کہ وہ بے ہوش ہو گئے۔
اپنے سابق کن مین کا تو اُس نے سر پھاڑ دیا۔ بعد میں
کیپون کے باڈی گاڑ نے تینوں کو کھٹکھٹا لگا دیا۔
اس واقعے پر کسی نے سوال نہیں کیا۔ خوف نے ہر
زبان پر مہر لگا دی تھی۔

☆☆☆

1929ء کے وسط میں ایک اہم واقعہ رونما ہوا۔
اٹلانٹک شہر میں امریکا کے تمام بڑے جرائم پیشہ گروہوں
کے سربراہان کی ایک خفیہ میٹنگ ہوئی جس کی صدارت
ستمبر 2012

جونئور پور کر رہا تھا۔ تمام بڑے غنڈوں کو ایک چھت تلے اکٹھا کرنے کا خیال کیوں ہی سوچا تھا جو اب اپنے کاروبار کو ملک گیر حیثیت دینے کا تھی۔ اس میٹنگ میں ڈیٹ شلس، فریک کسٹیلو اور کئی لوچاویجیے امریکا کے بدنام زمانہ بد معاشوں نے شرکت کی اور ان مفاد پرستوں کی ملاقات اور اشتراک کے فیصلے کے بعد امریکا میں ایک عفریت نے جنم لیا۔ "مافیاراج" کا آغاز ہو گیا تھا۔

کیوں آزاد تھا، بااثر تھا۔ اس کی آمدنی بڑھتی جا رہی تھی۔ کاروبار وسعت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ لینٹن ہول شکاگو کی نقدی کار مرکز تصور کیا جانے لگا تھا۔ اب کیوں اپنی آئرش بیوی کے ساتھ کم کم ہی نظر آتا۔ عام طور سے مجبوباتیں اس کے پہلو میں ہوتیں۔ دوسری جانب دنیا بدل رہی تھی۔ اکتوبر 1929ء میں وال اسٹریٹ کریش ہوئی۔ امریکا عظیم مالیاتی بحران کی لپیٹ میں آ گیا۔ اس واقعے نے پوری دنیا کو بدل دیا۔

امریکا میں لاکھوں لوگ بے روزگار ہو گئے، غربت اور جرائم بڑھنے لگے، مایوسی قوی ہونے لگی۔ شکاگو بھی اس بحران سے شدید متاثر ہوا تھا۔ شاطر کیوں نے اس بحران کو اپنی شہرت کے لیے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کی ہدایت پر شہر میں "سوپ کچن" کھلے گئے، جہاں غریبوں کو دو وقت کا کھانا فراہم کیا جاتا تھا۔ کیوں نے باقاعدہ ان کی تشہیر کی۔ مختلف اشتہارات تیار کیے گئے جو نیل ویٹن اور ریڈیو پر چلے، اخبارات کی زینت بنے۔ اشتہارات میں ان سوپ کچن سے استفادہ کرنے والے کیوں کی ستائش کرتے نظر آتے۔

اس کی چال کار گر ثابت ہوئی۔ سیاست میں اپنے ان دنوں میں قائم کردہ "سوپ کچن" امریکا بھر کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ وہ ایک دردمند انسان کے طور پر خود کو پیش کرنے میں کامیاب رہا۔

ان امرکز سے مجبوری کے ہاتھوں کئی ایسے افراد نے بھی اپنا پیٹ بھرا، جو کبھی کیوں کے شدید مخالف ہوا کرتے تھے۔ اسے قاتل اور ٹھگ تصور کرتے تھے۔ گوکہ وہ جانتے تھے کہ "سوپ کچن" بد معاش کیوں کی سازش ہے لیکن اب وہ بھوک کے پھل کیوں مجبور تھے۔

کیوں بن چکا تھا اور اس کا سہرا "شکاگو ماہنامہ سرگشتہ"

ٹریون" سے وابستہ ایک صحافی جیک لینگ کے سر تھا جو اس کا انتہائی قریبی دوست اور مشیر تھا۔ جیک انتہائی بااثر صحافی تھا۔ گوکہ اس کی تنخواہ فقط 65 ڈالر ماہانہ تھی، لیکن وہ ایک شاہانہ زندگی گزار رہا تھا۔ وراصل کیوں اسے سالانہ 60 ہزار ڈالر دے رہا تھا، جس کا مقصد اس کے حق میں رائے عامہ ہموار کرنا تھا۔ "سوپ کچن" کا خیال بھی اُس ہی سوچا تھا۔

☆☆☆

ایسا نہیں تھا کہ حکومت ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی تھی۔ گوکہ شکاگو کے کئی سیاست دان اور پولیس افسران کیوں کی جب میں تھے، لیکن ایسے بھی لوگ تھے جو اسے قرار واقعی سزا دلوانا چاہتے تھے۔ ان مخلص افراد کی فہرست میں مارچ 1929ء میں امریکی صدر کا عہدہ سنبھالنے والا ہربرٹ ہودر بھی شامل تھا جو کیوں کو سبق سکھانے کے لیے بے تاب تھا۔ اُس نے ایک نوجوان لیکن انتہائی باصلاحیت اور شاطر وفاقی افسر جے ایڈگر کو ریڈیو سے داری سوچی کہ وہ کیوں کے کیس پر کام کرے۔

گوکہ یہ کیس انتہائی مشکل تھا لیکن جس روز کیوں کی فائل ضدی جے ایڈگر کی میز پر پہنچی، اُس نے قسم کھائی کہ وہ اس بد معاش کو سلاخوں کے پیچھے ڈھیل کر ہی دم لے گا۔

اس زمانے میں جے ایڈگر "جسٹس ڈیپارٹمنٹ" کے سربراہ کے طور پر کام کر رہا تھا۔ اُس نے اس کیس کے لیے ایجنٹس کا ایک گروہ تشکیل دیا جس میں فقط کھرے اور بے داغ افسران کا چناؤ کیا گیا جن کا ریکارڈ صاف تھا۔ ایمان دار افسران کے اُس گروہ کو تاریخ میں "The Untouchables" کے نام سے پکارا گیا۔

اس گروپ میں وفاقی اہل کار ایلیٹس میں بھی شامل تھا جو کیوں کے کاروبار پر گہری نظر رکھے ہوئے تھے۔ شراب پر عائد پابندی کی خلاف ورزی کے حوالے سے ثبوت اکٹھے کرنا اس کی ذمہ داری تھی۔ وہ ماضی میں بھی کیوں پر ہاتھ ڈالنے کی کئی کوششیں کر چکا تھا لیکن کرپٹ اہل کاروں کے باعث وہ ناکام رہا۔ خوش قسمتی سے اس بار اسے ایسے افسران کا ساتھ حاصل تھا، جو کیوں کے اثر سے مکمل طور پر آزاد تھے۔

اس گروپ میں انتہائی باصلاحیت ایجنٹ فریک ولسن بھی شامل تھا جسے جے ایڈگر کی مکمل آشر باد حاصل تھی۔ اُسے ایڈگر نے کیوں کی جانب سے ٹیکس کی ادائیگیوں میں

کے جانے والے گھپلوں پر نظر رکھنے کی ہدایت کر رکھی تھی۔ ایجنٹس خفیہ طور پر کیوں کے قریبی ساتھیوں سے بھی تفتیش کر رہے تھے جن میں "شکاگو ٹریون" کا صحافی جیک لینگ بھی شامل تھا۔

جیک لینگ نے شاہانہ طرز زندگی کو اختیار کر لیا تھا لیکن وہ کیوں کے مانند محتاط نہیں تھا۔ اس کی آمدنی اور اخراجات کے گوشواروں میں پائے جانے والے تضادات واضح تھے، جن کی مدد سے وفاقی ایجنٹ اُس کے گرد اپنا گھیرا جگ کر رہے تھے۔ انہیں امید تھی کہ اس شخص سے حاصل ہونے والے شواہد کی بنیاد پر وہ بے آسانی بد معاش کیوں کی گردن دیوچ لیں گے۔

کیوں غافل نہیں تھا۔ 9 جون 1930ء کو وفاقی ایجنٹس سے ملاقات سے ایک دن قبل جیک کو قتل کر دیا گیا۔ یہ واقعہ ایک ہول کی لابی میں رونما ہوا۔ قاتلوں نے جیک کو انتہائی قریب سے گولیاں ماری تھیں۔

پہلا شکار کیوں ہی پر کیا کیونکہ یہ اطلاع گردش کر رہی تھی کہ جیک اُس کے خلاف وفاقی اہل کاروں کو اہم معلومات فراہم کرنے والا ہے۔ لیکن پولیس کچھ ثابت نہیں کر سکی۔ قتل والی شام ہول میں موجود ایک بھی شخص بے طور گواہ سامنے نہیں آیا۔

دوسرے دن کے اخبارات میں کیوں کا ایک بیان قانون نافذ کرنے والے اداروں کو منہ چڑھا رہا تھا جس میں اُس نے دعویٰ کیا تھا کہ جیک کو اس کے مخالفین نے قتل کروایا ہے اور جب تک وہ اُن ظالموں کو قرار واقعی سزا نہیں دلواتا، وہ چین سے نہیں بیٹھے گا!

☆☆☆

گوکہ جیک لینگ کی موت کے باعث کیوں کے خلاف جاری تحقیقات کو شدید دھچکا پہنچا تھا لیکن مستقل مزاج جے ایڈگر نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ یہ جگ لڑنے کے لیے تیار تھا اور اسے اپنے ساتھیوں پر پورا بھروسہ تھا۔

the untouchables میں شامل ایجنٹس نے کیوں کیس پر کام جاری رکھا۔ انہوں نے چند موثر کارروائیاں کی۔ اُس کے گوداموں پر چھاپے مار کر انہیں تباہ کر دیا گیا۔ اُس کی آدی گرفتار کیے گئے۔

طاقت کے نشے میں مست کیوں کو بہت بعد میں اندازہ ہوا کہ اُس کے گرد گھیرا جگ ہو رہا ہے۔ وراصل یہ پہلا موقع تھا، جب اس کا کھرے افسران سے پالا پڑا تھا

جو کچھ کے لیے تیار نہیں تھے۔ پھر ان کے پیچھے جے ایڈگر جیسا ضدی انسان کھڑا تھا جو تیزی سے اپنا رسوخ بوجھار ہا تھا۔ اُس کے ماتحت ایجنٹس کو ہر قسم کی آزادی حاصل تھی اور وہ شکاگو پولیس ڈیپارٹمنٹ کو کسی خاطر میں نہیں لاتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ بیش تر افسران کیوں کی جیب میں تھے۔

کیوں کی سرپرستی میں چلنے والے جوئے خانے، شراب کے اڈے، جسم فروشی کے ٹھکانے اب وفاقی ایجنٹس کے نشانے پر تھے۔ یومیہ بنیادوں پر کارروائی ہو رہی تھی۔ غیر قانونی شراب سمندری راستے امریکا پہنچ رہی تھی۔ اس راستے کو بند کرنے کے لیے جے ایڈگر نے

بندر گاہوں پر ایمان دار افسر تعینات کر دیے۔ نیوی بھی متحرک ہوئی۔ اس اقدام نے اسٹگنگ پر گہری ضرب لگائی۔ غیر قانونی شراب کی شکاگو آمد سکنے لگی۔ اس اقدام نے کیوں کو حواس باختہ کر دیا تھا۔

"the untouchables" کے اقدامات نے ملک گیر توجہ حاصل کی۔ اس کیس پر کام کرنے والوں میں ایک بہادر افسر ایجنٹ مائیک بھی شامل تھا جس نے کیوں کے خلاف ثبوت اکٹھے کرنے کے لیے بیٹھیں بدل کر لینٹن ہول میں ایک کمرہ پر بے لیا۔ گوکہ جان کا خطرہ تھا لیکن اس ایمان دار افسر نے کسی نہ کسی طرح اُن اہم ترین دستاویزات تک رسائی حاصل کی جنہوں نے یہ عیاں کر دیا کہ کیوں کے کاروبار میں بڑے پیمانے پر پھیلے ہوئے ہیں۔

پہلے کیوں کا بھائی رولف گرفتار ہوا۔ اُس کے دفتر اور گھر سے ملنے والی دستاویزات واضح اشارہ کرتی تھیں کہ اُس نے اپنی آٹھ ملین ڈالر کی آمدنی پر کوئی ٹیکس نہیں دیا۔ ٹھوس ثبوت اور مضبوط دلائل نے اُسے بے آسانی مجرم ثابت کر دیا۔ رولف کو تین برس کی سزا سنائی گئی۔ یہ کیوں کے لیے پہلا دھچکا تھا۔

ایجنٹس نے کیوں گینگ کے خزانچی جیک کسیری پر بھی ہاتھ ڈالا۔ اُسے مجرم ثابت کرنے میں قانون نافذ کرنے والے اداروں کو زیادہ تنگ و دو نہیں کرنی پڑی۔ عدالت نے اُسے پانچ برس کی سزا سنائی۔

کیوں اب واقعی مشکل میں پڑ گیا تھا۔ دھیرے دھیرے اس کی ریاست بکھرنے لگی تھی۔ اور پھر ایک روز باصلاحیت ایجنٹ ولسن اس شخص تک

بھی پہنچ گیا جو کیپون کے تمام کاروباری معاملات کا ریکارڈ رکھا کرتا تھا۔

اب کیپون پر ہاتھ ڈالنا آسان تھا۔ اُس پر ٹیکس کی عدم ادائیگی کے شدید الزامات تھے۔ عدلیہ مقدمہ سننے کو تیار تھی اور افسر اُسے ہر صورت سلاخوں کے پیچھے دیکھنا چاہتے تھے۔

کیپون کے دکھانے اسے بچانے کی سرتوڑ کوشش کی۔ چوری کو دھمکیاں دیں، عدلیہ کو خریدنے کی کوشش کی مگر لیکن انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔

27 اکتوبر 1931ء کا ایک اہم ترین دن تھا۔ سفاک، شاطر کیپون کو قصور وار قرار دیتے ہوئے گیارہ برس کی سزا سنائی دی۔ سزا سنائے جانے کے دوران اُس کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ وہ پہلے بھی جیل میں کچھ وقت گزار چکا تھا اور جانتا تھا کہ قید خانے کی چار دیواری کو کس طرح ایک شان دار اپارٹمنٹ کی شکل دی جاسکتی ہے۔

اُسے کوک کاؤنٹی جیل منتقل کیا گیا جہاں بیٹھ کر وہ بڑی سہولت سے اپنی حکومت چلاتا رہا، اب بھی شکاگو پر اُس کا عمل کنٹرول تھا۔ تاہم حالات میں جلد ڈرامائی تبدیلی آنے والی تھی حقیقتاً وہ اپنے زوال کے بے حد نزدیک تھا۔

اُس کے اثر کو توڑنے کے لیے کچھ ہی عرصے بعد حکام نے اُسے جورجیا کے مرکزی جیل منتقل کر دیا۔ اب صورتحال بدلنے لگی۔ وہ نسبتاً محدود ہو گیا تھا۔ گوکہ اُس نے ٹرانسپورٹیشن کے شہناز شوش، لالچ اور دھمکیوں کو برتنے کی کوشش کی، لیکن ناکامی اُس کا مقدر بنی۔ حالات اس وقت مزید بگڑ گئے جب 1934ء میں اُسے سان فرانسسکو کے ایک ایسے جیل خانے میں ڈال دیا گیا جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہاں سے کوئی فرار نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ ایک جزیرے پر واقع تھا۔

چالاک کیپون اُس ہیبت ناک جیل کو توڑنے میں ناکام رہا اور یوں بد معاشوں کا بادشاہ، ال کیپون کے نام سے معروف اُس بد معاش کا سیاہ دور اپنے اختتام کو پہنچ گیا۔

☆☆☆

درجنوں قتل کرنے والے اس درندے نے جیل میں خود کو دیگر قیدیوں سے الگ تھلگ رکھا۔ اس کے مٹی رویتے کی وجہ سے قیدی اُس سے متفرق ہو گئے اور وہ ایک ناپسندیدہ شخص تصور کیا جانے لگا۔

ماہنامہ سرگودشت

ایک بار قیدیوں نے اپنے حقوق کے لیے ہڑتال کی تو اُس نے اُن کا ساتھ دینے سے صاف انکار کر دیا جس پر ایک قیدی نے اُس کا گریبان پکڑ لیا۔ کیپون بھول گیا کہ وہ شکاگو میں نہیں بلکہ سان فرانسسکو کے ایک جیل خانے میں ہے۔ اُس نے جواباً اُس قیدی کے منہ پر پھنچر رسید کر دیا۔ پس پھر کیا تھا، دیگر قیدی اُس پر ٹوٹ پڑے۔ کچھ دیر بعد وہ ہسپر پر پڑا کر ہار ہا تھا۔

آنے والے برسوں میں بھی اُسے ساتھی قیدیوں کی جانب سے تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ اس مسلسل ذلت اور بے بسی کے باعث وہ اپنا ذہنی توازن کھوئے لگا۔ حالات کا بگاڑ اُس وقت اپنی انتہا پر پہنچ گیا جب ایک اُواس شام اُس پر قانع کا حملہ ہو گیا۔

بیماری کے دن اذیت ناک تھے۔ وہ جیل کے خستہ حال اسپتال میں پڑا سڑ رہا تھا۔ روزہ روز اُس کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔

طویل انتظار کے بعد 1939ء میں بالآخر علاج کی غرض سے اُسے سان فرانسسکو کی اس ہیبت ناک جیل سے نکال لایا۔

ڈاکٹروں نے چیک آپ کے بعد اعلان کر دیا کہ وہ ایک موذی مرض میں مبتلا ہے، جس کا سبب چمکی بے راہ روی ہے۔

ڈاکٹروں نے اُس کی بیوی کی بھی تشخیص کی، تاہم اُس میں اس مرض کے جراثیم نہیں پائے گئے جس سے یہ اندازہ لگایا گیا کہ دونوں کے درمیان برسوں سے جسمانی تعلق نہیں تھا۔

کیپون کو فلوریڈا کے مکان میں منتقل کر دیا گیا جہاں اُس کی بیوی، جسے شادی کے بعد ایک دن کی بھی خوشی نصیب نہیں ہوئی، سات برس اُس کی دیکر کچھ کرتی رہی۔

اُس کا ذہنی توازن اس حد تک بگڑ گیا تھا کہ بہتری کے تمام امکانات دم توڑ چکے تھے۔ بالآخر 25 جنوری 1947ء کو بیماری کے مسلسل حملوں کی تاب نہ لاتے ہوئے وہ 48 برس کی عمر میں انتقال کر گیا۔

کسی زمانے میں پورے شکاگو کو اپنی انگلیوں پر نہانے والے اُس سفاک شخص کی تدفین میں صرف چند افراد نے شرکت کی۔ یوں اس کی رنگین زندگی کا اختتام ایک المناک موت پر ہوا!

سپتمبر 2012

غالب

محمد ایا ز راہی

اردو ادب میں غزل کو ایک اہم مقام حاصل ہے اور غزل کی دنیا میں غالب کو۔ غالب پر بے شمار مضامین اور شرا حین لکھی گئی ہیں پھر بھی نئی تحریر کے لیے جگہ خالی رہتی ہے۔

فن غالب پر ایک مختصر تحریروں پر

ایک ترک زادے (امیر خسرو) سے شروع ہوئی اور ایک ترک زادے (غالب) پر آخر ختم ہوئی۔ محترم رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں کہ مغلیہ سلطنت نے ہندوستان کو تین تحفے بخشے، تاج محل، اردو اور غالب۔ اسد اللہ خاں غالب معروف بہ مرزا نوشہ بنیادی طور پر ان پانچ خواص سے ملو تھے۔ فطرت سکیم، بے پناہ قوت مقابلہ، زبردست فہم صالح، مزاح کی تکتکشی اور خود بینی۔ لہذا غالب کا ذہن رسالہ نارسا کو بھی فن کا بحر ابن رگیں عطا کرتا ہے، اس خوبصورتی سے کہ آج بھی دہائے علم و ادب سر دھنکی اور وجد کرتی نظر آتی ہے۔ غالب کا رنگ امیرانہ ہے، ان کا مشہور شعر ہے کہ کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب گالیاں کھاکے بد مزہ نہ ہو

اب غالب اگر عام رنگ کے اور دوسرے یا تیسرے درجے کے شاعر ہوتے تو شاید اس شعر کو اس رنگ میں اور یوں لیتے کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ اسد گالیاں کھاکے بد مزہ نہ ہو

اپنے مخصوص امیرانہ انداز کے حامل غالب ہی یہ بات کہہ سکتے تھے کہ۔ مجنوں کو برا کہتی ہے سلی مرے آگے۔ تقلید کی عام پامال راہوں سے دو گزر کر ناپرائی ایک الگ نئی راہ بنانا اس طور کہ دوسرے حیرت و استعجاب سے صرف نکلتے ہی رہ جائیں، اس ترک زادے کا طرہ امتیاز ہے، بقول فراق گورکھ پوری غالب پہلا شخص ہے جس نے رچی

فتون لطیف سے مراد وہ فتون یا ہنر ہیں جن میں اعلیٰ درجے کی ذہنی کشش پائی جائے یا وہ فن جس کا ناتا اس حسن سے ہے جو کسی تخلیق سے جھلک رہا ہو اور ذوق سلیم کے اصولوں پر پورا اترتا ہو۔ ارباب علم و فن نے فتون لطیف کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے، شاعری، موسیقی، مصوری، مجسمہ سازی اور فن تعمیر۔ ان میں سے پہلے دو کا تعلق تو حس سماعت سے ہے جبکہ باقی تین فتون کی بنیاد بصارت پر استوار ہے لیکن یہاں چشم بصارت کے ساتھ ساتھ چشم بصیرت بھی شرط ہے کہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ فتون لطیف ظاہری حواس (نہ دیکھنا، نہ سنا، نہ چھونا، نہ گھنٹنا) کے ہمراہ باطنی حواس (نہ حس مشترک، نہ حس و ادہ، نہ حس تصرف، نہ حس حافظہ، نہ خیال) کا بھی تقاضا کرتا ہے۔ ان میں خاص طور پر شاعری نہایت اعلیٰ، دقیق اور نازک ترین ہنر ہے جو پیشہ گری سے نکلتی زیادہ دشوار تر مرحلہ ہے۔ حواسِ مشترکہ کی سبکی کلیاں یہاں چلتی، کھلتی اور خوبصورت تصویر کشی کرتی ہیں۔ فتون لطیف کی اس دنیا میں غالب فن شاعری ہی کے بے مثل اور یکساں شہسوار ہیں۔ دو دمان سلاہ کا یہ سبق بوق ترک زادہ فطری طور پر درونِ تخلیق سے مالال مال تھا، چونکہ ہر تعلیم ادب کا یہ تاجور عقل سلیم اور دانش کامل کا استعارہ بنارہا اور اپنے کلام کی صورت میں بعد از مرگ بھی آج تک منارہ نور کی حیثیت رکھتا ہے اسی لیے عبدالرحمن بجنوری بے اختیار کہہ اٹھے تھے کہ ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، مقدس وید اور دیوان غالب۔ ایک دانشور کا کہنا ہے کہ ہند میں شاعری

قدیم ترین کھیلوں کا مقابلہ اس وقت برطانیہ میں جاری ہے۔ پوری دنیا کی نظریں ادھر ہی مرکوز ہیں۔ یہ میلہ کب اور کس طرح شروع ہوا، اہم نکات کیا ہیں، اس بارے میں ایک مختصر سا جائزہ۔



بازوق قارئین کے لیے ایک دلچسپ تحریر

اولمپک گیمز اور ونٹر گیمز پر مشتمل سب سے بڑا بین الاقوامی کھیلوں کا میلہ ہے جس میں ہزاروں کھلاڑی مختلف مقابلوں میں حصہ لیتے ہیں۔ اولمپک گیمز کو دنیا کا پہلا کھیلوں کا مقابلہ قرار دیا جاتا ہے جس میں 200 سے زائد ممالک شرکت کرتے ہیں۔ یہ گیمز ہر دو سال کے بعد گیمز اور ونٹر گیمز کے نام سے منعقد ہوتی ہیں۔ جبکہ یہ علاحدہ علاحدہ ہر چار سال بعد ہوتے ہیں۔ درحقیقت قدیم اولمپک گیمز یونان میں اولمپیا کے مقام پر 8 ویں صدی قبل از مسیح سے چوتھی صدی عیسوی

سے اردو شاعری ایک نئے موڑ پر مڑتی نظر آتی ہے یعنی خیال کی بلندی بھی، فکر کی جدت اور رعنائی بھی اور اسلوب کا نیا پن بھی۔ بیسویں صدی میں اعتراف غالب کے جو زاویے ابھرے ہیں، ان میں یاس یگانہ چنگیزی کو خاص اہمیت حاصل ہے جنہیں غالب شکر کہا گیا۔ انہوں نے اپنی انا کو غالب مرحوم کی انا کا مقابلہ سمجھ لیا اور پھر ششے کو ششے سے ٹکرانے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی، افسوس کہ غالب اسی وقت دنیا سے فانی سے کوچ کر چکے تھے لیکن اگر وہ زندہ ہوتے تو ایک معرکہ یگانہ وغالب میں ضرور پیا ہوتا۔ یاس یگانہ چنگیزی نے یہ ظاہر بطلان غالب کیا ہے لیکن دراصل یہ بھی اعتراف غالب کا ہی ایک زاویہ ہے جو غنی سے اثبات کا منظر پیش کرتا ہے اور پھر ان غالب کی غائب کشائی کرتا اور عظمت کا اقرار کرتا نظر آتا ہے۔ غالب جتنے بڑے شاعر ہیں، اتنے ہی بڑے نثر نگار بھی ہیں۔ اگر دیوان غالب نہ ہوتا اور صرف خطوط غالب ہی ہوتے تو بھی غالب، غالب ہی رہتے۔ انہوں نے نثر کو بھی وہ انوکھا رنگ عطا کیا کہ باید و شاید اسی لیے تو انہوں نے بیا بگ دال کہہ دیا تھا مابورقم بدیں مرتبہ راضی غالب شعر خود خواہش آں کرد کہ گرد و فن ما یعنی، میری شاعری خود ساختہ نہیں بلکہ ایک امر خداوار و خدا ساز ہے، میں نے خود شاعر بننے کا ارادہ نہیں کیا بلکہ شعر نے خود مجھے تاکہ اور اس نے میرا فن بننا چاہا، لا ریب کہ شعر ان کے فن کا حصہ نہ بھی بننا تو ان کی نثر ہی انہیں زندہ رکھنے کے لیے کافی تھی سو خطوط غالب کی تین بڑی خصوصیات ہیں۔ سادہ و بے تکلف انداز، طریق اظہار کے نئے اور مختلف راستے اور خطوط نوکیلی کو ادب بنادینا، ان خصوصیات نے غالب کو ہمیشہ کے لیے امر کر دیا ہے۔ غالب نے مکتوب نگاری میں بھی ایک نیا اسلوب اختیار کیا ہے کہ جو بھی اس کے رنگ میں خود کو رنگنا چاہتا ہے، اسے کی کھانی پڑتی ہے نتیجتاً وہ غالب کی عظمت کو حیرت سے صرف ہٹکتا رہ جاتا ہے۔ غالب کے کلام کی پہلی شرح غالب کی زندگی میں ہی درگا پرشاد نادر نے کی تھی، یہ شمار احمد فاروقی کی تحقیق ہے، انہوں نے اپنے مقالے میں جو پندرہ اشعار کا حوالہ دیا تھا۔ درگا پرشاد نادر کے بعد قمر الدین رالم، عبدالعلی والہ، حسرت موہانی سے لے کر مولانا غلام رسول مراد تک بہت سے شارحین غالب ہیں جنہوں نے اپنے اپنے انداز میں شرح غالب لکھی۔

اور سنواری ہوئی موسیقیت اردو شاعری میں پیدا کی لیکن پہنچاتی طور پر عامیت زدہ کانون کے سننے، سنانے یا سلی طور پر گانے بجانے کی چیز غالب کی موسیقیت نہیں ہے اسی طرح بقول مجھے اردو شاعری میں غالب پہلے اردو شاعر ہیں جنہوں نے طنز میں خدا کو مخاطب کیا۔ وزیر آغا کے الفاظ میں غالب کے ہاں شخصیت کی توانائی اور مردانہ پن نے احساس مزاح کو جنم دیا ہے اور وہ آنسوؤں میں بھی شکر انا نظر آتا ہے۔ غالب اگر سچے، کھرے جو ہری تھے تو جو ہر شناس بھی تھے۔ انہوں نے حالی کے اندر شاعری کے جوہر بھانپ لیے تھے سو حالی نے ایک غزل غالب کی خدمت میں اصلاح کے لیے پیش کی تو غالب نے کہا ”اگرچہ میں کسی کو فکر شعری صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمہاری نسبت میرا خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے“ فرمان فتح پوری کی تحقیق ہے کہ غالب کے اسلوب شاعرانہ میں جو چیز بہت نمایاں ہے، وہ ان کا سوالیہ یا استفہامیہ لب و لہجہ ہے، اس لب و لہجہ سے ان کی جدت طرازی، مشکل پسندی اور فلسفیانہ طرز فکر تینوں چیزوں کا سرانجام ملتا ہے ساتھ ہی یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کلمات استفہام کے استعمال سے جیسا فائدہ شاعری میں انہوں نے اٹھایا ہے، کسی دوسرے اردو شاعر نے نہیں اٹھایا۔ جہاں تک اسلاف کی خوش چینی کا تعلق ہے، غالب تقلید کرتے ہوئے بھی غالب ہی رہتا ہے نیز غالب اوروں سے استفادہ کرتے ہوئے بھی اپنے رنگ میں غالب ہی رہتا ہے۔ غالب کے سادہ اشعار میں بھی میریت نہیں بلکہ غالبیت ہے جو امر ہے۔ انور سدید رقم طراز ہیں کہ تقلید غالب کو ہمارے عہد تک ایک رجحان خاص کی حیثیت حاصل رہی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ غالب کا ایک مخصوص اسلوب ہے، جو لفظ بھی اس کی نکال سے نکلتا ہے، اس پر غالب کی ذاتی مہر لگی ہوتی ہے چنانچہ دلچسپ حقیقت یہ بھی ہے کہ غالب نے وسیع پیمانے پر اعلیٰ درجے کی ترکیب سازی کر کے مستقبل کے بہت سے شاعروں کا کام آسان کر دیا گو کہ اس کا اعتراف براہ انداز میں بھی نہیں کیا گیا۔ اس حقیقت کے اعتراف میں تاہل نہیں کیا جاسکتا کہ زبان و ادب میں ترقی اور نمو کا سلسلہ جاری رہتا ہے، یہ جادوئیں نمو پسند بلکہ نموسرشت ہے۔ غالب کی شاعری کی مثال ہمارے سامنے ہے، اس نے، دامان خیال یار، زرد پیشانی اور کاغذی پیرہن جیسی ترکیبیں ایجاد کیں اور انہیں قبول کر لیا گیا۔ غالب سے پہلے اس انداز میں کون شعر کہتا تھا کہ ”نقش فریادی ہے کسی کی شوقی تحریکا“ یہ وہ مقام ہے جہاں

تک منعقد ہوئے۔ یہ مقابلوں کا ایک سلسلہ تھا جو کہ قدیم یونان کے مختلف شہروں، ریاستوں اور بادشاہتوں کے نمائندوں کے درمیان منعقد ہوتے تھے۔ ان کھیلوں میں زیادہ تر ایتھلیٹکس کے مقابلے ہوتے تھے۔ تاہم کشتی اور تھریس (جنگی ریس) بھی منعقد ہوتی تھی۔ اولمپک گیمز کے دوران تمام جنگیں روک دی جاتی تھیں تاکہ کھلاڑی امن وامان سے ان کھیلوں میں حصہ لے سکیں۔

اولمپکس کا آغاز بہت سی کہانیوں اور اسراروں کے پردے میں چمپا ہوا ہے۔ مشہور ترین افسانوں میں سے ایک کے مطابق Heracles اور اس کا باپ Zeus ان گیمز کے بانی تھے۔

ایک کہانی کے مطابق یہ Heracles تھا جس نے گیمز کو اولمپک کا نام دیا اور چار سال کے بعد انقادی کی رسم کو اپنایا جبکہ دوسری کہانی یہ دیتی ہے کہ Heracles نے اپنی بارہویں مہم جونی میں کامیابی کے بعد Zeus کے اعزاز میں اولمپک اسٹیڈیم بنایا۔ اس سے قبل ہونے کے بعد وہ 200 قدم سیدھا چلا اور اس فاصلے کو اسٹیڈیم کا نام دیا جو کہ بعد میں فاصلے کی اکائی بنا۔ زیادہ تر یہ یقین کیا جاتا ہے کہ اولمپکس اسٹارٹ ہونے کا زمانہ 776 قبل مسیح ہے۔ اس تاریخ کی بنیاد اولمپیا سے ملنے والے کتبے ہیں۔

قدیم اولمپکس میں رنگ اپنیس پیچھا تھلون (جو کہ جہنگ اپونٹ، ڈسکس قمر، جوبلین قمر، فٹ ریس اور کشتی) پر مشتمل تھی۔ اس کے علاوہ بانگ، رسلنگ اور گھڑ سواری کے اپونٹ بھی شامل تھے۔

روایات کے مطابق الیس (Elis) شہر کا ایک باورچی کو روکس پہلا اولمپک چیمپئن تھا۔ تب یہ گیمز ہر چار سال کے بعد منعقد ہوتے تھے۔

پانچویں اور چھٹی صدی قبل مسیح میں اولمپکس اپنے عروج پہنچ گئے لیکن اس کے بعد یہ بتدریج زوال پذیر ہونے لگے۔ گویکروشن طاقت میں آ رہے تھے اور یونان پر ان کا اثر بڑھ رہا تھا۔

393 عیسوی میں شاہ جمیو ڈیسیس 1 نے تمام مذہبی رسومات کو ختم کرنے کا اعلان کیا تو اولمپک گیمز کا بھی اختتام ہو گیا۔ ایک اور روایت کے مطابق 426 عیسوی میں شاہ جمیو ڈیسیس 2 نے ان کو ختم کیا۔ اپنے اختتام کے بعد یہ ایتھنویں صدی تک دوبارہ منعقد نہیں ہوئے۔

پہلی نمایاں کوشش جو قدیم اولمپکس کے مقابلے پر کی گئی وہ فرانس میں ہونے والا سالانہ نیشنل اولمپک فیسٹول تھا جو کہ

1796ء سے 1798ء تک منعقد ہوا۔ اس فیسٹول میں قدیم یونانی اولمپکس کے بہت سے کھیل شامل کیے گئے۔ 1796ء کے گیمز میں پہلی دفعہ نظام کٹس بھی متعارف کروایا گیا۔ 1850ء میں ڈاکٹر وکیم پیٹی بروکس نے ایتھینز میں اولمپک کلاس کا آغاز کیا۔ 1859ء میں ڈاکٹر بروکس نے اس کا نام وین لاک اولمپک گیمز رکھ دیا اور یہ ہر سال منعقد ہونے لگے۔ ڈاکٹر بروکس نے 15 نومبر 1860ء کو وین لاک اولمپک سوسائٹی کی بنیاد رکھی۔

1862ء اور 1867ء کے دوران لیورپول میں سالانہ گریڈ اولمپک فیسٹول منعقد ہوا۔ جان ہوبی اور چارلس نیلی کی کوششوں سے منعقد ہونے والے یہ گیمز بین الاقوامی نوعیت کے تھے۔ اگرچہ اس میں صرف ایتھور کھلاڑی ہی حصہ لے سکے۔ پہلے ماڈرن اولمپکس 1896ء کا پروگرام لیورپول اولمپکس کا ہی عکس تھا۔ 1865ء میں ہوبی، ڈاکٹر بروکس اور ریڈیٹھن نے لیورپول میں نیشنل اولمپک ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی جو کہ برٹش اولمپک ایسوسی ایشن کی پیش رو ثابت ہوئی۔ اس نے ہی انٹرنیشنل اولمپکس چارٹر کا فریم ورک فراہم کیا۔ 1866ء میں لندن کے کرشیل پبلش میں پہلے نیشنل اولمپک گیمز منعقد ہوئے۔

1821ء میں یونانی سلطنت عثمانیہ سے جنگ آزادی کے ساتھ ہی اولمپکس کی بحالی کے لیے دلچسپی لینے لگے۔ اس کاسب سے پہلے خیال شاعر اور ایڈیٹر پیناکیوس ساؤکس نے 1833ء میں اپنی چھپنے والی نظم Dialogue of the Dead میں پیش کیا۔ Zappas جو کہ ایک دولت مند یونانی عوام دوست آدمی تھا نے 1856ء میں پہلی دفعہ شاہ یونان آڈو کو خط لکھا اور اولمپکس کی مستقل بحالی کے لیے فنڈ ریزی پیش کش کی۔ Zappas نے 1859ء میں پہلے اولمپکس کو اسپر کیا جو کہ ایتھینز میں اسکوار میں منعقد ہوئے۔ یونان اور سلطنت عثمانیہ کے کھلاڑیوں نے اس میں حصہ لیا۔ Panathenaic Stadium کی بحالی کے لیے فنڈز جاری کیے تاکہ یہ مستقبل کے تمام اولمپکس کی میزبانی کر سکے۔ اس اسٹیڈیم نے 1870ء اور 1875ء کے اولمپکس کی میزبانی کی۔ 30 ہزار تماشاہوں نے 1870ء کے اولمپکس کو دیکھا جبکہ 1875ء کے گیمز کے آفیشل حاضر کی ریکارڈز دستیاب نہیں ہیں۔

1890ء میں وین لاک اولمپکس میں شرکت نے جرمی ڈی کوبرٹن کو انٹرنیشنل اولمپک کمیٹی کی بنیاد رکھنے کے لیے

متحرک کیا۔ کوبرٹن نے Zappas اور بروکس کے کام اور آئیڈیاز کو سامنے رکھتے ہوئے ہر چار سال بعد اولمپک گیمز کروانے کو اپنا مطمح نظر بنایا۔ اس نے 1894ء میں فرانس میں ہونے والی پہلی آئی او سی کانگریس میں یہ منصوبہ پیش کیا۔ کانگریس کے آخری دن یہ فیصلہ کیا گیا کہ پہلے اولمپک گیمز آئی او سی کے زیر سرپرستی 1896ء میں ایتھینز میں منعقد ہوں گے۔ آئی او سی نے یونانی مصنف دیوٹری دی کی لاس کو اپنا پہلا صدر منتخب کیا۔

پہلے اولمپک گیمز 1896ء میں ایتھینز کے Panathenaic Stadium میں منعقد ہوئے۔ 14 ممالک کے 241 کھلاڑیوں نے 43 اپونٹ میں حصہ لیا۔ یونانی حکومت نے اس موقع پر یادگاری ٹکٹ جاری کیا۔ یونان کے لوگ اور عہدیداران اولمپکس کی میزبانی کے تجربے سے اتنے پرجوش تھے کہ انہوں نے ایتھینز کو مستقل طور پر اولمپک گیمز کا میزبان قرار دینے کا مطالبہ کر دیا لیکن IOC نے اس درخواست کو رد کر دیا۔ کئی سالوں میں یونان کے IOC نے ہر چار سال بعد دنیا کے مختلف شہروں میں ہوں گے۔ اگلے اولمپکس کے لیے پیرس کا انتخاب کیا گیا۔

1896ء کے گیمز کے بعد اولمپکس جمود کے دور میں داخل ہو گئے جس سے اس کے وجود کو خطرات لاحق ہو گئے۔

1900ء میں پیرس Exposition کے موقع پر سائیز شو کے طور پر اولمپکس ہوئے جس میں اسٹیڈیم بھی باقاعدہ طور پر موجود نہ تھا۔ ان اولمپکس میں پہلی دفعہ خواتین نے شرکت کی۔ 1904ء کے اولمپک گیمز کی میزبانی امریکی شہر شکاگو کو دی گئی لیکن ورلڈ فیئر تقریبات جو کہ سینٹ لوئیس میں ہونے کی وجہ سے اولمپکس کو بھی وہاں منتقل کر دیا گیا۔ یہ بھی ایک سائیز شو تھا۔ ان گیمز میں 650 کھلاڑیوں نے حصہ لیا جن میں 580 کا تعلق امریکا سے تھا۔ اس طرح کی تقریبات اور مقابلوں سے اولمپک تحریک کو دھچکا لگا۔ تاہم ایتھینز میں 1906ء میں دس سال مکمل ہونے پر دوبارہ اولمپکس ہوئے تو یہ گیمز دوبارہ اسی جوش اور جذبے سے بحال ہوئے۔ اگرچہ 1906ء کے گیمز کو آئی او سی نے باقاعدہ تسلیم نہیں کیا تھا اور نہ ہی دوبارہ اس طرح کے گیمز منعقد ہوئے۔

1924ء میں فرانس کے شہر کیوکس میں پہلے سرمائی گیمز منعقد ہوئے جن میں سردی اور برف کے وہ کھیل شامل تھے جو کہ گرمائی اولمپکس کے ساتھ کروانا ممکن نہیں تھا۔ گلد اسٹیک 1908ء اور 1920ء میں جبکہ آکس ہاکی

1924ء میں فرانس کے شہر کیوکس میں پہلے سرمائی گیمز منعقد ہوئے جن میں سردی اور برف کے وہ کھیل شامل تھے جو کہ گرمائی اولمپکس کے ساتھ کروانا ممکن نہیں تھا۔ گلد اسٹیک 1908ء اور 1920ء میں جبکہ آکس ہاکی

1920ء کے گرمائی اولمپکس میں شامل تھے جبکہ آئی او سی خواہش کرتی تھی کہ دوسرے مزید گیمز شامل کر کے اس لسٹ کو بڑھا دیا جائے۔ 1921ء کی لوزان (سوئٹزرلینڈ) میں ہونے والی اولمپک کانگریس میں فیصلہ کیا گیا کہ وینز اولمپکس علیحدہ سے گرمائی اولمپکس کے سال میں ہی منعقد ہوں گے۔ یہ سلسلہ 1992ء تک جاری رہا مگر یہ فیصلہ کیا گیا کہ 2 گرمائی اولمپکس کے درمیان سرمائی اولمپکس ہوں گے۔ 1994ء سے یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔

1948ء میں سرکٹ مین نے دوسری جنگ عظیم کے زخمی سپاہیوں کی بحالی کے لیے مختلف اسپتالوں کے درمیان کٹی اسپورٹس ایونٹ کا انعقاد کیا جو کہ لندن اولمپکس کے ساتھ ہی منعقد ہوئے۔ گٹ مین ایونٹ جو اس وقت Stoke Mandeville Game کہلاتا تھا۔ سالانہ اسپورٹس فیسٹول بن گیا۔ اگلے 12 سال گٹ مین اور دوسروں نے اپنی کوششوں کو ختم بھرنے کا ذریعہ بنائے رکھا۔ 1960ء کے روم اولمپکس میں گٹ مین اپنے ساتھ 400 کھلاڑی لایا جو کہ اولمپکس کے متوازی ایونٹ میں شریک ہوئے۔ ان گیمز کو پہلا جیرالڈ گیمز قرار دیا جاتا ہے۔ تب سے جیرالڈ گیمز ہر اولمپک کے سال میں منعقد ہوتے ہیں۔ 1988ء کے سیول اولمپکس سے ہر میزبان شہر جیرالڈ گیمز کا بھی میزبان ہوتا ہے۔

2001ء میں IOC اور انٹرنیشنل جیرالڈ گیمز کمیٹی نے ایک معاہدے پر دستخط کیے جس کی رو سے یہ گارنٹی دی گئی کہ میزبان شہر اولمپکس اور جیرالڈ گیمز دونوں کا انتظام کرے گا۔ یہ معاہدہ 2008ء کے بیجنگ اولمپکس اور 2010ء کے وینکو ورساوتز اولمپکس سے قابل عمل ہے۔

14 سے 18 سال تک کے کھلاڑیوں کو مقابلے کا موقع دینے کے لیے 2010ء سے پوتھ گیمز کا انعقاد ہوا۔ اس کا آئیڈیاز آئی او سی کے صدر جنکس روگ نے 2001ء میں آئی او سی کے 119 ویں کانگریس کے موقع پر پیش کیا تھا۔ پہلے سر پوتھ گیمز 2010ء میں سنگاپور میں منعقد ہوئے جبکہ وینز گیمز 2012ء میں آسٹریا کے شہر رالس برک میں ہوں گے۔ سر گیمز 12 دن جبکہ وینز گیمز 9 دن منعقد کیے جاتے ہیں۔ آئی او سی نے سر اولمپکس کے لیے 3500 کھلاڑیوں اور 875 آفیشلوں جبکہ وینز گیمز کے لیے 970 کھلاڑیوں اور 580 آفیشلوں کی جازت دی ہے۔ تاہم ان گیمز میں اپونٹس کی تعداد کم رکھی جاتی ہے۔

1896ء میں ہونے پہلے اولمپک گیمز میں 14 ممالک

- 1- یونان..... اولمپس کی جائے پیدائش۔
- 2- موجودہ میزبان ملک۔
- 3- اگلے گیمز کا میزبان ملک

اس موقع پر اولمپک آرگنائزنگ کمیٹی کے صدر اور IOC کے صدر اپنی اختتامی تقریر کرتے ہیں اور اولمپکس کے اختتام کا اعلان کیا جاتا ہے نیز اولمپکس مشعل بجا دی جاتی ہے۔ موجودہ میزبان شہر کا میزبان اولمپکس برچ IOC کے صدر دیتا ہے اور وہ اس کو اگلے میزبان شہر کے میز کو پیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد اگلے میزبان ملک کے فنکار اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

اولمپک گیمز کے دوران پہلے 3 نمبر پر آنے والے کھلاڑیوں کو گولڈ، سلور اور برنز میڈل پیش کیے جاتے ہیں۔ اس موقع پر اولمپکس کمیٹی کا ممبر یہ میڈل پیش کرتا ہے۔ تینوں میڈلسٹ کے قومی پرچم لہرائے جاتے ہیں اور گولڈ میڈل جیتنے

WELCOME BOOK SHOP
SOLE DISTRIBUTOR of U. A. E
 JASOOSI SUSPENSE PAKEEZA SARGUZASHT
 O.Box 27869 Karama, Dubai Tel: 04-3861016
 Fax: 04-3861015 Mobile: 050-6245817
 E-mail: welbooks@emirates.net.ae

Best Export From Pakistan
WELCOME BOOK PORT
 Publisher, Exporter, Distributor
 All kinds of Magazines, General Books and Educational Books

Main Urdu Bazar, Karachi Pakistan
 (92-21) 32633151, 32639581 Fax: (92-21) 32638086
 Email: welbooks@hotmail.com
 Website: www.welbooks.com

براعظموں کو ظاہر کرتے ہیں۔ امریکا، افریقہ، ایشیا، آسٹریلیا، یورپ۔ ماضی میں یہ تمام براعظم اکٹھے تھے پھر علاحدہ ہو کر ایک دوسرے سے دور چلے گئے۔ اولمپک دائروں کے رنگ 5 ہیں۔ نیلا، سیاہ، پیلا، سرخ اور بنہ۔ ان کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کے ہر ملک کے پرچم میں ان میں سے ایک رنگ موجود ہے۔ اس پرچم کو 1914ء میں اپنایا گیا تھا لیکن پہلی بار 1920ء کے انٹورپ (بیلجیئم) اولمپکس کے موقع پر لہرایا گیا۔

اولمپک مٹو لاٹینی زبان کے الفاظ ہیں
Citius, Altius, Fortius, Faster, Higher, Stronger

اولمپک مشعل اولمپکس کے آغاز سے کئی مہینے پہلے یونان میں اولمپیا کے مقام پر سورج کی شعاعوں سے روشنی کی جاتی ہے اور پھر یہ برزاور میل کا فاصلہ طے کر کے اولمپکس اسٹیڈیم پہنچتی ہے۔ 1928ء سے مشعل اولمپکس سبیل ہے۔ 1936ء میں پہلی دفعہ اولمپکس مشعل ریلی نکالی گئی۔ ہر اولمپکس کے لیے ایک مسکوٹ بھی ہوتا ہے جو میزبان ملک کی کوئی اہم شخصیت یا جانور ہوتا ہے جو میزبان کی نمائندگی کرتا ہے۔

اختتامی تقریب اولمپک گیمز کا ایک لازمی حصہ ہے۔ 1920ء کے انٹورپ گیمز سے باقاعدگی سے اختتامی تقریب کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ تقریب کے آغاز میں میزبان ملک کے گلوکار اور فنکار اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں اور اس دوران اسے ملک کی ثقافت کو بہترین انداز سے پیش کرتے ہیں۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ تقریب اتنی بہترین ہو کہ تمام دنیا اس کو مدحوں کا در کھے۔

آج کل اس تقریب کو بہت بڑے پیمانے پر منعقد کیا جاتا ہے۔ اس پر کافی اخراجات بھی آتے ہیں۔ بیجنگ اولمپکس کی اختتامی تقریب پر 100 ملین ڈالرز کے اخراجات آئے جو کہ کسی بھی ثقافتی سیمینٹ پر آنے والی سب سے بڑی لاگت ہے۔

اولمپک گیمز کی اختتامی تقریب بھی ایک بہت اہم ایونٹ ہوتا ہے۔ تمام گیمز کے اختتام پر ہر ملک کا ایک ایجنٹ اپنا جھنڈا اٹھائے کراؤنڈ میں داخل ہوتا ہے اور باقی تمام ایجنٹیں بکسیر کی تقریب کے اکٹھے اسٹیڈیم میں آتے ہیں۔ اس موقع پر تین ملکوں کے پرچم لہرائے جاتے ہیں اور قومی ترانہ بجا جاتا ہے۔

کیا۔
 بیسویں صدی کے پہلے ہاف میں IOC کا بہت چھوٹا بجٹ ہوتا تھا۔ جیسا کہ ایوری برٹنچ (1952-1972) نے اولمپکس کو کمرشل مفادات سے لنک کرنے کی ہر کوشش کو مسترد کر دیا۔ ان کا یقین تھا کہ کمرشل اداروں کی لابی IOC کے فیصلہ سازی پر غیر ضروری طور پر اثر انداز ہوگی۔ جب وہ ریٹائر ہوئے تو IOC کے اثاثہ جات صرف 2 ملین امریکی ڈالرز تھے۔ صرف آٹھ سال بعد یہ اثاثہ 45 ملین ڈالرز تک پہنچ گئے۔ یہ سب ابتدائی طور پر کارپوریٹ اسپانسر شپ ادارتی وی حقوق کی فروخت سے ہوا۔

1980ء میں جب ساراچ صدر بنے تو ان کی خواہش تھی کہ یہ مالی طور پر ایک خود مختار ادارہ بنے۔ 1984ء کے لاس اینجلس اولمپکس اولمپک کی تاریخ میں ہوا کا جھوٹا ثابت ہوئے جب لاس اینجلس آرگنائزنگ کمیٹی نے 225 ملین ڈالرز کا منافع کمایا۔ یہ سب کمپنیوں کو اسپانسر شپ حقوق بیچنے کی وجہ سے ہوا۔

ساراچ نے اولمپک براڈر بنانے کے لیے 1985ء میں دی اولمپک پروگرام (Top) بنایا۔ Top کی ممبر شپ بہت جلد چھٹی۔ 4 سال کے لیے ممبر شپ کی فیس 50 ملین ڈالر تھی۔ Top ممبرز کو بین الاقوامی طور پر اپنی پروڈکٹ اولمپک براڈ کے طور پر تشہیر کرنے کے لیے حقوق مل جاتے تھے اور وہ اولمپک سبیل ٹیفنی 5 دائرے اپنے اشتہارات میں استعمال کر سکتے تھے۔

اولمپک گیمز کو سب سے پہلے 1936ء کے برلن اولمپکس میں ٹی وی پر دکھایا گیا۔ اگرچہ یہ صرف مقامی مشاہدین کے لیے ہی تھا۔

1956ء کے دیو اولمپکس کو سب سے پہلے بین الاقوامی طور پر ٹیلی کاسٹ کیا گیا۔ ونٹر گیمز کے حقوق پہلی دفعہ فروخت کیے گئے۔ CBS نے امریکی مشاہدین کے لیے 394000 ڈالر جبکہ یورپین براڈ کاسٹنگ یونین نے 660000 ڈالر ادا کیے۔ آنے والی دہائیوں میں گولڈ دار کی وجہ سے سپر پاور کے درمیان اولمپکس کے حوالے سے کافی مقابلہ کار۔ تاجان دیکھنے میں آیا۔ جس کا IOC نے پھر پورا فائدہ اٹھایا۔

1998ء کے ناگانو ونٹر گیمز کے حقوق CBS کو 375 ملین ڈالرز میں فروخت کیے گئے جبکہ NBC نے 2000 سے 2012 تک کے تمام اولمپکس کے حقوق 3.5 ارب ڈالرز میں حاصل کیے۔ اولمپکس گیمز کے پرچم پر پانچ دائرے ہیں جو کہ پانچ

کے 241 کھلاڑیوں نے حصہ لیا تھا جبکہ اب یہ تعداد بڑھ چکی ہے۔ 2008ء کے بیجنگ اولمپکس میں 204 ممالک کے 10500 کھلاڑیوں نے حصہ لیا تھا۔ سرائی اولمپکس کا اسکیل بھی بڑھا ہے۔ 2006ء میں ٹورن میں 80 ممالک کے 2508 کھلاڑیوں نے 84 اپنوس میں حصہ لیا تھا۔ گیمز کے دوران کھلاڑی اور آفیشلوں اولمپک ویج میں رہائش اختیار کرتے ہیں۔ اولمپک ویج میں کیفے ٹیریا، مراکز صحت اور عبادت گاہیں بھی ہوتی ہیں۔

اولمپک تحریک میں وہ تمام نیشنل اور انٹرنیشنل اسپورٹس آرگنائزنگز اور فیڈریشنز، میڈیا، کھلاڑی، آفیشلوں، ججز، شخصیات اور ادارے شامل ہیں جو اولمپک چارٹر کو تسلیم کرتے ہیں اور اس کے قوانین پر عمل کرتے ہیں جبکہ ان تمام کے اوپر موجود آئی اوی میزبان شہر کا انتخاب کرنے اولمپک گیمز کی پلاننگ پر نظر رکھنے، اسپورٹس پروگرامز کی منظوری دینے اور اسپانسرز اور میڈیا براڈ کاسٹر حقوق کے بارے میں مذاکرات کرنے کی ذمہ داری ہے۔ اولمپک تحریک تین بڑے عناصر پر مشتمل ہے۔

1- بین الاقوامی فیڈریشنز: یہ انٹرنیشنل لیول پر کھیل منعقد اور سپر دائرہ کرانے کی ذمہ دار ہیں۔ جیسے فیفا، فٹبال کی گورننگ باڈی ہے اور IBA بانگک کو کنٹرول کرتی ہے۔ 35 انٹرنیشنل فیڈریشنز اولمپک تحریک کا حصہ ہیں۔

2- نیشنل اولمپک کمیٹی: یہ ہر ملک کے اندر اولمپک تحریک کی نمائندہ ہوتی ہے اور ملک کے اندر اولمپک کھیلوں کا انعقاد کرتی ہے مثلاً USOC امریکا کی نیشنل اولمپک کمیٹی ہے۔ آئی اوی کی تسلیم کردہ NOC کی تعداد 205 ہے۔

3- آرگنائزنگ کمیٹی فاروی اولمپک گیمز: یہ کسی بھی میزبان ملک میں بنائی جاتی ہے تاکہ گیمز کا انعقاد ہو سکے اور جب یہ گیمز کے بعد اپنی فائنل رپورٹ آئی اوی کو پیش کر دے تو یہ ختم ہو جاتی ہے۔

انگریزی اور فرانسیسی اولمپک تحریک کی آفیشل زبانیں ہیں جبکہ اولمپکس کے دوران میزبان ملک کی زبان بھی بولی جاتی ہے۔ اختتامی تقریب میں پریڈ کے دوران یہ تینوں زبانیں اتار و سمٹ کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔

IOC نے آغاز سے ہی تجارتی اسپانسرز سے فنڈز لینے کی مخالفت کی اور یہ سلسلہ 1972ء تک جاری رہا پھر IOC نے ٹی وی اور اشتہاری مارکیٹ سے فنڈز لینا شروع کیے۔ ساراچ کے دور میں گیمز انٹرنیشنل اسپانسرز کی طرف شفٹ ہوئے جنہوں نے اپنی پراڈکشن کو اولمپک براڈ کے طور پر پیش

والے ملک کا قومی ترانہ بجا جاتا ہے۔ ماضی میں قدیم اولمپکس کے موقع پر جیتنے والوں کو زیتون کی شاخوں کا تاج پہنایا جاتا تھا۔ انیسویں اولمپکس 2004ء کے موقع پر بھی یہ روایت دہرائی گئی۔

اولمپک گیمز پروگرام میں 41 کھیلوں کے تقریباً 400 ایونٹس شامل ہیں۔ گرمائی اولمپکس میں 26 اور سرمائی اولمپکس میں 15 کھیل شامل ہیں۔ اسٹیکس، سوئٹنگ، کوار بازی اور آرٹسک جمناسٹک ہر اولمپک گیمز میں شامل رہے ہیں۔ کراس کنٹری اسکیٹنگ، فگر اسکیٹنگ، آئس ہاکی، ہکی، جیمنگ اور اسپڈ اسکیٹنگ 1924ء سے ہونے والے ہر اولمپکس کا حصہ رہے ہیں۔ کچھ گیمز شروع میں اولمپکس میں شامل تھے جنہیں بعد میں نکال دیا گیا۔

صرف آسٹریلیا، برطانیہ، سوئٹزر لینڈ ایسے ممالک ہیں جنہوں نے 1896ء سے آج تک ہر اولمپک گیمز میں شرکت کی ہے۔

سب سے پہلا بائیکاٹ 1936ء کے برلن گیمز کے موقع پر اولمپک کونسل اور آئر لینڈ نے کیا تھا۔ ہوابوں تھا کہ IOC نے اس کی میز کو صرف آئرش فری اسٹیٹ تک محدود کرنے کے لیے کہا تھا جبکہ کونسل تمام جزیرہ آئر لینڈ کی نمائندگی کرنا چاہتی تھی۔ 1956ء کے میلبورن اولمپکس میں ہالینڈ، آئین اور سوئٹزر لینڈ نے سوویت یونین کے ہنگری پر حملے کی وجہ سے بائیکاٹ کیا تھا لیکن گھڑ سواری کا ایونٹ جو کہ اسٹاک ہوم (سوئیڈن) میں ہوا اس میں اپنے دستے کو بھیجا جبکہ کیمبوڈیا، مصر، عراق، لبنان نے فہر سوین کے بحران کی وجہ سے ان گیمز کا بائیکاٹ کیا تھا۔ تائیوان کو ان گیمز میں حصہ لینے کی اجازت دینے کی وجہ سے چین نے بھی بائیکاٹ کیا تھا۔

1972ء اور 1976ء میں بہت سے افریقی ممالک نے IOC کے بائیکاٹ کی دھمکی دی کیونکہ وہ جنوبی افریقا کی نسل پرستانہ پالیسی کی وجہ سے اس پر پابندی لگانا چاہتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ نیوزی لینڈ بھی ان کے ٹارگٹ پر تھا کیونکہ اس کی دکنی ٹیم نے جنوبی افریقا کا دورہ کیا تھا۔ IOC نے جنوبی افریقا پر پابندی لگا دی لیکن نیوزی لینڈ پر پابندی لگانے سے انکار کر دیا کیونکہ رسمی اولمپکس میں شامل نہیں تھی۔ دھمکی پر عمل کرنے کے لیے متنازعہ کی قیادت میں مکیان اور عراق کے ساتھ 20 افریقی ممالک نے مونٹریال گیمز 1976ء کا بائیکاٹ کیا۔ تائیوان نے بھی ان گیمز کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا کیونکہ چین نے مونٹریال آرگنائزنگ کمیٹی پر باؤڈالاکوہ فرقہ چین کے نام شامل ہونے والے وفد کو رکھے۔ تائیوان

نے اس تجویز کو رد کر دیا جس میں ان کو ریپبلک آف چائنا، جھنڈا اور ترانہ استعمال کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ تائیوان نے 1984ء تک گیمز میں شرکت نہیں کی تھی پھر یہ چائینیز تائی پے اور خصوصی جھنڈے اور ترانے کے ساتھ شریک ہوئے۔

1980ء اور 1984ء میں سرد جنگ کے حریفوں نے ایک دوسرے کے گیمز کا بائیکاٹ کیا۔ افغانستان پر روس کے حملے کی وجہ سے 1980ء کے ماسکو اولمپکس میں 65 ممالک نے بائیکاٹ کیا۔ 1984ء کے لاس اینجلس اولمپکس میں روڈانیہ کے علاوہ روس اور اس کے 14 مشرقی حریفوں نے بائیکاٹ کیا۔

مشرقی بلاک کے ان ممالک نے جولائی اور اگست میں اولمپکس کے متبادل کے طور پر علیحدہ فرینڈ شپ گیمز منعقد کیے۔ مسلمان ممالک میں ایران واحد ملک ہے جس نے یہ قدم اٹھایا ہے کہ اس کا کوئی بھی کھلاڑی اسرائیلی کھلاڑی کا مقابلہ نہیں کرے گا۔ 2004ء کے اولمپکس میں ایرانی جواد پلیر، آرش مائرس مائیلی نے بھی اسرائیلی کھلاڑی کے ساتھ کھیلنے سے انکار کر دیا۔ اس پر ایرانی حکومت نے اس آرش کو 125000 یو ایس ڈالر زانعام دیا۔

بیسویں صدی کے اوائل میں کھلاڑیوں نے پرفارمنس بڑھانے کے لیے مختلف ادویات کا سہارا لینا شروع کر دیا مثلاً 1904ء کے اولمپکس میں میراٹھن رز تھا جس میں کوس کے کوچ نے Strychnine اور براڈری دی تھی۔ اب تک ممنوعہ ادویات کی وجہ سے ایک موت بھی ہو چکی ہے۔ 1960ء میں روم اولمپکس میں سائیکل روڈ ریس کے دوران ڈینیٹس سائیکسٹ کٹو ڈینی مارک جنکسن سائیکل سے گر گیا اور بعد میں فوت ہو گیا۔

1960ء کی دہائی کے وسط میں کھیلوں کی فیڈریشنز نے ادویات کے استعمال پر پابندی لگا دی۔

1968ء کے میکسیکو اولمپکس سویڈن کے چیف ٹھکانوں پلیئر پیٹنس گٹر پہلا کھلاڑی تھا جس کا ڈرگ ٹیسٹ مثبت آیا اس نے الکوئل استعمال کی تھی۔ اس سے کئی کا متخافا ہیں نے لیا گیا۔ سب سے مشہور کس بین جانسن کا تھا۔ کیڈا کے استعفیٰ کو 1988ء کے اسٹیون اولمپکس میں ڈرگ ٹیسٹ مثبت آنے پر 100 میٹر ریس کا جیتا ہوا گولڈ میڈل واپس کرنا پڑا جو کہ امریکا کے کارل لوئیس کو دے دیا گیا۔ 1999ء میں IOC نے World Anti-Doping Agency (WADA) بنائی جس نے اپنے طے شدہ

طریقہ کار کے مطابق کام کرنا شروع کر دیا۔ اس وجہ سے اب ممنوعہ ادویات کا استعمال کافی کم ہوا ہے۔ بیجنگ اولمپکس میں 3667 کھلاڑیوں کے ٹیسٹ لیے گئے اور صرف تین کے مثبت نکلے۔

خواتین نے 1900ء سے اولمپکس سے گیمز میں حصہ لینا شروع کیا۔

اب تک 3 اولمپکس منعقد نہیں ہوئے۔ 1916ء کے اولمپکس پہلی جنگ عظیم کی وجہ سے منعقد نہ ہو سکے ان کی میزبانی برلن کے پاس تھی۔ 1940ء اور 1944ء کے اولمپکس دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے منعقد نہ ہو سکے۔ 1940ء کا میزبان ٹوکیو اور 1944ء کا لندن تھا۔

1972ء کے میونخ اولمپکس کے موقع پر فلسطینی مجاہدین کے ایک گروپ نے 11 اسرائیلی کھلاڑیوں کو اغوا کر لیا تھا جن میں 2 کھلاڑیوں کو فوری طور پر ہلاک کر دیا گیا تھا۔ باقی 9 کھلاڑی انرپورٹ پر جرمنی کی طرف سے ہونے والے کمائڈو ایٹشن کے دوران فلسطینیوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ اس کارروائی میں 5 فلسطینی شہید اور ایک جرمن پولیس افسر مارا گیا تھا۔

1996ء کے اٹلانٹا اولمپکس کے موقع پر ایک مقامی امریکی دہشت گرد نے بم دھماکا کیا جو کہ اولمپک پارک میں ہوا جس میں 2 افراد ہلاک اور 111 زخمی ہوئے۔

اولمپک گیمز کی میزبانی کا فیصلہ 7 سال پہلے کیا جاتا ہے۔ اس سے دو سال پہلے سلیکشن مکمل شروع کر دیا جاتا ہے۔ ایک سال بعد امیدواروں کو شارتس لٹ کر دیا جاتا ہے اور پھر فائنل بولی میں ممبران ووٹنگ کے ذریعے میزبان کا فیصلہ کرتے ہیں۔

2016ء تک 23 ممالک کے 44 شہر اولمپکس کی میزبانی کر چکے ہوں گے۔ شمالی امریکا اور یورپ سے باہر یہ صرف 8 دفعہ منعقد ہوئے ہیں جبکہ 1988ء کے سیول اولمپکس سے یہ 4 دفعہ ایشیا اور اوشینیا میں منعقد ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے 92 سال میں یہ 4 دفعہ منعقد ہوئے تھے۔ 2016ء میں برازیل کے شہر ریو ڈی جینیرو میں ہونے والے اولمپکس برائےظم جنوبی امریکا کے پہلے گیمز ہوں گے۔ اب تک افریقا میں اولمپکس منعقد نہیں ہوئے۔

امریکا نے سب سے زیادہ اولمپکس کی میزبانی کی۔ 4-4 بالعموم اور دو اولمپکس کی میزبانی کی ہے۔

سمر اولمپکس میں انگلینڈ نے دو دفعہ میزبانی کی ہے جبکہ 2012ء کے اولمپکس کے بعد یہ 3 دفعہ میزبانی کرنے والا

ملک بن جائے 2-2 سمر اولمپکس کی میزبانی کرنے والے ممالک جرمنی اور آسٹریلیا، فرانس اور یونان ہیں جبکہ 2-2 بار میزبانی کرنے والے شہر لاس اینجلس، جیورس اور ایڈنبرا ہیں جبکہ لندن اس سال تیسری دفعہ میزبانی کر چکا جو کہ سب سے زیادہ ہے۔

وٹر اولمپکس میں فرانس نے 3 دفعہ میزبانی کی ہے جبکہ سوئٹزر لینڈ، آسٹریا، ناروے، جاپان اور اٹلی نے 2-2 بار میزبان بننے کا شرف حاصل کیا ہے۔

1908ء کے لندن اولمپکس میں 10 جولائی سے میونخ ملٹری رائفل شوٹنگ کے مقابلے شروع ہوئے۔ ان مقابلوں میں 9 ٹیمیں شریک تھیں لیکن روسی ٹیم لندن میں نہیں تھی۔ فلسطینی حیران و پریشان تھے۔ ان دنوں موبائل یا ٹیلی فون نہیں تھے اس لیے صورت حال کا پتا نہ چل سکا۔ دراصل اس زمانے میں روس سمیت بعض یورپی ممالک میں جولین کیلنڈر استعمال کیا جاتا تھا جبکہ بیشتر ممالک چارمین کیلنڈر اپنانا چکے تھے۔ ان دونوں کیلنڈر میں 13 دن کا فرق تھا۔ اس لیے روسی ٹیم بھی بھٹکتے رہے کہ شوٹنگ مقابلے 2-3 جولائی کو ہوں گے، جب وہ لندن پہنچے تو یہ جان کر حیران رہ گئے کہ مقابلے ستم ہو گئے ہیں۔ انہیں یقین تھا کہ وہ جیت جائیں گے مگر ایک چھوٹی سی حسابی غلطی نے ان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔

ٹائٹلسٹ ہر دور میں ہوتی رہی ہے۔ 1908ء کے لندن گیمز کے دوران 27 اکتوبر کو ٹل ویٹ بانسٹ کلاس کا فائنل منعقد ہوا۔ مقابلہ آسٹریلیائی باکسر ریڈیڈ بیکر اور برطانوی باکسر جونی ڈکلس کے درمیان تھا۔ مقابلے کے دوران بیکر کا پلڑا بھاری رہا لیکن اختتام پر جب ریفری نے ڈکلس کو فائنل قرار دیا تو وہ ہکا بکا رہ گیا۔ اس ٹھکی دھاندلی پر بیکر نے احتجاج کیا لیکن اس کی شنوائی نہ ہوئی۔ تب تک بیکر کو ٹم تھا کہ ریفری جونی ڈکلس کا باپ ہے اچھ ڈکلس تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اچھ ڈکلس نے ہی بحیثیت صدر ایجنور بانسٹگ ایسوسی ایشن انگلینڈ نے بیٹے کی گردن میں طلائی تمغا ڈالا۔ ایک اور مزے کی بات یہ کہ بعد میں جونی ڈکلس بیکر سے ایک اور مقابلے کے لیے مان گیا۔ یہ مقابلہ لندن بانسٹگ کلب میں ہوا۔ پہلے ہی راولڈ میں بیکر نے یہ مقابلہ کو تک آؤٹ کر دیا۔

1920ء کے انٹورپ (بیلجیم) گیمز میں سویڈن کے 72 سالہ آسکر سوان نے 100 میٹر تک ڈیوٹر ڈبل شاٹ میں ٹیم ایونٹ جیتا۔ وہ تاریخ کے سب سے معمر اولمپک چیمپیئن ہیں۔





سراب

راوی : شہباز ملک

تحریر: کاشف زبیر

قسط: 65

وہ پیدائشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف بوش جونیان اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکار سی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحرے میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب..... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن و دل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر اسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سراپوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

بابا کا اصرار تھا کہ مجھے کیڈٹ کالج بھیجا جائے جبکہ میں آدمی جانتا نہیں جانتا تھا۔ اس دور میں میرے لیے واحد اچھی یاد دہا رہی ہے میرے دل کا حصہ تھی لیکن وہ میرے بھائی کا مقدر بنادی گئی اور میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ یہاں سے زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ سفیر، مونا اور ندیم جیسے دوست ملے لیکن ایک روز میری سے واپس آتے ہوئے ناورد علی کا ہم سے ٹکراؤ ہو گیا پھر مجھ پر اور در بدری کا ایک سلسلہ شروع ہوا جو دروازہ ہوتا گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شاہیے لوگ میرے ذہن ہو رہے تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور ویم جیسے جہاں ٹار دوست بھی تھے۔ اس کے بعد ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئی تھیں۔ میں دوبارہ وطن لوٹا تو فتح خان سے ٹکراؤ ہو گیا۔ اس کے آدمیوں کو شکست دے کر میں اندرون ملک آ گیا۔ میں زرین کو لے کر میرے کے لے نکلا تھا کہ دشمنوں نے گھیر لیا۔ ان سے بچتے بچاتے نکلے تو راستہ ٹھیک کر ایک ایسے علاقے میں پہنچ گئے جو میری کی طرف جاتا تھا۔ ایک ڈاکٹر نے آبادی تک پہنچانے کا وعدہ کر لیا۔ جب اس کے بچنے پر پہنچے تو احساس ہوا کہ ہم قید ہو چکے ہیں۔ زرین کی طبیعت بھی خراب ہو گئی تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ ڈاکٹر نے ہم پر ایک خطرناک دوائس کا تجربہ کیا ہے۔ زرین جانبر نہ ہو سکی۔ ڈیوڈ شاہ آ گیا۔ وہ ڈاکٹر کا قاتل تھا۔ اس نے مجھے باہر کر لیا اور کہا کہ اگر تم مجھے برسرِ اراوادی تک پہنچاؤ تو میں مرشد سے بھی کوغلا خیس کرادوں گا۔ اس کے بعد شائے نے مجھے اپنے ایک آدمی مارشل کے ساتھ کر دیا کہ وہ مجھے شہر چھوڑ آئے مگر راستے میں ہی اس کی نیت بدل گئی۔ وہ دروازہ کھول کر بچے کو دلہا۔ وہ بہتول سے فائر کرتا کہ ایک کتے نے مارشل کے بہتول والے ہاتھ پر منہ مارا تھا۔ وہ کتا مونا کا تھا۔ سفیر وغیرہ اس کی مدد سے مجھ تک پہنچے تھے۔ ان کے ساتھ میں شہر آ گیا۔ ہم اس جنگلے میں پہنچے جہاں وہ لوگ ٹھہرے ہوئے تھے، مونا و سادھنا کو عبداللہ والے جنگلے پر پہنچانے کا انتظام کیا پھر شہر کی تلاش میں نکلے۔ شہلا راضی کیا کہ وہ مجھے بینک کے لاکر تک پہنچا دے تاکہ میں جائیزہ بریف کیس حاصل کر لوں۔ اپنے جنگلے پر پہنچے۔ ہم بینک میں سیف سے بریف کیس نکال چکے تھے کہ باہر سے اطلاع آئی کہ کچھ لوگ ہمیں گھیر رہے ہیں۔ ہم باہر نکلے کہ شہلا نے بہتول سے ویم کو نشانے پر لے لیا۔ تب پتا چلا کہ شہلا نے فتح خان کے آدمیوں کو بلا لیا ہے۔ وہ مجھے برنماں بنا کر فتح خان کے گھر میں لے آئی۔ وہاں ایک خان بدوش عورت کو فتح خان کے آدمی پکڑ لائے تھے اور اس کی عزت سے ٹھیل رہے تھے کہ خان بدوش چڑھ دوڑے، انہوں نے لڑی کو بھی برآمد کر لیا تھا۔ وہ عورت کی عزت لوٹنے والے کو قتل کر کے ہمیں سزا سنائے آئے تھے کہ ایک جیپ آندھی طوفان کی طرح داخل ہوئی۔ وہ فتح خان کی تھی۔ فتح خان نے خان بدوشوں کو بھگا دیا۔ تب میں نے دیکھا کہ اس کے ساتھ سوہیا بھی ہے۔ وہ اسے اٹھا کر لایا تھا۔ پھر اس نے مجھے مجبور کر دیا کہ سوہیا کو حاصل کرنے کے لیے مجھے ڈیوڈ شاہ کے ہیرے تلاش کر کے دینے ہوں گے، میں ہیرو کی تلاش میں نکل پڑا۔ اس نے میری جیکٹ پر ایک چپ چپکادی تھی۔ جو میرے بارے میں مطلع کر رہا تھا۔ میں نے اس عورت کو مدد لانے کے لیے فرار کر دیا۔ تب فتح خان، برنماں شاہ کو لے آیا جو پاگل ہو چکا تھا۔ پھر اس نے میری طرف سے سیل کر کے اس میں کو بلا لیا۔ وہ دورہ کر ہم پر نظر رکھے ہوئے تھا کہ فتح خان کے آدمیوں پر فائرنگ شروع ہو گئی۔ برنماں شائے میرے بہتول سے فتح خان کو نشانے پر لیا تھا کہ اس کے آدمی نے برنماں شاہ کو گولی ماری۔ مرتے وقت برنماں شاہ بولا "نارنجہ..... بکٹ" دم توڑتے پرنماں شاہ کی آواز صرف میں نے ہی سنی تھی، تھوڑی دیر میں اندازہ ہو گیا کہ فتح خان نے اندازہ لگالیا ہے کہ اس پوری کارروائی میں میرا ہاتھ ہے، یہی مانیک سے اعلان ہوا کہ جو بھی ہے، وہ ہاتھ اٹھا کر باہر آ جائے۔ وہ راجا صاحب کے آدمی تھے۔ وہاں سے میں نکل آیا۔ وہاں ایمن بھی موجود تھی۔ اگلے دن ہم پھڑی جانے کے لیے نکلے۔ راستے میں فتح خان نے گھر کر کے بس کر دیا اور ایمن کو خود کش جیکٹ پہنا دی جسے اتارنے کی کوشش کی جاتی تو دھماکا ہو جاتا۔ ہم عبداللہ کی گولی میں پہنچے تو فون آ گیا۔ آواز مرشد کی تھی۔ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتا تھا۔ عبداللہ نے انکار کیا کہ یہاں شہباز نہیں رہتا مگر بیٹا م پہنچا دیا جائے گا۔ یہ ایک خطرناک بات تھی کہ میری موجودگی سے وہ آگاہ ہو گیا تھا۔ ہم دوسری جگہ منتقل ہو گئے۔ پھر اطلاع ملی کہ شہلا کا فون آیا تھا۔ میں نے اسے کال کر کے بریف کیس مانگا۔ اس نے بریف کیس دینے کے لیے دربان جگہ مقرر کی۔ ہم وہاں پہنچے اور بریف کیس لے کر طے تو مجھے شک ہوا اور میں نے بریف کیس ڈھلان پر رکھ دیا۔ اندازہ درست تھا۔ وہ دھماکا سے پھٹ گیا۔ ہم واپس ہو رہے تھے کہ ویم کا فون آیا کہ سوہیا راستے سے لاپتہ ہو گئی ہے۔ بعد میں فون آیا کہ اسے فتح خان نے اٹھا لیا تھا پھر اسے حویلی پہنچا دیا۔ میں نے شہلا کا ٹھکانا دریافت کر لیا اور رات کے اندر میرے میں مگر تلاشی لینے پہنچ گیا۔ باہر ویم وغیرہ کو پھرے پر ہتھیار دیا تھا کہ مجھے خطرے کا احساس ہوا کیونکہ ویم وغیرہ کے موہاں سے جواب نہیں آ رہا تھا پھر کمرے میں آ کر تیس کا گولہ مارا اور میں بے ہوش ہو گیا۔ ہوش میں آیا تو فتح خان کی قید میں تھا۔ اس نے مجھے ایک گاڑی میں بند کر کے روانہ کر دیا۔ گاڑی طویل سفر کے بعد رکی تو سامنے کرل کھڑا تھا۔ کرل زرین کی کوشیف عرف عبدالرحمن اس نے مجھے اندین آدمی کے حوالے کیا کہ میں ان کی قید سے نکل بھاگا۔ میں جب تک پہنچا تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ ہمارے درمیان تکرار ہو رہی تھی کہ باہر سے بے آواز فائرنگ ہوئی۔ فائرنگ کرنے والا جب اندر آیا تو فتح خان بھی حیران رہ گیا۔ (اب آگے پڑھیں)

امیر قدیم بچہ فرمانے والی شخصیت کرل زرین کی عرف عبدالرحمن کی تھی۔ اس کے ہاتھ میں سائنس کا ہسپتال تھا جس سے اس نے دوا فرا کو کوٹنا سے رخصت کیا تھا اور ان کے سفر کو ہٹا کر دیا تھا جو زیادہ مشکل کام تھا۔ یہ مشکل خود کرل نے ہی دور نہ اس کے لیے مشکل نہیں تھا کہ فتح خان کو بھی اس کے ساتھیوں کی طرح دنیا سے رخصت کر دیتا لیکن وہ کسی وجہ سے اسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔ کرل نے اندر آتے ہی ایک رومال فتح خان کی طرف اچھال دیا۔ "اسے اپنے درخت پر لپیٹ لو۔"

فتح خان نے رومال کی طرف دیکھا بھی نہیں جو اس کے قدموں میں گر ا تھا۔ وہ خونی نظروں سے کرل کو دیکھ رہا تھا۔ کرل کے پیچھے اس کے دونوں کرگے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں مخصوص ساخت کی شارٹ گنیں تھیں جو میں لیکن سے نکال لایا تھا اور ایک گہری کھائی میں پھینک دی تھیں۔ ظاہر ہے یہ وہ شارٹ گنیں نہیں تھیں۔ میں اس میز کی آڑ سے نکل آیا تھا جہاں میں فائرنگ سے بچنے کے لیے لیٹ گیا تھا حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ کرل نے ایک بھی فالتو گولی نہیں چلائی تھی۔ اس نے صرف تین فائر کیے تھے اور بچوں کو لیاں اپنے نشانے پر لگی تھیں۔ اس سے پتا چلتا تھا کہ اس کا نشانہ کتنا اچھا تھا۔

"کرل نے کیا ہے؟" فتح خان جنگل سے تازہ تازہ چڑیا گھر میں وارد ہوئے والے شیر کی طرح ڈاٹا۔ "میری تو میں تم سے پوچھنے آیا ہوں۔" کرل نے سرو لہجے میں جواب دیا۔ "وہ میرے کہاں ہیں جن کے لیے تم نے اتنا لمبا چوڑا پتھر چلایا؟"

"میرے نہیں ملے۔" فتح خان نے اطمینان سے کہا اس نے خود پر قابو پایا تھا۔ "میرا اسکیم ناکام رہا۔" لیکن میری اسکیم ناکام نہیں رہے گی۔" کرل نے کہا اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ "اس کی تلاشی لو۔"

فتح خان نے صورت حال کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے دونوں ہاتھ بلند کر لیے تھے۔ مگر تکریر نے اس کی تلاشی سے لے کر ایک عدد بہتول، ایک خوفناک خنجر، سیٹلائٹ فون اور کچھ کمزور آدمی تھے۔ فتح خان نے ہاتھ نیچے کرنے کے بعد اپنا رومال نکال کر ہاتھ پر لپیٹ لیا۔ "کرل تمہارا نیت خراب ہو گیا ہے کیا؟"

"میں مجھے عقل آ گئی ہے۔" وہ بولا۔ "میں تم جیسے گدھے کے کہنے پر چلتا رہا اور اپنا نقصان کرتا رہا۔"

کرل کے آدمی نے فتح خان کے پاس سے نکلے والی چیزیں وہیں پھینک دی تھیں۔ فتح خان ہنس۔ "اب تم کو قتل آ گیا ہے لیکن بہت دیر سے آیا اب تم کیا کرے گا؟" "تم دیکھ لو گے۔" کرل نے کہا۔ "اب رومال کی تیاری کرو۔"

"میرا خیال ہے ہماری واپسی ہوگی لیکن کی طرف اور وہاں سے میری رومال کی ہوگی بھارتیوں کے ساتھ۔" میں نے پہلی بار کہا۔ "کرل شاید تم نے کوئی نیا سودا کر لیا ہے۔"

اس نے بے نیازی سے میری طرف دیکھا اور باہر چلا گیا اس کے کرگوں نے اپنے ہتھیاروں سے اشارہ کیا اور ہمیں بھی باہر آنا پڑا۔ دن میں اس جگہ کو دیکھ کر میرا اندازہ غلط ثابت ہوا تھا یہ بالکل ویران نہیں تھا لیکن باقاعدہ آبادی بھی نہیں تھی۔ دور دور ایسی ہی کوٹیاں پہاڑیوں پر بکھری ہوئی تھیں جیسی کوٹھی میں اس وقت ہم تھے۔ یہ امر کا علاقہ تھا۔ مجھے پوری طرح اس آدمی کی لاش دیکھ کر انفسوس ہوا جو شاید یہاں چوکیدار تھا اور اس نے چند سو یا ہزار کے لالچ میں موت خرید لی تھی۔ اسے بے خبری میں پشت سے گولی ماری گئی تھی جو اس کے دل میں آگئی تھی اسے ترے تو کیا آواز نکالنے کا موقع بھی نہیں ملا ہوگا۔ میں نے کرل کی طرف دیکھا۔ "کیا قتل و قمارت کری ضروری تھی؟" "یہ میں بہتر جانتا ہوں۔" اس نے کہا۔ "وین میں بیٹھو۔"

وین کا حقیقی حصہ ایک بار پھر میرے لیے چشم برا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس بار میں انکلیشن تھا بلکہ فتح خان کو بھی میرے ساتھ سفر کا اعزاز حاصل ہو رہا تھا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے فتح خان سے پہلے آپ کہا اور وہ مجھے گھورتا ہوا وین میں گھس گیا۔ جیسے ہی ہم دونوں وین میں داخل ہوئے باہر سے اس کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ میں نے فتح خان کی طرف دیکھا۔ "مجھے انفسوس ہے تم نشست گاہ کو میرے خون سے بچانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن تمہارے ساتھیوں نے تو اسے مدفن خانہ بنا دیا۔"

فتح خان کے ہونٹ ہنسنے ہوئے تھے اور آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ "تمہارا قسمت اچھا ہے تم ایک بار پھر بچ گیا۔"

"حالانکہ موت سے کوئی بندہ بشر کی نہیں بچ سکتا ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ "میرا حال میں پوری نیک بنی ہے تمہارے ہاتھوں پر بے رحمی کے لیے تیار ہو گیا تھا۔"

فتح خان نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا ہے۔“

”اس میں یقین نہ کرنے کی کون سی بات ہے؟ اگر تقدیر نے میری موت یہاں تمہارے ہاتھوں لکھی ہوئی تو میں کچھ بھی کر لیتا بخ نہیں سکتا تھا اور اگر ایسا نہیں تھا جیسا کہ نہیں ہوا تو تم کچھ بھی کر لیتے میری جان نہیں لے سکتے تھے جیسا کہ ہوا۔“

”تمہیں پتا تھا کہ کوئی آجائے گا؟“ اس نے شک سے کہا۔ ”جو تم کو بچالے گا۔“

”ہاں خواب میں آیا تھا کہ رٹل میں طرہ بہ انداز میں کہا۔“ اس نے کہا تھا میں بس آنے والا ہوں مرنا نہیں۔“

”میں اسے چھوڑے گا نہیں ایسے مارے گا کہ اس کا روح بھی قیامت تک بلبلاتا رہے گا۔“ فتح خان نے غالباً خود سے کہا اور روئے سخن بقیہ کرتل کی طرف تھا۔

”تمہیں شک نہیں ہوا کہ کرتل تمہارا دشمن بن گیا ہے؟“

”شک کا کوئی وجہ نہیں تھا پھر میرا خیال تھا اسے اس جگہ کا پتا نہیں ہے۔“

”لیکن اسے پتا تھا اور اس نے عین موقع پر پہنچ کر تمہارے رنگ میں بھگ ڈال دیا۔“ میں نے کہا۔ ”فتح خان کیا تم نے اسے ہیروں کے بارے میں بتا دیا تھا؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”میں نے زندگی کا سب سے بڑا غلطی کیا اس خنزیر کو بتا کر۔“

”اب تمہارے ساتھ میں بھی بھگتوں گا ویسے یہ ہمیں کہاں لے جا رہا ہے؟“ میں نے ایک طرف ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ”یہ بڑی عالم وین ہے تم نے کہاں سے حاصل کی؟“

”یہی لایا تھا روس سے۔“ فتح خان بولا۔

میں حیران ہوا۔ ”اس کا مطلب ہے اس کی نمبر پلیٹ جلی ہے۔“

”ہاں صرف نمبر پلیٹ ہی نہیں کاغذات بھی جلی ہیں۔“ فتح خان نے انکشاف کیا۔ ”اس علاقے میں چلنے والی اکثر گاڑیاں ایسی ہی ہیں۔ یہ یہیں جلتی ہیں اور شہروں کی طرف نہیں جاتی ہیں۔“

فی الحال مجھے ایسی گاڑیوں پر ریسرچ سے کوئی.... دیکھی نہیں تھی۔ مجھے کرتل کی فکر تھی۔ وہ ہمیں اور خاص طور سے مجھے کہاں لے جا رہا تھا؟ ”تم بتا سکتے ہو کہ کرتل مجھے کیوں

لے جا رہا ہے؟“
 ”میں کیا کیا سکتا ہے۔“ اس نے شانے اچکائے۔
 ”بھارتیوں سے رابطہ کس کا تھا؟“
 فتح خان چونکا۔ ”بھارتیوں سے معاملات کرل کرل کر رہا تھا۔“
 ”تم یہ ظاہر کرنا چاہ رہے ہو کہ تمہارا ان سے کوئی
 رابطہ نہیں تھا۔“
 ”مجھے ظاہر کرنے کا کیا ضرورت ہے سچ یہی ہے۔
 بھارتیوں سے کرل بات کرتا تھا۔“
 ”لیکن ڈیوڈ شا سے معاملہ تم کرتے ہو اور یہ سارا
 کھیل اصل میں اسی کا ہے؟ ورنہ بھارتیوں کو اب تک تو میرا
 خیال نہیں آیا تھا۔“
 ”میں کیا کہہ سکتا ہے۔“ فتح خان نے ہزاری سے
 کہا۔
 ”تم مجھے مارنے میں ناکام رہے اب خود تمہاری جان
 کے لالے پڑ گئے ہیں۔“ میں نے اسے چھیڑنے کا سلسلہ
 جاری رکھا۔ ”اب کیا ہوگا؟“
 ”دو میں سے ایک بات ہو گا یا تو ہم بچ جائے گا یا
 نہیں بچے گا۔“ اس نے زندگی کا فلسفہ بیان کیا اور آرام
 پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا، اس لیے وہین حرکت میں آگئی۔ پتا نہیں
 کرل اور اس کے آدمی اتنی دیر سے یہاں کیا کر رہے
 تھے۔ مجھے تشویش لاحق ہو گئی تھی۔ اگر بھارتیوں سے کرل کا
 رابطہ تھا تو وہ ایک بار پھر ان سے میرا سودا کر سکتا تھا۔ وہ پہلے
 ہی میرے لیے ایک ملین امریکی ڈالر دے چکے تھے اور اب
 زیادہ دے سکتے تھے۔ میں نے ان کے دو بندے اور نوٹھی کے
 دیے تھے اور ایک قیمتی ہیلی کاپٹر بھی بندہ کر رہا تھا۔ ممکن ہے
 کرل اس بار زیادہ رقم کا مطالبہ کرتا اور رقم لے کر مجھے
 بھارتیوں کے حوالے کر دیتا۔ وہ فتح خان کی طرح ہیروں کی
 تلاش میں عمر گنوا دینے والا بندہ نہیں تھا۔ میری طرح فتح خان
 بھی غور و فکر میں تھا۔
 فتح خان سے میری دشمنی دو ادوار پر مشتمل تھی۔ پہلے
 دشمنی صرف چند دن چلی تھی اس کے بعد اس میں ایک نئی
 وقفہ آیا تھا۔ جب میری زندگی نے پلٹا کھایا اور اس میں میری
 اور نادر جیسے شیطان داخل ہوئے تو فتح خان بھی ایک نئی
 کردار کی طرح پھر سے لوٹ آیا۔ اس بار فتح خان بالکل بدل
 کر سامنے آیا۔ وہ ایک ایسا آدمی بن گیا جو میرے خلاف
 سازشیں تو کرتا لیکن اس نے مجھے جسمانی نقصان پہنچانے

کوشش نہیں کی اور نہ ہی براہ راست میرے کسی مفاد کو نوک پہنچانے اس کا انداز مجھے استعمال کرنے والا رہا تھا یا وہ ڈیوڈ شاہ اور مرشد جیسے لوگوں کا آلہ کار بنا رہا ہے۔ یہ پہلا موقع تھا جب فتح خان نے اچانک ہی دشمنی کا انداز بدلنا تھا اور مجھے کل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے بتادیا تھا کہ وہ کچھ ایسا کر رہا ہے جس میں میں لازمی ٹانگ اڑاؤں گا اور اس سے اس کا بہت بڑا مفاد وابستہ تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایسا کون سا کام کر رہا ہے جس کے لیے اسے خدشہ ہو کہ میں اس میں ٹانگ اڑاؤں گا اور وہ اس میں ناکامی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ یہ قول اس کے ہمیرے کا ہاتھ سے نکل جانے کے بعد اس کے پاس یہ آخری آپس چانس تھا۔ اس نے ایمین کے بدلے جوان کے مطالبے سے بھی دست برداری اختیار کر لی تھی۔ فتح خان نے مجھے بتانے سے بھی صاف انکار کر دیا تھا۔ اس کا بھی نہیں بتاتا۔ بہر حال محاورے میں ذرا سی ترمیم کے ساتھ تو میں زندہ صحبت باقی آئندہ بھی میری اور فتح خان کی کا قیام جاری رہیں اور میں نے بھی کل جاتا کہ وہ کون سا کام کر رہا ہے جیسا کہ سر انجام دے رہا تھا۔ مجھے ایمین کا خیال آیا اور میں نے فتح خان سے پوچھا۔

”تمہارا کیا خیال ہے ڈیوڈ شاہ اپنے وعدہ پر قائم رہے گا۔“

”وہ بڑا آدمی ہے اگر اس نے تم سے وعدہ کیا ہے تو وہ اس کا پاس کرے گا۔“

”لیکن مجھے اس پر اعتماد نہیں ہے۔“

”یہ تمہارا مرضی کا بات ہے۔ فتح خان بولا۔“

”مطمئن ہو مارشل کا کیا انجام ہوا ہے؟“

”میں چونکا۔“ نہیں لیکن ایک بار ڈیوڈ شاہ میری بات پر بات ہوئی تھی اور میں نے اسے ثبوت کے ساتھ مارشل کے جھوٹ کا بتا دیا تھا۔ مارشل بھی اس کے قابو میں تھا۔ کیا ڈیوڈ شاہ نے اسے مار دیا؟“

”نہیں اس پر انشائوں کی اس گنگ کا الزام لگا ہے اور وینس میں قید ہے اگر الزام ثابت ہو گیا تو وہ پچاس ساٹھ سال کے لیے جیل بھیج دیا جائے گا۔“

”یعنی جیلے جی وہ جیل سے باہر نہیں آ سکے گا؟“

”بالکل آگے گوارا لوگ کا سر کا انداز ہے۔ شکر ہے وائس اسے موت سے بچا رہا ہے۔ فتح خان نے کہا۔“

”تمہارا ساتھ صرف یہی دو لوگ تھے؟“

”ہاں! دھرم بھی دو تھا۔ باقی اُدھر شہر میں اور دوسری جگہوں پر ہے۔“

”یعنی کسی کو نہیں معلوم کہ تمہارے ساتھ کیا گزری اگر کرنل نے تمہیں مار کر نہیں وقتا دیا تو...؟“

”تو کیا۔“ اس نے شانے ہلائے۔ ”اب تک میں مارتا رہا ہے۔ میں بھی مارا جاسکتا ہے۔“

”اپنی آسانی ہے؟“

”نہیں میں بھی تمہاری طرح آخری سانس تک لڑنے کا عادی ہے۔ ممکن ہے میں مارا جائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کرنل کا آخری وقت آگیا ہو۔“

جس وقت فتح خان نے یہ بات کی تو نہ جانے مجھے خیال آیا کہ واقعی کرنل کا آخری وقت آگیا ہے وہ ہمیں نہیں اپنی شامت کو ساتھ لے جا رہا ہے۔ کرنل کا یہ قدم ظاہر کرتا تھا کہ اس کے دل میں شروع سے کوئی کھوٹ تھا اور وہ ہیروں کی بازیابی کا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن جب ہیرے نہیں ملے اور ان لوگوں کا منصوبہ نام کام رہا تو کرنل نے متبادل منصوبے پر عمل درآمد شروع کیا یہ منصوبہ اس نے فتح خان کو بانی پاس کر کے تیار کیا تھا۔ اس کا ایک نقطہ تو یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ ہمیں بھارتیوں کے حوالے کر کے چھوڑ رہا ہو اسے سیٹھ کے واپس روس چلا جائے۔

”تم نے کسی بینک اکاؤنٹ کا ذکر کیا تھا جس میں بھارتیوں سے حاصل ہونے والی رقم جمع ہے کیا یہ اکاؤنٹ تم نے خود کھلوا یا تھا؟“

میرے سوال پر فتح خان چونکا۔ ”نہیں اکاؤنٹ کرنل نے کھلوا یا تھا۔ مجھے ان معاملات کا زیادہ نہیں معلوم ہے۔“

میں نے انہوں سے سر ہلایا۔ ”تم بہت جالاک شخص لیکن کہیں کہیں مارکا جاتے ہو۔ میں دعوے سے کہتا ہوں ایسے کسی اکاؤنٹ کا کوئی وجود نہیں ہوگا۔ تمہارے حصے کے پانچ لاکھ ڈالر اب بھی کرنل ہنرم کر چکا ہوگا۔“

فتح خان کی آنکھوں میں مزید خون اُتر آیا اور اس نے اپنے قبائلی انداز میں مختلف قسمیں کھا کر مجھے یقین دلایا کہ ایسی صورت میں کرنل کے ساتھ بہت بُرا ہوگا۔ میں نے سر د آہجری۔ ”فی الحال تو ہمارے ساتھ بُرا ہوتا نظر آ رہا ہے، ہم بالکل نپتے ہیں ایک پبل تراش تک نہیں ہے۔ ویسے جب میں کرنل سے ملا تو میرا خیال دوسرا تھا کہ وہ تم پر اعتماد کر کے سخت حماقت کا ثبوت دے رہا ہے۔ وہ تمہارے بارے میں نہیں جانتا ہے لیکن اب الگ رہا ہے یہ حماقت تم نے کئی اور

درحقیقت تم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے ہو۔“
 فتح خان خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے
 کہا۔ ”ہم نے اچھا نہیں کیا اس جگہ کا باغی کے آگے
 سنا جاتا ہے۔“
 یہ سن کر میں ہچکل پڑا تھا۔ ”یہ تم اب بتا رہے ہو تم ج
 جچ پٹھان ہو۔“

اس نے سخت سے کہا۔ ”میرے کو خیال نہیں رہا۔“
 اس کے بعد ہم دونوں ہی خاموش ہو گئے تھے۔ وین
 کو چلتے ہوئے دو گھنٹے سے زیادہ کا وقت گزر گیا تھا۔ اگر ہم
 واپس اسی کیمپ کی طرف جا رہے تھے تو ابھی تین چار گھنٹے کا
 سفر تھا۔ وہ بھی موسمِ گرما تھا۔ بند وین میں پٹا نہیں چل
 رہا تھا کہ آگے کا موسم کیا تھا۔ مگر خلاف توقع کچھ دیر بعد وین
 رک گئی تھی۔ ایک منٹ بعد تھکی دروازہ کھلا۔ وین سڑک کے
 ساتھ ایک جنگل کے کنارے کھڑی تھی۔ کرنل اور اس کا ایک
 ساتھی ہتھیار بدست اور چوکنا موجود تھے۔ کرنل نے اشارت
 گن سے اشارہ کیا۔ ”ہیچ آ جاؤ۔“

”آ جاؤ میرے دوست نما دشمن۔“ میں نے نیچے
 اترتے ہوئے کہا۔ ”شاید ہمارا آخری وقت آ گیا ہے۔“
 میں اور فتح خان نیچے اتر آئے۔ فتح خان نے زہر لے
 لہجے میں کہا۔ ”تم جو کر رہا ہے تم کیا سمجھتا ہے فتح جانے گا؟“
 ”مجھے ایسی کوئی خوش قسمتی نہیں ہے۔“ کرنل نے
 سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”بولنے کے بجائے چلنے کی کرو۔“

یہاں بھی ہر طرف برف نظر آ رہی تھی لیکن سردی کی
 شدت بہت زیادہ نہیں تھی۔ کرنل کے اشارے پر ہم سڑک
 سے اتر کر درختوں کے درمیان ایک پگ ڈنڈی پر چلنے لگے۔
 درختوں کے نیچے کہیں کہیں برف تھی۔ جو برف درختوں کی
 شاخوں پر تھی وہ ٹھوپ پڑنے سے پھل گئی تھی۔ پانی پڑنے
 سے زمین نم اور نرم ہو رہی تھی۔ تقریباً ایک سو گز چلنے کے بعد
 ہم ایک چھوٹے سے کچے مکان کے سامنے پہنچے۔ یہ باقاعدہ
 کیمپ نہیں تھی۔ شاخیں اور پتھروں کی مدد سے اسے بنایا گیا تھا اور
 اس کی چھت ٹین کی شیٹ سے ڈالی گئی۔ یہ کسی لکڑ ہارے یا
 چرواہے کا عارضی ٹھکانہ لگ رہا تھا۔ جو وہ موسم گرما میں
 استعمال کرتا ہوگا۔ سردیوں میں یہ لوگ نچلے علاقوں میں چلے
 جاتے ہیں جہاں برف نہیں پڑتی ہے اور ان کے معمولات
 زندگی چلتے رہتے ہیں۔ گرمیوں میں یہ واپس آ جاتے ہیں۔

ہم مکان میں آئے اندر بہت معمولی سا ساڑو سامان
 پڑا تھا اس میں ایک آگے تھی اور ایک چارپائی تھی۔ مٹی کے

چند برتن بھی پڑے تھے۔ کرنل کے اشارے پر ہم
 ایک طرف دیوار کے ساتھ پشت لگا کر بیٹھ گئے۔
 محسوس کیا کہ کرنل کسی وجہ سے ہمیں زندہ رکھے
 تھا۔ اگر مارنا ہوتا تو جہاں فتح خان کے تین آدمیوں کی
 پڑی تھیں وہیں ہماری بھی دوشلاش رہ جاتیں۔ فتح خان
 وجہ سے واقف تھا اس لیے کسی قدر سے خوف تھا۔ مجھے
 رکھنے کی وجہ سمجھ میں آ رہی تھی۔ میں اس کے لیے ایک
 چپک تھا جسے وہ کسی بھی بھارتی بینک سے کیش کر سکتا
 فتح خان سے بھی اس کا کوئی ایسا مسئلہ اٹکا ہوا تھا جس کی
 سے وہ اسے زندہ رکھنے پر مجبور تھا۔ کرنل اسی کی طرف متوجہ
 اس نے اچانک کہا۔ ”فتح خان شہلا کہاں ہے؟“
 ”مجھے کیا معلوم۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میرا
 سے بہت عرصے سے رابطہ نہیں۔۔۔۔۔“

”جھوٹ مت بولو صرف تین دن پہلے تم مری
 سے ملے تھے۔“ کرنل نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔
 دوسروں کو بے وقوف بنا سکتے ہو مجھے نہیں۔“

”کیوں تم میں ایسا کیا بات ہے، اگر تم چاہے تو
 کو بھی بے وقوف بنا سکتا ہوں۔“ فتح خان کا لہجہ مذاق اڑانے
 والا تھا۔

”اگر شہلا میرے آدمیوں کو جیل دے کر نہ لے
 ہوتی تو تم اس طرح بات نہ کر رہے ہوتے۔“ کرنل کا
 ہو گیا۔ ”فتح خان مجھے ہر صورت میں شہلا کا پتا چاہیے۔“
 ”تم نے شہلا کا کیا کرتا ہے؟“ فتح خان کی قدرتی

ہو گیا۔
 تین دن پہلے شہلا سے ملنے کا مطلب تھا کہ
 جب مجھے مارنے کی کوشش کی تھی تو اس کے فوراً بعد
 خان سے ملی تھی۔ شاید مجھے بریف کس دینے کے
 واپس اسلام آباد کی طرف جانے کی بجائے مری
 تھی۔ مگر میں نے گفتگو میں مداخلت نہیں کی۔ میں جانتا
 تھا کہ کرنل شہلا تک رسائی کیوں چاہتا تھا؟ اس کی
 سے ایسا لگ رہا تھا کہ فتح خان اور شہلا کا تعلق نہ صرف
 تھا بلکہ اس میں مزید گہرائی آگئی تھی۔ فتح خان کے
 کرنل نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”تم جانتے ہو۔۔۔ کیا میں شہباز کے
 دوں۔“

اس بات نے فتح خان کو کسی قدر مضطرب کر دیا
 کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے کہا۔ ”کرنل میں تم سے

بات کرنا چاہتا ہے۔“
 کرنل نے سہلایا۔ ”میرا بھی یہی خیال ہے۔“
 میرا خیال تھا کہ وہ دونوں کہیں باہر جائیں گے لیکن
 کرنل نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا کہ وہ مجھے باہر لے
 جائے۔ اس نے شارنگھن لہرائی اور میں اس کے ساتھ باہر
 گیا۔ جب میں فتح خان کی قید میں آیا تھا تو اس کے آدمیوں
 نے میری بھاری گرم جینٹ اتار لی تھی۔ اس کی جگہ مجھے
 مقامی موسم کے لحاظ سے ایک ہلکی جینٹ دے دی تھی۔ میں
 اپنی ہلکی جینٹ میں تھا۔ مجھے یاد تھا کرنل کے اس آدمی کا نام
 آغا تھا وہ مجھے جھوٹے پڑے سے کوئی تین گز دور لے آیا۔
 اس کا دوسرا ساتھی شاید وین کے پاس تھا۔ میرا چھیڑ چھاڑ کا
 مؤذ ہونے لگا۔ ”تم شروع سے کرنل کے پالتو ہو یا حال ہی
 میں اس کے ساتھ شامل ہوئے ہو؟“

اس نے غرا کر مجھے دیکھا لیکن زبان سے کچھ نہیں
 کہا۔ میں نے نکل پٹائی جاری رکھی۔ ”تم شاید دوغلی نسل سے
 ہو اس لیے ذہنی عقل سے محروم ہو۔“

میں نے ان دونوں کو بہت کم بولتے دیکھا تھا۔ حد یہ
 کہ وہ آپس میں بھی زیادہ بات نہیں کرتے تھے۔ اپنے انداز
 سے ابوجے سمجھنے کی صلاحیت سے عاری ایک ایسی مشین
 تھے جو صرف حکم کی تعمیل کرنا جانتی ہو۔ مگر میرے اشتعال
 کیڑ جوں نے اسے مشتعل کر دیا تھا۔ وہ غراتا ہوا میری
 طرف آیا۔ پہلے مجھے لگا تھا کہ وہ مجھے گولی نہ مار دے۔ لیکن
 اگلے اشارت گن کی نال مجھے مارنے کی کوشش کی۔ میں نے
 اس کا وار بازو پر دوکا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے پیٹ
 میں مگا مارا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں نے سینٹ کی بوری پر مگا
 مارا ہو۔ وہ غرایا اور اس بار اس نے نال میرے سر پر مارنا
 چاہا۔ اس وار کو ہاتھ پر روکنے کا مطلب تھا میں اپنی ٹانگی

میں لٹا لیا اس لیے میں نے سر جھکا تے ہوئے اس کے پیٹ
 میں ایک مگا ماری جہاں مگا مارا تھا۔ اشارت گن کی گھومتی
 خان میری کرپریگ کی لیکن اتنے پاس سے اس کا زور ختم ہو گیا
 تھا میں اسے لے کر نیچے جا کر۔ اس نے اشارت گن نہیں
 چھوڑی تھی اس لیے میں نے ایک ہاتھ سے اس کی نال پکڑ
 لیا کہ وہ تیسری بار اسے نہ استعمال کر سکے۔ اس نے چلا کر
 کی اپنی زبان میں کچھ کہا ظاہر ہے وہ میری مدد سرائی تو
 سے رہا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے اس کے منہ
 سے مارا۔ اس سے پہلے میں دوسرا وار کرتا عقب سے کرنل
 لٹا آواز کی۔

ملاحظہ فرمائیے
 COURTESY WWW.PDFBOOKS.PK

”شہباز رک جاؤ۔“

میں رک گیا اور پھر آہستہ آہستہ اٹھ کھڑا ہوا میں نے
 ہاتھ بھی بلند کر لیے تھے۔ کرنل نے سر دیکھے میں پوچھا۔ ”یہ
 کیا ہو رہا تھا؟“

”کچھ نہیں ملے تہا رہے آدمی سے اس کے بارے
 میں کچھ سوالات کیے تھے یہ غصے میں آ گیا اور زبان کے
 بجائے ہاتھ سے جواب دینے لگا۔“

کرنل نے اپنے آدمی سے کہا۔ ”تم دفع ہو جاؤ اور
 جا کر بمشکو یہاں بھیجو۔“

مجھ پر غراتے والا آغا کرنل کے حکم پر دم دبا کر وہاں
 سے چلا گیا۔ ایک منٹ بعد بمشرا آگیا۔ کرنل نے اسے حکم
 دیا۔ ”اس پر کڑی نظر رکھو اور اگر یہ کوئی غلط حرکت کرے تو
 اس کے پاؤں پر فائر کرنا گھنٹے پر۔“

بمشرا نے فوراً اشارت گن کا رخ میرے دائیں گھٹنے کی
 طرف کر دیا اور میں ساکت ہو گیا۔ کرنل حکم دے کر واپس چلا
 گیا تھا۔ میں نے مسکرا کر بمشرا کو دیکھا تا کہ اس کے سنے
 ہوئے اعصاب نرم پڑ جائیں۔ وہ جذبات سے عاری مشین
 نما انسان تھا اور حکم کی حرف بہ حرف تعمیل کرتا میری کسی حرکت
 پر وہ جچ جچ فائر کر سکتا تھا اور اشارت گن کا فائر صرف میرا گھٹنا
 نہیں توڑتا بلکہ اسے جسم سے الگ بھی کر دیتا۔ مجھے حیرت تھی
 کہ اندر فتح خان سے مذاکرات میں مصروف کرنل کو کیسے پتا
 چلا کہ باہر کچھ کڑ پڑے اور اس سے بھی زیادہ حیرت کی
 بات یہ بھی کہ وہ فتح خان کو چھوڑ کر کیسے آ گیا۔ یقیناً اس نے
 کچھ ایسا کیا ہوگا کہ اس کی عدم موجودگی میں فتح خان فرار نہ
 ہو سکے۔ بمشرا اشارت گن کا رخ میری طرف کیے بالکل
 ساکت کھڑا تھا۔ مارے خوف کے میں بھی ساکت تھا۔ اگر
 کرنل اسے حکم دیتا کہ مجھے شوٹ کر دے تب بھی میں اتنا
 خوفزدہ نہیں ہوتا جتنا اس حکم پر ہوا تھا۔ ایک پاؤں سے
 محروم ہو کر معذور بن جانا مجھے کووارہ نہیں تھا اس کے مقابلے
 میں مجھے موت زیادہ آسان لگ رہی تھی۔ تقریباً دس منٹ
 بعد کرنل جھوپڑی سے باہر آیا اور اس نے بمشرا کو حکم
 دیا۔ ”اسے اندر لاؤ۔“

میں جھوپڑی میں داخل ہوا اور ٹھک گیا۔ فتح خان اس
 حالت میں کھڑا تھا کہ اس کے دونوں ہاتھ پشت سے بندھے
 تھے اور سبکی رتی چھت کو سہارا دینے والی لکڑی کی لمبی سی
 گزاری کی گئی تھی۔ یہ رتی دیوار میں ایک کھونٹے سے بندھی تھی
 اور فتح خان نہایت اذیت ناک پوز میں کھڑا ہوا تھا کیونکہ رتی

آخری حد تک کھینچی ہوئی تھی۔ اگر اسے ذرا سا اور اوپر کھینچا جاتا تو فتح خان کے دونوں ہاتھ شانوں سے اکٹڑ جاتے۔ دائیں اٹکھ کے اوپر چوٹ کا نشان بتا رہا تھا کہ کرٹل نے کچھ نقیش بھی کی تھی فتح خان کے منہ پر ٹیپ چکا رکھا تھا اس لیے وہ آواز بھی نہیں نکال سکتا تھا۔ کرٹل نے منگھرا کر میری طرف دیکھا۔ ”میرا خیال ہے تمہیں خوش ہوگی اسے اس حال میں دیکھ کر؟“

”اگر تم ایسی ہی ایک رتی مہیا کر سکو تو میں تمہیں بھی اسی پوز میں لٹکا کر زیادہ خوش ہو سکتا ہوں۔“

کرٹل کا موڈ آف ہو گیا اور اس نے فتح خان کے منہ سے ٹیپ ایک جھٹکے سے اُتار دیا۔ فوراً ہی فتح خان کے منہ سے پشتوں کی وہ نایاب گالیاں نکلی تھیں جو اب سننے میں بھی کم آتی ہیں۔ کرٹل نے ذرا بھی بُرا نہیں منایا کیونکہ وہ پشتوں سے ناواقف تھا۔ اس نے کہا۔ ”اگر تم نے مجھے شہلا کا پتا نہیں بتایا تو پہلے تمہارے دونوں ہاتھ شانوں سے الگ ہو جائیں گے۔ اس کے بعد میں تمہیں اٹلا لٹکا دوں گا اور تمہارے سر کے نیچے اس آئینے کو روشن کر دوں گا اور اس کی کرنی سے تمہارا مغز پھیل کر گرے گا۔“

”مجھے شہلا کا نہیں معلوم۔“ فتح خان نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”تم ایسا کرو میرا مغز نکال کر ڈائریکٹ فرانی کر کے اپنے کتوں کو کھلا دو۔“

”تم کیا سمجھتے ہو میں اسے تلاش نہیں کر سکتا۔ میں بس ذرا زحمت سے چننا چاہ رہا تھا ورنہ اسے تلاش کرنا ناممکن نہیں ہے۔“

”تم اسے تلاش نہیں کر سکتا ہے۔“ فتح خان نے یقین سے کہا۔

”اچھا تم نے اسے ایسی جگہ چھپایا ہے؟“ کرٹل نے طنزیہ انداز میں کہا۔ اس پر فتح خان نے کرٹل کی والدہ کے حوالے سے جگہ کا بتایا اس پر کرٹل کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور میں نے پہلی بار اسے جذباتی دیکھا۔ اس نے فتح خان کو گھونسا مارا۔ اس کا ہونٹ پھٹ گیا اور خون جھلک آیا تھا۔ کرٹل بالکل اپنے آدمیوں کی طرح غرائے لگا۔ ”فتح خان میں آخری بار پوچھ رہا ہوں اگر تم نے شہلا کا پتا نہیں بتایا تو تمہاری موت بہت خوفناک ہوگی۔“

”اگر میرے کو پتا ہوتا تب بھی نہیں بتاتا۔“ فتح خان نے کہا اور اچانک کرٹل کے منہ پر قھوک دیا۔ ”فتح خان تم جیسے کسی حرامی کتے سے نہیں ڈرتا ہے۔“

کرٹل غصے سے پاگل ہو گیا۔ اس نے پہلے خان پر کتوں کی برسات کی اور اس کا ناک نقشبند کر دیا۔ کرٹل کے ہاتھ بہت سخت تھے اور فتح خان کے مقامات سے لہو لہان ہو گیا تھا۔ میں ایک طرف کھڑا رہا۔ میری مگرانی کمر پر تھا۔ اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کی بجائے کرٹل سے پتول نکالا تو میں سمجھا وہ فتح خان کو مرنے جا رہا ہے۔ لیکن اس نے پتول نیچے کیا اور اس کی ران میں گولی اُتار دی۔ فائز کی آواز زیادہ دھم دھم فتح خان کی دھاڑ بہت بلند تھی۔ وہ بلبلایا اور دو بارہ کرٹل کی مدد مانگنے لگا۔ کرٹل نے لگا کرٹل سکون تھا۔ جب فتح خان کی بلبلاہٹ ذرا کم ہوئی تو اس نے کہا۔ ”میں اسی طرح تمہارے ہاتھ جیروں میں ایک کر کے گولی اُتارتا رہوں گا اس میں کوئی زخم ایسا نہیں جس سے تم فوراً مرنے جاؤ۔ میرے پاس پتول میں ایک گولیوں اور ہیں۔ دونوں گتوں، دونوں گتوں، کھنٹوں اور کھنٹوں اور دونوں کلائیوں کے لیے آٹھ گولیاں ہیں۔ اس کے بعد تمہاری دوسری ران اور پھر بازو پاری آئے گی۔ ابھی تمہاری ہڈی بجا کر گولی چلائی ہے۔ اس کے بعد میں براہ راست ہڈی میں گولی ماروں گا۔ معلوم ہے ہڈی ٹوٹنے کی تکلیف کیا ہوتی ہے اگر تم جانتے تو جلد جان جاؤ گے۔“

کرٹل کا منصوبہ بن کر نہ جانے فتح خان کی اندر حالت ہوئی تھی لیکن میرے اندر سسٹمی سی ووڈ کی نہایت خوف ناک اور اذیت ناک منصوبہ تھا۔ جیسٹر اس جگہ سے خون سے تر ہو گئی تھی جہاں گولی خون بہہ کر اس کے جوتے تک چلا گیا تھا۔ وہ اس زور ڈالنے کے بجائے دوسرے پاؤں پر زور ڈال رہا تھا۔ جب کرٹل خاموش ہوا تو فتح خان نے ایک اٹھایا اور کرٹل پر قھوک دیا۔ اس بار قھوک اس کے نہیں گیا تھا لیکن کرٹل کی جیکٹ پر گرا تھا کرٹل تھا۔ اس نے فتح خان سے کہا۔ ”میں تمہارے ساتھ ہوں اس سے زیادہ اور کیا کروں لیکن اب ہر وہ میں نہیں ایک گولی اُتارتا رہوں گا۔ آدھے گتے میں نہیں رہو گے جھلٹی بن جاؤ گے لیکن میں تمہیں مرنے میں ہوں اس پر بھی تم نہیں مرو گے تمہیں مرنے میں ایک گھنٹا لگے گا۔“

”کرٹل۔“ میں نے پہلی بار زبان کھلی

خان بہت خدی آدی ہے یہ سر جائے گا لیکن زبان نہیں کھولے گا۔“

”جیک ہے تب یہ مرے گا۔“ کرٹل نے سفاک لہجے میں کہا۔ ”مجھے اس سے مہر کا حساب بھی برابر کرنا ہے۔“

فتح خان نے قہقہہ لگایا۔ ”تم مجھے ماروے گا لیکن اس سے مہر کے ساتھ جو ہوا تھا وہ واپس۔“

کرٹل نے فتح خان کے منہ پر پتول والا ہاتھ مارا۔ اس کی بات اُدھوری رہ گئی اور جب اس نے کھانسی کر قھوک تو خون کے ساتھ ایک عدد دانت بھی باہر گرا تھا۔ کرٹل نے بالکل ٹھیک کیا تھا مہر کے ساتھ فتح خان کے ساتھیوں کا انسانیت سوز سلوک مجھے بھی نہیں پسند آیا تھا۔ اس لحاظ سے فتح خان سزا کا مستحق تھا۔ مہر کی اُردو ریزی میں جو لوگ شامل تھے وہ خود مہر کے ہاتھوں مارے گئے تھے اور اب فتح خان ہی باقی تھا۔ نگراں کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں کرٹل کے اس منصوبے سے متفق ہو گیا تھا جو اس نے فتح خان کے بارے میں بنایا تھا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ جی بچ اپنے منصوبہ پر عمل کرے گا۔ اس نے پتول سیدھا لگایا۔ میں نے اسے روکا۔

”ایک منٹ کرٹل کیا تم میری بات سننا پسند کرو گے؟“

اس نے پتول نیچے نہیں کیا لیکن میری طرف دیکھا۔ ”کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”کرٹل کیا تم مجھے بتانا پسند کرو گے کہ تمہیں شہلا کی تلاش کیوں ہے؟“

کرٹل نے کچھ دیر سوچا اور پھر نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ میں نہیں نہیں بتا سکتا۔“

”اؤکے اگر تم فتح خان کے لیے اپنے منصوبہ پر عمل درآمد کی لال بتائی کرو تو میں شہلا کی تلاش میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔“

کرٹل نے ایک لمبے کے لیے حیرت سے مجھے دیکھا۔ ”یہ بات اس کے دل میں یہی بات ہو گئی کہ میں اپنے دشمن کو جاننے کی کوشش کیوں کر رہا ہوں جس نے پہلے مجھے ہتھکڑیوں کے حوالے کیا اور پھر خود قتل کرنے کی کوشش کی؟ مگر اس نے میری پیشکش کو مسترد کر دیا۔“ مجھے تمہارے مدد کی ضرورت نہیں ہے میں خود شہلا کو تلاش کر لوں گا۔“

کرٹل سے اس گفتگو کے دوران میں بہت غیر محسوس اعزاز میں دامن طرف سرک رہا تھا۔ فتح خان بھی اسی طرف

بندھا ہوا تھا۔ کرٹل اور مبشر بائیں طرف تھے۔ میں اس پوزیشن میں آنے کی کوشش کر رہا تھا جس میں مجھے کرٹل اور مبشر دونوں سامنے دکھائی دیں۔ مجھے انکار کر کے کرٹل فتح خان کی طرف متوجہ ہوا۔ ”فتح خان کیا کہتے ہو؟“

فتح خان خاموش رہا تھا کرٹل نے پتول کا رخ اس کے بائیں پاؤں کے فٹے کی طرف کیا۔ یہ موقع ایسا تھا کہ مبشر کی توجہ بھی میرے بجائے ان دونوں کی طرف گئی تھی۔ وہ فتح خان کے پاؤں میں گولی لگنے کا منتظر کھینچا جاتا تھا اور میں اسی موقع کا انتظار کر رہا تھا میرا دایاں ہاتھ جو جیکٹ کی جیب کے پاس تھا تیزی سے اندر گیا۔ یہ ہاتھ ان دونوں کی نظروں سے پوشیدہ تھا۔ میں نے جیب سے ہاتھ نکالا اور اسے پشت کی طرف لاتے ہوئے مبشر پر فائر کیا۔ یہ انداز سے کیا گیا فائر تھا کیونکہ سامنے ہاتھ لانے کی صورت میں کرٹل اور مبشر دونوں پتول دیکھ لیتے۔ اس لیے میں نے ہاتھ پشت کی طرف کر کے فائر کرنے کا خطرہ مول لیا تھا۔ دھماکے کے ساتھ مبشر گرہا اور پیچھے جا کر، گولی اس کے سینے میں اُتر گئی تھی۔ کرٹل چونکا اور ایک لمبے کے لیے کھنٹ ہو گیا کہ گولی کہاں سے چلی تھی کیونکہ میرے پاس کوئی ہتھیار نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اس ایک لمبے کے کھنٹوں کا فائدہ اٹھایا اور زمین پر گرتے ہوئے ہاتھ سامنے لاکر دوسرا فائر کرٹل پر کیا۔ خوش قسمتی سے یہ فائر بھی نشانے پر لگا تھا۔ گولی کرٹل کے دامن شانے میں اُتر گئی۔ وہ گرہا اور پتول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا تھا۔ اس سے پہلے وہ جیک پر پتول اٹھاتا میں نے اسے لات مار کر چار پائی کے نیچے کر دیا اور پتول کا رخ اس کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

”بس کرٹل اب حرکت مت کرنا۔“

گولی نے اس کے شانے کی ہڈی توڑ دی تھی اور بازو جھول رہا تھا لیکن وہ حیرت انگیز طور پر اپنے زخم سے بے نیاز لگ رہا تھا۔ تکلیف سے زیادہ اس کے تاثرات میں حیرت تھی۔ ”یہ پتول کہاں سے آیا تمہارے پاس؟“

”جب تم نے فتح خان کے ایک آدی کو قتل کیا تھا اور وہ پلٹ کر گرہا تھا تو اس کا پتول چھوٹ کر میرے سامنے آگرا تھا میں نے اس کے پیچھے تھا اس سے پہلے کہ تمہیں فتح خان کو پتا چلا میں نے پتول اٹھا کر جیکٹ میں رکھ لیا تھا۔“

کرٹل کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ ”تم سچ تھے اور میرے کسی آدی کو خیال نہیں آیا۔“

”خیال تو تمہیں بھی نہیں آیا تھا۔“ میں نے کہا اور

اسے نشانے پر رکھے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ مہربانے ہوش تھا یا سر چکا تھا۔ ظاہر اس کے جسم میں حرکت نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں کرل پر نظر رکھے ہوئے اس تک گیا اور اس کی شاٹ گن اٹھائی۔ فائرنگ کی آواز یقیناً باہر تک گئی ہوگی اور کرل کا دوسرا ساتھی آغا آنے والا ہوگا۔ شاٹ گن اٹھا کر میں نے کمرے میں ایک ایسی جگہ پوزیشن سنبھالی لی کہ آنے والے کو دیکھ سکوں اور ضرورت پڑے تو اسے شوٹ کر دوں۔ فتح خان بولا۔ ”شہباز پہلے اسے شوٹ کر دو پھر اس کا ساتھی سے نمٹنا۔“

”تم چپ کرو۔“ میں نے اسے جھڑکا۔
کرل طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ ”اسے خوف ہے میں اس کا راز نہ ناش کر دوں۔“

میں نے ان دونوں کی باتوں سے توجہ ہٹائی تھی اور میرے کان باہر سے آتی آہٹوں پر مرکوز تھے۔ ظاہر ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی دیے قدموں جھوپڑی کے آس پاس چل رہا ہو۔ اچانک مجھے خیال آیا اور میں نے سرگوشی میں کرل سے کہا۔ ”اپنے آدی کو آواز دو۔“

اس نے نفی میں سر ہلادیا بولنے سے گریز کیا تھا۔ میں نے اسے گھورا لیکن کچھ نہیں کہا۔ یہاں سب ایک سے بڑھ کر ایک خدی تھے جان چلی جائے لیکن اپنی خد سے نہیں ہٹتا تھا۔ چند لمحوں بعد آہٹ دروازے تک آگئی تھی۔ میں اس آدی کو مارنا نہیں چاہتا تھا لیکن کرل کی ہٹ دھرمی کے بعد یہ مشکل کام ہو گیا۔ وہ اندر آنے سے ہچکچا رہا تھا اور آگرتا تو مجھے مارنے کی کوشش کرتا۔ جواب میں میں بھی اس پر پھول نچھاور نہیں کرتا۔ اس مار دھاڑ کے بعد ہم دونوں میں سے کوئی ایک ہی بچتا۔ اچانک مجھے ایک خیال آیا اور میں نے بلند آواز سے کہا۔ ”آغا تم میری آواز سن رہے ہو؟“

”آغا تم نے اس کی کوئی بات نہیں سنی ہے۔“ کرل بھی بولا۔

”تم خاموش رہو۔“ میں نے دانت چیں کر کہا۔ ”میں کسی کو قتل کرنا نہیں چاہتا لیکن تم اس پر تے ہوئے ہو کہ میں تمہارے دوسرے ساتھی کی لاش بھی کرادوں۔“

”وہ ہتھیار نہیں ڈالے گا۔“ کرل نے اطمینان سے کہا۔ ”چاہے تم مجھے قتل کرنے کی دھمکی ہی کیوں نہ دو۔“

”میں تمہیں دھمکی نہیں دوں گا بلکہ قتل کر دوں گا۔“ میں نے گرج کر کہا اور پستول سے ہوا میں گولی چلا دی اور فوراً ہی کرل کے سر پر پستول کا دستہ بجا دیا۔ وہ چلا یا اور نیچے

جاگرا۔ فائر اور کرل کی چیخ نے باہر موجود آغا کو مشتعل کر دیا تھا۔ اسے یقیناً یوں لگا ہوگا کہ میں نے کرل کو شوٹ کر دیا۔ کسی اندھے تیل کی طرح اندر آیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اندر سے بند ہے اور اس نے اسے نگر مار کر توڑنے کی کوشش کی لیکن دروازہ کھلا تھا اس لیے وہ جھونک میں اندر آ کر اس نے خود پر اکام آسان کر دیا تھا۔ گرنے کے بعد اس نے شاٹ گن اوپر کرنے کی کوشش کی۔ میں نے لات مار کر اس کی یہ کوشش ناکام بنا دی، ہر پر چند تیلی بخش قسم کی شوٹ کرکھانے کے بعد وہ لمبا لیٹ گیا۔ میں نے اس کی تلاش کی اور اس کے پاس سے ایک پستول اور ایک عدد جاکو برآمد کیا۔ اسی طرح کرل کے پاس سے ایک اضافی پستول اور اس کا مخصوص منجر تھا۔ ان لوگوں نے کوئی ایسی چیز جس سے شناخت ہو سکیں اسے پاس نہیں رکھی تھی۔

مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ میٹر جان سے گزر گیا تھا۔ اب اسے اتفاق کے سوا اور کیا کیا جاسکتا تھا کہ میں نے اپنے پشت کی طرف کرکے گولی چلائی تھی اور وہ اس کے دل میں آگئی تھی۔ میں نے مزید رسی تلاش کرکے کرل اور آغا کے ہاتھ پاؤں باندھے۔ وہ عام انسان نہیں تھے جو کوئی کارڈم کرے بس ہو جاتے ہیں، وہ اس حالت میں بھی میرے خلاف کچھ بھی کر سکتے تھے، ان کا بے بس ہونا بہت ضروری تھا۔ فتح خان خاموشی سے کھڑا تھا، پاؤں میں گولی کھانے اور نہایت مشکل انداز میں بندھے ہوئے کے باوجود اس نے ایک بار بھی مجھ سے نہیں کہا تھا کہ میں اسے کھول دوں۔ دوسری طرف میں کرل والی غلطی نہیں دہرائتا چاہتا تھا اس نے فتح خان کے ٹھکانے پر میری تلاش نہیں کی تھی اس لیے خیال تھا میں فتح خان کا قیدی تھا اور میرے پاس اس کے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا جب کہ میں نے ایک عدد پستول حاصل کر لیا تھا۔

میں نے سارا اسلحہ سمیٹ کر اوپرے کارکر کے چار پائی کے نیچے ڈال دیا۔ اس کے بعد منجر سے رسی کاٹ کر فتح خان کو کھولا۔ وہ کراہتا ہوا نیچے ڈھیر ہو گیا۔ میں نے اس کے پاس بیٹھ کر زخم کا معائنہ کیا اور پھر منجر سے جھڑکا ڈالی۔ گولی ایک طرف سے داخل ہو کر دوسری طرف سوراخ کرتی گئی تھی۔ زخم سے خون بہنے کی رفتار خاصی کم ہو گئی تھی۔ میں نے مہربانے کی قیاس کا دامن پھاڑا اور اسے ہی جی کرکس کر فتح خان کے زخم پر باندھ دیا۔

فتح خان اب تک خاموش تھا پھر اس نے آہستہ سے

کہا۔ ”شہباز خان تم نے میری خاطر کیا ہے؟“
”میں بھی کسی سے کچھ مفت میں لینا پسند نہیں کرتا۔ تم نے امین کے بدلے میری جان مانگی تھی مگر قدرت کو ابھی میری زندگی منظور ہے اس لیے تم ناکام رہے۔ اس کے باوجود مجھے اچھا نہیں لگتا تم نے میرے کہنے پر امین کو چھوڑا ہے اس لیے میں نے تمہاری زندگی بچا کر حساب برابر کرنے کی کوشش کی ہے۔“

”اب تم کیا کرے گا؟“
”کچھ نہیں کہیں یہاں سے لے جاؤں گا۔“
وہ بے چین ہو گیا۔ ”لے جائے کہاں.... کیوں؟“
”اگر تم سوچ رہے ہو کہ میں تمہیں یہاں ان لوگوں کے پاس چھوڑ جاؤں گا اور تم کرل سے اپنا حساب چکاؤ گے تو یہ تمہاری بھول ہے۔ جس طرح میں کرل کے ہاتھوں تمہاری موت گوارا نہیں کروں گا اسی طرح مجھے یہ بھی پسند نہیں ہے کہ میری آؤ میں تم کرل سے اپنا حساب چکاؤ۔ اپنے بدلے اپنے بل بوتے پر چکاؤ۔“

”تمہیں اس سے کیا ہمدردی ہے؟“ فتح خان نے مجھ سے پوچھا۔

”کوئی ہمدردی نہیں ہے۔“ میں نے کہا اور کرل کو ہلانے چلانے لگا۔ اس کے زخمی بازو کو ہلاتا زیادہ کارآمد ثابت ہوا تھا۔ وہ جلدی ہوش میں آ گیا۔ اس دوران... فتح خان نے کئی بار مجھ سے کہا کہ میں اس پر لعنت بھیجوں اور یہاں سے چلوں ایسا نہ ہو کہ اس کا کوئی اور ساتھی آجائے۔ مگر میں نے فتح خان کی باتوں پر توجہ نہیں دی۔ میں اس کی توشیہ کی وجہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ اسے خطرہ تھا کہ میں کرل سے اس بارے میں پوچھ گچھ نہ شروع کر دوں جو وہ مجھ سے چھپا رہا تھا اور اس سے زیادہ خطرہ اسے کرل سے تھا کہ وہ از خود نہ آگلی دے۔ اگرچہ مجھے اب بھی اس معاملے سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ کرل ہوش میں آیا اور اٹھ بیٹھا۔ اب اس کے چہرے سے تکلیف اور ثقاہت کے آثار نظر آرہے تھے۔

”کرل مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے۔“
”اسے چھوڑو میں تمہیں راستے میں سب بتا دوں گا۔“ فتح خان جلدی سے بولا۔ ”مجھے سب معلوم ہے۔“
”تم خاموش بیٹھو۔“ میں غریبا اور پھر کرل کی طرف دیکھا۔ ”کرل یہ کیا چکر ہے، تم وہاں کیسے پہنچے اور ہمیں کیوں اٹھالائے؟“

وہ کچھ دیر فتح خان کو سختی نظر نفروں سے گھورتا رہا اور وہ اس سے نظریں نہار ہا تھا۔ پھر اس نے مجھ سے کہا۔ ”اس کا تم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“
”اوکے جب مجھے یہ بتاؤ کہ مجھے کیوں اٹھالائے تھے؟“

اس بار اس نے بلا جھجک جواب دیا۔ ”میرا انڈین سے دوبارہ معاہدہ ہو گیا تھا۔“
”گویا تم مجھے بھارتیوں کے حوالے کرنے لائے تھے۔“ میں نے غور کیا۔ ”کیا اسی جگہ مجھے ان کے حوالے کیا جانا تھا؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”یہاں نہیں لیکن یہاں سے کچھ دور ان کا ایک فیلڈ یونٹ تمہیں لینے آتا۔ آدھی رات کے وقت۔“

ابھی دوپہر کا ایک بج رہا تھا یعنی خاصا وقت تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”کہاں لینے آتا؟“
”میں اس جگہ کے نام سے واقف نہیں ہوں لیکن تمہیں چل کر دکھا سکتا ہوں۔“ وہ بولا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”کرل تم غلط بیانی سے کام لے رہے ہو۔ بھارتی مجھے پیدل کیسے لے جاسکتے ہیں اس طرف بہت اونچے پہاڑ ہیں؟“

”تم نے ٹھیک کہا لیکن اب وہ بار بار سرحد کی فضائی خلاف ورزی نہیں کر سکتے ہیں۔ اس لیے اب تمہیں زمینی راستے سے افغانستان میں موجود ایک بھارتی فوجی ٹیلیٹ لے جایا جائے گا اور وہاں سے بھارت روانہ کر دیا جائے گا۔“

”کیا یہ سب بھارتیوں نے بتایا ہے؟“
”نہیں میرے اپنے ذرائع ہیں۔ اس خطے میں بھارتیوں کے ایجنٹس یونٹ موجود ہیں۔“

اب کرل کی بات قابل غور تھی۔ میں نے اگلا سوال کیا۔ ”آدھی رات ہی کیوں تم نے ابھی مجھے حوالے کیوں نہیں کیا؟“

”مجھے اس سے بھی نمٹنا تھا۔“ کرل نے فتح خان کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس لیے میں نے انہیں آدھی رات کا وقت دیا۔“

”فتح خان سے تم مجھے لے جا کر بھارتیوں کے حوالے کر دیتے؟“
اس نے سر ہلایا۔ ”ہاں اس کے بعد میری ذمہ داری ختم ہو جاتی۔“

”جیسے پہلے ہو گئی تھی۔“ میں نے طنز کیا۔ ”اگر میں ایک بار بھر بھاگ جاتا تو تم تیسری بار معاہدہ کرتے یا ہول سیل میں معاہدہ کر لیتے ہر بار پکڑنے کے اتنے ہوں گے اس بار کتنے لیے؟“

”دو ملین ڈالر۔“ اس نے بے ساختہ بتا دیا۔

”یکش یا ایک اکاؤنٹ میں تمسے ہوں گے؟“

”بنک اکاؤنٹ میں۔“ اس نے کہا۔ ”وہ مجھے ڈرافٹ دیتے جب میں انہیں تمہارے حوالے کرتا۔“

”ٹھیک ہے دیکھ لیتے ہیں آج رات تک۔“ میں نے کہا۔

”فتح خان بے چین ہو گیا۔“ شہباز خان نے تم کس چکر میں پڑ گیا ہے۔ غصت بھیجو اس پر چلو اور سے۔۔۔“

”فتح خان بھارتی میرے لیے بے چین ہو رہے ہیں اور میں بھی ان کو اپنی بے چینی دکھانا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”تم اس معاملے میں مت بولو اور ہاں میں تمہیں آزاد کر دوں گا۔“

”فتح خان چونکا۔“ کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ اب میں تمہیں نہیں بلکہ کرل کو لے کر جا رہا ہوں۔“

”تم مجھے یہاں چھوڑ جاؤ گے؟“

”یہاں تو یہ آغا صاحب رہیں گے۔“ میں نے بے ہوش آغا کی طرف دیکھا۔ ”تمہیں میں سرک پر کسی ایسی جگہ اتار دوں گا جہاں سے تم کسی آبادی تک جاسکو۔“

”اس موسم میں۔۔۔ وہ بچھڑا۔“

اس کی طرف توجہ دے بغیر میں نے کرل سے کہا۔ ”تم مجھے وہاں لے چلو گے جہاں بھارتی مجھے لینے آئیں گے۔“

”میں لے چلوں گا لیکن یہ بہت رسی کام ہے۔“ اس نے کہا۔ ”تمہیں لینے کے لیے آنے والے تربیت یافتہ لوگ ہیں، ان پر قابو پانا آسان نہیں ہوگا۔“

”مجھے آسان کام کرنے کی عادت بھی نہیں ہے۔ اب تو چند دن کوئی مشکل کام نہ کروں تو ہاتھ میں جھلی ہونے لگتی ہے۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا تو کرل پریشان نظر آنے لگا۔

”دیکھو اس میں میرے لیے رسک بہت زیادہ ہے۔“

انڈین میرے دشمن ہو جائیں گے؟“

”یہ تو اچھی بات ہے میرے دو دشمن آپس میں ایک

دوسرے کے دشمن ہو جائیں۔“

”دیکھو مجھے مت لے کر جاؤ۔“ کرل نے

قدر عاجزی سے کہا۔ ”میں تمہیں جگہ بتا دیتا ہوں تم چلے جاؤ۔“

”میں تمہیں لے کر کیوں نہ جاؤں؟“ میں نے

استہزائیہ انداز میں پوچھا۔ ”میرے لیے یہ زیادہ آسان کام ہے۔“

کرل سوچ میں پڑ گیا تھا۔ وہ واضح طور پر بھارتی سامنا کرنے سے کتر رہا تھا۔ ظاہر ہے وہ ان کے لیے

کرنا تھا اور اگر بھارتی یہ سمجھتے کہ میں نے کرل کی مدد انہیں نقصان پہنچایا ہے تو وہ اس کے بھی دشمن ہو جائے۔

برنس تو بھاڑ میں جاتا خود کرل کو بھی جان پہچانی مشکل جاتی۔ اس نے دل لڑا کر کے کہا۔ ”شہباز میں تمہیں اس

نہیں لے جاسکتا۔“

میں نے شارٹ گن کا رخ اس کی طرف کر دیا۔ ”اس

میں تمہیں نہیں گولی مار کر نہ چھوڑ جاؤں۔ میرا کم سے کم ایک دشمن کم ہوگا۔“

میرے لیے اسے لگا کہ میں اس معاملے میں

سنجیدہ ہوں تو اس نے جلدی سے کہا۔ ”ایک منٹ روکو

تمہیں ایک ایسی بات بتا سکتا ہوں جو تمہارے لیے بہت

ہے لیکن تم اس بارے میں نہیں جانتے۔“

”کرل۔“ فتح خان نے دانت چیں کر کہا۔ ”ان

زبان بند رکھتے۔“

”کون سی بات ہے کرل جو میرے لیے اہم ہے

مجھے ہی اس کے بارے میں معلوم نہیں ہے؟“

”کرل اگر تم نے اس معاملے میں زبان کھولا تو

بھول رہا ہے ہر دو میرا نظریہ میں ہے۔“

کرل نے بے چینی سے اسے دیکھا۔ ”تم جھوٹ

رہے ہو ہر دو وہاں سے جا چکی ہے۔“

”ہاں لیکن میرا ایک آدمی مسلسل اس کے

ہے۔“ فتح خان بولا۔ ”جیسے تم مجھ پر اعتماد نہیں کرتا ہے

طرح میں بھی تم پر اعتماد نہیں کرتا ہے۔ مجھے معلوم تھا تم

کبھی کتا پن کر گئے۔ اس لیے میں نے پہلے سے بندوبست

کر رکھا تھا۔“

میں نے دیکھا کرل کے چہرے پر تشویش کے

نظر آنے لگے تھے یعنی اس نے فتح خان کی بات کو غلط

سمجھا تھا۔ ان دونوں کے درمیان ایک ایسی نظر آنے

محسوس جاری تھی جس کے سر پر کافی الجال مجھے پتا نہیں تھا اور

بقول ان دونوں کے وہ مجھ سے متعلق تھی۔ مگر میرے ذہن

میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ کرل نے مجھے یہی بتانے کی دھمکی

دی تھی اور فتح خان نے جوابی دھمکی دے کر اس کا بند کر دیا

تھا۔ میں نے فتح خان سے کہا۔ ”آخر ایسی کیا بات ہے جو تم

مجھ سے چھپا رہے ہو؟“

”شہباز خان اگر تم میرے ساتھ وہ کرے جو اس

کرل نے کہا تھا تب بھی میں نہیں بتائے گا۔“ فتح خان نے

مضبوط لہجے میں کہا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں اگر پتول کی

پتھر دھونکوں اس کے جسم میں اتار دوں تب بھی وہ مجھے وہ

بات نہیں بتائے گا۔ اب تک میں کسی نامعلوم بات کے چکر

میں پڑنے کے بجائے اس فکر میں تھا کہ کسی طرح اس چکر

میں سے جان چھڑاؤں۔ مگر اب مجھے جتنی لائق ہو گیا تھا کہ آخر

فتح خان کس معاملے کو مجھ سے چھپانے کے لیے اتنے جتن کر

رہا ہے۔ وہ اسے چھپانے کے لیے مرنے کو بھی تیار تھا۔

دوسرے اس معاملے میں کرل بھی ملوث تھا۔ مہرو کے

بارے میں میرا شبہ بڑھتا جا رہا تھا کہ اس کا خاندان قبیلے

نہایتی میں جس عورت کی جھلک دیکھی تھی وہ مہرو کی

بیوی تھی۔ وہ وہاں کیا کر رہی تھی اور اب کہاں تھی؟ کچھ دیر

میں نے زیادہ غور و فکر کو بے سود قرار دیا اور حالات

حاضر کی طرف توجہ ضروری سمجھی۔ میں نے فتح خان سے

کہا۔ ”کرل کے شانے کی ہر مہم پنی کر دو۔“

”مجھے ہاتھ لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ کرل

فرمایا۔

”مجھے بھی تمہیں ہاتھ لگانے کا شوق نہیں ہے۔“ فتح

خان نے جوابی غراٹ کے ساتھ کہا۔

”اس صورت میں تمہیں ایسے ہی سفر کرنا ہوگا۔“ میں

نے اسے خبردار کیا۔ ”راستے میں ہونے والی تکلیف بھی

مددگار ثابت کرنی پڑے گی۔“

میں نے چارپائی کے نیچے سے اسلحے کا تمام ایونینشن

نکال لیا۔ ایک سے زیادہ پتول اور شارٹ گن میرے لیے

پیکار میں۔ البتہ دوسرا پتول مختلف کھلیں کا تھا اس لیے میں

سے رکھ لیا۔ ان کے میگزین اور گولیاں جیکٹ کی مختلف

جیبوں میں ڈال لی تھیں۔ میرے اصرار پر کرل نے پڑے

کی ہڈی کیلنگ بنا کر اپنا کارہ ہاتھ لگا لیا تھا۔ فتح خان کے

لیپس نے چارپائی کی ایک پٹی نکال دی اس دار تک کے

ساتھ کہ وہ اسے میرے اوپر آزمانے کی حماقت نہ

کرے۔ روانہ ہوتے ہوئے میں نے آغا کے پاؤں کھول

دے دیے تھے البتہ ہاتھ بندھے رہنے دیتے تھے۔ وہ یہاں سے

لکھا تو کہیں نہ کہیں پہنچ جاتا جہاں اس کی جان بچ جاتی۔ ہم

وین تک آئے میں نے غصی دروازہ کھولتے ہوئے فتح خان اور

کرل کو اندر جانے کا حکم دیا۔ ”خیال رہے ایک دوسرے کو قتل

کرنے کی کوشش مت کرنا ورنہ دوسرے کو میں مار دوں گا۔“

دراصل مجھے فتح خان کی فکر تھی۔ کرل نے دیکھا لیا تھا

کہ میں اسے لے جا رہا تھا کو یا فتح خان میرے لیے غیر

ضروری تھا۔ کرل کا بازو زخمی تھا اس کے باوجود وہ زیادہ

خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ فتح خان کمزور نہیں تھا لیکن وہ

کرل کی طرح مضبوط اور تربیت یافتہ نہیں تھا۔ کرل کو قتل

کرنے کی پیشہ ورانہ تربیت دی گئی تھی۔ وہ ایک ہاتھ مار کر

فتح خان کی زندگی ختم کر سکتا تھا۔ اس خیال نے مجھے فیصلہ

بدلے پر مجبور کر دیا اور میں نے فتح خان کو گایا ہر آنے کا اشارہ

کیا تو کرل کے چہرے پر پامپوئی چھائی گئی یقیناً اس کے دل

میں فتح خان کے لیے ایچھے عزائم نہیں تھے۔ فتح خان بچنے

اُترا تو میں نے دروازہ بند کر دیا اور اس سے کہا۔ ”تم

میرے ساتھ سفر کرو گے۔“

”اس عنایت کی وجہ؟“ اس نے کسی قدر زہر لیے

انداز میں کہا۔

”میرا خیال تھا کہ کرل تمہیں فوت کرنے کی کوشش

کرے گا۔“ میں نے اسے وین میں فرنٹ سیٹ پر دھکیلتے

ہوئے کہا۔ اس سے پہلے میں وین کی اندر سے تلاشی لے چکا

تھا کہ اس میں کہیں کوئی ہتھیار تو نہیں رکھا ہے۔ تم اس کا

مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔“

”کرل کیا جہز میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔۔۔“ اس

نے دعویٰ کیا۔

”فتح خان جب موت آتی ہے تو چیونٹی بھی وجہ بن

جاتی ہے بہر حال میں نہیں چاہتا کہ ابھی تم مارے

جاؤ۔“ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور وین اشارت کی

اور آگے بڑھا دی۔ ”میں تمہیں کسی ایسی جگہ چھوڑ دوں گا

جہاں سے تم بدلے لے سکو۔“

”تم مجھ اس کو بھی تک پہنچا سکتا ہے۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”وہاں جانا رسی ہوگا اب

تک پولیس آچکی ہوگی۔“

”تم تب مجھے اس کے آس پاس اتار دو۔“

اس بار میں نے صاف کہا۔ ”فتح خان میں تمہیں کسی

ایسی جگہ نہیں اُتار سکتا جہاں تم میرے لیے خطرہ بن جاؤ گے
تمہیں کسی آبادی کے پاس اُتاروں گا جہاں سے تمہیں اپنے کسی
ٹھکانے تک پہنچنے میں کچھ وقت لگے۔ اس سے زیادہ کی امید
مت رکھو۔“

اس کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔ ”شہباز خان، تم
بہت چالاک ہو گیا ہے۔“

وہ مجھے اب مستقل شہباز خان کہنے لگا تھا اور میں نے
تھک ہار کر اسے نوکنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اس کے پاؤں سے
خون رستا بند ہو گیا تھا لیکن اسے باقاعدہ علاج کی ضرورت
تھی۔ یہ سارا علاقہ میرے لیے انتہائی تھا۔ مگر میں فتح خان
کے سامنے ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگر اسے پتا چل جاتا تو وہ
مجھے رہنمائی کے بہانے گمراہ کر سکتا تھا۔ اس لیے میں پورے
اعتماد ڈرنا دیکھتا رہا۔ ہم جہاں سے گزر رہے تھے، یہ
ویران اور غیر آباد علاقہ تھا جہاں جنگل تھے اور ان میں کہیں
کہیں چرواہوں کی گرمائی بستیاں تھیں لیکن فی الحال، یہ
بستیاں خالی پڑی تھیں۔ چرواہے اپنے جانور لے کر اپریل
کے شروع میں اس طرف آتے۔ کچھ دیر بعد فتح خان نے
پوچھا۔ ”تم مجھے کہاں لے جا رہا ہے؟“

”میں نے بتایا تھا تمہیں کسی آبادی کے آس پاس چھوڑ
دوں گا جہاں سے تمہیں مدد مل جائے گی۔“

اس کا زخم ٹھنڈا ہو کر اب زیادہ تکلیف دے رہا تھا۔ وہ
سیٹ سے سرٹاک کر بیٹھ گیا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد مجھے سڑک
کے کنارے ایک آبادی نظر آئی۔ یہ آبادی اسی قسم کی تھی جو
پہاڑوں پر سڑکوں کے کنارے کسی ضرورت کے تحت وجود
میں آجاتی ہیں۔ میں نے وین ڈرا اور روک دی۔ ”فتح خان
یہاں سے تم کو مدد مل جائے گی۔“

اس نے تشویش سے دیکھا۔ ”یہ تو بہت چھوٹی سی
آبادی ہے۔“

”اس چھوٹی سی آبادی میں بھی انسان رہتے ہیں۔“
میں نے کہا اور دروازہ کھولتے ہوئے اچانک اسے باہر دھکا
دے دیا۔ فتح خان اس سلوک کے لیے بالکل تیار نہیں تھا وہ
سڑک پر جا کر اور زخم کی تکلیف سے چلا تھا۔ وہ صرف
چلا یا نہیں تھا اس نے اور بھی بہت کچھ فرمایا تھا۔ میں نے
کہا۔ ”یہ میری طرف سے تمہاری تمام جراتوں کا بہت چھوٹا سا
جواب ہے۔ لیکن فتح خان یہ آخری موقع ہے۔ میرے ساتھی
فیصلہ کر چکے ہیں کہ روز بروز کے تماشوں سے بہتر ہے تمہارا
ایک ہی بار خاتمہ کر دیا جائے تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ مجھ

سے اور میرے معاملات سے دور رہو۔ ورنہ موت
تمہارا مقدر بنے گی۔“
”فتح خان کا فیصلہ کوئی نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔ اس نے
خند لہجے میں کہا۔

”کیوں کیا تم نے اپنی زندگی موت کا اختیار
حاصل کر لیا ہے۔“ میں نے اسے گھورا۔ ”فتح خان
بول مت بولو اور میں بتا رہا ہوں اب اگر میرے معاملات
میں تمہاری طرف سے مداخلت ہوئی تو تمہیں کوئی رستہ
نہیں ملے گی۔“

میں نے دروازہ بند کر کے وین گھائی اور جس طرف
سے آتا تھا اسی طرف چل پڑا۔ کچھ دور جا کر میں نے
میں موجود نقشے کا یہ غور معائنہ کیا اور جان گیا کہ میں اس
کہاں تھا۔ یہ جگہ سوات کے شمال مغرب میں کہیں کہیں
سڑکوں سے واضح تھا کہ اب مجھے کہاں جانا تھا۔ میں نے
طرف نہیں جانا چاہتا تھا جس طرف سے آتا تھا۔ ممکن
وہاں فتح خان یا کرگل کے آدمی کھوم رہے ہوں اور ان
لیے یہ وین جانی پہچانی تھی۔ صبح کا ناشا اگرچہ ٹھنڈا
ہمسم ہو چکا تھا اور اس موسم میں بھوک ویسے بھی زیادہ
ہے۔ میں نے وین ایک ذیلی سڑک کی طرف
دی۔ یہاں میں ممکنہ دشمنوں کی نظروں سے محفوظ رہ سکتا
اور کوئی چھوٹی موٹی آبادی مل جاتی تو کھانے کا انتظام
جاتا۔ مجھے کرگل کی فکر نہیں تھی۔ اگر ہم پٹی کا سامان
تو میں اس کی ڈرینک کر دیتا ورنہ ایسے بھی کڑا چل رہا
وہ مرنے نہیں۔

ڈرائیو کرتے ہوئے اچانک مجھے دائیں طرف
بلندری پر ایک گھٹی دکھائی دی۔ یہ پتھروں اور گلیز سے
بڑی خوب صورت اور عالی شان قسم کی گھٹی تھی۔ اس
جانے کا راستہ ذرا آگے آیا۔ یہ کھردرے پہاڑی
سے بنا راستہ تھا اس قسم کی ڈھلان کے لیے ایسے ہی
موزوں تھے ورنہ کچنے پتھروں پر چڑھنے والی گاڑی
ناز پھسل سکتے تھے۔ میں نے بلا تکلف وین اس راستے
دی۔ اگر کوئی اعتراض کرتا تو میں معذرت کر کے مدخل
سکتا تھا اور کوئی بالکل ہی غیر مہذب لگتا تو میں وہاں سے
سکتا تھا۔ زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ مجھے یہاں
مدد مل جائے گی۔ گھٹی کا کوئی گیٹ نہیں تھا۔ ذرا اوپر
ایک خوب صورت خراب سے راستہ گزرا جس کے
لان اور باغ تھا۔ سردی کی وجہ سے فی الحال اس کی

پتھر پڑی ہوئی تھی لیکن اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ یہاں
کیا قبضہ کی لکھی پائی جاتی ہوگی۔ گھٹی کی قدر مقامی اور
جدید طریقہ پر کا ملا جلا احترام تھی۔ جیسے ہی وین خراب سے
اندرا دل ہوئی اور اس کے انجن کا شور اندر پہنچا عمارت کا
داخلی دروازہ کھلا اور ایک کسی قدر طویل قامت اور صحت مند
بوزخا شخص باہر آیا اس نے گاؤں پہنچ کر رکھا تھا اور اپنے حلیے
اور انداز سے اس گھٹی کا مالک لگ رہا تھا۔ میں نے احتیاطاً
وین پورچ سے پہلے روک دی اور نیچے اتر آیا شاد کن میں
نے اندر ہی چھوڑ دی تھی۔

”ویل یک مین ہو آر ہو؟“ اس نے کھڑے انداز
میں پوچھا اس کے بولنے کا انداز سی آرمی آفیسر جیسا تھا۔
”میرا نام شہباز ملک ہے سر اور میں مددی امید لے
کر اس گھٹی میں بلا اجازت داخل ہوا ہوں۔“ میں نے نے
نے انداز میں کہا۔ ”مجھے امید ہے آپ میری اس حرکت کو
معاف فرمائیں گے۔“

اس کے پتھر جیسے سخت چہرے پر مسکراہٹ کی ننھی
کی کوئٹل چھوٹی وہ بولا تو اس بار اس کا لہجہ بھی نرم تھا۔
”ویل تم نے وضاحت کر کے خود کو مصیبت میں پڑنے
سے بچالیا ہے۔“

اس کا ایک ہاتھ مستقل گاؤں کی جیب میں تھا اور شاید
اس میں کوئی ہتھیار پوشیدہ تھا۔ میں نے گہری سانس لی۔
”میں ویسے ہی بہت بڑی مشکل میں پڑا ہوں لیکن میں آپ
کو یقین دلاتا ہوں میں آپ کے لیے کسی مشکل کا باعث نہیں
ہوں گا۔“

”اندرا ڈیہاں سردی بہت ہے۔“
”میرے ساتھ ایک شخص ہے اس کے شانے میں گولی
ہے اور اسے طبی امداد کی ضرورت ہے۔“ میں نے فیصلہ
کر لیا کہ اس شخص سے ممکنہ حد تک سچ بولوں گا بغیر کوئی فالتو
بات کہے۔ اس ویرانے میں اس کی مدد وقت غیر متوقع ثابت
ہوئی تھی۔

”تب ایک منٹ روکو میں شاکر کو بھیجتا ہوں وہ تمہاری
مدد کرے گا۔“

وہ اندر غائب ہو گیا اور جب تک شاکر آتا میں نے
وہاں کا غائب گھول کر کرگل کو اپنے میزبان کے بارے میں
تفصیلات منسوب کر دی ہیں اور بر فانی لوہڑیوں کا شکار کھیلنے
کے لیے اسے انڈی کی گولی نے تمہیں زخمی کر دیا۔ تمہارا نام
میرا نہیں ہوگا۔ میں نے تمہارا اصل نام بتایا ہے۔ کوئی فالتو

بات یا حرکت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“
”میں سمجھ گیا۔“ اس نے سر ہلایا۔ اس کا ہاتھ چہرہ بتا
رہا تھا کہ گولی کا زہر اثر کر رہا تھا۔ اسے بخار ہو گیا تھا
اور تکلیف بھی بڑھ گئی تھی۔ شاکر عمر میں تقریباً ہمارے
میزبان جتنا تھا مگر صحت مند اور جاق و چوبند تھا۔ صورت اور
لہجے سے وہ بھی شہر کا لگتا تھا۔ اس نے تپاک سے مجھ سے
ہاتھ ملایا۔ ”تم یہاں کام کرتے ہو؟“

”نہیں صاحب، میں تو چالیس سال سے صاحب کا
اردلی ہوں۔“ اس نے تھد لپ کر دی کہ ہمارا میزبان آرمی
آفیسر ہی تھا اور یقیناً رٹائر ہو گیا تھا۔ شاکر نے میری مدد کے
بغیر ہی کرگل کو سہارا دے کر نیچے اُتار لیکن نیچے آکر وہ اپنے
بیروں پر کھڑا ہو گیا اس نے مزید سہارا لینے سے انکار کر دیا۔
”میں خود چلوں گا۔“

شاکر ہمیں گھٹی کے اندر لایا۔ گیٹ ہاؤس سامنے
والے حصے میں تھا۔ وہ ہمیں ایک کمرے میں لایا۔ اس نے
کرگل کی جیکٹ اُتاری اور اس وقت کرگل کو سچ معنوں میں
چھٹی کا دودھ یاد آ گیا تھا۔ بازو مستقل ایک ہی پوزیشن میں
رہنے کی وجہ سے آکر گیا تھا۔ اس کی کراہیں نکل گئی
تھیں۔ شاکر نے میری طرف دیکھا۔ ”آپ آرام کریں
میں انہیں صاحب کے پاس لے جا رہا ہوں۔“

”صاحب کیا کریں گے؟“
”کچھ نہ کچھ کریں گے وہ فوج میں رہ چکے ہیں۔“
شاکر نے کہا۔ وہ کرگل کو لے جانے لگا تو میں بھی ساتھ چل
پڑا۔ شاکر رک گیا اس نے ہچکچا کر کہا۔ ”صاحب نے صرف
ان کے لیے کہا ہے۔“

”ٹھیک ہے لیکن مجھے تمہارے صاحب سے بہت
ضروری بات کرنی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اس شخص
کے بارے میں۔“

شاکر نے سوچا اور پھر ہمیں وہیں رکنے کا کہہ کر چلا گیا
کرگل مسکرایا۔ ”تم مجھ پر اعتماد کرنے کے لیے تیار نہیں ہو۔“
”کیا مجھے اعتماد کرنا چاہیے؟“ میں نے اس سے سوال
کیا تو وہ خاموش ہو گیا۔ شاکر کچھ دیر بعد آیا اس نے مجھ سے
کہا۔ ”صاحب آپ کو مار رہے ہیں۔“

”میں اسے اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔“ میں نے کرگل کی
طرف اشارہ کیا۔ ”یہ بہت خطرناک آدمی ہے۔“
شاکر نے اچانک اپنے لباس سے ایک چھوٹا سا آٹو
جیک نکال لیا۔ ”آپ اطمینان سے جائیں یہ کوئی حرکت نہیں

کرے گا دائیں طرف دوسرا دروازہ ہے۔“
شاگرد صاحب ایک چھوٹی سی اسٹریٹ میں میرا منتظر تھا اس نے بلا تہدید کہا۔ ”مسٹر ملک یہ کیا چکر ہے؟“
”سر پہلے تو میں آپ کا نام جانتا چاہوں گا۔“
”زیادہ کرل فیال دین۔“ اس نے جواب دیا۔
”کرل کیا میں آپ پر اعتماد کر سکتا ہوں۔“
”وائے ناٹ۔“ اس نے میز پر رکھا۔ گار اٹھا کر
لگا تے ہوئے کہا۔
”یہ شخص جس کا نام کرل زریسکی یا عبدالرحمن
ہے۔ سابق سوویت فوج کا کرل ہے اور آج کل کرائے کا
فونی بنا ہوا ہے۔“
کرل فیال دین نے سر ہلایا۔ ”بہت سارے سابق
روسی فوجیوں نے یہ کام شروع کر دیا ہے لیکن یہ یہاں کیا
کر رہا ہے؟“
”یہاں یہ ایک مقامی جرائم پیشہ شخص فوج خان کے
لیے کام کر رہا ہے۔ فوج خان کے مراسم وسط ایشیا میں جرائم
پیشہ گروہوں سے ہیں۔ بعض وجوہات کی بنا پر وہ میرا دشمن
بن گیا ہے۔ کرل اس کا آدمی ہے۔ میں اسے پکڑ کر لے
آیا ہوں۔“
”اگر یہ مجرم ہے تو تم نے اسے پولیس کے حوالے
کیوں نہیں کیا؟“
”یہ پولیس کے بس کی بات نہیں ہے اور دوسرے
مجھے اس سے کچھ حساب برابر کرنا ہے۔“
”دشمنی کا معاملہ ہے؟“
”ویسی دشمنی نہیں جس میں آدمی دشمن کا وجود مٹانے پر
مُل جاتا ہے۔ اگر ایسی بات ہوتی تو میں اسے ساتھ لیے
کیوں پھر رہا ہوتا۔ مار کسی جنگل میں نہ پیچید دیتا؟“
کرل کچھ دیر سوچتا رہا۔ اسے کوئی مسئلہ یا خوف نہیں
تھا بلکہ وہ میرٹ پر فیصلہ کر رہا تھا کہ میری مدد کی جائے یا نہیں
بالآخر اس نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے نوجوان تم مجھ سے کیا
چاہتے ہو؟“
”اس کا علاج اگر ہو سکے تو اور آج رات تک آپ کی
حیثیت تلتے پناہ جاتا ہوں۔“
”ٹھیک ہے شاگرد کے ساتھ اسے یہاں بھیج دو فوج
میں ہمیں فرسٹ ایڈ اور چھوٹی موٹی سرجری کا کورس بھی کرایا
جاتا ہے۔ میں دیکھتا ہوں سامان میرے پاس سارا ہے۔“
اس نے سگار اٹیش ٹرے میں رکھ دیا۔ ”میرا خیال ہے تم مجھے

ہوئے ہو اور بھوکے بھی ہو۔“
”جی کچھ ایسا ہی ہے۔“ میں نے دینی زبان میں
”ٹھیک ہے شاگرد کراس کے ساتھ بھیج دو۔“
”کرل وہ خطرناک آدمی ہے اگرچہ دشمنی ہے اور
ہے لیکن پھر۔۔۔“
”تم فکر مت کرو۔“ ریٹائرڈ کرل کا لپسہ
ہو گیا۔ ”میں ایس ایس جی گروپ میں ہوتا تھا۔“
میں کمرے میں آیا اور شاگرد کو کرل کی طبیعت سے
کیا۔ وہ کرل کو لے کر چلا گیا۔ میں نے پہلے ہاتھ روم
چھانکنا۔ یہ آرامت اور شاندار قسم کا ہاتھ روم تھا جس
صفائی ستھرائی کے تمام تر لوازمات موجود تھے۔ گرم پانی
آ رہا تھا اس لیے میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر کرل کے
فیصلہ کیا۔ دس منٹ میں میل پیکل کے ساتھ میری
چھکن بھی دور ہو گئی تھی اور مجھے بے پناہ سکون ملا تھا۔ صاف
سترا ہو کر میرا یہ گنڈے پکڑے سینے کو دل نہیں جا رہا
لیکن میرے پاس اور پکڑے موجود نہیں تھے ابھی میں
رہا تھا کہ کیا کروں کہ میری مشکل شاگرد نے آسان کر
اس نے ہاتھ روم کے دروازے پر دستک دی۔ میں نے
ساکھول کر دیکھا۔
”آپ کے لیے کھانے کی کچھ چیزیں لایا ہوں
ٹھنڈی نہ ہو جائیں۔“
مجھے شرم آ رہی تھی لیکن میں نے دل نکڑا کر
درخواست کر دی۔ ”شاگرد کیا کوئی صاف سوٹ مل سکتا
شلوار قمیض یا پینٹ شرٹ؟“
”کیوں نہیں صاحب، اگر آپ نے اپنے
دھولانے ہیں تو وہ بھی مجھے دے دیں۔“
اس نے مجھے ایک استعمال شدہ اونٹنی ٹراؤزر اور
موٹی جری لادی کوشی کے اندر کی حد تک بے لباس کافی تھا
میرے پہلے پکڑے اور جو تے موزے لے گیا۔ اس نے
کہ دو گھنٹے میں یہ صاف ہو کر مل جائیں گے۔ ایک طرف
بیٹھ صوفہ اور اس کے آگے چھوٹی ٹیبل کی ٹاپ والی میز
اس پر ایک ٹرے میں رول سموے، چنے کی جات اور
بھلے رکھے تھے۔ یہ سب نعمتیں یہاں دیکھ کر مجھے
آنکھوں پر یقین نہیں آیا تھا اور جب میں پوئی ٹرے صاف
چکا تھا تب بھی میرا شک برقرار تھا۔ اوپر میں نے
صاف کی اور آٹھ شاگرد کسی جین کی طرح کافی لے
نے دل کی گہرائیوں سے اس کا شکریہ ادا کیا۔ ”اللہ

خوش رکھے دوست اس وقت میں کچھ اور مانگتا تو شاید وہ بھی
مل جاتا مگر ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ بندہ کافی کی خواہش کرے
اور اللہ اسے چائے بھجوا دے۔“ میں نے کہا اور پہلا پل لیا
طبیعت نہیں کیف کی مہک ہے تر و تازہ ہو گئی تھی میں نے
کھانے کی چیزوں کی تعریف کی تو وہ خوش ہو گیا۔
”یہ سب میں نے خود بنایا ہے صاحب۔“
”شاگرد میں نے کہیں بھی یہ ٹیبل چیزیں اتنے مزے
کی نہیں کھائی ہیں۔“
”ارے نہیں صاحب۔“ اس نے انکساری سے
کہا۔ ”میں تو بس ٹھیک بنالیتا ہوں۔“
”اس کا کیا ہوا؟“ میرا اشارہ کرل زریسکی کی طرف تھا۔
”صاحب نے کوئی نکال کر پٹی کر دی ہے۔ ابھی
اسے نیند کا انجکشن دے کر سلا یا ہوا ہے۔ رات تک وہ بہتر۔۔
بھولے گا۔“
”اس کا خون بھی بہت نکلا ہے۔“
”اسے طاقت کا انجکشن بھی دیا ہے۔“ شاگرد نے
بتایا۔ ”وہ مضبوط آدمی ہے اس کے لیے یہ معمولی
زخم ہے۔“
مجھے خیال آیا کہ اگر یہاں راپلے کا کوئی ذریعہ تھا تو
میں عبداللہ کو اطلاع دے سکتا تھا لیکن پوچھنے پر شاگرد نے بتایا
کہ کوئی میں فون ہے لیکن لائن پچھلے تین دن سے مردہ ہے
اس موسم میں یہ خرابی آئے دن ہوتی تھی۔ میں مایوس ہو گیا
تھا۔ کسی ہنگامی حالت میں وہ فون کرنے کے لیے کوئی دس
کلومیٹر دور ایک قصبے تک جاتے تھے۔ اس وقت شام کے چار
بج رہے تھے اور میں نے سوچا کہ کچھ دیر سو جاؤں میں نے
شاگرد سے کہا۔ ”مجھے نوبتے اٹھا دینا۔“
اس کے بعد جو میں سویا تو شاگرد نے باقاعدہ ہلا کر
مجھے اٹھایا۔ ”جناب نونج گئے ہیں اور صاحب کھانے کی
میز پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ سات بجے شام کو کھانا
کھا لیتے ہیں۔“
میں غلبت میں منہ ہاتھ دھو کر ڈائننگ ہال میں پہنچا
تو کرل فیال دین میز پر موجود تھے میں نے تاخیر پر
معذرت کی۔
”کوئی بات نہیں۔“ وہ مسکرائے۔ ”ہم تو نوجوانی میں
بھی ایسی چیزیں نہیں سوتے۔“
کھانے میں بھیڑ کے گوشت کا پلاؤ تھا اور شامی

کیا اب تھے بغیری نان کے ساتھ کمرے کا بھنا گوشت
تھا۔ لیکن کرل نے بہت تھوڑا سا کھایا تھا۔ اس نے اصرار
کر کے مجھے زیادہ ہی کھلا دیا تھا۔ کھانا بھی لذیذ تھا اور میں
زیادہ ہی کھا گیا۔ آخر میں میرے لیے سائس لینا بھی
مشکل ہو رہا تھا لیکن اس نے کہا۔ ”میرے پاس اس کا
علاج بھی ہے۔“
کھانے کے بعد شاگرد نے خاص قسم کا قہوہ پیش کیا
جس سے بڑی عجیب سی مہک اٹھ رہی تھی۔ لیکن اس نے کام
دکھایا اور قہوہ ختم ہوتے ہوتے پیٹ کی گرانی بھی ختم ہو گئی تھی
اور ایسا لگ رہا تھا جیسے میں نے معمول سے بھی کم کھایا
ہے۔ ”کرل صاحب میں آپ کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔“ میں
نے کہا۔ ”آپ نے واقعی میری مدد کی ہے۔“
”ایک زخمی آدمی کی معمولی سی دیکھ بھال اور دو وقت کا
کھانا کوئی مدد تو نہیں ہوتی۔“
”بات مزہم پٹی یا دو وقت کے کھانے کی نہیں ہے
بات اس ضرورت کی ہے جو صرف آپ نے پوری کی ہے اور
ہمیں یہاں کہیں سے ایسی مدد نہیں مل سکتی تھی۔“
”اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟“
”میرا تھیدی کس حالت میں ہے؟“
”اس کا بخار اتر گیا ہے اور زخم کی تکلیف بھی قابل
برداشت ہوگی۔ وہ چند گھنٹوں کے لیے سفر کر سکتا ہے اس کے
بعد اس کی طبیعت خراب ہونا شروع ہو جائے گی۔“
”میں چند گھنٹوں کا کام ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس
کے بعد میں اسے آزاد کر دوں گا۔“
کرل عبدالرحمن ہوش میں تھا اور جج جج بہتر حالت
میں تھا۔ کرل فیال دین نے کوئی نکال کر اچھی طرح پٹی کی
تھی۔ جدید قسم کی سیلنگ سے اس کا بازو اس طرح لٹکا دیا تھا
کہ اسے چلنے پھرنے اور اٹھنے بیٹھنے میں دشواری نہ ہو۔ کرل
فیال دین سے مل کر اور اجازت لے کر جب میں کرل کو لیے
باہر آیا تو رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ کوئی سے کل
کر میں نے دین کا رخ واپس اسی طرف موڑا جہاں سے ہم
آئے تھے۔ عین ممکن تھا وہاں دشمن گھات لگائے بیٹھے ہوں
لیکن یہ خطرہ مجھے رد کرنے کے لیے نا کافی تھا۔ راستے میں کرل
نے بھی ممکن حد تک مجھے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ میں
بھڑوں کا چمٹا چمپیر نے جارہا ہوں اور مجھے بھارتیوں سے پنگا
لینے سے گریز کرنا چاہیے۔
”تم بھول رہے ہو مجھے انہو کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”اگر کوئی زہریلا سانپ یا آدم خور شیر تمہارے پیچھے لگ جائے تو بھاگو گے یا اس سے مقابلہ کرنے کی کوشش کرو گے۔“

”عام آدمی ہوگا تو اس کے لیے بھاگنے میں ہی عافیت ہے لیکن تم جانتے ہو میں عام آدمی نہیں ہوں۔ میں دشمن سے چسپ نہیں سلکا اور سکون سے بیٹھ بھی نہیں سلکا۔۔۔۔ اس لیے اگر کوئی دشمن سامنے آئے تو کیوں نہ میں اس کا پھن چل دوں۔ صرف اس بنیاد پر پیچھے ہٹ جانا میرا طریقہ نہیں ہے۔ گرو دشمن کی دشمنی میں شدت نہ آجائے۔“

کرٹل مایوس ہو گیا۔ ”تم نہیں مانو گے۔“
”بالکل نہیں اس لیے اس معاملے میں شٹ اپ۔“
میں نے کہا۔ ”دوسری کوئی بات کرو مثلاً یہ کہ بھارتیوں سے تمہاری اتنی ہوا کیوں خراب ہو رہی ہے جبکہ ایک طرح سے تم ان کے کاؤں میں سے ہو۔“

”ہم کبھی تھے۔“ کرٹل نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”کیا جہیں نہیں معلوم انہوں نے آقا تبدیل کر لیے ہیں۔“
”اس کے باوجود تم لوگ بھی ان سے پُرانے تعلقات پوری طرح بھارے ہو۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔ ”آج سچی روی اسلحہ کا سب سے بڑا خریدار بھارت ہے۔“

”میں اب فری لانسر ہوں اور ان لوگوں کو جواب دہ ہوں۔ جو میری خدمات حاصل کرتے ہیں۔“
”میرا خیال ہے تم ان کو جواب دینے کی زحمت سے بچ جاؤ گے۔“ میں نے کہا۔ ”یا تو وہ میرے ہاتھوں مارے جائیں گے یا پھر میں مارا جاؤں گا۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اگر وہ مارے گئے تب بھی مجھ سے پوچھا جائے گا۔ کیونکہ تمہیں ان کے حوالے کرنا میری ذمہ داری ہے۔“

”تم کہہ سکتے ہو کہ تم نے حوالے کر دیا تھا اب آگے کیا ہوا اور میں کس طرح نکل گیا تم اس بارے میں کچھ نہیں جانتے۔“

”ایک دفعہ میں عذر کر کے بچ گیا تھا لیکن دوسری بار وہ مٹکوک ہو جائیں گے۔“

”ہوئے دو تمہاری پیلا سے۔“ میں نے جھنجھلا کر کہا۔ ”بھارت میں جاؤں بھارتی اور تم۔۔۔۔“

نصف کھٹے بعد ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں سڑک سے کچھ فاصلے پر وہ چھوٹی سی جگہ میں تھی اور خاں کو لایا

گیا تھا۔ میں نے کرٹل کی طرف دیکھا۔ ”اب یہاں سے تم میری رہنمائی کرو گے۔“

”اور اگر میں نہ کروں تو۔۔۔۔؟“

میں نے پستول نکال کر اس کی کینٹی پر رکھ دیا۔ ”اس صورت میں میں تمہاری لاش یہیں چھوڑ جاؤں گا فیصلے کے لیے تمہارے پاس ایک منٹ ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے کچھ دیر بعد کہا وہ سمجھ گیا کہ میں وہی کروں گا جو کہہ رہا ہوں۔ ”میں تیار ہوں۔“

میں نے پستول ہٹا لیا۔ ”اب بتاؤ کہاں چلنا ہے؟“

”اسی سڑک پر آگے جانا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”پھر دائیں طرف ایک چکی سڑک پر مڑنا ہے۔“

”چکی سڑک یہاں سے کتنی دور ہوگی؟“

”تقریباً دو کلومیٹر۔“

”اس کے بعد نکلتا جانا ہے؟“

”دو کلومیٹر اور جانا ہے۔“

میں نے وین آگے بڑھا دی۔ ”بھارتی کب تک وہاں پہنچیں گے؟“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں تم کو لے کر مجھے بارہ بجے وہاں پہنچنا تھا۔“ اس نے بتایا۔ میں نے اس چکی سڑک سے پہلے ہی وین ایک جگہ دیکھ کر سڑک سے انار کی اور جھاڑیوں میں گھسادی۔ کرٹل چونکا۔ ”کیا کیا کر رہے ہو؟“

”خاموش رہو۔“ میں غصا رہا۔

وین یہیں روک کر میں کرٹل کے ساتھ نیچے اتر آیا۔ کچھ اور جھاڑیاں ڈالنے سے وین مکمل طور پر کیموفلاج ہو گئی تھی۔ کرٹل خاموشی سے ایک طرف کھڑا یہ کارروائی دیکھ رہا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ میں اس طرح اس مقام تک نہیں پہنچتا چاہتا تھا جیسے کرٹل مجھے لے جاتا۔ میں بھارتیوں کی بے خبری میں وہاں تک جانا چاہتا تھا۔ ایک لمحے کو مجھے خیال آیا کہ کیا

میرا اس طرح جانا حماقت تو نہیں ہے۔ پتا نہیں بھارتیوں نے پہلی ہزیمت کے بعد مجھے وہاں لے جانے کے لیے کیا انتظامات کر رکھے ہوں؟ اس بار وہ مجھے زمینی راستے سے لے جاتے اور اس میں زیادہ محتاط رہنا پڑتا۔ مگر پھر میں نے احتیاط کا خیال ذہن سے نکال دیا۔ مجھے پہلے بھی اللہ پر بھروسہ تھا اور اب بھی میں اسی کے بھروسے پر اپنے دشمنوں سے خائف جا رہا تھا جو صرف میرے نہیں میرے ملک کے بھی دشمن تھے۔ روانہ ہونے سے پہلے میں نے کرٹل کی طرف دیکھا۔ ”میرا خیال ہے تم چند کلومیٹر کا سفر پیدل کر سکتے ہو

اور جہیں یہ بتانے کی ضرورت بھی نہیں ہے کہ کسی قسم کی دھوکا دہی کی صورت میں میرا اولین نشانہ تم ہو گے۔“

”تم قلمت کرو۔“ اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”میں کوئی حماقت نہیں کروں گا۔“

ہم نے سڑک پر پیدل مارچ شروع کی تو کرٹل نے ایک بار پھر مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”شہباز تم حماقت کر رہے ہو وہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔“

”میں جانتا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”تم مجھے بتانے کی زحمت نہ کرو ابھی کل تک تم بھی بہت خطرناک تھے اور اب تم ایک بے بس قیدی ہو۔“

”جیسی تمہاری مرضی۔“ اس نے غالباً خون کے مگھونٹ پی کر کہا۔

دس منٹ بعد ہم اس کپڑے رستے تک پہنچ گئے تھے لیکن یہاں سے میں نے اس سفر کرنے کے بجائے ذرا آگے نکل کر درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان چلنے کو ترجیح دی تھی۔

اگر کوئی اس راستے کی نگرانی کر رہا تھا تو اسے ہماری آمد کا علم نہیں ہوتا لیکن میں کسی خوش فہمی کا شکار نہیں تھا۔ وہ لوگ ایشی جنس سے تعلق رکھتے تھے اور انہیں نگرانی کے دس طریقے آتے تھے جس طرح میں نے متبادل راستہ اختیار کیا تھا اسی طرح وہ بھی سوچ سکتے تھے اور اس متبادل راستے کی نگرانی کر سکتے تھے۔ مگر مفرور خطرے کی بنیاد پر میں پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا کوئی نصف گھنٹے بعد ہم اس جگہ کے قریب تھے جہاں۔۔۔

یہ قول کرٹل کے میری حواگی نکل میں آتی تھی۔ جیسے ہی کرٹل نے اس جگہ کی نشان دہی کی میں نے وہ کیا جو سوچا ہوا تھا۔ میں نے پستول کے دھتے سے اس کے سر پر ضرب لگائی۔ ٹپکی سی کراہ کے ساتھ وہ زمین پر لڑھکتے لگا۔ میں نے اسے تھام کر آرام سے نیچے لٹا دیا اور آہستہ سے کہا۔ ”اب تم آرام کرو باقی میں خود دیکھوں گا۔“

کرٹل کو ایسی جگہ لٹا کر جہاں اسے آسانی سے نہ دیکھا جاسکے میں درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ لینا ہوا اس طرف بڑھنے لگا جہاں بھارتیوں کو آنا تھا یا آچکے تھے۔ یہ دو

جھاڑیوں کے درمیان ایک چھوٹا سا درہ تھا۔ میں زمین پر لیٹ گیا جو برف کی طرح ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ آسمان پر چاند موزون تھا اور اس کی ہلکی روشنی میں کھلی جگہیں صاف دکھائی دے رہی تھیں جبکہ درختوں سے بھی کسی کی حرکت محسوس کی جاسکتی تھی۔ اس لیے میں نے لیٹ جانا مناسب سمجھا۔ میرے پاس ایک عدد شارٹ کن اور دو عدد پستول تھے

لیکن کھلی جگہ دو بدو مقابلے کے لیے یہ تینوں ہتھیار نا کافی تھے۔ ان کے بجائے اگر ایک سی آئی ٹیک رائفل ہوتی تو وہ کہیں زیادہ کارآمد ہو سکتی تھی۔ بہر حال مجھے بھارتیوں سے مقابلہ تو کرنا تھا۔ اگر میں انہیں بے خبری میں نشانہ بناتا تو یہ ہتھیار بھی بڑے نہیں تھے۔

زمین پر لیٹنے سے ٹھنڈ تیزی سے میرے جسم میں سرایت کرنے لگی۔ جبکہ گرم تھی لیکن اتنی گرم نہیں تھی مجھے زمین سے آتی ٹھنڈ سے محفوظ رہتی۔ مجبوراً میں اٹھا اور ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔ یہ پوزیشن بہتر تھی اس میں میرا دوسری جسم زمین سے نہیں لگ رہا تھا البتہ پاؤں ٹھس رہے تھے۔ میں نے شارٹ کن بنے پر مڑی ہوئی تھی اور پستول بائیں ہاتھ میں تھا میں کسی بھی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھا۔ وقت ست روی سے گزر رہا تھا شاید ایک چاق تھا اور ابھی تک کسی کی آمد کے آثار نمایاں نہیں ہوئے تھے۔ اگر بھارتی پہلے سے آگئے تھے اور کہیں جیسے ہوئے انتظار کر رہے تھے تو ان کی استقامت قابل تعریف تھی کیونکہ ایک گھنٹے میں میرا اڑا حال ہو گیا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ کٹھن کر چل قدی شروع کر دوں اور اپنے جسم کے اکڑ جانے والے رگ بچھے کھولوں۔ دو بجے تک میں دل ہی دل میں ان لوگوں کو گالیاں دے رہا تھا جو نہ جانے کہاں مر گئے تھے۔

اچانک کہیں سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی پرندہ بولا ہو۔ حالانکہ اس سے پہلے کوئی پرندہ نہیں بول رہا تھا۔ ماحول مکمل طور پر خاموش تھا۔ فوراً ہی نہیں پاس سے دوسرا پرندہ بولا۔ اس کے بعد تیسرے پرندے نے بھی آواز نکالنا ضروری سمجھا۔ اتنے تواتر سے اور سوچ کچھ کر پرندے آواز نہیں نکالتے ہیں جب تک ان کے ساتھ کوئی مسئلہ نہ ہو۔ نصف رات کو کوئی مسئلہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ پرندے اپنے تمام معمولات دن میں نمٹا لیتے ہیں سوائے الو کے۔ اگر وہ الو کی آواز نکالتے تو شاید میں دھوکا کھا جاتا۔ یہ انسان ہی تھے جو پرندوں کی آواز میں نکال کر پیغام رسانی کر رہے تھے۔ میں چونکا ہو گیا۔ دشمن کہیں آس پاس ہی تھا وہ ان اشاروں کی مدد سے ایک دوسرے کو پیغام دے رہے تھے۔ کیا انہوں نے مجھے دیکھ لیا تھا یا یہ پوچھ رہے تھے کہ ہمارا مطلوبہ شکار ابھی تک کیوں نہیں آیا ہے؟ میں جہاں بیٹھا تھا وہیں درختوں کے درمیان گھس گیا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ رات میں نگرانی کرنے کے لیے سب سے

موثر چیز نائٹ ویزٹن دور بین ہے اور یہ اب عام ملنے لگی ہے تو کیا ان لوگوں کے پاس نہیں ہوگی؟

میں ممکنہ حد تک تحوں کی آڑ میں ہو گیا تھا۔ نائٹ ویزٹن اصل میں انفرادی روشنی کو دیکھ لیتی ہے جو کسی جسم کی حرارت کی وجہ سے خارج ہوتی ہے۔ انسانی جسم درخت یا چٹان سے زیادہ حرارت خارج کرتے ہیں اس لیے وہ الگ سے اور نمایاں نظر آتے ہیں۔ کسی آڑ میں ہونے سے کسی حد تک محفوظ ہو جاتا ہے لیکن طاقتور نائٹ ویزٹن دیوار کے پیچھے بھی دکھا سکتی ہے۔ میں نے دل ہی دل میں دعا کی کہ ان لوگوں کے پاس نائٹ ویزٹن نہ ہو ورنہ میں بہت آرام سے نظر آ جاتا۔ ویسے مجھے امید کم ہی تھی کہ ان لوگوں کے پاس نائٹ ویزٹن نہیں ہوگی اگر مجھے پہلے اس چیز کا خیال آ جاتا تو میں اس طرح یہاں کا رخ نہ کرتا بلکہ کچے راستے کے اس حصے پر ان لوگوں کا انتظار کرتا جو پکی سڑک کی طرف جاتا تھا یہاں سے مایوس ہو کر وہ اسی طرف سے کہیں جاتے۔ اس علاقے کی ساخت سے لگ رہا تھا کہ یہاں آنے جانے کے لیے وہی پکی سڑک استعمال ہوتی ہے کیونکہ آگے تو مزید اونچے اور ناقابل گزر قسم کے پہاڑ دکھائی دے رہے تھے۔

جیسے ہی یہ خیال آیا میں نے پیچھے کی طرف سرکنا شروع کر دیا۔ اس خیال پر تواب بھی مل گیا جاسکتا تھا۔ خوش قسمتی سے اگر میں اب تک بھارتیوں کی نظر میں آنے سے بچا رہا تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ آگے بھی بچ سکتا ہوں۔ اس لیے میرا جلد از جلد یہاں سے نکل جانا ضروری تھا۔ میں اندازے سے اس مقام تک آیا جہاں کرنل کو چھوڑ کر گیا تھا اور جب میں نے اسے ان درختوں کے درمیان تلاش کیا تو وہ وہاں نہیں تھا۔ میں دم پر خود رہ گیا تھا۔ نہ جانے وہ کس وقت ہوش میں آ گیا تھا اور موقع پاتے ہی وہاں سے غائب ہو گیا تھا۔ میں نے اس کی طرف سے غفلت برتی تھی اسے صرف بے ہوش کر دینا کافی سمجھا تھا اگر میں اسے باندھ کر جاتا تو اس کا باپ بھی یہاں سے فرار نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے کرنل پر لعنت بھیجی وہ اس قابل نہیں تھا کہ یہاں رک کر کچھ پر قابو کی سوچتا اس نے یقیناً موقع ملے ایسی دوڑ لگائی ہوگی کہ دوبارہ مرکز نہیں دیکھا ہوگا۔

میں اب اس جگہ سے دور نکل آیا تھا اس لیے بے دھڑک چل رہا تھا لیکن ساتھ ہی میرے کان عقب پر گئے تھے اگر کوئی میرا پیچھا کرتا تو یقیناً کچھ نہ کچھ آئیں تو ہوش جیسے میرے چلتے سے ہو رہی تھیں۔ میں چلتے چلتے یک دم

رک کر رہ گیا تھا۔ اگر کوئی پیچھے ہوتا تو وہ اپنی رفتار یک دم نہیں توڑ سکتا تھا اور مجھے اس کی آہٹ مل جاتی لیکن پکی سڑک تک آتے آتے مجھے ایسی کوئی آہٹ سنائی نہیں دی تھی۔ مرکز تک آ کر میں نے اس مقام کا جائزہ لیا جہاں جیگی اور پکی سڑکیں آپس میں مل رہی تھیں اگر بھارتی اسی طرف سے واپسی کا راستہ اختیار کرتے تو میں انہیں روک سکتا تھا۔ صرف روک ہی نہیں سکتا تھا بلکہ جنم پر سیدی کر سکتا تھا اس مقصد کے لیے میں نے پکی سڑک کے بائیں طرف ایک اونچی جگہ جی لی۔ یہاں دو چٹانوں کے درمیان پیالے نما جگہ قدرتی طور پر کام دیتی یہاں سے میں دونوں راستوں پر نظر رکھ سکتا تھا بلکہ حملہ کرنے کے لیے یہ جگہ بھی بہتر تھی۔

رات کے دو بج رہے تھے اور ابھی صبح ہونے میں خاصا وقت تھا۔ سردی کی شدت بڑھ گئی تھی اور صبح روشنی ہونے تک اس کی شدت برقرار رہتی۔ میں چٹانوں کے درمیان گھس کر بیٹھ گیا۔ اوپر چند گھنٹے درخت تھے اس لیے چاندنی میں بھی مورچہ چتا رہا ایک تھا البتہ راستے بالکل صاف نظر آ رہے تھے۔ اچانک کچے راستے کی طرف سے کسی کی حرکت محسوس ہوئی۔ کوئی درختوں کے درمیان چل رہا تھا لیکن وہ تھوڑا سا چلتا اور پھر رک جاتا۔ اس کی موجودگی کا پتا اس کے قدموں کی چاپ نے دیا تھا۔ وہ بہت محتاط تھا۔ میں نے نظر بجا کر دیکھا اور پھر اسے پہچان لیا وہ کرنل تھا۔ اس کا ایک جھوٹا بازو اس کی شناخت تھا۔ پچھر خالی ہاتھ تھا جیسے کہ بھارتی لازمی مسلح ہوتے۔ کرنل ابھی تک نہیں تھا۔ میرا اندازہ غلط ثابت ہوا تھا کہ وہ بھاگ نکلا تھا۔ شکر ہے مجھے اندازے کی اس غلطی کا خیاں نہ نہیں بھگتنا پڑا ورنہ وہ کہیں ایک عدد ڈنڈا لیے گھات میں ہوتا اور پاس سے گزرتے ہی میرے سر پر سیدی کرتا تو اُمی ہو جاتا میں سب تدبیریں۔

کرنل بہت چالاک تھا۔ یقیناً اس کے ذہن میں یہ خیال ہو گا کہ میں نہیں کہیں آس پاس گھات لگائے بیٹھا ہوں اور جیسے ہی وہ پکی سڑک کی طرف جائے گا میری نظروں میں آ جائے گا۔ یہی خیال اسے مرکز پار کرنے سے روک رہا تھا۔ اگر وہ اُٹنی طرف جا کر پکی سڑک پر کھٹا تب بھی اسے دین کی طرف جانے کے لیے اسی سمت سے گزرتا پڑتا اور وہ میری نظروں میں آ جاتا میں نے سوچ لیا کہ اگر وہ دین والی سمت گیا تو میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔ اس علاقے میں یہ دین ہی واحد چیز تھی جو مجھے یہاں سے باہر لے جاسکتی تھی ورنہ اس موسم میں ان پہاڑوں پر بھٹکنے کا سوال

ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میری نظریں اس پر مرکوز تھیں۔ بالاخر وہ حرکت میں آیا اور درختوں کے نیچے ہی ڈھلان کے ساتھ ساتھ پکی سڑک کے دوسری طرف جانے لگا۔

کچھ دیر بعد وہ گھوم کر میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ کرنل نے عقل سے کام لیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر اس نے دین کی طرف جانے کی کوشش کی تو اس کا امکان تھا کہ میری نظروں میں آ جائے گا اور میں اسے دین لے جانے کی اجازت نہیں دوں گا اس لیے اس نے متبادل راستہ اختیار کیا۔ وہ اُٹنی طرف چلا گیا۔ اسے معلوم تھا کہ میں بھارتیوں کی گھات میں ہوں اور اگر میں نے اسے دیکھ بھی لیا تو پچھلے کے ڈر سے اسے چھپنے سے گریز کروں گا۔ وہ جیو اور جینے دو کے فارمولے پر عمل کر رہا تھا۔ میں اس کی توقع پر پورا اُتر اور اسے جانے دیا۔ اس چکر میں تین بج گئے تھے اور اب تک بھارتی دکھائی نہیں دیے تھے۔ مجھے شبہ ہونے لگا کہ کہیں بھارتی کسی اور طرف سے تو نہیں آئے تھے اور اب اسی سمت نکل گئے ہوں گے۔ مجھے اس علاقے کے بارے میں زیادہ علم نہیں تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو میں احمق بن کر یہیں بیٹھا رہ جاتا۔ بہر حال یہ ایک چانس تھا۔ جو میں نے لیا تھا اگر بھارتی میرے ہاتھ نہیں آتے تو میں بھی کون سا ان کے ہاتھ آ گیا تھا اس لیے حساب برابر ہو جاتا۔

چار بجے یک دم ہی آسمان پر باد پڑا پھانے لگے اور یہ خاصے خطرناک قسم کے بادل تھے۔ چاند چھپ گیا اور ماحول تاریک ہو گیا۔ بس ایک ہلکا سا روشنی کا احساس باقی رہ گیا تھا۔ بادلوں کی آمد کے ساتھ ہی ہلکی سرد ہوا چلنے لگی۔ مشکل سے آدھے گھنٹے بعد یہ ہوا قیامت خیز ہو چکی تھی اور آسمان سے برف کے گولے آڑے تیرتے گر رہے تھے اس لیے یہ براہ راست آنکھوں اور منہ میں گھسے جلے آ رہے تھے۔ یہ ایک نئی آفت تھی جو اچانک ہی نازل ہو گئی تھی۔ اس علاقے میں موسم کی یہ اچانک تبدیلی کوئی نئی بات نہیں تھی۔ مگر اس نے میرے عزائم کو کمزور کر دیا تھا۔ آڑنی برف نے ماحول کو تقریباً اندھا کر دیا تھا اور تیز ہوا کے مقابل آنکھیں کھلی رکھنا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ طوفان آنے کے آدھے گھنٹے کے اندر میں نے یہاں سے جانے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ اگر میں کچھ دیر یہاں رہا تو سردی سے اکثر کمر جاتا۔ اس طوفان میں کھلی جگہ ایک گھٹا گزرا تا خوشی کے مترادف ہو سکتا تھا۔ میرے جسم پر کپڑے بھی اتارے گئے نہیں تھے۔

میں اُتر کر نیچے کچے راستے تک آیا۔ اسی لمحے پیچھے

سے بجلی کی چمکی میں نے مرکز دیکھا۔ یہ ایک گاڑی تھی جو کچے راستے پر اسی طرف چلی آ رہی تھی اور روشنی اس کی طاقتور ہیڈ لائٹس کی تھی۔ میں پلٹ کر بھاگا۔ گاڑی مشکل سے سو گز دور تھی اور اس کا امکان بھی تھا کہ اس میں سوار افراد نے مجھے دیکھ لیا ہو۔ مورچے والی چٹانوں تک جانے کا وقت نہیں تھا۔ میں دو برابر آگے بڑھے تو والے درختوں کے پیچھے آ گیا۔ ان کے سنے مجھے محفوظ دے سکتے تھے۔ اب سوال یہ تھا کہ آنے والے کون تھے؟ اگر وہ بھارتی تھے تب میں ان کو روکنے کی کوشش کرتا مگر یہ معلوم کرنا تقریباً ناممکن تھا کہ گاڑی میں کون تھا اور میں یہ جانے بغیر فائر کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا میرے ہاتھ سے کسی بے گناہ کا خون ہو جاتا اور یہ مجھے گوارہ نہیں تھا۔

ابھی میں اس کشمکش میں تھا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں کہ وہ گاڑی وہیں آ کر رکی جہاں ایک منٹ پہلے میں تھا اور اس کے چاروں دروازے یک دم کھلے اور ان سے بیک وقت چار افراد نیچے اُترے۔ ان میں سے جو دوسری طرف تھے انہوں نے وہیں گاڑی کے پیچھے مورچہ چھپ سنبھال لیا اور دو اس طرف تھے انہوں نے اوپر ڈھلان کی طرف خود کار رائفلیں تان لیں۔ شب کی کوئی تلاش نہیں تھی یہ بھارتی تھے اور میری تلاش میں تھے۔ شامت کے بارے میں خود نیچے پہنچ گیا اور عین اسی وقت گاڑی کی روشنی میں نظر بھی آ گیا۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا اور وہ مجھے واپس ڈھلان کی طرف جاتے ہوئے بھی تاڑ لیا تھا۔ انہوں نے کمانڈر والی حکمت عملی اپنائی تھی۔ دوا آگے تھے اور دو ان کو پیچھے سے محفوظ دے رہے تھے۔

اگر وہ اوپر آ جاتے تو میرے لیے مقابلے کی گنجائش کم ہو جاتی اور اس صورت میں مجھے ہتھیار ڈالنے پڑتے یا مرنے پڑتا۔ دونوں باتیں مجھے منظور نہیں تھیں اس لیے میں نے فوری مقابلے کا فیصلہ کیا اور پہلے ذرا پیچھے اور محتاط انداز میں چلنے والے شخص کا نشانہ لیا۔ تیس گز کے فاصلے سے شاہد گن کا نشانہ خطا جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے دھماکے کے ساتھ ہی شاہد گن کا رخ دوسرے شخص کی طرف کر کے گولی چلائی۔ اتنی دیر میں وہ ہوشیار ہو کر ایک درخت کے عقب میں چھلا گیا لگا رہا تھا لیکن وہ ہوش تھا۔ گولی نے اس کی ٹانگ کو کھنسنے سے ذرا اوپر تقریباً کٹ دیا تھا۔ اس نے کرب ناک چیخ ماری جو طوفان اور شاہد گن کے دھماکے میں دب کر رہ گئی تھی۔ دکن دس سیکنڈ میں اپنی آدمی سپاہ سے

محروم ہو گیا تھا۔

نیچے بیک اب کے لیے موجود دونوں افراد نے درختوں کی طرف فائرنگ شروع کر دی تھی اور انہوں نے شادریں سے نکلنے والے اولین شعلے سے میری لوکیشن کا اندازہ کر لیا تھا۔ اس لیے دوسرا فائر میں نے بہت خطرہ مول لے کر کیا تھا۔ میرے آس پاس گولیاں برس رہی تھیں اور میں انہیں نظر انداز کر کے دوسرے کو نشانہ بنا رہا تھا۔ دوسرا شات چلاتے ہی میں سنے کی آڑ میں ہو گیا اور پھر لیٹ کر ریٹکٹ ہوا دوسرے سنے کی آڑ میں چلا گیا۔ اس دوران میرے ہاتھ شادریں کن کے خالی ہو جانے والے خالوں کو لوڈ کر رہے تھے۔ دوسرا آدی جوشن بنا تھا وہ ڈھلان پر بڑا چلا رہا تھا۔ مگر نیچے والوں کو اس کے بجائے میری فکرمشغلی میں نے دو آدی مار کر آدی جنگ جیت لی تھی اور اب وہ جارحیت چھوڑ کر دفاعی پوزیشن پر آئے تھے۔

ان کے پاس خود کار رائفلیں تھیں اور وہ بے دریغ ان کا استعمال کر رہے تھے۔ گولیاں اتنے تو اتنے تو اسے تنوں پر برس رہی تھیں کہ مجھے سر نکلنے کا موقع بھی نہیں مل رہا تھا۔ دیے ان کا زیادہ زور اس سنے پر تھا جس کے پیچھے میں نہیں تھا۔ بالآخر ایک کی رائفل کی ختم ہوا اور وہ اسے تبدیل کرنے لگا۔ دوسرا دوسرے سنے پر فائر کر رہا تھا۔ میں نے شادریں کن نکال کر جب کے بوٹ پر فائر کیا۔ جو وہ شیلڈ پر لگا اور وہ بکھر گئی۔ دوسرا فائر میں نے جب کے اندر کیا وہ اتنا بوکھلائے کہ نیچے جھک گئے اس لیے اگلا فائر میں نے اطمینان سے کیا اور جب کا اگلا پیر برست کر دیا۔ اس کے چھوڑے اڑ گئے تھے۔ دوسرے فائر سے اس طرف کا پھلپھلایا پیر بھی اڑا دیا۔ شاید اس کے پیچھے جس کو بھی چوٹ آئی تھی کیونکہ اس نے بے ساختہ پنجابی میں گالی دی تھی اور لہجہ لاہوری تھا۔

”سر دار اپنی زبان قابو میں رکھو۔“ دوسرے نے تصدیق کرتے ہوئے کہا۔

”وہا تیرے منہ سے گدڑا میں نے پھندا۔“ سردار نے بلبل کر کہا۔ شاید گولی زمین سے لگی تو کوئی پتھر اڑ کر اس کے منہ سے جا لگا تھا۔

”وٹال مارا گیا ہے۔“ پہلے نے کہا۔ ”گوتم زخمی ہے۔“

”اپنی فکر کرو۔“ سردار جی غصے سے بولے۔
مجھے حیرت ہوئی کہ بھارتیوں نے کچھلی ہزیمت اور میرے ٹیک ریکارڈ سے بھی کوئی سبق نہیں سیکھا تھا۔ انہوں

نے اس بار بھی صرف چار آدمی بھیج دیے تھے۔ ان میں سے دو تو فوراً مارے گئے تھے اور دو ابھی دفاعی پوزیشن میں تھے۔ لیکن وہ مدد کے لیے ایس والیں دے سکتے تھے۔ میں نے جب کے اگلے والے حصے پر مزید فائر کر کے کہا اگر اس میں کوئی ریڈ ہو تو وہ ناکارہ ہو جائے۔ دوسرے وہ جب میں گھسنے کی ہمت نہ کریں۔ انہوں نے میگزین ری لوڈ کر لیے تھے اور اب دوبارہ گولیاں ضائع کر رہے تھے۔ لیکن یہ ان کی چالاکی تھی۔ وہ فائر کر کے مجھے دیکھ رہے تھے پر مجبور کر رہے تھے تاکہ میں ان کی اگلی حکمت عملی نہ بھانپ سکوں۔ وہ دیکھ ہم بھینکنے چارے تھے۔ مجھے تو اس کی آمد کا پتا بھی نہیں چلا اور وہ میرے پاس گرا لیکن ڈھلان ہونے کی وجہ سے لڑھکھا ہوا تنوں سے ذرا آگے گیا اور پھر پھینا۔ وہ مجھ سے مشکل سے چار گز دور ہوگا۔

دھماکے نے میرے کان سن کر دیے تھے اور کچھ دیر مجھے کچھ سنائی نہیں دیا تھا۔ صرف کان ہی نہیں بلکہ اعصاب بھی سن ہو گئے تھے۔ البتہ سنے نے مجھے ہم کے اڑتے ٹکڑوں سے بجایا تھا۔ نہ میں ادھر کر رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس کی کیفیت میں کتنی دیر گزری لیکن اچانک ہی میری چھٹی جس نے چونکا اور میں نے بے ساختہ پھپھول نکالتے ہوئے نیچے کی طرف اندھا دھند فائرنگ کی۔ میں نے خود سامنے آنے سے گریز کیا تھا اور میرا مقصد کسی کو نشانہ بنانے سے زیادہ انہیں یہ بتانا تھا کہ میں زندہ ہوں اور اس قابل ہوں کہ ان سے منٹ سکوں۔ دیکھ ہم بھینکنے ہی انہوں نے اوپر کی طرف دوڑ لگائی تھی۔ قدرت ایک بار پھر مجھے پرہیزبان ثابت ہوئی۔ میری چلائی ہوئی اندھا دھند گولیاں نشانے پر لگیں ان میں سے سردار جی چلائے اور اس نے اپنی پنجابی میں بے اختیار کچھ کہا لیکن جو مجھے صاف سنائی نہیں دیا لیکن ظاہر ہے میری مذمت میں تھا۔

دوسرا یقیناً جنوبی ہند سے تعلق رکھتا تھا، اس کا لہجہ بتاتا تھا۔ وہ بدحواسی میں واپس بھاگا اور جب تک میں اٹھ کر اسے نشانہ بنانے کی کوشش کرتا وہ واپس جب کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ اس سے پہلے وہ دوبارہ مورچہ سنبھال کر میری طرف کوئی دیکھ رہا تھا اور اس نے اپنی پنجابی میں بے اختیار کچھ بدلی اور دوڑ کر ایک اور سنے کے پیچھے چلا آیا۔ ڈھلان پر ابھی تک دیکھ ہم بدحواسی چھلپا ہوا تھا اور پھر برف کے ذرات اڑ رہے تھے۔ ہوائیں چھلکا رہی تھیں، اس لیے مجھے امید تھی کہ میں نہ تو اسے درخت کے پیچھے جاتا دکھائی دیا

ہوں گا اور نہ ہی اس نے میری آہستہ سنی ہوگی۔

تاریکی میں پتا نہیں چل رہا تھا کہ تیسرا آدمی کہاں گرا تھا اور وہ زندہ تھا یا مر گیا تھا۔ شروع میں جب کی لاشیں آن گئیں اور ان کے انکسار سے تھوڑا بہت نظر آ رہا تھا لیکن جب میں نے جب کے پگولیاں برسا لیں تو اس کی لاشیں بھی بند ہو گئیں۔ تیسرا بندہ کہاں گرا تھا زندہ تھا یا مر گیا تھا اس کا پتا نہیں چل رہا تھا۔ نیچے والا حادثہ جس جب کے پیچھے پناہ گزین تھا۔ اس بار ایسا لگ رہا تھا کہ بھارتیوں نے اپنا ناقص دست بھجیا تھا تاکہ مجھے دنیا سے رخصت کر دیا جائے۔ یہ چاروں افراد اپنے انداز سے تربیت یافتہ قاتل لگ رہے تھے لیکن بد قسمتی سے ان کا واسطہ مجھ سے پڑ گیا تھا اور مجھے اس قسم کے قاتلوں سے غمخوار اور انہیں جہنم رسید کرنے کا وسیع تجربہ حاصل ہو چکا تھا۔ انہوں نے برسوں لگا کر جو کچھ تربیت گاہوں میں سیکھا تھا میں نے اس سے زیادہ چند مہینوں میں عملی میدان میں حاصل کر لیا تھا۔

بڑے سائز کی جب کے پیچھے اس کا اندازہ کرنا دشوار تھا کہ جو تھا فرد کہاں ہے۔ اسے سامنے لانا بھی مشکل تھا اس لیے میں نے روایتی طریقہ استعمال کیا۔ میں نے ایک عدد چتر تلاش کیا اور پھر اسے جب کی طرف اچھال دیا۔ ٹی کی آواز کے ساتھ وہ بوٹ پر گر کر۔ جو تھکے کمانڈو نے بھڑک کر جگہ بدلی اور مجھے اس کا پیولا سلا دکھائی دیا تھا لیکن یہ نظر کا دھوکا بھی ہو سکتا تھا اس نے فائر کرنے سے گریز کیا۔ میں نے اسی طریقے کو ذرا موثر انداز میں استعمال کرنے کا سوچا۔ ڈھلان پر پتھروں کی کمی نہیں تھی بلکہ کچھ زیادتی تھی اور اکثر پتھر خاصے بڑے تھے جن میں اپنے مطلب کا پتھر تلاش کرنا مشکل ثابت ہو رہا تھا۔ بہر حال میں نے کسی طرح دو درجن کے قریب پتھر جمع کر لیے اور اس کے بعد تیزی سے انہیں جب کے پیچھے ارسال کرنے لگا۔ سامنے سے مارنے کے بجائے میں انہیں اس طرح اچھال رہا تھا وہ اوپر جانے کے بعد وہ سیدھے گریں اسی طرح میں جب کے عقب میں پیچھے ہٹ کر پریشان کر سکتا تھا۔ اگرچہ اس کا امکان ایک فیصد ہی تھا لیکن تھا کہ کوئی پتھر میں اس کے سر پر لینڈ کرے۔ لیکن دو ٹکڑے پتھر اس کے آس پاس بھی گرتے تو وہ بدحواس ہو سکتا تھا اور کوئی ایسی حرکت کرتا جس سے وہ سامنے آ جاتا۔

میرے عمل کا فوری ردعمل سامنے آیا۔ اکثر پتھر جب کے آگے اور کچھ اس کے پاس گرے۔ ایک اسے لگا بھی تھا کیونکہ اس نے آہستہ سے بے ساختہ شٹ کہا تھا۔ میں نے

سن لیا تھا چند پتھر اور اچھالے تو اس نے اچانک جب کے پیچھے سے نکل کر اوپر کی طرف ایک برست مارا۔ اس نے ان ہی دونوں تنوں کا نشانہ لیا جہاں میں پہلے تھا اوپر سے آتے پتھروں سے یہ اندازہ کرنا تقریباً ناممکن تھا کہ انہیں کہاں سے پھینکا جا رہا ہے۔ وہ جب کے بائیں طرف تھے اس لیے وہ جب کے دائیں طرف سے نکلا تھا اور اسے خبر نہیں تھی کہ میں اب دائیں طرف تھا اور وہ میرے سامنے ہی تھا۔ لیکن اس نے اتنی پھرتی سے برست مارا اور واپس جب کی آڑ میں چلا گیا کہ میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

میں سارے ہی پتھر پھینک چکا تھا اس لیے میں نے دوبارہ پتھر جمع کیے اور اس بار پوری حکمت عملی کو ذہن میں ڈھرایا کہ کس موقع پر مجھے کیا کرنا ہے۔ کیونکہ میرے پاس ایک ہی چانس ہوتا اور اس کا یہ تھا کہ اس کے بعد مجھے چانس نہیں ملتا۔ فائر کرتے ہی وہ میری پناہ گاہ سے واقف ہو جاتا۔ یہ بڑا لیکن ایک ہی تھا تھا اور مجھے دو تنوں جتنا تحفظ نہیں دے سکتا تھا۔ اگر وہ بیچ جاتا تو ٹرائی ٹرائی اکیں کے فارمولے پر عمل کرتے ہوئے دوبارہ دیکھ ہم ارسال کرتا اور مجھے فوت کر دیتا۔ اس بار میں نے زیادہ تیزی سے پتھر اچھالنے شروع کیے تھے اور اگلے ہاتھ سے شادریں کن بخل کے ساتھ لگائے نشانہ لینے کے لیے بھی پوری طرح تیار تھا۔ کوئی ایک درجن پتھر اچھالنے کے بعد مجھے جب کے ساتھ حرکت محسوس ہوئی اور میرا دایاں ہاتھ تیزی سے ٹریگر پر آیا۔ جیسے ہی وہ سامنے آیا اور اس نے برست مارنا شروع کیا میں نے فائر کر دیا۔ شادریں کن گرجی اور وہ اٹک کر پیچھے جا کر اٹھا۔

میں نہیں جانتا تھا کہ اسے گولی کہاں لگی تھی؟ وہ زندہ تھا یا مر گیا تھا؟ میں اٹھ کر تیزی سے ڈھلان کے موازی بھاگا میں نے نیچے کی طرف جانے سے گریز کیا تھا۔ ایک لمبا چکر کاٹ کر میں کی سڑک پر اتر آ۔ اس بھاگ دوڑ کے دوران میں دو مرتبہ جھپکتے کرتے تھا۔ مگر اللہ نے خبری ورنہ بڑی پہلی ایک ہو سکتی تھی اور میں بھی دشمنوں کے ساتھ نہیں لہا لیٹ جاتا۔ سڑک سے ہوتے ہوئے میں کچے راستے پر آیا اور جب کی طرف بڑھا میری نظر بیک وقت ڈھلان اور جب کی طرف تھی جو تھا دشمن یقیناً جب کے پیچھے تھا اگر وہ بیچ گیا تھا تب بھی زخمی ضرور ہوا تھا۔ مجھے ڈھلان پر کوئی سرگرمی نہیں دکھائی دی۔ اس لیے میں دے قدموں جب کی طرف بڑھا۔ تب مجھے پہلی بار آواز سنائی دی۔

”ایم ون... ڈیور یڈی... ایم ون...“

بولنے والے کا لہجہ بتا رہا تھا وہ شدید تکلیف میں ہے۔ میں نے جیب کے کنارے سے جھانکا۔ وہ جیب سے ٹیک لگائے اور دوپٹوں پاؤں پھیلانے بیٹھا تھا۔ اس کا سر دوسری طرف تھا جہاں سے اسے غصہ تھا کہ میں نہ آ جاؤں لیکن میں مخالف سمت سے آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا واکی ٹاکی تھا لیکن اس کی ریٹج یقیناً اتنی تھی کہ وہ اپنے جیس سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر موسم کی خرابی آڑے آ رہی تھی۔ میں دبے قدموں اس تک گیا اور اس سے پہلے کہ وہ ہوشیار ہوتا میں نے پستول اس کے سر سے لگا دیا۔

”بس اب مزید کوئی حرکت مت کرنا۔“

وہ ساکت ہو گیا۔ میں نے پہلے اس کے ہاتھ سے واکی ٹاکی اچک لیا اور اسے بند کر کے اپنی جیکٹ میں رکھ لیا پھر لٹ مار کر اس کی رانفل کو دور کر دیا۔ اس کے لباس میں کوئی دوسرا ہتھیار ہو سکتا تھا۔ اس لیے میں نے اس کے زخم کی پروا کیے بغیر اچانک اسے اوندھے منہ لٹا دیا ایک پیراس کے پشت پر رکھتے ہوئے اس کی اوپر سے لے کر نیچے تک تفصیل تلاش لی۔ گولی اس کے دائیں پہلو کو اچھڑ گئی تھی۔ وہ زخمی تھا لیکن اسے قریب المرگ نہیں کہہ سکتے تھے البتہ جب میں نے اسے لٹایا تو اس نے خاصا شور مچایا تھا اور اپنی مادری پھاٹا یعنی اڑم گڑم گڑم والی زبان میں مجھے گالیاں بھی دی تھیں۔ اس کے پاس سے ایک عدد پستول ایک بڑا خنجر، دو عدد پستول کے میگزین اور دو رانفل کے میگزین برآمد ہوئے۔ میں نے انہیں اپنی جیکٹ میں رکھ لیا۔ اسے سیدھا کیا تو وہ یوں بھول رہا تھا جیسے بے ہوش ہونے والا ہو لیکن جب میں نے پستول کی نال اس کے زخم پر رکھ کر دبائی تو وہ چلا اٹھا تھا اور بالکل ہوش میں آ گیا۔

”تم کون سی زبان سمجھتے ہو؟“ میں نے انگریزی میں پوچھا۔

”یادہ زبان جو گاؤں سمجھتے ہیں۔“

”شہباز۔“ اس نے انگریزی میں تکلیف زدہ لہجے کے ساتھ کہا۔ ”تم سچو نہیں ہمارے اور سامی بھی ہیں ہم چار کو مار کر تم ہی مت بھٹکا کر بیٹھ گئے ہو۔“

”مجھے ایسی خوش فہمی نہیں رہی۔ جب میری موت کا وقت آئے گا تو مجھے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ ورنہ تمہاری ساری فوج مل کر بھی مجھے نہیں مار سکی گی۔“ میں نے کہا۔ ”یہ بتاؤ تم کے کال کر رہے تھے؟“

”اپنے ساتھیوں کو۔“

”وہ کہاں ہیں یہاں تمہارا میں کہاں ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم اور یہاں ہمارا کوئی نہیں ہے۔“

میں نے پستول اس کے گتھے پر رکھ کر قافلاً گر کر دیا۔ اسے مجھ سے اس سلوک کی توقع نہیں تھی اس لیے زپ کر رہ گیا۔ میں نے اپنا سوال دہرایا اور پستول اس کے دوسرے پاؤں کے گتھے پر رکھ دیا۔ اس نے سر جیب کی باڈی پر مارتے ہوئے کہا۔ ”مجھے نہیں معلوم مجھے مارو۔“

لیکن جب میں نے اس کے دوسرے گتھے میں بھی سوراخ کیا تو اس کی یادداشت بحال ہو گئی اور اس نے رک رک تقریباً روتے ہوئے بتایا کہ وہ اس علاقے میں ملک مقیم کے پاس رکے تھے۔ وہ یہاں ان کا ایجنٹ تھا اور انہیں تمام سہولیات مہیا کرتا تھا۔ وہ سب سرحد پار سے آئے تھے اور افغانستان کے ایک شاہی شہر میں بھارت کے قنصلیٹ سے روانہ ہوئے تھے۔ وہ یہ بتاتے ہوئے ہنچا رہا تھا کہ اس کے مزید کتنے ساتھی یہاں موجود ہیں۔ یہ ہنچاٹ گتھے پر گتے والی گولی نے دور کر دی اور اس نے دھاڑیں مار کر روتے اور گتھے کوستے ہوئے بتایا کہ ایسے ہی دوسرے اور بھی ہیں اور وہ کہیں آس پاس موجود ہیں۔ گویا ایک درجن بھارتی کمانڈوز میری خاطر یہاں آئے تھے اور ان میں سے ایک تہائی زخمی تھا میں جا چکے تھے۔ ایک تہائی یوں کہ میں نے ان میں سے کسی کو نہ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا اس لیے جب میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے مزید کچھ بتانے کی پوزیشن میں نہیں ہے تو میں نے اس کے سر میں گولی مار کر اس کا خاتمہ کر دیا۔ وہ ویسے بھی سخت اذیت میں تھا اور کچھ دیر میں مر جاتا۔

میں نے جیب کی تلاش اس میں سے ہتھیاروں کے ایجنٹیشن کے ساتھ کھانے پینے کا سامان اور کچھ ٹارچیں بھی لی تھیں۔ میں نے ایک ٹارچ روشن کی اور باقی تین کا معائنہ کیا۔ جس کی ٹانگ پر شارٹ کرن کی گولی لگی تھی وہ زندہ تھا اور بے ہوش تھا۔ باقی دوسرے گتھے میں نے بے ہوش کی تلاش لی اور اس کے پاس سے صرف پستول اور خنجر لگا تھا۔ پہلے میں اسے مارنے والا تھا لیکن پھر میں نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ میں اسے کرٹل ضیاء الدین کے توسط سے خفیہ اداروں کے سپرد کر دوں تو وہ ان سے بہت کچھ معلومات حاصل کر سکتے تھے۔ یہ ارادہ کرتے ہی میں نے پہلے اس کی زخمی ٹانگ پر کس کر اس کے جوتے کا فیتہ باندھ دیا تاکہ خون رک جائے اور پھر فوری طور پر وین لینے روانہ ہو گیا۔

راستے میں میں نے واکی ٹاکی کا جائزہ لیا اسے آن کی لین اس سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ خود میں نے کسی کو پکارنے سے گریز کیا اور اسے دوبارہ آف کر کے رکھ لیا۔ نصف کلومیٹر کا فاصلہ دوڑتے ہوئے طے کیا اور اس جگہ پہنچا جہاں وین چھپائی تھی۔ جھارپاں ہٹا کر میں نے وین باہر نکلی اور وہاں آئے۔ بے ہوش کمانڈو کو وین کے عقبی حصے میں ڈالا۔ پھر اس کے تین ساتھیوں کی لاشیں اور اسلحہ بھی وین میں ڈالا۔

یہ سب بھی ایک طرح کا ثبوت تھا۔ صرف جیب وہاں رہی تھی۔ میں نے احتیاطاً اس کا نمبر بھی نوٹ کر لیا۔ اگرچہ مجھے یقین تھا کہ یہ نمبر نفی ہوگا۔ روانہ ہونے سے پہلے مجھے ایک خیال آیا۔ وین میں ڈیزل کم رہ گیا تھا وہ یہ جب بھی ڈیزل والی گتھی تھی۔ مجھے ابھی طویل سفر کرنا تھا اس لیے میں نے وین میں موجود ڈیزل سے بھرے جیری کین وین کے ٹینک میں انڈر لے اور جیب کے ٹینک سے پائپ لگا کر ان جیری کین کو دوبارہ بھر لیا۔ جیب کا ٹینک خاصا بڑا تھا اور پورا بھرا ہوا تھا۔ وین کا ٹینک اور جیری کین بھر جانے کے بعد بھی جیب کے ٹینک میں ڈیزل موجود رہا تھا۔

میں نے بیج جانے والے ڈیزل کا متبادل استعمال تلاش کر لیا۔ ایک سوئی تھی جو جیب میں موجود تھی پہلے اسے ٹینک میں ڈال کر ڈیزل سے اچھی طرح ترکیب اور پھر اسے صحیح کر دوڑ تک لایا۔ وین میں بیٹھ کر میں نے اسے لائٹر سے آگ دکھائی اور پھر وین اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ ابھی میں بکی سرک پر کچھ دور گیا تھا کہ عقب میں دھماکا ہوا۔ جیب کا ٹینک پھٹ گیا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ بیچھے سے بھارتی یا ان کے مقامی ایجنٹ بیچھے گئے تو وہ ٹائر برسٹ ہونے کے باوجود جیب کو لے جا سکتے تھے اس لیے میں نے اسے سرے سے کسی قابل نہیں چھوڑا تھا۔ خاصی دیر بعد مجھے سکون کا سانس لینے کا موقع ملا تھا اور جب میں نے گھڑی دیکھی تو حیران رہ گیا۔ صبح کے چھ بج رہے تھے۔ روشنی ہونے والی تھی۔ مجھے روشنی ہونے سے پہلے کرٹل ضیاء الدین کی گتھی تک پہنچ جانا تھا۔

اس جگہ برفانی طوفان نے ماحول کو پھر سے سفیدی کی چادر اوڑھا دی تھی۔ ہوا کی شدت میں کمی آگئی تھی اور شاید چند گھنٹوں میں طوفان ختم جاتا۔ مجھے ونڈ اسکرین صاف رکھنے کے لیے واپس مستطیل چلانے پڑ رہے تھے، اس کے باوجود سب گڑے آگے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے وین کی رفتار بہت کم رکھی تھی۔ سات بجے برف باری رک گئی اور

روشنی بھی بہتر ہوئی تو میں نے رفتار میں اضافہ کیا تھا۔ مگر یہ بھی نابل رفتار سے آگئی تھی۔ تازہ برف نے سرک پر پھسلن پیدا کر دی تھی اور تیز رفتاری پر وین بے قابو ہوئی ہو سکتی تھی کوشش کے باوجود میں روشنی ہونے سے پہلے کرٹل ضیاء الدین کی گتھی تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ جب میں وہاں داخل ہوا تو آسمان سے بادل چھٹ رہے تھے اور اوپر موصوبہ نظر آنے لگی تھی۔ صبح کے آٹھ بج چکے تھے کرٹل ضیاء الدین یقیناً جاگ گیا ہوگا۔

اس بار بھی کرٹل خود نمودار ہوا تھا مگر اس نے گاؤں کے بجائے مکمل گرم سوٹ پہن رکھا تھا۔ میں وین سے اتر آیا وہ پہلے ہی برآمدے کی سیڑھیاں اتر چکا تھا۔ ”ویل شہباز ملک تم پھر آگئے۔“

”کرٹل مجبوری تھی۔“ میں نے معذرت کی تمہید باندھی۔

”نو۔“ اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔ ”میرا یہ مطلب نہیں ہے، اس گھر میں تمہیں ہمیشہ خوش آمدید کہا جائے گا۔ میرا مطلب ہے تم پھر کسی مشکل میں پڑ گئے ہو؟“

”جی جناب۔“ میں نے کہا۔ ”یہ مشکل پہلے سے کہیں زیادہ بڑی اور بھاری ہے۔“

میں نے اسے وین کا عقبی حصہ کھول کر دکھایا۔ لاشوں اور زخمی کو دیکھتے ہی وہ عجیبہ ہو گیا۔ ”یہ کون ہیں؟“

”ان کے حلیے بتا رہے ہیں کہ یہ کمانڈوز ہیں ویسے ان کا تعلق بھارت سے ہے۔“

کرٹل ضیاء الدین چونک گیا تھا۔ ”بھارت سے؟“

”میں آپ کا بتاتا ہوں، پہلے اس زخمی کو دیکھنا ہے، یہ زندہ رہا تو اس خلیے میں بھارتی سرگرمیوں کے بارے میں بہت سے اہم انکشافات کر سکتا ہے۔ صرف یہی نہیں اس علاقے میں مزید بھارتی گروپ موجود ہیں۔“

کرٹل سمجھ گیا تھا، اس نے فوراً شاکر کو طلب کیا اور اسے زخمی کو اندر لے جانے کی ہدایت کی۔ وہ اسے اٹھا کر لے گیا تھا۔ میں نے کرٹل کو اسلحہ بھی دکھایا۔ ”میں نہیں جانتا کہ ملک کے خفیہ رکھوالوں سے کس طرح رابطہ کیا جاسکتا ہے لیکن میرا خیال ہے آپ یقیناً جانتے ہوں گے۔ یہ کیسی آری اٹھیں جس یا ایسے ہی کسی ادارے کا ہے۔“

”تم اس کی فکر مت کرو میرے ساتھ آؤ۔“

کرٹل نے گتھی میں طبی امداد کے لیے ایک چھوٹا سا کمر بٹا رکھا تھا جس میں تمام ہتھیار تھیں۔ اتنی دیر میں شاکر

نے دُشمن کے کپڑے اُتار دیے تھے اور اب وہ صرف انڈر ویئر میں تھا۔ کرنل نے پہلے اس کا معائنہ کیا اور تصدیق کی۔ ”یہ ہندو ہے۔“

شارٹن گئی گولی نے اس کی ٹانگ گھسنے کے اوپر سے تقریباً کاٹ دی تھی۔ کرنل نے ٹانگ کا معائنہ کیا اور بولا۔ ”اسے کاٹنا ہوگا لیکن میں یہ کام نہیں کر سکتا ہوں۔“

”اس کی ضرورت بھی نہیں ہے، بس اسے اس وقت تک زندہ رہنا چاہیے جب تک یہ یہاں موجود تھا تو اس اور دوسرے بھارتی غریب کاروں کے بارے میں معلومات نہیں دیتا۔“

”تم فکر مت کرو، وہ لوگ کسی کومرے نہیں دیتے ہیں اور اپنے مطلب کی معلومات وہ آدمی کی کھوپڑی سے نکلوا لیتے ہیں۔“ کرنل ضیا الدین نے کہا۔ اس نے دُشمنی کراؤپر سے بیڑی تاج کر دی پھر اسے چند انگلیشن دیے۔ ”تم تھکے ہوئے ہو بہتر ہوگا کچھ دیر آرام کرو۔“

”کرنل میں جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا ہوں دوسرے میں کسی اتھارٹی کا سامنا نہیں کرنا چاہتا ہوں سمجھ لیں کہ میں نے یہ سارے لوگ آپ کے سپرد کر دیے ہیں۔ آگے آپ جائیں۔“

”لیکن فوجیوں مجھے معلومات تو درکار ہوں گی۔“

ہم کرنل کی اسٹڈی میں آئے۔ شاکر کافی اور کوکیز لے آیا تھا۔ باقاعدہ ناشتے کے بارے میں اس نے اطلاع دی کہ وہ ٹھیک ٹوبہ جیز پر ہوگا۔ میں نے کافی اور کوکیز سے انصاف کرتے ہوئے کرنل کو بتایا کہ کس طرح ان لوگوں نے مجھے مارنے کی کوشش کی اور خود مارے گئے۔ اسے تعجب ہوا تھا۔ ”بھارتی تمہارے دشمن کیوں ہو رہے ہیں؟“

”کیونکہ وہ اس ملک کے دشمن ہیں اور اس ملک میں بسنے والے ہر بھرت وطن پاکستانی کے دشمن ہیں۔“ میں نے گول مول انداز میں کہا۔ ”اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ یہاں اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں اور ان کا ستر باب کرنے والے ادارے ان سے بے خبر ہیں۔“

”ایسا مت کہو وہ بالکل بے خبر نہیں ہیں۔“ کرنل نے کسی قدر سختی سے کہا۔ میں نے اس سے اختلاف نہیں کیا۔

”یہ یہاں اپنے مقامی ایجنٹ اور غدار ملک مقیم کے پاس مقیم تھے۔ ایسے ہی کم سے کم آٹھ بھارتی کمانڈرز مزید ہیں جو میری تلاش میں ہیں۔“

کرنل نے میری بات سنی اس نے دوبارہ میرے

بارے میں سوال نہیں کیا تھا وہ کچھ سوچ رہا تھا پھر اس نے کہا۔ ”ٹھیک ہے میں اس معاملے کو ہینڈل کر لوں گا۔“

”یہاں فوج خراب ہے اور راجے کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے۔“

”شاکر ناشتا تیار کر کے گاڑی میں جائے گا۔ کوئی دس کلومیٹر دور ایک فوجی چوکی ہے وہاں اطلاع کر دے گا۔“

”یہ کام سختی جلدی ہو جائے اچھا ہے۔“ میں نے بے چینی سے کہا۔ ”میں تاخیر سے دوسرے بھارتی اور غدار فرار نہ ہو جائیں۔“

”میرا خیال ہے انہیں زیادہ مہلت نہیں ملے گی۔“

کرنل نے اطمینان سے کہا۔

مجھے خیال آیا۔ ”تب بہتر ہوگا کہ آپ شاکر کو صرف اطلاع کے لیے مت بھیجیں بلکہ لاشوں اور دُشمنی کے ساتھ بھیجیں تاکہ آری اٹلی میں فوری حرکت میں آجائے۔“

”یہ خیال اچھا ہے لیکن اس صورت میں مجھے خود جانا ہوگا۔“ کرنل نے سر ہلایا۔ ”پھر معاملہ شاکر کے بس کا نہیں رہے گا۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو لاشیں اور دُشمنی دیکھ کر وہ زیادہ تیزی سے حرکت میں آئیں گے۔ میں نے ناشتا کر لیا ہے۔“

”آپ وین میں لے جائیں کیونکہ لاشوں اور دُشمنی کو اسلحہ سمیت کسی دوسری گاڑی میں منتقل ہونے میں وقت لگے گا یہ وین بھی ان لوگوں کی ہے اور اس کے علاوہ ایک جیب بھی ہے جسے میں نے آگ لگا کر تباہ کر دیا ہے۔“

میں نے کرنل کو تمام ضروری معلومات فراہم کیں۔

اس نے علاقے کے نقشے کی مدد سے سمجھ لیا تھا کہ بھارتیوں کی جیب کہاں ملی ہوئی موجود تھی۔ میں نے وین کی چابی اس کے سپرد کر دی اور وہ فوری طور پر روانہ ہو گیا تھا۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس دیرانے میں مجھے کرنل ضیا الدین جیسا مددگار مل گیا تھا۔ اس کے توسط سے میں اپنے ملک کے کام بھی آگیا تھا۔ کرنل کی روائی کے کچھ دیر بعد شاکر نے ناشتا لگا دیا تھا۔ کافی اور کوکیز نے کسی حد تک میری جھوک مٹا دی تھی اور رہی تھی کمراس ناشتے نے پوری کر دی۔ اب مجھے شدت سے کچھ دیر کی نیند کی خواہش محسوس ہو رہی تھی۔

شاکر مجھے گیٹ روم میں لے آیا جہاں میں کل شام کو بھی رکا تھا۔ کپڑے صاف ستھرے تھے۔ گرم پانی سے غسل کر کے میں نے وہی کپڑے پہنے اور بستر پر گرا تو پھر مجھے ہوش نہیں رہا تھا۔ اچانک ہی کسی نے مجھے بری طرح سمجھوڑا اور میں نے خطرے کا احساس کرتے ہی اسے دبوچ لیا۔

چھوڑنے والا تیز لپٹے میں بولا۔ ”شہباز صاحب! یہ میں ہوں۔ جلدی اٹھیں باہر خطرہ ہے۔“

وہ شاکر تھا میں آٹھ بیٹھا اس کے چہرے پر فکر کے آثار تھے میں نے سختی سے کہا۔ ”شاکر یہ کیا حرکت ہے اگر میں انجانے میں تمہیں کوئی نقصان پہنچاؤں گا تو؟“

”بھوری ہے جناب۔“ اس نے کہا۔ ”کرنل صاحب کو گئے ہوئے کئی گھنٹے ہو چکے ہیں۔“

”ٹھیک ہے لیکن مجھے اس طرح چھوڑ کر اٹھانے کی کیا ضرورت تھی؟“

”کوئی کے باہر دو گاڑیاں آرہی ہیں اور کم سے کم نصف درجن افراد ان سے نکل کر کٹھنی کے گرد پھیل رہے ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”وہ ویسا ہی لباس پہنے ہوئے ہیں جیسا یہاں آنے والے دُشمنی نے پہنا ہوا تھا۔“

”میرے خدا۔“ میں نے کہا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ میں یہاں محفوظ ہوں اور بھارتی یا ان کے مقامی ساتھی اس جگہ میرا سراغ نہیں لگا سکیں گے لیکن اگر شاکر کا بیان درست تھا تو بھارتی یہاں آن پہنچے تھے۔ آٹھ کر تیزی سے جوتے پہنے اور پھر جیکٹ پہنی۔ شاد رنگ اور پتول لیتے ہوئے میں باہر کی طرف لپکا تھا شاکر کرنے مجھے روک لیا۔

”واپس نہیں میرے ساتھ آئیں۔“

وہ مجھے کٹھنی کے اوپری حصے میں ایک ایسے کمرے میں لایا جس کے چاروں طرف کھڑکیاں تھیں اور شیشوں کے پار سے ہر طرف دیکھا جاسکتا تھا۔ خاص طور سے سامنے کا حصہ واضح تھا۔ لیکن چھلچھلاہٹا دور تھا کہ خالی آنکھوں سے صاف دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ شاکر نے مجھے ایک عدد دور بین لا دی میں نے دور بین سے دیکھا تو درختوں کے درمیان مجھے ایک آدمی فوراً ہی نظر آگیا تھا۔ وہ ایک آڑ میں چھپا ہوا تھا اور اس کی رائفل کی نال صاف دکھائی دے رہی تھی۔ دو منٹ کے اندر میں ایسے تین عدد مزید مسلح افراد نظر آنے لگے تھے۔ جبکہ شاکر کا کہنا تھا کہ دو گاڑیوں سے کم سے کم چھ افراد اترے تھے۔ بہر حال وہ چار ہوں یا چھ یا اس سے زیادہ ہوں۔ مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ یہ بھارتیوں کا وہی گروپ تھا جو میری تلاش میں یہاں آیا تھا۔ کسی طرح سے وہ میری بوسہ گھٹا ہوا یہاں تک آگیا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا اور میں نے شاکر سے پوچھا۔

”کرنل صاحب کو گئے ہوئے کتنی دیر ہوگئی ہے۔“

”چار گھنٹے ہو گئے ہیں اب ایک بج رہا ہے۔“ اس

نے جواب دیا۔ ”شہباز صاحب! یہ کون لوگ ہیں۔“

”اس دُشمنی کے ساتھی جنہیں میں یہاں لایا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”ویسے یہ بھارتی ہیں اور میری تلاش میں یہاں آئے ہیں۔“

ایک لحظہ شاکر کی حالت عجیب سی ہوگئی۔ اس نے جھرجھری لی تھی اور اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ یہ تبدیلی لفظ بھارتی پر آئی تھی۔ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ”آپ کچھ کہہ رہے ہیں یہ انداز میں ہیں؟“

”سو فیصد۔“ میں نے کہا۔ ”یہ ٹیک نیت سے نہیں آئے ہیں۔ ایسا کر وہ تم کہیں چھپ جاؤں ان سے نمٹتا ہوں۔“

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے جناب۔“ وہ جذباتی انداز میں بولا۔ ”خدا نے برسوں بعد میری دعا قبول کی ہے۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے دور بین سے معائنہ جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا دعا کی تھی تم نے؟“

”میں فوج میں بھرتی کی خواہش لے کر کرنل صاحب کے پاس آیا تھا۔ یہ اکثر کے بعد کی بات ہے۔ ہر نئے پاکستانی کی طرح میں بھی انڈیا کے خلاف بھرا ہوا تھا۔ کچھ کرنا چاہتا تھا مگر اس کے بعد موقع ہی نہیں ملا۔ فوج میں آیا تو کرنل صاحب جو اس وقت لیفٹننٹ تھے انہوں نے مجھے اپنے ساتھ رکھ لیا۔ بعد میں جب بوئے افسر بنے تو وادی کر لیا پھر کرنل صاحب کے ساتھ کی عمر گزار گئی تھی۔ پہلے کرنل صاحب ریٹائرڈ ہوئے وہ یہاں آگئے۔ چند سال بعد میں بھی پٹیشن لے کر ان کے پاس آگیا۔ فوج میں اڑتیس برس تک رہتا رہا کہ مجھ پر جانے کا موقع ملے لیکن تعجب میں نہیں تھا۔ سیاہن پر جنگ ہوئی۔ میں نے اپنا نام دیا لیکن ایک پاؤں میں معمولی سی کمزوری کی وجہ سے مجھے رینجٹ کر دیا گیا۔“ شاکر موقع کی مناسبت سے جلدی جلدی بتاتا تھا۔

میں اس کی بات سمجھ گیا۔ ”ٹھیک ہے اب تم کیا کرو گے؟“

”میں ان سے لڑوں گا جی اور ہو سکا تو انہیں مار دوں گا۔“

میں نے لٹی میں سر ہلایا۔ ”تم نہیں جانتے یہ پیشہ ور کمانڈر ہیں۔ تم صرف ایک سپاہی رہے ہو اور وہ بھی زیادہ تر سروں میں۔“

”لیکن میرے اندر جذبہ تو ہے۔“ شاکر نے کہا۔ ”پھر آپ اکیلے کیسے لڑیں گے؟ میں آپ کی طرح تو

نہیں لڑ سکتا لیکن آپ کا ساتھ ضرور دے سکتا ہوں۔“
 میں نے اس ساتھ ہاتھ سال کے بوڑھے سپاہی کے لیے دل میں احترام محسوس کیا تھا۔ وہ رنڈاڑ ہوا تھا لیکن اس کے اندر کا سپاہی بیڑا نہیں ہوا تھا۔ وہ آج بھی اپنے وطن کے دشمنوں سے لڑنے کے لیے تیار تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”تمہارے پاس کوئی ہتھیار ہے؟“
 ”جی کرنل صاحب کی رائفل ہے۔ وہ میری تحویل میں ہوتی ہے میں یہاں کا گارڈ بھی ہوں۔“
 ”بس تو رائفل نکال لاؤ جب تک میں طے کرتا ہوں کہ تم نے کیا کرتا ہے۔“
 شاکر جوش دھندلے سے روانہ ہوا تھا۔ اس دوران میں سامنے کا سارا حصہ دور بین سے کھنگال لیا تھا۔ یہاں چار بھارتی کمانڈوز تھے بانی یقیناً گولی کے عقبی حصے کی طرف ہوں گے۔ وہ چاروں طرف سے گولی کو گھیر رہے تھے تاکہ فرار کی کوئی راہ سدود نہ رہ جائے۔ اچانک مجھے اپنے پاس موجود دو ٹائی کی کا خیال آیا۔ وہ جینٹ میں تھا۔ اسے نکال کر میں نے اس کا وائلم کیا اور پھر اسے آن کر دیا۔ فوراً ہی اس سے آواز بھری۔
 ”دن اور نو تم کہاں ہو؟“
 ”ہم پیچھے پیچھے رہے ہیں۔“ ون یا ٹو کی طرف سے جواب آیا۔
 ”خواب رو سس۔“ اسی آدمی نے پوچھا۔
 ”ہم اپنی پوزیشن پر آگئے ہیں۔“
 میں ان کی گفتگو سنتے ہوئے مجھے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس دوران میں شاکر آگیا اور اس نے دلچسپی سے واکی ٹائی دیکھا۔ ”یہ کہاں سے ملا جناب؟“
 ”انہی لوگوں سے جنہیں میں ساتھ لایا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ابھی تک تو یہ پتا چلا ہے کہ باہر چھ سے سات افراد موجود ہیں۔“
 ”میرے لیے کیا حکم ہے؟“
 ”فی الحال تو تم کسی ایسی جگہ طے جاؤ جہاں سے گولی کے عقبی حصے پر نظر رکھ سکو۔ وہ وہاں سے بھی آ سکتے ہیں۔“
 ”میں سمجھ گیا اور اگر کوئی گولی میں آنے کی کوشش کرے تب؟“
 ”تب تم وہی کرنا جو ایک سپاہی اپنی سر زمین پر حملہ کرنے والے دشمن کے ساتھ کرتا ہے۔“
 شاکر کے پاس بائیس بور کی کسی قدر چرائی لیکن

بہترین رائفل تھی۔ میں نے اسے لے کر دیکھا اور پھر اس سے کہا۔ ”یہ مجھے دیدو، تم شارٹ گن لے جاؤ۔ پاس سے جنگ کے لیے بہترین ہتھیار ہے لیکن یاد رکھنا تمہاری اولین ترجیح دشمن کو پیچھے سے گولی میں آنے سے روکنا ہے۔ اس لیے بغیر جوش کے بالکل ٹھنڈے دماغ کے ساتھ دفاع کرنا۔“
 ”میں سر۔“ اس نے سلیوٹ مار کر کہا۔ رائفل کی گولیوں کا ڈبا مجھے تھمیا اور شارٹ گن اور اس کی اضافی گولیاں لے کر نیچے کہیں چلا گیا۔ وہ آتے ہوئے گولی میں داخل ہونے کے تمام دروازے بھی بند کر آیا تھا۔ کرنل کی گولی چھوٹی اور دو منزل تھی لیکن ساتھ ہی سب سے اوپر یہ اضافی کمرابی تھا اور اس کی ساخت دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اسے خاص طور سے آس پاس کے نظارے کے لیے بنایا گیا ہے۔ میں نے ایک بار پھر دور بین سے سامنے والوں کا جائزہ لیا وہ رفتہ رفتہ آگے بڑھ رہے تھے مگر انہوں نے گولی کا حاصرہ کرنے میں خاصی دیر لگا دی تھی۔ اس سے مجھے حکمت عملی تیار کرنے کا موقع مل گیا تھا اور میں نے ان کی پوزیشنیں بھی جان لی تھیں۔
 ”اگر شاکر عقبی حصے کا کامیاب دفاع کر لیتا تو میں سامنے سے آنے والے حملہ آوروں سے نمٹ سکتا تھا۔ میرے لیے شارٹ گن مسئلہ تھی وہ اتنی دور تک مار نہیں کر سکتی تھی لیکن اس رائفل کی مار خاصی زیادہ تھی۔ شاید وہ اسی لیے اتنی بے فکری سے سامنے پھیل رہے تھے کہ انہیں معلوم تھا کہ میرے پاس دور مار ہتھیار نہیں ہیں۔ مجھے رہ رہ کر یہ سوال پریشان کر رہا تھا کہ انہیں اس گولی کا پتا کیسے چلا؟ اور دوسرے کرنل نے اگر آرمی کی چوکی تک رسائی حاصل کر لی تھی تو اسے اب تک واپس آ جانا چاہیے تھا۔ وہ کہاں تھا؟ ان دونوں سوالوں کے جواب ممکنہ طور پر آپس میں طے ہوئے تھے۔ کرنل اپنے مقصد میں ناکام رہا تھا اور ان لوگوں کے ہاتھ آگیا تھا اور انہوں نے اس سے معلوم کر لیا تھا کہ میں اس کی گولی میں موجود تھا۔ اگر کرنل ان کے ہاتھ آگیا تھا تو اس کی سلامتی مشکوک تھی۔
 وہ چاروں ابھی تک گولی سے باہر ڈھلان پر واقع جنگل میں تھے اور میں انتظار کر رہا تھا کہ وہ گولی کے اجاڑے میں داخل ہوں تو میں کارروائی کروں۔ یہ ظاہر ان کی حکمت عملی یہی تھی کہ سامنے سے حملہ کریں لیکن اس کا بھی امکان تھا کہ انہوں نے دھوکا دیا ہو، انہیں اتنا تو علم ہوگا کہ ان کی پہلی

بارنی جو میرے لیے روانہ کی گئی تھی ماری گئی تھی اور راپلے کا ذریعہ واک ٹاک میرے ہاتھ لگا گیا تھا اس لیے وہ دھوکا دینے کے لیے اسے استعمال کر سکتے تھے۔ میں سامنے کی طرف سے ان کا منتظر رہتا اور وہ پیچھے سے حملہ کر دیتے۔ یہ خیال میرے ذہن میں آیا تھا کہ عقبی سمت سے شارٹ گن کے لیے درپے دھماکے ہوئے اور پھر کسی نے مسلسل برسٹ مارا۔ کوئی دردناک آواز میں چلا گیا تھا۔ بھارتیوں نے پیچھے سے حملے کی کوشش کی تھی اور شاکر نے انہیں روکنے کی۔ یہ انہیں دونوں میں سے کون کا کامیاب ہوا تھا۔ خود کا ہتھیار یقیناً بھارتیوں کے پاس تھے۔
 اس وقت مجھے شدت سے انفس ہونے لگا کہ میں نے لاشوں کے ساتھ ہتھیار کیوں بیچ دیے۔ وہ کسی اور کے کام نہیں آتے لیکن اس وقت میرے پاس ہوتے تو میں زیادہ بہتر پوزیشن میں ہوتا۔ اس وقت مجھے خیال نہیں آیا تھا کہ بھارتی اس جگہ کا سراغ لگا کر یہاں بھی حملہ کر سکتے ہیں۔ میرے پاس وہی دو ہتھیار تھے جو میں نے کرنل سے حاصل کیے تھے یعنی شارٹ گن اور ہتھول۔ پیچھے ہی عقبی سمت حملہ ہوا۔ سامنے موجود بھارتی کمانڈوز بھی تیزی سے حرکت میں آئے۔ یقیناً انہیں علم تھا کہ گولی میں سوائے دو افراد کے اور کوئی نہیں ہے اور دو افراد انہیں دو سے زیادہ سمتوں سے نہیں روک سکتے تھے وہ چاروں طرف سے حملہ کر سکتے تھے اور انہوں نے ایسا ہی کیا تھا۔
 اب وقت ضائع کرنا ہے کار تھا میں نے کھڑکی کا شیشہ پٹایا اور باہر سب سے آگے نظر آنے والے بھارتی کا نشانہ لیا۔ وہ کوئی سو کوڑ دور تھا اور میرا نشانہ بہت اچھا نہیں تھا۔ میں نے اس کے سینے کا نشانہ لیا تھا لیکن گولی اس کے بائیں شانے میں لگی اور وہ محسوس کر گیا فوراً کھڑا ہو گیا۔ وہ اپنا بازو جھٹک رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اس نے جینٹ تلے پلٹ پروف پہن رکھا تھا۔ گولی سے اسے دھچکا لگا تھا لیکن زخم نہیں لگا تھا اس بار میں نے اس کے سر کا نشانہ لیا وہ یقیناً غیر محتاط تھا جب ایک بار اسے گولی لگ چکی تھی تو اسے احتیاط سے کام لینا چاہیے تھا وہ بدستور سامنے کھڑا رہا اور اسی وجہ سے فوت ہو گیا۔ گولی اس کے سر کے اوپری حصے میں لگی اور وہ گر گیا۔ اس دوران.... نیچے سے اس کمرے کی طرف ایک وقت کی خود کار رائفلوں کے منہ کھول دیے تھے۔ پہلے ہی حملے میں اس طرف کے سارے شیشے ٹوٹ گئے تھے۔ اب میں آرام سے دیکھ کر ان پر فائرنگ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کئی تھے

دو فائر کرتے تھے اور ایک آگے بڑھتا تھا پھر دہرا دیتا اور پیچھے والے آگے آتے تھے۔ اس طرح وہ نہایت منظم طریقے سے آگے آرہے تھے اور انہوں نے اب تک مجھے دو بارہ فائر کرنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ وہ گولی کی حد میں داخل ہو چکے تھے اور کسی لمحے بھی اندر آنے والے تھے۔
 میں اس طرح اوپر بیٹھ کر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا اس لیے میں نے فوری فیصلہ کیا اور نیچے آ کر گیا۔ پہلی منزل پر آتے ہی میں نے چلا کر شاکر کو آواز دی۔ ”تم کہاں ہو؟“
 ”میں.... پیچھے ہوں۔“ اس نے اگرچہ لہجہ سنبھالنے کی کوشش کی تھی لیکن میں سمجھ گیا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ وہ گراؤ پڑ فلور پر پھیلی طرف تھا اور اس نے چھوٹی نشست گاہ میں مورچہ سنبھال رکھا تھا۔ لیکن اس کا بائیں پہلو خون سے تر ہو رہا تھا میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ ”یہ کیا ہوا شاکر؟“
 اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ”کچھ نہیں شہباز صاحب سپاہی کو میدان جنگ میں زخم تو لگتے ہیں۔ یہ بھی معمولی سا زخم ہے۔“
 لیکن زخم معمولی نہیں تھا دل سے ذرا نیچے دو سوراخ تھے ان سے اب بھی خون رس رہا تھا۔ میں نے میز پوش اتار کر اس کی ایک پٹی بچھا دی اور بائیں میز پوش گدی کی طرح بنا کر زخم پر رکھ کر اوپر سے پٹی باندھ دی۔ فی الحال میں اتنا ہی کر سکتا تھا۔ ”شاکر شاید ان لوگوں نے کرنل صاحب کو بھی قتل کر لیا تھا اور ان ہی سے یہاں کا پتا حاصل کیا ہے۔“
 اس کا چہرہ مزید زرد ہو گیا تھا۔ ”اس کا مطلب ہے کرنل صاحب اب زندہ نہیں ہیں۔“
 میں نے اس سے نظریں چڑائیں۔ ”امکان تو یہی ہے۔“
 اس نے سر آہ بھری۔ ”تب شاکر بھی زندہ رہ کر گیا کرے گا؟“
 ”ایسا تم کو کرنل کی اپنی زندگی تھی اور تمہاری اپنی....“
 اس نے فنی میں سر ہلایا۔ ”آپ نہیں جانتے، میں اور کرنل صاحب الگ الگ نہیں ہیں۔“
 ”پیچھے کیا ہوا؟“
 ”دو اندر آ رہے تھے۔ میں نے دونوں کو گرا دیا۔ ایک فوراً مر گیا تھا لیکن دوسرے نے گرنے سے پہلے....“ اس نے بات ادھوری چھوڑ کر اپنے زخموں کی طرف دیکھا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ آگے کیا تو میں چونک گیا اس میں ایک اسٹک گرینڈ دبا ہوا تھا۔ اس کی چابی نکال دو تو یہ دھماکے سے پھٹ

جاتا تھا اور یہ خاصا پرائیوٹ لیکن نہایت تباہ کن فوجی ہتھیار تھا۔
”یہ کیا ہے؟“

”اسٹاک گرینڈ“ وہ بولا۔ ”اپنی پوری فوجی زندگی میں شاکر نے ایک ہی بار قانون توڑا۔ میں نے یہ گریڈ چڑھایا تھا۔ مجھے بہت اچھا لگا تھا پھر یہ میرے ساتھ رہا۔ تیس سال سے یہ میرے پاس ہے۔“

مجھے تشویش ہونے لگی۔ ”شاکر تمہارا ارادہ کیا ہے؟“ اس نے میرا سوال نظر انداز کر کے کہا۔ ”شبہاز صاحب آپ پیچھے کی طرف سے نکل جاؤ وہ اندر آنے والے ہیں۔“

”تم میرے ساتھ چلو۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میری حالت ایسی نہیں ہے کہ میں چل سکوں ویسے بھی میں زیادہ دیر زندہ نہیں رہوں گا۔ آپ جا میں آپ اکیلے آرام سے نکل سکتے ہیں۔ یہ شارٹ گن لے جائیں اب یہ میرے لیے بیکار ہے اور اگر کسی بھارتی کی خود کار رائل مل جائے تو زیادہ اچھا رہے گا۔“

میں نے کچھ کہا جانا لیکن شاکر کا انداز بتا رہا تھا اس نے فیصلہ کر لیا ہے۔ میرے پاس وقت نہیں تھا۔ کوئی کے سامنے والے حصے میں کسی نے برست مار کر دھلی دروازے کا لاک توڑ دیا۔ شاکر نے مجھے دھکا دیا۔ ”جلدی کرو۔۔۔۔۔ نکل جاؤ۔۔۔۔۔ وہ آنے والے ہیں۔“

”میں کس راستے سے جاؤں؟“

”یہ ہاتھ روم ہے اس کے روشن دان سے نکل سکتے ہو۔“ شاکر نے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام کر دیا اور پھر تیزی سے ہاتھ روم میں گھس گیا۔ وقت بالکل نہیں تھا۔ اگر بھارتی یہاں آ جاتے تو مجھے نکلنے کا موقع بھی مشکل سے ملتا۔ وہ زیادہ تعداد میں تھے اور پوری طرح چوکنے والے تھے۔ ہاتھ روم کا روشن دان زیادہ بڑا نہیں تھا اور میں کوشش کرتا تو اس سے نکل سکتا تھا۔ شارٹ گن کا بٹ مار کر روشن دان کا شیشہ توڑ دیا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ میں پہلے اپنا ہتھیار باہر پھینکتا تو ہتھیار جاتا تو اس آ جاتا تو نہایت آرام سے مجھے مار دیتا۔ اگر باہر منتظر ہوتا تو اس کے لیے اور بھی آسانی ہو جاتی۔ ہتھیاروں کے ساتھ میں روشن دان سے نہیں نکل سکتا تھا۔ اسی لمحے مجھے نشست گاہ کی طرف سے شور کی آواز سنائی دی۔ یہ بھارتی تھے جو چلا چلا کر شاکر سے ہتھیار ڈالنے کو کہہ رہے تھے اور وہ بتا رہا تھا کہ وہ نہتا ہے۔ میری چھٹی جس نے خبردار کیا اور میں نے تیزی سے شب میں

لیٹنے ہوئے دونوں ہاتھ سر پر رکھ لیے اسی لمحے خوفناک دھماکہ ہوا تھا۔

واش روم کی نشست گاہ کے ساتھ والی دیوار اندر گری اور دھواں ہی دھواں پھیل گیا۔ یہ ہم کا زیر ہلا دھواں تھا جس میں لمبے کی دھول مٹی بھی شامل ہوئی تھی۔ میں نے نشست گاہ میں جھانکا۔ وطن کا سپاہی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر وطن کی مٹی میں مل گیا تھا اور اس کے دھوکے میں آنے والے تین بھارتی بڑی حالت میں بڑے تھے۔ وہ مر چکے تھے یا مرنے والے تھے۔ نشست گاہ کی عقی دیوار بھی گر چکی تھی۔ میں نے ایک بھارتی کی خود کار رائل اٹھائی اور باہر آ گیا کرل کی پائیں بور کی رائل میں نے وہ پین چھوڑ دی تھی۔ شاکر کی خواہش پوری ہو گئی۔ وہ ساری عمر ملک کے دشمنوں سے لڑنے کی حسرت کرتا رہا اور اسے آخر میں یہ اعزاز حاصل ہو گیا تھا۔ اکیلے شاکر نے شہادت سے پہلے پانچ بھارتی کمانڈرز کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

میں باہر آتے ہی زمین پر گر گیا اور دیوار کی بڑ کے ساتھ سر ٹکے لگا۔ مجھے خطرہ تھا کہ باہر کچھ نہ کچھ بھارتی ہوں گے۔ انہوں نے عقی حصہ کوڑ کرنے کے لیے صرف دو آدمی نہیں بھیجے ہوں گے۔ دیوار کے سوراخ سے دھویں کے ساتھ دھول بھی باہر نکل رہی تھی اس لیے مجھے امید تھی کہ کسی نے مجھے باہر آتے نہیں دیکھا ہوگا۔ دیوار کے ساتھ گلاب کی سوکھ جانے والی جھاڑیاں لگی تھیں اونٹنوں والی بہانیاں ان پر گلاب آئیں لیکن شاید ان گلابوں کو دیکھنے کے لیے خود کرل نہ ہو۔ شاکر تو چاچکا تھا۔ میں نے ذہن جھٹکا۔ اس موقع پر جب چاروں طرف جان کے دشمن گھوم رہے ہوں تو فوجی سوچوں میں اچھٹا خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔

احتیاط بہتر ثابت ہوئی اور مخالف سمت سے ایک بھارتی عمودار ہوا۔ اس کی نظر سوراخ پر پڑی اور مجھ سے اس نے تاخیر سے دیکھا۔ اس سے پہلے وہ میرا نشانہ لیتا میں نے اس کے چہرے کا نشانہ لے کر برست مارا اور اس کا سر تقریباً غائب ہو گیا۔ اس کی سر بڑیدہ لاش زمین پر گر گئی۔

میری رائل کا میگزین خالی ہونے والا تھا۔ میں نے دوڑ کر مارے جانے والے کی جینٹ سے اس کی رائل کے میگزین نکالے اور پیچھے کی طرف درختوں میں گھس گیا۔ کوئی کا پانچ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اساطی کی چھوٹی سی دیوار پھلتے ہی مجھے ان دونوں بھارتیوں کی لاشیں دکھائی دیں جو شاکر کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ انہوں نے سوچا بھی نہیں ہوگا

کرل کا معمولی سا نظر آنے والا بوڑھا ملازم ایسا دلیر ثابت ہوگا۔ میں نے حساب لگایا میری معلومات کے مطابق میرے لیے آنے والے بھارتیوں کی تعداد ایک درجن تھی اور ان میں سے دس مارے گئے تھے۔ باقی دو کو یقیناً اپنی فکر زیادہ ہو گئی۔ پھر اتنا دھوم دھماکا ہو چکا تھا اس لیے اس پاس اس کی خبر پہنچی ہوگی۔ وہ میرے پیچھے آنے کے بجائے بھاگنے کی فکر میں ہوں گے۔ لیکن معاملہ اس کے برعکس بھی ہو سکتا تھا۔ وہ آخری آدمی تک اپنے مشن کی تکمیل کی کوشش کر سکتے تھے۔ وہ عام فوجی نہیں تھے بلکہ ایلیٹ فورس کا حصہ تھے۔ ان کے لیے جانے سے زیادہ اہم ان کا مشن ہوتا ہے۔ اس لیے میرا جلد از جلد یہاں سے نکل جانا ضروری تھا۔

مجھے افسوس ہو رہا تھا۔ کرل اور شاکر دونوں نے اپنی جان قربان کر دی تھی لیکن وہ بھارتی کمانڈر کو آدمی تک پہنچانے میں ناکام رہے تھے۔ مگر انہوں نے بھارتیوں کا مشن بھی کامیاب ہونے نہیں دیا تھا۔ خاص طور سے شاکر کے بارے میں میں کہہ سکتا تھا کہ اللہ کے بعد میری زندگی بچنے کا سبب وہی تھا ورنہ بھارتی مجھے سے خبری میں یا اکیلا باہر مار چکے ہوتے۔ میں درختوں کے درمیان سے ہوتا ہوا پیچھے جا رہا تھا۔ میں زیادہ بڑا پیکر کاٹ رہا تھا تاکہ نیچے بھارتی ہوں تب بھی ان سے ڈھبھڑکا امکان کم سے کم ہو۔ میں کوئی چندہ منٹ بعد نیچے سرک پر نکلا اور جیسے ہی سرک پر نکلا دوسری طرف سے دو عدد آدمی صحیحیں عمودار ہوئیں۔ ایک مسلح آدمی کو سرک پر پا کر ان کے بریک گگ گئے اور پھر مسلح فوجیوں نے باہر کوڑ کر میری طرف اپنی گنیں تان لی تھیں۔ ان میں ایک کیپٹن بھی تھا۔

”خبردار اپنے ہتھیار پھینک دو۔“

میں نے جلدی سے شارٹ گن اور رائل زمین پر گرا دی اور دونوں ہاتھ سر پر رکھ لیے۔ دو سپاہیوں نے میری تلاشی لی۔ کیپٹن اور دوسرے فوجی مجھی پاس آ گئے تھے۔ میں نے کیپٹن سے کہا۔ ”میرا نام شبہاز ملک ہے اور میں کرل ضیاء الدین کا مہمان ہوں۔“

کیپٹن نوجوان تھا لیکن آنکھوں اور چہرے سے ذہانت جھلک رہی تھی۔ ”تم کرل کے مہمان ہو۔“ اس نے کہا اور رائل کی طرف اشارہ کیا۔ ”تمہارے پاس بھارتی ساختہ رائل ہے۔“

”تم بے شک مجھے اپنی تحویل میں رکھو لیکن کرل کی کوئی میں اس وقت بھی کم سے کم دو زندہ بھارتی کمانڈرز

موجود ہیں۔“

کیپٹن چونکا۔ ”کچھ مارے بھی گئے ہیں؟“

میں نے سر ہلایا۔ ”کم سے کم چھ مارے گئے ہیں اور افسوس ناک خبر یہ ہے کہ کرل کا رولڈ شاکر شہید ہو گیا ہے۔“ کیپٹن کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اسے میری بات پر کسی قدر یقین آ گیا تھا لیکن اس نے میرے ہاتھ پشت پر بندھوا کر ایک جیب میں سوار کر دیا تھا۔ میرے اوپر ایک سپاہی لگا کر باقی پارتی کرل کی گولی کی طرف روانہ ہوئی۔ وہ پوری طرح مسلح ہر قسم کی صورت حال سے نمٹنے کے لیے تیار تھے۔ مجھے پوچھنے کا موقع نہیں ملا کہ آری کو کیسے پتا چلا کہ کرل کی گولی میں کچھ ہوا ہے۔ یہ سوال میں نے سپاہی سے کیا۔ اس نے مجھے ہرک دیا۔

”جیب کر کے بیٹھو۔“

”بھائی میں بھی پاکستانی ہوں آج ہی پانچ انڈین میرے ہاتھ سے مارے گئے ہیں۔ میں کرل ضیاء الدین کا مہمان بھی ہوں۔“

میرے یہ کارنامے سن کر سپاہی کسی قدر نرم پڑ گیا اس نے کہا۔ ”کرل صاحب دہلی حالت میں چوکی تک پہنچے تھے؟“

”کرل صاحب زندہ ہیں۔“ میں نے خوشی سے کہا۔ ”ان کے ساتھ کوئی اور بھی تھا؟“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں وہ اکیلے اور پیدل تھے بہت دہلی تھے ہت کر کے کسی طرح چوکی تک پہنچ گئے۔“ یہ سن کر میری خوشی کا نور ہو گئی۔ میرا خیال تھا کہ کرل صاحب دہلی اور مردہ بھارتیوں کو لے کر آری چوکی تک پہنچ گئے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ ان کی راستے میں بھارتیوں سے ڈھبھڑکا ہوا تھا اور انہوں نے اپنے آدمی واپس حاصل کر لیے تھے۔ جھڑپ میں کرل صاحب زخمی ہوئے تھے لیکن کسی طرح بچ کر چوکی تک پہنچنے میں کامیاب رہے تھے۔ کیپٹن کے ساتھ کل آٹھ سپاہی تھے جن میں سے ایک میرے ساتھ تھا باقی آٹھ افراد مشکل میں پڑ جاتے اگر کوئی میں موجود تمام بھارتی زندہ ہوتے مگر اب کیپٹن کے لیے رکی کاروائی باقی رہ گئی تھی۔ آدھے گھنٹے بعد وہاں مزید کچھ پہنچ گئی تھی۔ اس بار آنے والے اٹلی جس سے تعلق رکھتے تھے اور انہوں نے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ ظاہر ہے معاملات میں میں بھی شامل تھا۔ مجھے جیب سے اتار کر ایک بڑی جیب میں بٹھا گیا لیکن میرے ہاتھوں دیے تھے اس

کا مطلب تھا کہ اب میں محکوم نہیں رہا تھا لیکن فی الحال مجھے جانے کی اجازت بھی نہیں مل سکتی تھی۔

بڑی جیب میں منتقلی کے دس منٹ بعد ایک کسی قدر بھاری جسامت کا شخص اندر آیا۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ”مسٹر شہباز ملک... تم مجھے میجر آدم کہہ سکتے ہو۔“

وہ سادہ لباس میں تھا اور لازمی بات تھی اس کا نام بھی اصلی نہیں تھا۔ وہ انٹیلی جنس کا بندہ تھا اور اپنی شناخت ظاہر نہیں کر سکتا تھا لیکن اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ مجھ سے واقف ہے۔ کم سے کم نام سے زیادہ ہی واقف تھا۔ میں نے پہلا سوال اپنے حیثیت کے بارے میں کیا۔ ”کیا میں سرکاری تحویل میں ہوں؟“

”نہیں دوست تم ہمارے مہمان ہو۔“ وہ مسکرایا۔

”تمہاری وجہ سے ہم بہت اہم جاسوسوں تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔“

”یہ جاسوس نہیں انٹرن کمانڈوز ہیں۔“ میں نے تصحیح کی۔

”یہ درست ہے، یہ تمہیں مارنے آئے تھے؟“

میں نے سر ہلایا۔ ”تمہاری حکومت میرے درپے ہو رہی ہے۔“

میجر آدم کے پاس میرے لیے یقیناً بہت سارے سوالات تھے لیکن ابھی ہم باہر تھے اور اسے بہت سارے معاملات نشانہ تھے۔ وہ وہاں مصروف ہو گیا اور میں گاڑی میں بیٹھا انتظار کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ شام تیزی سے اتر رہی تھی۔ مزید آدھے گھنٹے بعد معاملات کو سول حکام کے حوالے کر کے میجر آدم واپس آیا اور ہم لوگ یہاں سے روانہ ہوئے۔ میں کرنل کی حالت کے بارے میں جاننے کے لیے بے چنن تھا لیکن میجر آدم کو کبھی فی الحال کچھ نہیں معلوم تھا اس نے مجھے تسلی دی۔ ”ہیڈ کوارٹر پہنچ کر پتا چل جائے گا۔“

میں نے اسے شاکر کے بارے میں بتایا تو وہ بھی متاثر نظر آنے لگا لیکن اس نے کچھ کہا نہیں۔ روانگی کے کچھ دیر بعد تاریکی چھانے لگی تھی اور جب ہم ایک پھیلی ہوئی دمنزلہ عمارت تک پہنچے تو رات مسلط ہو چکی تھی۔ یہ شاید کسی آری تنصیب کا کوئی حصہ تھا جو انٹیلی جنس والوں کو دیا ہوا تھا۔ مجھے ایک سادہ لیکن صاف ستھرے اور آرام دہ کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ اندر درجہ حرارت بھی معتدل تھا۔ مجھے کمرے تک پہنچانے والے نے شاکستہ لہجے میں بتا دیا کہ میں قیدی نہیں

تھا لیکن مجھے بلا وجہ کمرے سے نکلنے سے گریز کرنا ہو گا کسی بھی ضرورت کے لیے کمرے میں انٹر کام موجود تھا۔ میں ایک جتن دبا کر بات کر سکتا تھا۔ میں نے سب سے پہلے کافی طلب کی اور پھر میجر آدم سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ مجھے بتایا گیا کہ کافی دس منٹ میں آجائے گی اور وہاں میجر آدم نام کا کوئی شخص نہیں تھا۔

لیکن کافی کے ساتھ میجر خود آ گیا۔ ”تم نے مجھ سے ملاقات کی بات کی تھی۔“

”ہاں مگر یہاں تو کوئی میجر آدم نہیں ہے۔“

”ہم سب آدم ہیں۔“ اس نے شرمندہ ہوئے بغیر فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ”اور میجر صرف میں ہوں اس لیے میجر آدم ہوں۔“

میں نے کافی کا سب لیا۔ ”میجر تم لوگ کتنی دیر میں اپنی تحقیق مکمل کر لو گے اور مجھے جانے کی اجازت مل جائے گی؟“

”اس میں شاید ایک مہینہ لگ جائے گا۔“ اس نے کہا تو میں نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ لیکن وہ مکمل سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

”میجر تم سنجیدہ ہو، ہماری پولیس بھی ایک رات میں سب معلوم کر سکتی ہے جسے آگے بھی جواب دینا ہوتا ہے اور تمہیں تو ہمیں جواب دہی بھی نہیں کرنی ہوتی ہے۔“

”اسی لیے ہمیں زیادہ احتیاط کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔“ وہ بولا۔ ”ہم پر دیے بھی الزام لگنا بہت آسان اور فیشن بن گیا ہے۔“ اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

”میں اپنی بات کر رہا ہوں۔“ میں نے اسے ٹوک دیا۔ ”دیکھو میں نے تمہاری مدد کی ہے۔ تمہاریوں کا یہ گروپ نہ جانے کب سے یہاں سرگرم عمل تھا۔“

”تم نے خود کو بتایا ہے۔“ اس نے چالاکی سے کہا۔

”ہاں پہلی بار بتایا تھا لیکن دوسری بار میں نے خود پتہ لیا، میں برداشت نہیں کر سکا کہ پاک سرزمین پر بھارتی پولی وڈنا سے پھریں اور میں جانتے ہو جیسے انھیں بند کر لوں اور نہ میں اب تک اسلام آباد چا چکا ہوتا۔ تم لوگ اچھا صلہ دے رہے ہو۔“

وہ مستعد ہو گیا۔ ”سوری میں مذاق کر رہا تھا۔ ہمارے ہاتھ دوزندہ بھارتی لگے ہیں اور ان سے پوچھ کچھ جاری ہے۔“

”کرنل نے تمہیں ملک مقیم کے بارے میں بتایا ہوگا؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”اسی کے ڈیرے پر چھاپے سے ہمیں پتا چلا کہ بھارتی کرنل کی کوشش کی طرف گئے ہیں وہاں سے ہم نے اپنی مقامی غدار چکرے ہیں۔ اسلحہ اور غیر ملکی کرنسی بھی بڑی مقدار میں نکلی ہے۔“

”میرے خیال میں تمہیں بھارتی روپیہ یا ڈالر رکھتے ہوئے ہچکچاہٹیں چاہیے۔“ میں نے سادگی سے کہا۔ ”ملک کا ہر شخص جانتا ہے کہ ملک میں کیا ہو رہا ہے اور اس میں کون کون لوٹ ہے۔“

میجر آدم نے سر آہ بھری۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن ہماری مجبوریات شدید نوعیت کی ہیں۔ بہر حال جو ہمارے ہاتھ آجائے ہم اسے چھوڑتے نہیں ہیں۔ یہ بھی ٹھیک ہے ملک کے لوگوں کو بہت قربانیاں دینی پڑ رہی ہیں لیکن کوئی ملک قربانی دیے بغیر اچھے نہیں بڑھ سکتا ہے۔“

”مگر قربانی ہمیشہ نچلے درجے کے لوگوں کی کیوں لی جاتی ہے؟“

”کیونکہ اوپر والے اس قابل نہیں ہیں کہ اللہ ان سے قربانی لے۔“ میجر آدم نے یہ بات اتنی سنجیدگی سے کہی کہ میں خود کو لا جواب محسوس کرنے لگا۔ اس لیے میں نے بات بدل دی۔

”تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟“

”تم آزاد ہو زیادہ سے زیادہ کل صبح تک یہاں سے جاسکو گے۔“

میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ ”ٹھیک ہے کل صبح ہی سہی لیکن کیا میں یہاں سے اپنے دوستوں کو کال کر سکتا ہوں؟ وہ میری خیریت کے بارے میں فکر مند ہوں گے۔“

اس نے سوچا اور پھر سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے کافی پی لو پھر پلے ہیں۔“

میری کافی ختم ہونے والی تھی۔ میں نے نگ خالی کر کے تپائی پر رکھا اور کھڑا ہو گیا۔ میجر آدم مجھے ایک کمرے میں لایا جو بے ظاہر کٹرول روم لگ رہا تھا۔ اس نے ایک فون اٹھا کر مجھے سے نمبر اور نام پوچھا۔ میں نے عبد اللہ کا نام اور اس کی کوشش کا نمبر بتایا۔ اس نے نمبر ڈائل کیا اور رابطہ ہونے پر عبد اللہ سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی چند لمحوں بعد عبد اللہ لائن پر تھا۔ میجر نے اس سے کہا۔ ”مسٹر شہباز ملک تم سے بات کرنا چاہیں گے۔“

اس نے ریسیور ہاتھ سے دبا کر میری طرف

دیکھا۔ ”تم یہاں کے معاملات کے بارے میں کوئی بات نہیں کرو گے۔“

میں نے سر ہلایا تو اس نے ریسیور مجھے دے دیا۔ ”شہباز صاحب۔“ عبد اللہ کہہ رہا تھا۔

”عبد اللہ۔“ میں نے مشکل سے کہا۔ ”تم کیسے ہو باقی سب کیسے ہیں۔“

”ہم ٹھیک ہیں لیکن آپ کہاں ہیں ہم سب بہت پریشان ہیں وسم اور ایاز آپ کی تلاش میں تادرون ایریا جاسے ہیں۔“

”میں ٹھیک ہوں یا ر انہیں روک لو۔ میں انشا اللہ کل تک پہنچ جاؤں گا۔“

”آپ نے پہلے بھی یہی کہا تھا۔“ اس نے شکوہ کیا۔

”پہلے دشمنوں کی تحویل میں تھا لیکن اب دوستوں کی تحویل میں ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”تم فکر مت کرو میں کل آ جاؤں گا یا دیر ہوئی تب بھی تم سے رابطہ رکھوں گا۔“

اس دوران میں وسم بھی آ گیا تھا میں نے اس سے کچھ دیر بات کی اور اسے تسلی دی۔ ڈھکے چھپے انداز میں وہاں کے معاملات کے بارے میں پوچھا تو اس نے گول مول سے انداز میں جواب دیا۔ ”یہاں بہت کچھ ہو چکا ہے، ہم نے کئی کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ آپ آئیں تو آپ کے سامنے رکھتے ہیں لیکن اب آپ کا آنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔“

”میں جلد آؤں گا اور سنو اس لائن سے زیادہ دیر بات نہیں کر سکتا ہوں، باقی سب کو میری خیریت کی اطلاع کر دیتا۔“ میں نے کہا اور پھر فون بند کر دیا۔ میجر نے مجھ سے ریسیور لے لیا۔

”ٹھیکس۔“ اس نے کمرے سے باہر آ کر کہا۔

”دس بات کا؟“

”تم نے وعدے کے مطابق یہاں کے معاملات کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ یونہی یہاں لائن پر چیک ہوتا ہے اور ہم ایک حد سے زیادہ کال نہیں کر سکتے کیونکہ لائنیں محدود ہیں اور ان پر بوجھ بہت زیادہ ہوتا ہے۔“

میں نے اب تک میجر آدم کو بھارتیوں کی پہلی کوشش کے بارے میں نہیں بتایا تھا جس میں ایک بمبلی کا پٹر اور دو بھارتی کام آئے تھے ان کی لائیں اور چوہر کا علیہ پاکستان کی حدود میں موجود تھا۔ پہلے میرا ارادہ زبان بند رکھنے کا تھا لیکن مجھے خیال آیا کہ بھارتیوں نے اس بارے میں پھوٹ دیا تو میجر آدم کو بجا طور پر شک ہو جائے گا کہ میں نے ان سے یہ

بات کیوں چھپائی؟ ممکن ہے اس سے میری کل صبح روانگی خطرے میں پڑ جائے۔ دوسری طرف بتانے میں ایک خطرہ یہ بھی تھا کہ اس بارے میں بھی انکو آری شروع ہو جائے اور مجھے تب تک کے لیے یہاں روک لیا جائے یا معاملہ اوپر کی سطح تک چلا جائے اور معاملات ششکے ششکے میری رہائی ملتوی کر دی جائے۔ دوسرا خطرہ ہلکی نوعیت کا تھا اس میں تاخیر ہو سکتی تھی لیکن ان لوگوں کو مجھ پر کسی قسم کا شک نہیں ہوتا۔ اس لیے میں نے میجر آدم کو بتانے کا فیصلہ کر لیا۔ ہم کمرے میں واپس آئے تو میجر نے میرے تاثرات سے بھانپ لیا۔

”کیا بات ہے تم پریشان لگ رہے ہو؟“

میں نے سر ہلایا۔ ”ایک بات کا میں نے ابھی تک ذکر نہیں کیا۔“

”بھارتیوں سے متعلق ہے؟“

”ہاں... انہوں نے مجھے پہلے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔“ میں نے کہا پھر فتح خان اور کرنل کو واضح طور پر درمیان میں لائے بغیر میں نے تمام واقعات بتائی کے ساتھ بیان کر دیے تھے۔ میجر فورس سن رہا تھا۔ اس نے درمیان میں سوالات نہیں کیے تھے لیکن جب میں نے بات مکمل کی تو اس نے سوالات شروع کیے اور تب مجھے صحیح معنوں میں اندازہ ہوا کہ اس کا تعلق اٹلی جنس سے ہے۔ اس نے پوچھا کہ میں نے دوا کے زہر اثر ہونے کے باوجود بھارتیوں پر کسی طرح سے قابو پایا میں کرنل زریب کی اور فتح خان کے کتہ جوڑ اور چالاک کے بارے میں نہیں بتا سکتا تھا جو انہوں نے مجھے بیچانے کے لیے کی تھی۔ فتح خان کا دوسرے سے ذکر ہی نہیں کیا تھا اور کرنل زریب کی کا ذکر ایک ناواقف شخص کے طور پر کیا تھا جسے میں نے پہلی بار دیکھا ہو لیکن میجر نے میرے بیان میں کمزوری تلاش کر لی تھی اور اسے یہ بات ختم نہیں ہو رہی تھی کہ جسمانی طور پر کمزور ہونے کے باوجود میں نے دو بھارتیوں پر قابو پایا تھا۔

میں نے دوبارہ کرنل والے کہیں میں واپسی کی بات بھی گول کر دی تھی کہ وہ مجھے اس کے مزید کئی سوالات کا جواب دینا پڑتا۔ میں نے اپنا بیان یہاں تک محدود رکھا تھا کہ جہاں چاہا پر کریش ہوا وہاں سے میں نے ایک وین چرائی اور بھاگ نکلا مگر راستے میں مجھ سے بھارتی لگرا گئے جو میری تلاش میں تھے۔ میں علاقے سے ناواقف ہونے کی وجہ سے بھگ رہا تھا اور انہوں نے مجھے گھیر لیا اس کے بعد جو ہوا وہ میں نے جوں کا توں بیان کر دیا تھا۔ اب میجر آدم یقین نہیں

کر رہا تھا تو یہ اس کی مرضی تھی۔ میں نے زندہ اور مردہ ہونے ان کے حوالے کر دیے تھے اور وہ ان سے بچائی انکو اٹھاتے تھے۔ بہر حال میں مجرم نہیں تھا جس سے وہ بہر صورت بچائی انکو ان کا اختیار رکھتا تھا۔

میجر نے میرا بیان ریکارڈ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن میرا اندازہ تھا کہ اس کمرے میں ہونے والی ہر بات ریکارڈ ہو رہی تھی۔ اس کے جانے کے کچھ روز بعد مجھے رات کا کھانا مہیا کر دیا گیا اور یہ اچھے معیار کا لذیذ کھانا تھا جس میں مقدار کا بھی خیال رکھا گیا تھا۔ کھانا کھا کر میں بہت دن بعد بے غلری کی نیند سو گیا تھا۔ میں نے میجر آدم سے درخواست کی تھی کہ مجھے کرنل ضیا الدین کی حالت سے باخبر کیا جائے۔ اس نے وعدہ کر لیا تھا کہ جیسے اس تک اس کے بارے میں کوئی اطلاع آئے گی وہ مجھے بتائے گا۔ کرنل ضیا الدین کو نزدیک ترین سی ایم ایچ منتقل کر دیا گیا تھا۔ اسے پیٹ اور ران پر دو گولیاں لگی تھیں اور وہ اس حالت میں بھی بھارتیوں کی قید سے فرار ہو گیا تھا۔ اس کی ہمت اور حوصلہ قابل تعریف تھا۔ اس نے ثابت کر دیا کہ شیر ہوا جڑ ہونے کے باوجود شیر ہی ہوتا ہے۔ اس کا جسم کمزور ہوتا ہے لیکن اسے حملہ کرنے کے کراتے ہیں۔

میں رات نو بجے سو گیا تھا اور صبح چھ بجے میری آنکھ کھل گئی۔ کمرے کے ساتھ ایک چھوٹا سا واٹس روم تھا۔ میں نے گرم پانی کی سہولت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے غسل کیا اور پھر انگرام پر کافی اور ناشا طلب کیا۔ سات بجے میں نے میجر آدم سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ ابی دفتر میں نہیں ہے۔ میں نے کہہ دیا کہ اس کے آتے ہی میری درخواست اس تک پہنچا دی جائے۔ میرے پاس ممبرس انتظار کرنے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا لیکن اس دن مجھے پتا چلا کہ دشمن کی قید سے زیادہ دوستوں کی تحویل میں وقت گزارنا زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ جب آپ اپنی مرضی کرنے کے لیے آزاد نہیں ہوتے اور اپنی مرضی بھی کرنا چاہتے ہو۔ وقت تھا کہ گزرنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ گھڑی کی سوئیاں جیسے اپنی جگہ انگ کر رہی تھیں آگے بڑھنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔

میں نے وقت گزاری کے لیے اپنا آزمودہ نسخہ آزمایا۔ دس بجے میں نے ورزش کی اور بارہ بجے دوبارہ کھانا طلب کیا۔ ایک بجے جب میں دفتر میں موجود کی اور آفیسر سے بات کرنے کا سوچ رہا تھا تو میجر آدم آ گیا۔ اس

نے آتے ہی معذرت کی۔ ”سواری یا تمہارے چکر میں دیے ہوگی۔“ میرے چکر میں...؟“ میں نے خشکی سے کہا۔ ”میں یہاں بندھا ہوا ہوں۔“

”بھائی تمہاری رپورٹ بھی تو کرنی تھی۔“ اس نے طعنت سے کہا۔ ”میں اپنی صوابدید پر تمہیں اپنی تحویل میں لے سکتا ہوں لیکن اپنی صوابدید پر چھوڑ نہیں سکتا۔ اس کے لیے مجھے اتھارٹیز کے سامنے تمہارا سارا کیس رکھنا پڑا اور کئی دن تک ان کے سرکھانا پڑا تب کہیں جا کر تمہاری گلو خلاصی آ کر آؤ حاصل کیے۔ دینے اب مجھے پتا چلا کہ تمہاری تو بہت سی چوڑی فائل ہمارے پاس موجود ہے اور اس میں تمہارے بہت سارے کارنامے درج ہیں۔“

”وہ کارنامے جو پولیس کی ایف آئی آرز میں لکھے گئے ہیں۔“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

”وہ بھی ہیں لیکن ہماری توجہ کا مرکز وہ کارنامے ہیں جو تم نے انڈیا میں سرانجام دیے تھے اور اس کے بعد تم چین میں بھی رہے ہو۔“

”یہ درست ہے۔“

میجر آدم کچھ سوچنے لگا جیسے کچھ کہنا چاہ رہا ہو۔ ”پچھلے دنوں چینی حکام کی جانب سے پاکستانی حکام کو ایک درخواست موصول ہوئی کہ ان کا ایک نہایت کا فائدہ بخش ریف کیس پاکستان میں کہیں موجود ہے اور پاکستانی حکام اس کی تلاش میں ہماری مدد کریں۔“

”میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“ میں نے غلط انداز میں کہا۔

”ٹھیک ہے تم پر اس سلسلے میں کوئی الزام نہیں ہے لیکن ہتھیوں نے ہمیں کچھ تصدیق دی ہیں۔ کچھ افراد بھارت کی طرف سے سرحد عبور کر کے غیر قانونی طور پر چین میں داخل ہوئے اور انہوں نے ایک لڑکی کو چینی حکام کی تحویل میں دیا تھا۔ بعد میں ان افراد کو چین میں ایک اور جگہ منتقل کیا جا رہا تھا کہ پہلی کارپز بھارت کی طرف سے فائر کیے جانے والے جوائل کا نشانہ بن گیا۔ اس حادثے میں چین کے کئی فوجی اور تین فوجی آفیشلوں مارے گئے۔ لیکن جن افراد کو منتقل کیا جا رہا تھا ان کی لاشیں کہیں نہیں ملی تھیں۔ اسی پرواز میں وہ لاشیں بھی تھیں جو غائب پایا گیا۔ جو پر کے بلے کے آس پاس اس کا بھی کوئی نام و نشان نہیں ملا تھا۔“

میں سمجھ رہا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے میں نے دل

کڑا کر کے پوچھ لیا۔ ”میجر آدم تم مجھے یہ سب کیوں بتا رہے ہو؟“

”کیونکہ ہمیں جو تصاویر دی گئی تھیں ان میں سے ایک تصویر تمہاری بھی تھی۔“

”میں بھی چینی حکام کی تحویل میں نہیں رہا۔“ میں نے فوراً انکار کر دیا۔ ”اس شخص کی صورت مجھ سے ملتی ہوگی۔“

میجر بہر طور مجھے دیکھ رہا تھا پھر اس نے کہا۔ ”میں نے بھی وہ تصویر دیکھی ہے تم ٹھیک کہہ رہے ہو وہ شخص تم سے حیرت انگیز حد تک ملتا ہے لیکن وہ تم نہیں ہو۔“

میں نے سکون کا سانس لیا۔ ”اس اعتماد کے لیے میں تمہارا شکر گزار ہوں لیکن یہ بتاؤ کہ میرے بارے میں کیا فیصلہ ہوا ہے میں واپس جانے کے لیے بے تاب ہوں۔“

”تم جا سکتے ہو۔“ اس نے جواب دیا۔ ”لیکن تمہیں کسی ایسے شخص کا پتا اور فون نمبر دینا ہو جس کی مدد سے ہم یہ وقت ضرورت تم سے رابطہ کر سکیں۔“

”میں نے جس نمبر پر کال کی تھی اور عبداللہ نامی شخص سے بات کی تھی یہی نمبر ارا رابطہ کار ہوگا۔“ میں نے خوش ہو کر کہا۔

میجر آدم واضح طور پر میرا غور کر رہا تھا۔ ورنہ یہ بات تو سامنے کی تھی کہ چینی حکام نے جو تصویر دی تھی وہ میری ہی تھی۔ یہ اونچے درجے کے سفارتی معاملات تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ چینی حکام نے کس نوعیت کی درخواست کی تھی اور پاکستانی حکام نے اس پر کیا ردعمل ظاہر کیا تھا۔ اگر یہ ردعمل چینی مطالبے کے مطابق ہوتا تو میری اتنی آسانی سے رہائی ممکن نہیں تھی۔ شاید کوئی سفارتی ڈیل لاک تھا۔ میجر مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔

”ایک گاڑی تمہیں سوات میں ایک گیسٹ ہاؤس تک پہنچائے گی۔ وہاں تم رات کو قیام کرو گے اور کل صبح یہی گاڑی تمہیں اسلام آباد پہنچا دے گی۔“

”پکڑے جانے والے بھارتیوں کا کیا ہوا؟“

”یہ معاملہ اوپر تک چلا گیا ہے اور ہمیں اس بارے میں علم نہیں ہے۔“

”کرنل کی حالت کیسی ہے؟“

”بہتر ہے، آپریشن کے کئی گولیاں نکال دی گئی ہیں۔ اسے صحت یاب ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔“

”اسے شاکر کے بارے میں علم ہے؟“

”ہاں وہ بہت شور کر رہا تھا اس لیے مجبوراً اسے بتانا پڑا۔“

”مجھے انوس ہے بہر حال یہ ایسی بات نہیں تھی کہ کرنل سے چھپائی جاسکتی۔ شاکر شہید ہوا ہے مجھے امید ہے کرنل اس صدمہ کو برداشت کر لے گا۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ میجر آدم کھڑا ہو گیا۔ ”تم نے کھانا کھا لیا؟“

”ہاں میں کھا چکا ہوں۔“

ہم باہر آئے، پارکنگ میں ایک چھوٹی دوسٹیوں والی ملٹری جپ موجود تھی۔ ایک وردی پوش ڈرائیور پہلے سے موجود تھا۔ ”یہ قاتب حسن ہے۔ تم اس میں جاؤ گے۔“

میں نے سکون کا سانس لیا۔ میرے پاس کچھ نہیں تھا اگر مجھے خود سے جانا پڑتا تو میں خالی ہاتھ تھا۔ کرنل اور فتح خان سے میں نے صرف اسلحہ لیا تھا اور مال غنیمت میں ان دونوں کا مال چھوڑ دیا تھا حالانکہ دونوں کے پاس اچھی خاصی رقم تھی۔ قاتب حسن نے گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ”سر آپ فخر کریں اسلام آباد تک کوئی پریشانی نہیں ہوگی سارا راستہ میرا دیکھا ہوا ہے۔“

”کیا تم نان اسٹاپ نہیں جاسکتے؟“

”نہیں اسٹاپ طے ہے۔“ میجر آدم نے کہا۔ ”اسے سوات میں رپورٹ کرنی ہے۔“

”تب ٹھیک ہے۔“ میں نے سر آدھ بھری۔

میجر آدم نے مجھے سینے سے لگایا۔ ”اللہ تمہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے اور دشمنوں کے عزائم ناکام بنائے۔“

”تم جیسے پُر خلوص لوگ ہوں اور ان کی دعائیں ہوں تو آدمی کامیاب ہی رہتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”آگر زندگی رہی اور موقع آیا تو ہم پھر ملیں گے۔“

”انشاء اللہ۔“ اس نے کہا تو میں اچک کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

”یہ تمہارے لیے کچھ چیزیں ہیں۔“ میجر آدم نے ایک چھوٹا سا شاپر بکڑا دیا۔ ”کھانے کا سامان اور کافی کا تھرماس بھی ساتھ ہے ضرورت پڑے تو قاتب سے کہہ دینا۔“

”شکر ہے دوست۔“ میں نے کہا اور شاپر لے لیا۔

میں نے پوچھا کہیں اس میں کیا تھا۔ جب جپ پارکنگ سے نکل کر سڑک پر آئی تو میں نے سیٹ پیچھے کر لی اور سر نکال کر اونگھنے لگا۔ قاتب اس دھواں پھاڑی علاقے میں بھی اتنی ہموار ڈرائیونگ کر رہا تھا کہ مجھے نیند آگئی۔ میں سویا ہوا تھا کہ

قاتب نے جپ روک دی۔ ہلکے سے دھچکے سے میری کمر کھل گئی۔ شام کے پانچ بج رہے تھے۔ ”کیا ہوا قاتب؟“

”انجن گرم ہو گیا ہے اسے آرام دے رہا ہوں۔“ اس نے جواب دیا اور نیچے آ کر آیا میں بھی نیچے

آ گیا۔ جپ سڑک کے کنارے ایک آبشار سے ڈرافٹ لے رہی تھی۔ قاتب حسن کین لے کر گیا اور اس میں تازہ پانی

بھر لایا۔ اس نے ریڈی ایٹر میں سرد پانی ڈالا۔ میں نے آبشار تک جا کر یہ سرد پانی پیا اس کے بعد قاتب نے ہات

ہات سے سینڈ وچ اور تازہ بیک کیے ہوئے ایک جپ لے لیا۔ ”نکلے اور کافی کے ساتھ سرد کیے۔ سردی تھی اور پانی کی

قربت میں زیادہ سردی تھی لیکن ہم اسے انجوائے کر رہے تھے۔ سوات کی طرف جاتے ہوئے موسم بہتر ہو رہا تھا۔

اچانک مجھے خیال آیا اور میں نے قاتب سے پوچھا۔

”آج تاریخ کیا ہے؟“

اس نے کسی قدر حیرت سے مجھے دیکھا پھر

بولی۔ ”تین مارچ ہے۔“

گویا مجھے غائب ہوئے ایک ہفتے سے زیادہ کا وقت

ہو چکا تھا۔ میں سوچ سکتا تھا کہ میرے پیاروں اور چاہنے

والوں پر کیا کڑی ہوئی میری اس کم شدگی کے دوران۔ میں

سوات کے آری گیٹ ہاؤس سے کال کر کے ان لوگوں سے

بات کر سکتا تھا۔ کافی نے ہمیں تازہ دم کر دیا تھا اور سرد پانی

نے جپ کے انجن کو خشک ہٹا کر دوبارہ چلا دیا۔ اس کے بعد دوپہ

کا سفر مزید تھا۔ سڑک بہت اچھی نہیں تھی لیکن بہت خراب

بھی نہیں تھی۔ اصل بات یہ تھی کہ قاتب حسن بہت اچھا

ڈرائیور تھا اور ملٹری جپ بہترین حالت میں تھی اس لیے

اس سفر کا پتا ہی نہیں چلا تھا اور ساڑھے سات بجے ہم آری

گیٹ ہاؤس کی خوب صورت عمارت کے اندر موجود

تھے۔ قاتب حسن نے ریسپشن پر ایک کاغذ پیش کیا جس کے

بعد مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

ایک وردی پوش وینٹر نے مجھے اس صاف ستھرے

اور سجے ہوئے کمرے میں پہنچایا جو میرے لیے مختص کیا گیا

تھا۔ اس نے بتایا کہ ڈنٹا ٹائم آٹھ سے دس تک ہوتا ہے اگر

میں میس میں نہ کھانا چاہوں تو کمرے میں بھی سرد ہو سکتا

ہے۔ میں نے اس سے کہا۔ ”میں ساڑھے آٹھ بجے کمرے میں کھانا پسند کروں گا۔ لیکن اس سے پہلے مجھے کچھ

کا لڑکھائی ہے۔“

ایک مینٹن موجود ہے آپ آپریٹر سے کہہ کر کہیں بھی

ہال ملوا سکتے ہیں۔“ وینٹر نے بتایا اور رخصت ہو گیا۔ مجھے

دست محسوس ہوئی۔ میرے پاس کچھ تھقی نہیں جو میں اسے

پیش میں دیتا اور اس نے بھی ایسا ظاہر نہیں کیا جیسے وہ پپ کے

انتظار میں تھا۔ اس کے جانے کے بعد مجھے اس شاپر کا خیال

آیا جو میجر آدم نے دیا تھا۔ اس میں کوئی کپڑے جیسی چیز تھی

میں نے اسے کھولا تو اندر سے ایک نیوی بلو پتلون اور رائفل بلو

کمری ملی۔ سیلو جری برآمد ہوئی تھی۔ یہ یہاں کے موسم کے لحاظ

سے نہیں تھی لیکن اسلام آباد میں یہ یقیناً کام آتی۔ میں نے

بقی اٹھائی تو اس کی تہہ سے ایک چھوٹا سا لفافہ باہر کرا میں

نے اسے کھولا تو اندر پانچ ہزار روپے مالیت کے پانچ نوٹ

تھے۔ ایک چھوٹا سا نوٹ بھی تھا۔

”ایک دوست اور بھائی کی طرف سے خلوص کے

ساتھ۔“

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ یہ اللہ کا احسان تھا کہ

اس نے مجھے بنا چاہے اتنے اچھے اور پُر خلوص دوست عطا

کیے تھے۔ کمرے میں چھوٹا سا اور سادہ ٹون سینٹ موجود تھا۔

میں نے اسے اٹھا کر صفر دیا تو فوراً آپریٹر کی آواز

آئی۔ ”میں نے آئی ویلیپ پوسر۔“

”پلیز مجھے کچھ کا لڑکھائی ہے۔“

”فرزٹ نمبر پلیز سر۔“

میں نے اسے پہلا نمبر سویرا کا دیا۔ یہ سویرا مل گیا۔

آپریٹر نے کال ملائی اور پھر کمرے میں ٹرانسفر کر دی۔ سویرا

نے چلو کہا تو میرا دل دھڑکا تھا۔

”کون بات کر رہا ہے؟“

”یو جھوٹو جانیں۔“ میں نے جان بوجھ کر ڈرا بھاڑی

آواز میں کہا۔

”آپ۔۔۔ آپ شہباز ہیں۔“ وہ بے تاب ہو گئی۔

”تم نے پہچان لیا۔“

”ہاں آپ کہاں غائب ہو گئے تھے سب اتنا پریشان

تھے۔ میں شام عبد اللہ بھائی کو کال کر رہی تھی۔“

”تمہیں پتا تو چل گیا ہو گا کہ میں مشکل میں پڑ گیا تھا

لیکن اب میں آزاد ہوں۔“

”آپ کو دشمن لے گئے تھے؟“

”ہاں فتح خان اور کچھ دوسرے دشمنوں کی قید میں تھا

لیکن اللہ کی مہربانی سے اب آزاد ہوں اور اللہ نے چاہا تو کل

نیک اسلام آباد پہنچ جاؤں گا یہ بتاؤ تم کیسی ہو؟“

یک دم اس کی آواز بھگ گئی۔ ”آپ کے بغیر کسی

ہونکتی ہوں۔“

”میری جان۔۔۔۔۔ یہ جدائی بس چند دن۔۔۔۔۔“

”مجھے جھوٹی تسلی نہ دیں میں صبر سے انتظار کر رہی

ہوں مجھے صبر کرنے دیں۔“

میں نے گہری سانس لی۔ ”ٹھیک ہے لیکن مجھے پوری

امید ہے وہ وقت زیادہ دور نہیں ہے۔“

کچھ دیر سویرا سے بات کی پھر ماں جی آئیں ان سے

بات کی۔ بابا کو سلام دینے کو کہا۔ وہ حویلی کے پیچھے والی

زمین ہوار کر رہے تھے اور اسی سلسلے میں باہر تھے۔ پھر میں

نے وسیم کا موبائل نمبر ملوایا۔ وہ میری آواز سن کر خوش ہو گیا۔

اس نے ٹھکھو کیا۔ ”آپ نے کہا تھا آج آجائیں گے؟“

”ہاں یار بس کچھ مسئلے ہو گئے تھے بہر حال اب میں

راستے میں ہوں اور اللہ نے چاہا تو کل تک تم لوگوں کے پاس

ہوں گا۔“

”آپ کہاں ہیں۔۔۔۔۔ یہ لائن محفوظ ہے؟“

”میں آری گیٹ ہاؤس سوات میں ہوں اور یہاں

کی لائن کے بارے میں تم خود سوچ سکتے ہو کتنی محفوظ ہوگی۔“

وسیم سمجھ گیا تھا کہ کوئی بات مکمل کر نہیں کرتی ہے۔ اس

نے گول مول انداز میں کہا۔ ”آپ کی عدم موجودگی میں

یہاں جیش رفت ہوئی ہے۔ ایک تو بیوی پاررو والی ہمارے

ساتھ مل کر کام کرنے کے لیے تیار ہو گئی ہے۔“

میں سمجھ گیا وہ کال کر لیں شہینہ کی بات کر رہا تھا جو تار

کے پاس جاتی رہتی تھی۔ ”یہ تو اچھی خبر ہے اسے بتے میاں کا

کیا حال ہے سنا ہے بے چارے ڈھیل چیخ پر آگئے ہیں؟“

”ان کے بارے میں بتا رہا تھا ان کے لیے اسپتال

میں الگ کمرہ حاصل کر لیا ہے آپ آجائیں تو ان کو شفٹ کر

دیا جائے۔“

”باقی سب کا کیا حال ہے؟“

”ٹھیک ہے ماں اب جیتو بہت یاد کرتے ہیں اپنے سفیر

بھائی نے دونوں کا ناظرہ بند کر رکھا ہے۔“

”وہ دونوں مل کر بھی اس کا مقابلہ نہیں کر پار ہے

چیں؟“ میں ہنسا۔ ”اپنے پیر صاحب اور خان صاحب کے

بارے میں کچھ پتا چلا؟“

”پیر صاحب کا آپ کو پتا ہے خان صاحب منظر عام

سے غائب ہیں لیکن وہ خان صاحب کی محرم راز خاتون پھر

میں دیکھی گئی ہیں۔“

منہ ہاتھ دھو لیا۔

وہ شہلا کا ذکر کر رہا تھا۔ ”کس نے دیکھا تھا؟“
”عبداللہ نے... سگنل پر اتفاق سے دیکھ لیا وہ مخالف
لائن میں تھی اس کا سگنل جلد کھل گیا تھا۔ خیر عبداللہ نے گاڑی
نمبر نوٹ کر لیا تھا۔ اب اسے تلاش کیا جا رہا ہے۔“
”وسیم یہ بہت ضروری ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ کسی
بڑے چکر میں ہے اور خان صاحب سے اس کا کٹھ جوڑ بہت
آگے جا چکا ہے۔ وہ دونوں مجھ سے کچھ چھپانے کی پوری
کوشش کر رہے ہیں۔“
”آپ کے آنے تک اس کا سراغ لگ جائے گا۔“
وسیم نے کہا۔

وسیم سے بات کر کے میں نے سفر کو کال کی۔ اس کا
نمبر یاد نہیں تھا اس لیے وسیم سے لے لیا۔ سفر نے مجھے گالیاں
دیں اور دھمکی دی کہ اب میں واپس آیا تو وہ مونا کو لے کر
کہیں غائب ہو جائے گا۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”تو اکیلا
جائے گا مونا نہیں جائے گی۔“
وہ مزید بھنکا گیا تھا۔ ”ہاں تمہاری چچی جو ہے۔“
”بٹے تم نے بہت حرام خوری کر لی ہے تیار ہو جاؤ
کام کے لیے کل مابدولت شریف لا رہے ہیں۔“
”پھر تمہیں اچانک غائب ہو جانے کے لیے۔“ اس
نے طنز کیا۔

”غائب ہو کر بھی میں کام ہی کرتا ہوں تم کیا کرتے
ہو۔“ میں نے اسے ڈانٹا۔ ”دونوں بچے کہاں ہیں؟“
”کمپیوٹر سے لگے رہتے ہیں۔ مانی نے بیٹو کو بھی
بہت تیز کر دیا ہے۔ دونوں سارا دن نہ جانے کہاں کہاں
سے کھانے کی چیزیں منگاتے ہیں اور اسٹڈی میں بیٹھ کر
کھا جاتے ہیں۔“ اس نے شگہہ کیا۔ ”بل مجھے ادا کرنا
پڑتا ہے۔“
”کوئی بات نہیں یار بچے ہیں کھائیں پیتیں گے نہیں تو
کیا کریں گے۔“ میں نے کہا۔

سویرا اور دوسرے لوگوں سے بات کر کے مجھے وہ
سکون ملا تھا جس سے میں ایک ہفتے سے نا آشنا تھا۔ کمرے
میں لی وی بھی تھا۔ میں نے مزید وقت گزاری کے لیے ٹی
وی آن کر لیا۔ ساڑھے آٹھ بجے وہی ویٹر آیا تھا اس نے
کھانے کا آرڈر لیا اور چلا گیا۔ میں نے اٹھ کر منہ ہاتھ
دھوا جالانکہ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ طویل سفر میں
ذرا بھی گرد مٹی نہیں پڑی تھی اور میں سر سے پاؤں تک
صاف ستھرا تھا۔ پھر بھی کھانے سے پہلے عادت کے مطابق

کھانے کے بعد میں نے چائے منگوائی۔ اس بار
جب ویٹر برتن لینے آیا تو میں نے اسے پانچ سو روپے پیش کر دیے
خوش ہو کر گیا تھا۔ میں ٹی وی دیکھتے ہوئے چینل سمسٹ رہا تھا
کہ ایک جگہ رک گیا۔ اس انگریزی چینل سے ایشیا کے
بارے میں ایک سیاسی تجزیہ پیش کیا جا رہا تھا۔ اس میں اس
خطے میں جاری بڑی طاقتوں کے درمیان گریٹ گیم پر بات
ہو رہی تھی اسے دیکھتے ہوئے مجھے اس بریف کس کا خیال
آیا جو میں چین سے ساتھ لایا تھا اور اس میں چین کے نوٹری
رازنے لیکن یہ بریف کس شہلا کے پاس تھا۔ سوچتے ہوئے
اچانک ہی ایک خیال نے مجھے اچھل پڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔
خیال یہ تھا کہ کہیں فتح خان اور شہلا اس بریف کس
کے چکر میں تو نہیں تھے اور یہ بات مجھ سے چھپا رہے
تھے۔ بھی فتح خان نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر مجھے اس معاملے
کا پتا چل گیا تو میں لازمی اس میں ٹانگ اڑاؤں گا اور وہ
اس میں میری مداخلت برداشت نہیں کرے گا اور اسی وجہ
سے فتح خان زندگی میں پہلی بار تنجید گی سے مجھے قتل کرنے کو
تیار ہو گیا تھا۔ میری قسمت اچھی تھی کہ وہ ناکام رہا۔ جیسے
جیسے میں اس بارے میں سوچتا جا رہا تھا میرا یقین بڑھتا جا رہا
تھا کہ معاملہ بریف کس کا ہی تھا اور فتح خان اس سے بہت
بڑا مالی فائدہ اٹھانے کی فکر میں تھا۔ یقیناً بریف کس اور اس
کے راز نہایت قیمتی تھے۔ چین کی مخالف کوئی بھی قوت اس
کی منہ مانگی قیمت دینے کو تیار ہو سکتی تھی۔ فتح خان کو یہ راہ
شاید کرنل زرمسکی نے سچائی ہو گی وہ خود اسی میدان کا
کھلاڑی تھا۔

پھر فتح خان کا بھارتیوں سے گٹھ جوڑ بھی بہت کچھ کہہ
رہا تھا۔ کیا وہ بریف کس کا سودا بھارتیوں سے کر رہا تھا لیکن
اس کی کہیں زیادہ قیمت امریکی دے سکتے تھے۔ یہ بات فتح
خان بھی سمجھتا تھا لیکن وہ از خود سودا کرنے کا اہل نہیں تھا اس
نے کرنل یا پھر ڈیوڈ شاؤ کا دعویٰ کیا ہوگا۔ بریف کس شہلا کے
پاس تھا اور وہ بھی اس سودے میں شامل تھی۔ سوچتے ہوئے
میں غیر ارادی طور پر چینل تبدیل کرتا جا رہا تھا اچانک ایک
مقامی نیوز چینل لگ گیا اور اس پر ہیڈ لائن چل رہی تھی۔
”اسلام آباد کے رہائشی علاقے میں ایک کوشی میں بم
دھماکہ۔“

پھر ٹی وی پر کوشی کی تصویر آئی اور میں اچھل پڑا تھا۔
جاری ہے

(نوشین، جنگ کا جواب)

مظفر علی خان..... لاہور

وہ تو کچھ ہو ہی گئی تھی تم سے محبت ورنہ
ہم وہ خود سر ہیں کہ اپنی بھی تمنا نہ کریں
واصف علی..... مظفر گڑھ

وہ اس کی گفتگو کلیاں چٹکنے کی صدا جیسے
یہ نرمی اس کے لہجے میں ہمارے پیار سے آئی
محسنت جہاں..... لاہور

وہ دن بھی ہو کر کڑی دوپہر میں آنکھوں کے
اداس دشت میں تجھ کو رہنہ پا دیوں
(محسن فاروقی، احمد پوریال کا جواب)

سعید احمد چاند..... کراچی

نہ تھی ہم میں اتنی کشش کہ تم کو یاد رہ جاتے
نہیں کوئی شگہہ ہم کو تمہارے بھول جانے کا
ظفر معراج..... لٹن، وٹاری

نہند آئے تو اچانک تری آہٹ سن لوں
جاگ انھوں تو بدن سے تیری خوشبو آئے
(ناصر اسلم، راولپنڈی کا جواب)

محمد نعیم اختر..... ڈی آئی خان

مذہب والوں کو یہ حسرت کب دنیا سے کفر مٹے گا
میں تو بس اتنا سوچ رہا ہوں کب انسان انسان بنے گا
منیر احسن..... جیکب آباد

مجھے دردِ دل وہاں لے گیا
جہاں در کھلے تھے طلسمات کے
کاشف انیس..... دریا پار بکر

مجھ سے محبت بھی ہے اس کو لیکن یہ دستور ہے اس کا
غیر سے ملتا ہے ہنس ہنس کر مجھ سے ہی شرماتا ہے
(سعدیہ کلیم، میرپور خاص کا جواب)

محمد سعید قاسمی..... ڈوالال

کتنے موسم تھے جو دے کر مجھے طعنے گزروے
تم تو کہتے تھے کہ اک سال میں آ جاؤں گا
امیر اراقی..... لاہور

کنارے پر یہ رونق ریت کی جھنکار سے آئی
کشش رکھ نہیں اب بھول میرے واسطے کوئی

شع محسن..... لاڑکانہ

کل دیرانی صحرا کی
آج میرے گھر ہے مہمان

فیہم گریز خان..... کوٹ ادو

کہاں کا بادباں چوار کس کے ناخدا کیسا
کہ ہر سیلاب سے گرداب سے ساحل نکلے ہیں

انجم فراز..... حیدر آباد

کیسی خواہش تھی کہ جی ابھی جھوم یاس میں
کیسا شطہ تھا کہ جو برقاب میں زندہ رہا
ٹار فاروق..... لاڑکانہ

کس درجہ حسین تھا مرے ماحول کا غم بھی
میں بھول گیا آپ کا انداز ستم بھی

محسن حسن..... سکھر

کیوں اڑ رہی ہیں وقت کے رخ پر ہوائیاں
کیا کائنات میں کوئی رنگ نہیں رہی

محبوب علی خان..... فیصل آباد

کیا ہو میں روایتیں اب ہیں کیوں شکایتیں
عشق نامراد سے حسن بے ثبات کو
نصرت جاوید..... چنیوٹ

کبھی کہا کہ یہاں جان جلتی ہے اپنی
تو پوچھتے ہیں بھلا جان کیسے جلتی ہے
(شمر فیروز، فیصل آباد کا جواب)

اکبر حسین..... کوٹ سیال

اس سے ملنے سے پہلے میرا کوئی ذوق نہیں تھا
یوں محفلوں میں پڑنے کا کوئی شوق نہیں تھا
نازش ممتاز..... سرگودھا

انہیں اس دور میں دھوئی ہے مسکائی کا
ہم جنہیں دور ہی سے دیکھ کے پیار ہوئے
ذکا حسن چغتائی..... کراچی

اپنی محرومی کے احساس سے شرمندہ ہیں
خود نہیں رکھتے تو اوروں کے بجائے ہیں چراغ

(واصف چنگاری، جبیک آباد کا جواب)

خالد یوسفی..... لید
قید میں بھی تھی ترے وحشی کو رہی زلف کی یاد
ہاں مگر کچھ رنج گراں باری زنجیر بھی تھا
تنویر رفیق..... کراچی

آنا نہ میری قبر پہ ہمارا رقیباں
مردے کو مسلمان چلایا نہیں کرتے
(اقربا نونا گوری، کراچی کا جواب)

حبیب الرحمن..... گوجرہ ٹوبہ ٹیک سنگھ
یہ عدل و انصاف پہ موقوف نہیں ہے بانو
زندگی خود بھی گناہوں کی سزا دیتی ہے
ناصر سلطان..... جنگ صدر

یاد آئے ہیں تم کو ہم شاید
پیکا پیکا ہے رنگ کا جل کا
قصاحت اللہ..... ڈی آئی خان
آنکھوں میں دھند سی ہے گزرے کل کی
دل پر اس کی یاد کی ہر دم دستک
(نوشین ملک، مظفر گڑھ کا جواب)

حافظ محمد میثاق..... جنگ
اس موج کے ماتم میں روٹی ہے بھنور کی آنکھ
دریا سے اٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی
نسرین صدف..... کراچی
آج کوئی پتھروں کے مول بھی لیتا نہیں
ورنہ حسن ہم بھی کل تک بے بہا ہیروں میں تھے
(ایوذر حسن، لندن کا جواب)

تنویر رفیق..... کراچی
یاد کر کے تو میرے پیار کو روتا ہوگا
چاند جب جب تیرے آئین میں اترتا ہوگا
(ارباب گل، پشاور کا جواب)
ایم افضل کمرل..... عظیم والا نکانہ صاحب
شجر تب ہی لگانا جب زمین پر رکھ لو
ہر اک مٹی کی فطرت میں وفاداری نہیں ہوتی

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے
اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔
کثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے
شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مد نظر رکھ کر ہی شعر
رسال کریں۔

مظفر نسیم..... لاہور

ایک لمحے کو توجہ نہیں حاصل اس کی
اور یہ دل کہ اسے حد سے سوا چاہتا ہے
کاظم فریق..... حیدر آباد

احساس عنایت کر آثار مصیبت کا
امروز کی شورش میں اندیشہ فردا دے
زینت جہاں..... چنیوٹ

آئے ہیں جسے شہر بدر کر کے یہ ناداں
وہ شعلہ لبر رنگ یہیں ہے میرے دل میں

خان زادہ ناصر..... حیدر آباد
آدیکہ میرے سینے میں ہے دل ہی دل تمام
اور وہ بھی تیرے شور و شغب سے بھرا ہوا

نجمہ اسفندیار..... ہری پور
انہیں بھی آج کچھ بڑپا گئے ہیں
مری پلوں پہ دو آنسو چل کے
ماہ نور رفیق..... کراچی

اس طرح میں طاق بھراں میں چلا ہوں رات بھر
نکھر نکھرا سا کھر آگن میں دھواں دن بھر رہا

سندس رفیق..... کراچی
آنکھیں میری بھونپی جیسی دل کو لالہ زار کیا
اس غم رت نے کس چاہ سے میرا ہر سنگھار کیا
نعمان فرحت..... ملیر
اللہ رکے عمر ہے جتنی بھی مری
بکلی سے لگیں گزرتے یہ ماہ و سال

(دعا زہرا، فیصل آباد کا جواب)
محمد سعید قاسمی..... ڈالوال، بچوال
یہ تیرے رستوں سے کانٹے چنے مری تو پوریں ہی چھد گئیں
بھی تو میرے نصیب کی زلف اپنے ہاتھوں سنوار تو بھی

(فیروز حسن، فیصل آباد کا جواب)
مرزا فرحان بیگ..... حیدر آباد
اچھی گزر رہی ہے دل خود شکیل ہے
لنگر سے روٹی لیتے ہیں پانی سبیل سے
سلطان خان..... لالہ موسیٰ
الجہ کے چلتی ہے تار حیات سے ہر سانس
دم گزشتہ کا غم ہے دم نفس میں بھی

انسان

محترم مدیر اعلیٰ
السلام علیکم!

میں نے اس سے پہلے کبھی کہانی نہیں لکھی۔ پہلی بار لکھ رہی ہوں بالکل سچی۔ تمام واقعات سچے ہیں اور میں اس کی گواہ ہوں۔ یہ ایک ایسی داستان ہے جسے ہر گھرتک پہنچنا چاہیے تاکہ لوگ عبرت حاصل کرسکیں۔

جمیلہ یوسف
(لاہور)

انسان اپنی زندگی کے حالات سے تو واقف ہوتا ہی ہے لیکن کبھی دوسروں پر گزرنے والے واقعات بھی ہمارے علم میں آتے رہتے ہیں۔ پھر کچھ لوگ ایسی پیشہ ورانہ مصروفیتوں سے وابستہ ہوتے ہیں کہ انہیں عام افراد سے کہیں زیادہ دوسروں کی زندگی میں جھانکنے کا موقع ملتا رہتا ہے۔ مثلاً جیسے ڈاکٹر، وکیل، پولیس آفیسر وغیرہ۔ نرسوں کا پیشہ بھی ایسا ہوتا ہے کہ انہیں زیادہ نہ سہی تو کبھی کبھی ایسی داستانوں سے واقف ہونے کا موقع ملتا رہتا ہے جو اپنی جگہ دلچسپ و سبق آموز ہونے کے علاوہ عبرت آمیز اور حیرت انگیز بھی ہوتی ہیں۔

میراثام جمیلہ ہے، میں ایک سندھی فیزیاترس ہوں اور پچھلے پچیس تیس سال سے اس پیشے سے وابستہ ہوں، مجھے بھی کبھی غیر ارادی اور کبھی ارادی طور پر دوسروں کے حالات جاننے کا موقع ملتا رہا ہے۔ سرگزشت میں سچ بیانوں کے سلسلے کو دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ شاید میں آئے ہوئے ایسے بہت سے واقعات ہیں جنہیں قارئین کی معلومات اور دلچسپی کے لیے تحریر کیا جاسکتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اپنے پیشے کی وجہ سے جو حالات میرے غلم میں آئے انہیں ایک پیشہ ورانہ راز کی

زمانے سے جو جانی کے ابتدائی دور تک وہ ایک دوسرے کے ساتھ رہیں۔ ایک ساتھ ایک ہی اسکول میں تعلیم حاصل کی مگر پھر کچھ ایسے حالات پیش آئے جنہوں نے دقی طور پر دونوں کو الگ کر دیا۔ طاہرہ کے والدین دوسرے شہر میں منتقل ہو گئے جس کی وجہ سے ان کے درمیان صرف مراسلت کا سلسلہ ہی قائم رہ سکا لیکن اس دوری کے باوجود وہ ایک دوسرے سے اتنی محبت کرتی تھیں کہ ایک دوسرے کے حالات سے بخوبی آگاہ رہیں۔

کوڑا ایک غریب خاندان کی لڑکی تھی۔ والد کا بچپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔ اس کی ماں نے زمانے کے قسب و فراز میں بڑے عزم اور استقامت کا مظاہرہ کیا۔ محنت مزدوری کر کے بھی اپنی بیٹی کو ضروری تعلیم سے آراستہ کیا۔ بیٹی نے بھی ماں کا خیال رکنے میں کوئی کمی نہیں کی۔ جب تک زندگی قائم رہی، بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر ماں کا بوجھ ہلکا کیا اور جب بیٹی اسے پاس کر لیا تو ملازمت کے لیے دوڑ دھوپ شروع کر دی۔ وقت بدل رہا تھا۔ وہ زمانہ گزر گیا تھا جب لڑکیاں صرف رنگین لباس کے زیبائشی شہیوں میں جانی تھیں۔

سرکاری دفاتروں اور ان کی بیرونی میں پرائیویٹ اداروں نے بھی لڑکیوں کو ملازمت دینا شروع کر دی تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس وقت بھی اور اب بھی جبکہ خواتین کی کافی تعداد ہر قسم کے شعبوں میں نظر آتی ہے، لڑکیوں کو ملازم رکھنے میں صرف ایک جاب پُر کرنے کی خواہش کا فرما نہیں ہوتی بلکہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اس میں صنفی نازک کے قرب کی آرزو بھی شامل ہوتی ہے۔ بلکہ بعض دفاتر میں تو لڑکیوں



حیثیت حاصل ہے اور اخلاقیات میں انہیں متعلقہ افراد کی اجازت اور علم کے بغیر تحریر نہیں کرسکتی اور یہ کام انتہائی مشکل ہے۔ زندگی کے سر دو کرم میں اکثر کہانیوں کے کردار خدا جانے کس مقام پر اور کس حال میں ہوں گے، ان کا کیا معلوم کرنا، ان سے رابطہ قائم کرنا اور پھر اجازت لینا کوئی آسان کام نہیں ہے لیکن جو داستان میں لکھنے جارہی ہوں، حسن اتفاق سے اس کے مرکزی کرداروں سے نہ صرف میری واقفیت براہ راست رہی ہے بلکہ ان سے اب بھی تعلقات کا تسلسل کسی نہ کسی انداز میں چل رہا ہے اس لیے مجھے ان سے اجازت لینے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر جگہ کہانی کی طرح اس میں بھی چند مقصود اور دو رائے کی خیال سے نام و مقامات میں جزیی تہریلی ناگزیر تھی۔

حقیقت میں یہ دو سہیلیوں کی داستان حیات ہے جنہیں حالات کے چکر اور تقدیر کی تم ظریفی نے ایک دوسرے کی زندگی میں اس طرح الجھا دیا تھا کہ ایک کو دوسری سے الگ کر کے کسی ایک کی کہانی بھی مکمل نہیں ہو سکتی۔ ان میں سے ایک کا نام کوڑا تھا اور دوسری کا طاہرہ۔ بچپن اور لڑپن کے

صرف خوبصورت لڑکیوں کو رکھا ہی اس لیے جاتا ہے کہ مالک یاغیر کو موصل مل جائے تو وہ ایک پختہ اور دو کاج پر کامیابی سے عمل کر سکیں۔ دفتر کا کام جیسا کچھ بھی ہو لیکن ان کی سرسبز اور آرزوئیں مکمل طور پر پوری ہوتی رہیں۔ اب یہ پھر ایک اور بات ہے کہ لڑکیاں بھی کافی ہوشیار ہوتی ہیں، وہ اس قسم کے پھندوں میں صرف اس وقت آتی ہیں جب انہیں اپنے مستقبل کے خوشگوار اور پرکشش ہونے کا یقین ہو جاتا ہے ورنہ یا تو بہت محتاط رہتی ہیں یا بوجہ ہوتی جہاں توں پر ایک پھنسرید کر کے دفتر سے نکل آتی ہیں۔

معمولی سی کوشش کے بعد کوثر کو ایک پرائیویٹ کمپنی میں ملازمت مل گئی۔ عجیب بات یہ تھی کہ ملازمت اسٹینو ٹائپسٹ کی تھی جبکہ کوثر کو تھوڑی بہت ٹائپنگ تو آتی تھی مگر شارٹ ہینڈ کی الف بے سے بھی نا آشنا تھی۔ اگر اسے کچھ دیا اور اس کے لوگوں کا تجربہ ہوتا تو یہی بات اسے چونکانے کے لیے کافی تھی مگر وہ ایک سیدھی سادی، ہر ایک پر اعتبار کرنے والی لڑکی تھی۔ ملازمت ملنے کی خوشی میں اس نے اس نکتے پر غور ہی نہیں کیا کہ امیدواروں کی طویل لائن میں جن میں تجربہ کار اسٹینو ٹائپسٹ ہی نہیں کچھ اسٹیوگرافر بھی شامل تھے، آخر اسے کیوں منتخب کیا گیا جبکہ اس کی ٹائپنگ کی رفتار اوسط سے زیادہ غلطیوں کے ساتھ اٹھارہ الفاظ فی منٹ تھی اور شارٹ ہینڈ تو اسے بالکل آتی ہی نہیں تھی۔ خود اسے ملازمت ملنے کی کوئی توقع نہیں تھی اس لیے اس کی حیرت اور اگر ذہن میں کوئی شبہ پیدا ہوا تو اسے دور کرنے کے لیے منیجر صاحب نے جو انٹرویو لے رہے تھے، اسے بتایا کہ وہ ملازمتوں کے سلسلے میں خواتین کی حوصلہ افزائی کرنا چاہتے ہیں اس لیے اسے اس شرط کے ساتھ ملازمت دی جا رہی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ تین ماہ کی مدت میں ٹائپ اور شارٹ ہینڈ کی مطلوبہ صلاحیت حاصل کر لے۔

کوثر نے اس دن سے محنت شروع کر دی۔ ٹائپنگ کی رفتار بڑھانے کی سہولت اسے دفتر کی مشینوں پر حاصل تھی۔ سردست اسے ٹائپ کا معمولی سا کام دیا جا رہا تھا اور اسے اجازت تھی کہ وہ چاہے تو تمام وقت اپنی اسپینڈ بوحانے میں استعمال کر سکتی ہے۔ شارٹ ہینڈ کے لیے کوثر نے ایک انٹروی ٹیوٹ میں داخلہ لے لیا اور اس قدر لگن اور محنت کے ساتھ پڑھنا شروع کیا کہ تین ماہ میں کورس مکمل کر کے اسپینڈ کلاس میں آ گئی۔

کمپنی کا نام مقبول ٹریڈنگ کارپوریشن تھا اور بنیادی طور پر اس کا بزنس کمیشن ایجنٹ کا تھا جو کسی قسم کی اشیا کی

تھوک خرید و فروخت میں صنعت کار اور خریدار کے درمیان رابطے کا کام انجام دیتی تھی۔ کمپنی کے مالک مقبول ان صاحب بہت ایماندار، مخلص اور خوش اخلاق انسان تھے۔ دنیا میں کم و بیش بالکل تنہا۔ والدین کا سایہ بچپن میں ہی سر سے اٹھ جانے کے بعد انہوں نے اپنی ذاتی جدوجہد سے تقریباً تیس سال میں یہ مقام حاصل کیا تھا۔ اس وقت ان کی عمر چھیتریس سال سے بھی زیادہ تھی مگر ابھی تک انہوں نے شادی نہیں کی تھی اور نہ ہی اس موضوع سے انہیں کوئی خاص دلچسپی تھی۔ وہ جو کچھ اپنے بزنس میں کماتے تھے اس کا بہت ہی کم حصہ اپنی ذات پر خرچ کرتے تھے۔ بزنس کو بڑھانے اور مستحکم رکھنے کے لیے جتنے سرمائے کی ضرورت ہوتی تھی، اس سے جو کچھ بھی بچتا تھا، سارا کارسارا رفاہی کاموں پر خرچ کر دیا کرتے تھے۔ اپنے ایک دور کے عزیز یاد کو انہوں نے منیجر بھی زیادہ تر اس خیال سے ملازم رکھا تھا کہ وہ یہ اسے پاس کرنے کے بعد ایک مدت سے بیکار تھا جبکہ ایک خاصے بڑے کمپنی کی ذمہ داری اس کے کاندھوں پر تھی۔ ملازمت کے وقت یاد بالکل ہی نا اہل اور اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کو سنبھالنے کے قابل نہیں تھا۔ مقبول صاحب نے خود ہر وقت اسے اپنے ساتھ رکھ کر اس کی تربیت کی تھی اور چھ ماہ سے زیادہ عرصہ تک محنت کر کے اسے اسے قابل کیا تھا کہ وہ کسی نہ کسی حد تک اپنے فرائض سرانجام دینے لگا تھا۔

مقبول ٹریڈنگ کارپوریشن کا کل عہدہ پندرہ افراد پر مشتمل تھا جس میں ایک اکاؤنٹنٹ اور دو اکاؤنٹنٹ کلرک کے علاوہ مزید چار جنرل ڈیوٹی کلرک۔ ایک اسٹیوگرافر، تین ٹائپسٹ، ایک ٹیلی فون آپریٹر اور دو چپراسی شامل تھے۔ شاہد منیر کا ڈنٹس کلرک تھا۔ بہت مختصر، قابل اور کچھ دار۔ وہ ملازمت کے ساتھ ہی پرائیویٹ طور پر ایم کام کی تیاری بھی کر رہا تھا اور اپنے فرائض سے اس کی لگن کو دیکھتے ہوئے مقبول صاحب نے اپنے طور پر فیصلہ کر لیا تھا کہ جب موجودہ اکاؤنٹنٹ صاحب ریٹائر ہوں گے تو وہ کسی نئے آدمی کو ملازم رکھنے کے بجائے یہ منصب شاہد کے ہجرہ کر دیں گے۔

مقبول صاحب زیادہ تر اپنے آفس میں بیٹھے رہتے تھے۔ اس لیے آفس سے باہر، غیر پیشہ ورانہ سرگرمیوں کے سلسلے میں کیا ہوتا ہے اور کیا نہیں، اس سے ان کی واقفیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ مگر دفتر کے دوسرے عملے کی آنکھیں تو بند نہیں تھیں۔ وہ دیکھتے رہتے تھے کہ منیجر ماری کی رنگن مزاحمت

کھا کھل کھلائی رہتی ہے۔ پہلے دفتر میں مسز عباسی تھیں جن کی سرپرست اس سال سے زیادہ تھی۔ شارٹ ہینڈ سے متعلق تمام کام خواہ وہ مقبول صاحب کی جانب سے ہو یا منیجر یاد کی جانب سے، وہی انجام دیتی تھیں۔ یاد نے ان کی موجودگی کو جواز بناتے ہوئے اپنی نظر باز طبیعت کی تسکین کے لیے پہلے ایک لڑکی کو ٹائپسٹ رکھا اور پھر دوسرے ہینٹ کبھی اس عذر کی آڑ میں ہر طرف کیا کہ وہ اس کی چھ ایک اسٹینو ٹائپسٹ رکھنا چاہتا ہے اور وہ جگہ ایک حسین لڑکی کو دے دی لیکن وہ کوئی شریف اور غیرت دار لڑکی تھی کہ یاد کی دست درازیوں سے جب کسی اور طرح نہ بچ سکی تو ملازمت چھوڑ کر چلی گئی۔ اس کی جگہ دوسری آئی تو اسے بھی یاد اپنی راہ پر نہیں لاسکا اور اس پر چرائی پا ہو کر اس نے اسے خود ہی ہر طرف کر دیا۔

تیسری لڑکی کوثر تھی۔ پہلی دونوں سے زیادہ خوبصورت، اس لیے یاد اور اس کے سلسلے میں کافی احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ اتفاق کچھ ایسا ہوا کہ جن دنوں کوثر کو ملازم رکھا گیا وہ کمپنی میں حسابات کی کلوننگ کا زمانہ تھا۔ بے روپے اکاؤنٹنٹ کے اسٹینٹ ٹائپ ہو رہے تھے اسی سلسلے میں شاہد کا رابطہ کوثر سے شروع ہوا۔ جو غیر محسوس طور پر رفتہ رفتہ ایک دوسرے کی ذاتی پسندیدگی اور اس کے بعد حاجت میں تبدیل ہو گیا۔ تعلقات نے یہ نوعیت اختیار کی تو شاہد نے کوثر کو منیجر یاد کی طرف سے محتاط رہنے کی ہدایت کی لیکن اس وقت تک یاد نے کوثر کے ساتھ کوئی ایسی حرکت نہیں کی تھی جو اس کی بددیہتی کو ظاہر کرتی اس لیے کوثر نے شاہد کی تاکید کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی اور یاد کو اس بات کا انکار تھا کہ کوثر شارٹ ہینڈ سیکھ لے، اس کی کچھ اسپینڈ بھی ہو جائے تاکہ وہ ڈکٹیشن دینے کے بہانے اپنے آفس میں بلا سکے جہاں وہ جتنی دیر بھی مصروف رکھنا چاہے کسی کو شبہ نہیں جھٹکایا۔ بغیر رکھ سکے اور ان ہی تجاویز کی ملاقاتوں میں وہ رفتہ رفتہ اپنا دام ہم رنگ زمین بچھا کر کوثر پر قابو پانے کی کوشش کرے۔

کوثر کے شارٹ ہینڈ کا کورس پاس کرتے ہی یاد نے اس کی تحوہ دینی کر دی اور اسے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے اسے ذرا ذرا سی بات کے لیے اپنے آفس میں بلانے لگا۔ ایسا بے تکلفانہ چٹنی چپڑی باتوں سے اور بھر گاہے گاہے ہونے والے تحائف پیش کر کے اسے پرچانے کی کوشش کرنے لگا۔ کوثر نے ایک حد تک اس کی بے تکلفی کو برداشت کیا۔ یہ سوچ کر کہ وہ منیجر ہے، اس کی ناراضگی نہیں

ملازمت نہ ختم کر دے، اس کے تحائف بھی چارو تا چار قبول کرتی رہی۔ قدرتی طور پر یاد کو کوثر کی خاموشی سے حوصلہ ملا اور اس نے برملا اظہار محبت کا فیصلہ کر لیا۔

ایک دن اس نے کچھ ضروری خطوط ڈکلیٹ اور ٹائپ کرنے کے بہانے کوثر کو دفتر کی اوقات کے بعد روک لیا۔ دفتر کا دوسرا عملہ چلا گیا تو اس نے چپراسیوں کو بھی چھٹی دے دی کہ وہ خود ہی آفس بند کر دے گا۔ مقبول صاحب سب سے پہلے آتے تھے اور سب کے بعد ہی جاتے تھے۔ سب کے بعد میں جاتے۔۔۔ کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ دفتر اپنی موجودگی میں بند کرایا کرتے تھے بلکہ صرف اتنا ہی تھا کہ وہ ساڑھے پانچ بجے اپنے آفس سے نکلے تھے جب عموماً چپراسیوں کے علاوہ سارا عملہ جا چکا ہوتا تھا۔ ظاہر تھا کہ کبھی کبھی ایسا اتفاق بھی ہوتا تھا کہ عملے کو اور ٹائپ کے لیے روک لیا جاتا تھا ایسی صورت میں مقبول احمد اور ٹائپسٹ ہونے کا انتظار نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے تقریباً مقررہ وقت پر اٹھ جاتے تھے۔

مگر اس دن یاد کی قسمت یاد نہیں تھی۔ جب ساڑھے پانچ بجے کے بعد بھی مقبول صاحب اپنے آفس سے برآمد نہیں ہوئے تو اس نے پہلو پر پہلو بدلتا شروع کر دیا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ خود مقبول صاحب سے انٹرکام پر بات کر کے اس تاخیر کی وجہ دریافت کرتا، مقبول صاحب کا فون آ گیا۔

”یاد“ مقبول صاحب نے کہا ”چپراسیوں سے کہو کہ وہ بازار سے کچھ کھانے پینے کی چیزیں لے آئیں اور چائے تیار کر لیں۔“

یاد کا دل دھک سے ہو گیا۔ اس حکم کا صاف مطلب تھا کہ کوئی بزنس پارٹی ملاقات کے لیے آ رہی ہے۔

”کیا کوئی بزنس مینٹگ ہے؟“ یاد نے پھر بھی پوچھ لیا۔

”ہاں، گوجر انوالہ سے ایک پارٹی بجلی کے بکھوں اور سلاکی کی مشینوں کے سلسلے میں بات کرنے آئی ہے، میں نے اسے چھ بجے کا ٹائم دیا تھا۔“

”مگر۔۔۔ چپراسی تو چلے گئے۔“ مجبوراً یاد کو بتانا پڑا۔

”کیا۔۔۔ وہ اتنی جلدی کیسے جاسکتے ہیں؟“

”میں نے انہیں چھٹی دے دی تھی۔“

”کیوں؟“

”آج مجھے کچھ اور ٹائپ بیٹھنا تھا۔“ یاد نے کوثر کا

نام نہیں لیا ”اس لیے سوچا کہ انہیں روکنے سے کیا فائدہ،

”میرا خیال ہے۔“ وہ بولے ”کہ تم اس بات کو نہیں ختم کرو تو زیادہ بہتر ہے۔“

”ظاہر ہے کہ میں بھی اسے بڑھانا نہیں چاہتی۔“ کوثر نے جواب دیا ”میرا پولیس میں رپورٹ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“

”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ مقبول صاحب نے نرمی سے کہا ”بلکہ میرا مشورہ ہے کہ تم گھر پر اپنی والدہ وغیرہ سے دفتر میں اپنے ساتھیوں سے اور خاص طور پر شاہد سے اس حادثے کا کوئی تذکرہ مت کرنا۔ اول اس لیے کہ اس نوعیت کا واقعہ جب لوگوں کے علم میں آئے گا تو ہر فرد اپنی سوچ کے اعتبار سے نتیجہ نکالے گا اور پھر اس کے حوالے سے وہ کیا کچھ کہتا ہے، اس کے بارے میں کوئی اچھی توقع نہیں رکھی جاسکتی۔ دوسرے اس لیے بھی کہ تمہارا اس معاملے میں کوئی تصور نہیں ہے لیکن دوسروں کے کہنے میں آکر یا ان خود شاہد اس میں کوئی ایسا مفہوم تلاش کرنے کی کوشش کرے جو تمہارے باہمی تعلقات پر ابھی یا آگے چل کر اپنے مضمر اثرات مرتب کرے تو یہ کوئی اچھی بات نہیں ہوگی۔“

”لیکن یہ بات چھپی بھی کیسے رہ سکتی ہے۔ کم سے کم چھریوں کو ضرور معلوم ہے کہ میں اور نام کر رہی ہوں۔“ کوثر نے جواب دیا ”کل جب میں آفس آؤں گی اور وہ میری حالت دیکھیں گے تو خواہ مخواہ چیونٹیاں کریں گے۔ پھر اس کے ساتھ یاور کی برطرفی کی خبر بھی عام ہوگی، آپ خود سوچیں کہ لوگ کیا اندازہ لگائیں گے۔“

”درست ہے مگر اس کا آسان علاج یہ ہے کہ تم ایک ہفتے کی چھٹی لے لو۔“ مقبول صاحب نے جواب دیا ”یوں بھی تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ رہی یاور کو برطرف کرنے کی بات تو میں کوئی جواز تلاش کر لوں گا، خود وہ بھی نہیں چاہے گا کہ اصل واقعہ کسی کے علم میں آئے۔“

”مگر شاہد.....“ کوثر نے کہا ”وہ تو مجھے چھٹی پر پا کر میری خبریت معلوم کرنے گھر آسکتے ہیں۔“

”اسے تم کسی بھی بہانے سے مطمئن کرونا۔ مثلاً کہ بس سے اترتے یا چڑھتے ہوئے چوٹ لگ گئی یا کسی مسافر کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کسی چیز نے تمہارا ہونٹ زخمی کر دیا۔ بہر حال میرے کہنے کا مطلب صرف اتنا ہے کہ کہیں یہ بات پلاؤں تمہاری آئندہ خوشیوں کو متاثر نہ کرے اور اب آؤ میں تمہیں گھر تک چھوڑ دوں۔ کہو تو تمہاری والدہ سے بھی کہہ دوں کہ دفتر میں تم نیچے اترتے ہوئے

سیڑھی پر پھسل جانے کی وجہ سے جھگڑے سے ٹکرائی تھیں۔“

☆☆☆

کوثر نے مقبول صاحب کے مشورے پر عمل کیا اور یہی عذر بیان کیا کہ اس کا سیر میزجی سے پھسل گیا تھا۔ یاور دوسرے دن دفتر نہیں آیا بلکہ وہ مسلسل دو ہفتے غائب رہا۔ مقبول صاحب کو موقع مل گیا، انہوں نے بغیر اطلاع یا کسی چھٹی کی درخواست دیے ڈیوٹی سے غیر حاضر رہنے کے عذر کی آڑ میں یاور کو برطرف کر دیا۔ پھر ایک دن یاور خاموشی سے دفتر آ کر اپنا حساب کتاب بھی صاف کر گیا اور یہ ظاہر ایسا معلوم ہونے لگا کہ وقتی طور پر ایک بری ٹھہری آئی تھی اور کچھ زیادہ نقصان پہنچانے بغیر گزرتی۔

لیکن کوثر کی طبیعت سنبھلنے کے بجائے اور خراب ہوتی گئی۔ اس کے سر میں مسلسل درد رہنے لگا۔ جھوک مرنی۔ طبیعت میں ہر وقت جھکی کا سا احساس رہتا تھا جو اسے کچھ کھانے پینے نہیں دیتا تھا۔ مقبول صاحب تیسرے چوتھے دن کوثر کی عیادت کے لیے جا رہے تھے۔ ان کے ظلم میں یہ باتیں آئیں تو انہوں نے اپنے ایک دوست ڈاکٹر شریف سے مشورہ کیا جو.... کافی بڑا اور جدید طرز کا اسپتال کامیابی سے چلا رہے تھے۔

ڈاکٹر شریف نے کوثر کو مکمل چیک اپ کے لیے اسپتال بلایا۔ توجہ سے اس کی پوری بات سنی۔ سر کے اس حصے کا جو بائیں جانب کپٹل اور سر کے پچھلے حصے کے درمیان واقع تھا، یہ غور معائنہ کیا۔ مختلف ٹیسٹ بھی کیے اور پھر ایک دن مقبول صاحب اور کوثر دونوں کو اپنے آفس بلایا۔

”میں نہ ہی آپ لوگوں کو بلاؤں خوفزدہ کرنا چاہتا ہوں۔“ انہوں نے کہا ”اور نہ تحقیق کے بارے میں کوئی بات چھپانا مناسب سمجھتا ہوں۔ کوثر کے سر میں دیوار سے لگنے والی اندرونی چوٹ کافی تشویشناک ہے۔ سر کی ہڈی جڑ گئی ہے اور اس کے ارد گرد انجماد خون بھی ہو گیا ہے جس کے نتیجے میں یہ بھی امکان ہے کہ رفتہ رفتہ کوثر اپنا چہرہ ہوجائے یا اس کی بینائی اور گویائی کو نقصان پہنچے۔ سر کے جو اسکرے لیے گئے ہیں، ان سے اس امر کا پورا خطرہ موجود ہے۔“

فطری طور پر کوثر پسن کر پریشان ہو گئی۔

”پھر کیا اس کا کوئی علاج نہیں ہے؟“ مقبول صاحب نے فکر مندی سے پوچھا۔

”علاج دو طرح سے ممکن ہے۔“ ڈاکٹر شریف نے جواب دیا ”اول یہ کہ دواؤں کے ذریعے انجماد خون ختم کرنے کی کوشش کی جائے اور سر کی ہڈی فطری طور پر رفتہ

رہن ٹھیک ہو جائے لیکن اس صورت میں کامیابی کی امید کافی کم ہے۔ دوسری صورت آپریشن ہے۔ مگر یہ آپریشن بھی انتہائی نازک اور مشکل ہوگا اور اس پر خرچ بھی بہت زیادہ آئے گا۔“

”آپ خرچ کی پروا نہ کریں۔“ مقبول صاحب نے بلاتل کہا ”اس کی ذمہ داری میں لیتا ہوں۔“

”لیکن مجھے منظور نہیں ہے۔“ کوثر نے جواب دیا ”آپ کے احسانات پہلے بہت زیادہ ہیں۔ میں آپ کو مزید زیر بار کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوں۔ جو کچھ میری قسمت میں لکھا ہے وہ پورا ہو کر رہے گا۔ ڈاکٹر صاحب آپ دوائی علاج بتائیں، وہ میرے وسائل کی حد میں ہوا تو میں اسے جاری رکھوں گی۔“

”یہ قسم کیا کہہ رہی ہو اس میں احسان کی کیا بات ہے؟“ مقبول صاحب بولے۔

”بے کیوں نہیں، آخر میں کس استحقاق کی بنیاد پر اسے قبول کر سکتی ہوں؟“

”تم میری کمپنی میں ملازم ہو اور کمپنی اپنے ملازمین کو طبی سہولتیں دینے کی پابند ہے۔“

”ہاں مگر ایک خاص حد تک۔“ کوثر نے جواب دیا ”میں اپنے لیے کوئی ایسی رعایت نہیں چاہتی جو دوسرے ملازمین کو حاصل نہیں یا انہیں نہیں دی جاسکتی۔“

”دوسرے ملازمین کے اور تمہارے معاملے میں بہت فرق ہے۔ خاص طور پر اس لیے کہ اس صورت حال کی ذمہ داری بالواسطہ مجھ پر عائد ہوئی ہے۔ یاور میرا درکار رشتے دار ہے اور اس کی وجہ سے یہ حادثہ پیش آیا ہے۔“

”مگر لوگ تو یہ بات نہیں جانتے، اس کے علاوہ میری عزت نفس بھی یہ گوارا نہیں کرتی کہ میں اپنے حق سے زیادہ آپ سے طلب کروں۔“

مقبول صاحب نے کوثر کو سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر وہ اپنی بات پر اڑی رہی۔ مجبوراً یہی طے کیا گیا کہ دوائی علاج شروع کر دیا جائے۔ شاید اس سے کام بن جائے لیکن ڈاکٹر شریف نے آگاہ کر دیا کہ علاج تو شروع کیا جاسکتا ہے لیکن ناکامی کی صورت میں بعد میں آپریشن کا فیصلہ اور زیادہ نازک اور خطرناک ہو جائے گا اور یہ عین ممکن ہے کہ دوائی علاج کے دوران، جس کے نتائج زیادہ سے زیادہ ایک دو ماہ میں ظاہر ہو جائے، کوثر کسی اعتبار سے معذور یا اپنا چہرہ ہوجائے۔ کوثر یہ خطرہ مول لینے کے لیے تیار تھی اس لیے مجبوراً مقبول صاحب کو بھی خاموش ہو جانا

☆☆☆

علاج تو شروع ہو گیا۔ ابتدائی طور پر کچھ فائدہ بھی ہوا لیکن کوثر کے سر کا درد پوری طرح ختم نہیں ہو سکا۔ اسے گاہے بگاہے چکر بھی آنے لگے۔ مقبول صاحب دیکھ رہے تھے کہ اپنی بیماری کے علاوہ بھی کوئی اور بات کوثر کو پریشان کر رہی ہے اور اس بات کا ذکر ایک دن خود کوثر نے ہی مقبول صاحب سے کر دیا۔

”شاید کے فائنل امتحان معقریب ہونے والے ہیں۔“ اس نے کہا ”قوی امید ہے کہ وہ کامیاب بھی ہو جائیں گے جس کے بعد پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق ان کی طرف سے شادی کے لیے زور ڈالا جاسکتا ہے لیکن جب یہ شادی طے ہوئی تھی تب کے اور اب کے حالات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ آپ کا طرز عمل ایک شفیق مہربان دوست کا سا رہا ہے اسی سے ہمت پا کر میں آپ سے مشورہ کرنا چاہتی ہوں کہ مجھے اب کیا کرنا چاہیے؟“

”میری دلی خواہش جانا چاہتی ہو تو وہ اب بھی یہی ہے کہ تم آپریشن کرالو۔“ مقبول صاحب نے نرمی سے کہا ”خدا نے چاہا تو آپریشن ضرور کامیاب ہوگا جس کے بعد تمہارے لیے کوئی مسئلہ پریشان کن نہیں رہے گا۔“

”وہ موضوع مت پیچیدہ ہے جس پر میں کوئی مفاہمت نہیں کر سکتی۔ اپنی زندگی کی قیمت پر بھی نہیں۔“

”پھر تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟“

”ڈاکٹر شریف کے بقول میں ایک دو ماہ کے اندر یا تو اپنا چہرہ یا معذور ہو جاؤں گی یا میری زندگی ختم ہو جائے گی۔“ کوثر بڑے حوصلے کے ساتھ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بات کر رہی تھی ”مدت کا اندازہ غلط بھی ہو جائے تب بھی معذوری اور موت کا خطرہ بہر حال لاحق ہے اور میں نہیں چاہتی کہ میں شاہد کی زندگی میں خوشی اور مسرت کے بجائے آزمائش اور امتحان بن کر جاؤں۔ اس لیے میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں شاید سے شادی نہیں کروں گی۔“

”جب فیصلہ کر لیا ہے تو مجھ سے کسی مشورے کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟“ مقبول صاحب نے انفرادی سے کہا۔

”شاید اس فیصلے کو کبھی قبول نہیں کریں گے۔“ کوثر نے اپنی بات جاری رکھی ”وہ مجھے اس کی وجہ بتانے پر مجبور کریں گے اور شاید میرے اندر اتنی ہمت نہیں ہے کہ میں ان کے

آج سے پون صدی پہلے ایک مورخ نے ہندوستان کی تاریخ کے بارے میں کہا تھا کہ "اصلی وقت تاریخوں کے تعین میں ہوتی ہے۔ تاریخ کی عمارت Chronology کے ڈھانچے پر کھڑی ہوتی چاہیے اور بغیر اس کے تاریخ نامکمل ہے۔ اگرچہ یہ بات ہندوستان کی تاریخ کے بارے میں کہی گئی تھی لیکن اس کا اطلاق نہ صرف برہمن کے زمانہ قبل از تاریخ پر بلکہ پوری دنیا کے اس دور پر ہوتا ہے۔ برصغیر میں یہ مشکل تو اب بھی موجود ہے اور وادی سندھ سے برآمد شدہ شواہد اور اس کی تاریخوں پر کوئی حتمی روئی نہیں ڈالے۔ آثار قدیمہ کا طریق کار Stratagrapy جس سے کھدائی کے وقت مختلف سطحوں سے تاریخوں کا پازمانوں کا اندازہ لگاتے ہیں یہ تو ضرور بتا سکتا ہے کہ کون سی آبادی پہلے تھی اور کون سی اس کے بعد۔ دیگر واقعاتی شواہد مثلاً فلز، ان کے رنگ، بناوت، ان کے نقش و نگار، ان کے اسلوب وغیرہ کا کسی دوسرے مقام سے برآمدہ سامان سے تقابل بھی اس طریق کار میں کافی معاون ہو سکتا ہے لیکن حتمی تاریخ کا فیصلہ آخر کار ریڈیو کاربن 14 کے ٹیسٹ سے ہی کیا جاسکتا ہے مگر اس طریق کار میں بھی کئی فیصدیوں میں ہیں۔ ڈیڑھ سو سے دو سو سال کا ادھر ادھر ہونا اس طریق کار میں ایک معمولی سی بات ہے جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ازمنہ قدیم میں ریڈیو کاربن کا عمل یکساں نہیں رہا۔ اس طریقہ کار سے جو ہمیں پتا چلا ہے وہ محض اس حد تک ہے کہ ہم ایک اضافی Chronology مرتب کر سکیں اور یہ طریقہ

اصرار کے مقابلے میں ٹھہر سکیں۔ وجہ بتاؤ گی تو وہ خود کو میری قسمت میں شامل کرنے پر زور دیں گے جو میں ہرگز نہیں چاہتی اس لیے انہیں خاموش کرنے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ وہ خود مجھ سے شادی نہ کرنا چاہیں۔

"ایسا کس طرح ممکن ہوگا؟"

"اس طرح کہ وہ مجھ سے نفرت کرنے لگیں۔"

"اور اس کی کیا صورت ہوگی؟"

"یہ کہ میں انہیں یقین دلا دوں کہ میں کسی اور کو پسند کرنے لگی ہوں اور اسی سلسلے میں مجھے آپ کا مشورہ درکار ہے۔"

"میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"آپ یاور سے رابطہ قائم کر کے اس سے کہیں کہ اگر وہ مجھے حاصل کرنا چاہتا ہے تو مجھ سے شادی کر لے۔" کوثر نے بڑے حوصلے سے کہا۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" مقبول صاحب حیرت زدہ رہ گئے "تم یاور سے شادی کرو گی؟"

"مجھوری ہے۔ مجھے تو بہر حال مرنا ہے یا ساری زندگی اپنا چن کر گزارنا ہے۔" کوثر نے جواب دیا "یاور نے میرے ساتھ جو کچھ کیا ہے، آخر اسے اس کی کچھ تو سزا ملنی چاہیے۔"

"یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔" مقبول صاحب نے کہا "یاور کھلونوں سے کھیلنے کا عادی ہے۔ وہ اپنے پیروں میں کوئی مستقل زنجیر نہیں باندھ سکتا اور بالفرض وہ آبادہ ہو بھی جائے تو جیسے ہی تمہاری حالت نازک ہوگی، وہ تمہیں

کا روناقت کے مابین قرب یا بعد کو بتانے سے قاصر ہے۔ چنانچہ تمام ترکوشوں کے باوجود وادی سندھ کے نہ آغا کا پتا چلتا ہے اور نہ ہی انجام کام۔ جو ہے وہ قیاس پر مبنی ہے۔ یہ صورت حال پڑے ہوئے جوداد کا لی ٹکن "کھول" "کھول" وغیرہ مقامات پر ماہرین کو پیش آتی ہے اور یہ مسئلہ جہاں تھا آج تک وہیں ہے۔

آریاؤں کی ہندوستان میں آمد کے بارے میں بھی یہی دقتیں ہمارے سامنے ہیں۔ 1500 ق م یا 1200 ق م ایسی تاریخیں ہیں جو مورخوں نے محض سہولت کی خاطر وضع کر لی ہیں۔ آریاؤں نے رگ وید کے علاوہ اور کوئی دوسری شہادت چھپے نہیں چھوڑی۔ زہر کے خیال میں آریاؤں کی برہمن میں آمد کا زمانہ 14 ہزار ق م سے ایک ہزار ق م تک ہو سکتا ہے۔ نرادیو چوہدری کہتا ہے کہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ آریا کہاں کب آئے۔ رالف فرزیر بھی اس خیال کی تائید کرتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ ہم صرف قیاس سے ہی یہ کہہ سکتے ہیں کہ 2300 ق م کے قریب انہوں نے جنوب کی طرف حرکت کی اور بالآخر پہنچے جہاں سے ان کی ایک شاخ جمیل ارمیا کی طرف نکل گئی اور دوسری ہندو کش کو عبور کر کے برہمن میں داخل ہو گئی۔ تاہم فی بھی آریاؤں کی آمد کے بارے میں انہی محققین کا ہم خیال ہے۔

تلاش: اے بے صدیقی، کراچی

فرق نہیں پڑے گا البتہ ان تمام حالات کو سامنے رکھتے ہوئے اگر تم چاہو تو مجھ سے شادی کر سکتی ہو۔ یہ شادی ہر اعتبار سے رکی ہوگی، اس کا واحد مقصد شاید کوتم سے مایوس کرنا ہوگا۔ دنیا کی نظروں میں شوہر اور بیوی ہونے کے باوجود ہم اندرونی طور پر صرف اچھے دوست ہوں گے اور تمہیں پوری آزادی حاصل ہوگی کہ تم جب چاہو اس ظاہری رشتے کو ختم کر دو۔ میرا خیال ہے کہ خود کوئی مزید پریشانی میں مبتلا کیے بغیر تم صرف اسی طرح شادی کی زندگی سے نکل سکتی ہو۔"

کوثر نے چونک کر مقبول صاحب کی طرف دیکھا لیکن ان کے چہرے پر کوئی غیر خلصانہ تاثر نہ پاتے ہوئے اپنی نظریں پٹی کر لیں۔ مقبول صاحب اپنی بات ختم کر چکے تو وہ کافی دیر تک اس تجویز کے مختلف پہلوؤں اور امکانات کا جائزہ لیتی رہی۔

"آپ واقعی ایک بہت ہی اچھے انسان ہیں۔" آخر اس نے جواب دیا "مجھے آپ کی تجویز منظور ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ اس تعلق کے حوالے سے آپ مجھے آپریشن کے لیے مجبور کر کے ایک گراں خرچ سے زیر نہیں کریں گے۔"

"آخر تم خود اپنی اس قدر دشمن کیوں بن گئی ہو؟" مقبول صاحب نے کہا "تمہیں پورا یقین ہو چکا ہے کہ خدا خواستہ یا تو تم معذور ہو جاؤ گی یا زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھو گی، اس صورت میں تم اپنے ہی خواہوں کو یہ اقتدار کیوں نہیں دیتیں کہ وہ تمہیں بچانے کے لیے اپنی سی کوشش کر لیں۔"

"میں اگر اپنے علاج و معالجے کے اخراجات اٹھانے

کے قابل ہوتی تو ضرور ایسا کرتی لیکن اپنی تنگدستی کی صورت میں نہ جانے کیوں میرا دل اور ضمیر اس پر آمادہ نہیں ہوگا کہ کوئی اور یہ بوجھ اٹھائے اور پھر یا تو ناکامی اس کا مقدر بنے یا زندگی بھر کے لیے میری خودداری اس احسان کے عوض فروخت ہو جائے۔

”خیر یہ بعد کی بات ہے، اس پر ضرورت محسوس ہوئی تو بات کر لیں گے مگر یقین رکھو کہ میں تمہیں بھی کسی بھی کام کے لیے مجبور نہیں کروں گا۔“

”آپ یہ وعدہ کرتے ہیں تو پھر مجھے آپ کی تجویز منظور ہے۔“ کوثر نے جواب دیا۔

☆☆☆

کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کوثر نے اپنی والدہ کو کس طرح اپنے فیصلے کی تائید کرنے پر آمادہ کیا لیکن مقبول صاحب سے اس گفتگو کے ایک ہفتے بعد شادی کی طرف سے منگنی میں دی ہوئی انگلی اور جوڑا واپس کر کے گویا بالواسطہ منگنی توڑنے کا اعلان کر دیا گیا۔ شاید نے کوثر سے بات کی تو کوثر نے بالکل سپاٹ سلجھ کے ساتھ جواب دیا کہ وہ کسی تفصیلی گفتگو یا وضاحت کی ضرورت نہیں سمجھتی۔ بات صرف اتنی

ہے کہ دوبارہ غور کرنے پر وہ اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ وہ شاید سے شادی نہیں کر سکتی اس لیے اس موضوع پر مزید گفتگو بیکار اور ایک دوسرے کا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہوگی۔

شاید پھر بھی مایوس نہیں ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کوئی غیر معمولی بات ایسی نوعیت کی عیش آتی ہے جس نے دل سے نہ چاہتے ہوئے بھی کوثر کو اس فیصلے پر مجبور کر دیا ہے اس لیے مزید اصرار کرنے اور بغض ہونے سے زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ وہ کچھ دن انتظار کرے اور پھر کوثر سے دوبارہ بات کرے لیکن دوبارہ بات کرنے کا موقع ہی نہیں آیا۔ دوسرے ہفتے بغیر کسی پیشگی اطلاع اور اعلان کے مقبول صاحب اور کوثر کی شادی ہو گئی اور شاید کوثر کا بوجھ اس طرح کے کاموں کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ وہ بھی کئی دنوں کے انتظار کے بعد ہی اس کا موقع ملا کہ مقبول صاحب نے پروپوز کیا تھا اور کوثر نے ایک عام لڑکی کی طرح پیار و محبت کو دولت اور عیش و آرام پر قربان کرتے ہوئے مقبول صاحب سے شادی کر لی۔

شادی کے دوسرے دن ہی اس نے مقبول صاحب کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔

☆☆☆

تقدیر بھی کبھی کبھی ایسے انقلابات لے آتی ہے کہ اسے

ستم ظریفی کے علاوہ کچھ اور نہیں کہا جاسکتا۔ شاید ہی والدہ کے ایک ہی بھائی تھے جو اپنی جوانی کے دنوں میں کسی بات پر اپنے والد سے شدید اختلاف کے باعث گھر چھوڑ کر چلے گئے تھے اور تب سے ان کے بارے میں کوئی خبر نہیں ملی تھی کہ وہ کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟ یہاں تک کہ والدین اور عزیز واقارب کو ان کی زندگی کے بارے میں بھی مایوس ہو چکے تھے۔ شاید نے مقبول ٹریڈنگ کمپنی کی سروس چھوڑ کر دوسری جگہ ملازمت کی تلاش شروع کی لیکن خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہو رہی تھی۔ ایک دو جگہ آدمی کا اظہار تو کیا کیا لیکن تنخواہ اتنی کم بتائی گئی کہ شاید اسے قبول نہیں کر سکا۔ اس دوران اس نے ایم کام فائل بھی پاس کر لیا لیکن پھر بھی اس کو حسب خواہش سروس نہیں مل رہی تھی کہ اس کا ایک تقریباً چالیس سال کے بعد افریقہ سے وکلا کی ایک فرم کا خط اسے موصول ہوا جس میں اسے اطلاع دی گئی تھی کہ اس کے ماموں محمد سعید حسین بہت بیمار ہیں اور نیرونی کے ایک اسپتال میں زیر علاج ہیں۔ وہ فوری طور پر اس سے ملنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں اگر شاید آمادہ ہو تو سفر کے جملہ اخراجات ایک ہفتے میں کیے جاسکتے ہیں۔

اس خط نے ناقابل بیان خوشی کے ساتھ ہی شاید کے والدین کو ایک محسوس میں بھی مبتلا کر دیا۔ چالیس برس کے بعد بھائی نے بہن کو یاد کیا تھا۔ شاید کی والدہ کی بے تابی اپنی جگہ بالکل بجا تھی۔ وہ بھی شاید کے ساتھ ہی افریقہ جانا چاہتی تھیں مگر وکلا کی فرم صرف شاید کے اخراجات کی ذمہ داری لینے کو تیار تھی بلکہ اس کی جانب سے یہ عہدہ بھی ملا تھا کہ محمد حسین صاحب صرف اس سے ملنا چاہتے ہیں چنانچہ شاید ہی نیرونی گیا۔ اپنی والدہ کی اس تاکید کے ساتھ کہ جس طرح بھی ممکن ہو وہ یا تو ماموں کو وطن لانے کی کوشش کرے یا ان سے کہے کہ وہ اپنی بہن کو بھی کم سے کم ملاقات کے لیے ہی افریقہ بلا لیں۔

محمد حسین صرف بسترِ علالت پر نہیں بلکہ بسترِ مرگ پر دراز تھے۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا اور انہیں شئی آلات کی مدد سے زندہ رکھا جا رہا تھا۔ اتفاق سے جس دن شاید نیرونی پہنچا اس دن محمد صاحب کی کیفیت نسبتاً بہتر تھی جسے سمجھتے چراغ کا آخری سنبھلا بھی کہا جاسکتا ہے۔ انہوں نے بھانجے کو سینے سے لگایا، سر سے پیریک بنوڑ دیکھا پھر ان کے اور شاید کے درمیان جو باتیں ہوئیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ کھر سے نکل کر ایک تاجر کے ہمراہ افریقہ پلے آئے تھے۔ جہاں چند برس انہوں نے اس تاجر کی

ملازمت میں گزارے۔ وہ تاجران سے اس قدر خوش ہوا کہ اپنی بیٹی کی شادی ان کے ساتھ کر دی اور اس کی موت کے بعد اس کا تمام برزس جو بیشتر باپ کی تجارت پر مشتمل تھا، محمود صاحب کی ملکیت میں آ گیا۔ بد قسمتی سے محمود صاحب کے یہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ انہوں نے بہت علاج کئے اور اسی علاج کے سلسلے میں کسی ٹوٹے پر عمل کرنے سے ان کی بیوی کی جان پر بن گئی اور بالآخر ایک سال بیمار رہ کر وہ چل بسیں محمود صاحب نے دوسری شادی نہیں کی اور اب جب خود ان کی زندگی کی گئی چینی سائیں رہ گئیں تب انہوں نے اپنے آدمی بھیج کر اپنے عزیز واقارب کے بارے میں معلومات فراہم کیں۔ اس کے نتیجے میں انہیں رپورٹ دی گئی کہ ان کی اکلونی بہن کا اکلوتا بیٹا شاید موجود ہے اور بہت ذہین محنتی، تعلیم یافتہ اور کچھ دارو نو جوان ہے۔ اس پر انہوں نے اپنے قانونی مشیر کے ذریعے شاید کو نیرونی بلایا ہے اور اب جبکہ وہ آ گیا ہے اور اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر وہ مطمئن ہو گئے ہیں، وہ اسے اپنا وارث قرار دینا چاہتے ہیں۔ یہ شاید کی مرضی پر ہوگا کہ وہ افریقہ میں رہ کر ان کے برزس کو جاری رکھے یا اسے فروخت کر کے تمام دولت پاکستان لے جائے اور وہاں کوئی کاروبار کرے۔ شاید نے واپس جانے کو ترجیح دی۔ محمود صاحب نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ دوسرے دن وصیت نامہ تیار ہو گیا اور چونکہ شاید برزس ختم کرنے کا ارادہ رکھتا تھا اس لیے محمود صاحب نے اپنی وصیت میں اپنے پرانے ساتھیوں اور بہن کے ورکرز کو بھی انعامات سے نوازا۔

تیسرے دن محمود صاحب کا انتقال ہو گیا اور ان کی خواہش کے مطابق انہیں نیرونی میں ہی ان کی بیوی کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ شاید کو برزس فروخت کرنے کے سلسلے میں مزید پیچھے نہ پڑا۔ اس کام میں محمود صاحب کے قانونی مشیر نے بہت مدد کی ایک ماہ کے اندر تمام برزس اور محمود صاحب کی افریقہ میں موجود تمام جائیداد کا سودا ہو گیا۔ شاید وطن واپس لوٹا تو تقدیر کے انقلاب نے اسے لکھ جی نہیں بلکہ کروڑ پتی بنا دیا تھا۔

☆☆☆

شاید نے اس دولت کو بڑی سوجھ بوجھ سے مختلف کاروبار میں لگا دیا۔ اس کے فیصلے درست بھی ثابت ہوئے اور تمام ہی برزس منافع بخش انداز میں چلے گئے لیکن خود شاید میں ذہنی طور پر ایک تبدیلی پیدا ہو گئی تھی۔ کوثر کے طرز عمل نے اسے پوری صنف تازک کے خلاف کر دیا تھا اور وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ عورت صرف دولت پرست ہوتی ہے۔ کسی

نپو سلطان کو موسیقی سے نہ صرف دلچسپی بلکہ وہ فن موسیقی سے بھی واقف تھے۔ اس کمال فن کے باعث ان کی سرپرستی میں فن موسیقی پر ایک کتاب 1199 ہجری میں لکھی گئی اس کا نام ”مفرح القلوب“ ہے۔ انڈیا آفس کے کتب خانے میں اس کے نو نسخے موجود تھے۔ اس کے مصنف عبداللہ ہیں۔ کتاب کی ابتدا میں ایک فارسی دیباچہ بھی ہے جس میں اس امر کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ نپو سلطان کے حسب خواہش یہ کتاب مرتب کی گئی ہے۔ اس میں موسیقی کے قواعد و ضوابط کے ساتھ راگ اور راگینوں اور نغموں کے متعلق روٹی ڈالی گئی ہے اور پھر راگ کے تحت غزلوں کو لکھا گیا ہے۔

اس کتاب کے دیباچہ میں اس امر کو واضح کیا گیا ہے کہ ”مفرح القلوب“ کی تصنیف کیوں کرائی گئی ہے۔ دیباچہ کا مختصر ترجمہ درج ذیل ہے۔

”چونکہ دین اور دنیا ہم و جان لازم و ملزوم ہیں۔ اسی طرح حرب اور ضرب بھی ایک دوسرے کے ساتھ جزو لا ینفک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حرب یعنی لڑائی کے متعلق ایک کتاب مرتب ہو چکی ہے اس لیے اب ضرب یعنی موسیقی کے متعلق یہ کتاب مرتب کی جاتی ہے۔“ اقتباس: دوکی پھرا زید نصیر الدین ہاشمی انتخاب: فیلیا ظہر، کراچی

بھی حسین سے حسین لڑکی کو دولت سے خریدا اور دل بھر جانے پر ناکارہ کھلونے کی طرح مستر دیکھا جاسکتا ہے۔ اس نے اس راستے پر پوری بے باکی سے چلنے کی کوشش کی لیکن اس کی فطری بلند اخلاقی اور پاکیزہ کردار نے اسے انتہائی حدود کو پار کرنے سے باز رکھا اور اس نے کوثر کی روش سے پیدا ہونے والے غم و غصے کی آگ کو صرف اس انداز میں بجھانے پر اکتفا کیا کہ خوبصورت لڑکیوں کو اپنی دولت کی چمک دکھ سے رجھانے کے بعد جب وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو جاتی تھیں تو انہیں انتہائی ذلت آمیز برتاؤ کے ساتھ محسوس کر کے نکال دیا کرتا تھا۔

☆☆☆

ان ہی دنوں کچھ ایسے اتفاقات پیش آئے کہ کوثر کی سبکی ظاہر کے والدین ایک بار پھر اپنے آبائی شہر واپس آ گئے۔ کوثر اور ظاہر کی خط و کتابت تو کبھی مستقل طور پر بند نہیں ہوئی تھی۔ دو چار ماہ کے وقفے سے دونوں کے خطوط ایک دوسرے کے پاس آتے جاتے رہے تھے لیکن وہ زیادہ تر رسمی انداز کے خطوط ہوتے تھے جس میں بس ایک

دوسرے کی خیر و عافیت کا تذکرہ ہی ہوتا تھا۔ طاہرہ جب واپس آ کر فطری طور پر کوثر سے ملی تو اسے یہ جان کر بہت حیرت ہوئی کہ اب وہ مزہ مقبول بن چکی ہے۔ وہ شاہد اور کوثر کی محبت سے واقف تھی۔ اس لیے اسے فطری طور پر اس انقلاب سے دکھ ہوا۔ کوثر نے ابھی تک اسے نہ اپنی بیماری کے بارے میں کچھ لکھا تھا اور نہ اپنی شادی کے بارے میں۔ اس لیے فطری طور پر طاہرہ کا پہلا تاثر بھی یہی تھا کہ کوثر نے شاہد کو صرف اس لیے مستر کر دیا کہ وہ غریب تھا اور مقبول صاحب سے، ان کی عمر زیادہ ہونے کے باوجود صرف اس لیے شادی کی کہ وہ دولت مند تھے اور کوثر کو دینی تمام راتیں اور آسائشیں مہیا کر سکتے تھے۔

”مجھے تم سے ایسی امید نہیں تھی۔“ وہ بولی۔
 ”کیسی؟“ کوثر نے دانستہ انجان بننے ہوئے پوچھا۔
 ”کہ تم شاہد کے ساتھ شادی کرنے سے صرف اس لیے انکار کر دو گی کہ وہ فی الحال تمہیں بنگلا، کار، زیورات قیمتی ملبوسات اور ایک بڑا بینک بینکس دیں دے سکتا تھا۔“
 ”تو تمہارا خیال ہے کہ میں نے مقبول صاحب سے دولت کے لالچ میں شادی کی ہے؟“

”طاہرہ یہ نہ شاہد کو گھرانے کی اور ایسا بچہ ہو سکتی ہے؟“
 ”شکر ہے کہ تم..... میری بچپن کی سبیلی جب ایسا سمجھ سکتی ہو تو شاہد کی سوچ بھی مختلف نہیں ہوگی۔“
 ”کیا کہا تم نے؟“ طاہرہ نے چونک کر کوثر کی طرف دیکھا۔
 ”تم اس پر شکر ادا کر رہی ہو؟“
 ”کیونکہ میرا مقصد بھی یہی تھا کہ شاہد مجھ سے نفرت کرنے لگے۔“

”مگر کیوں؟“
 ”اس لیے کہ اس صورت کے علاوہ اسے ایک زندہ لاش کے ساتھ شادی کرنے سے باز نہیں رکھا جاسکتا تھا۔“
 ”زندہ لاش..... کون تم..... کیا ہوا ہے تمہیں؟“ طاہرہ نے اضطراب سے پوچھا۔

اور جواب میں کوثر نے اسے پوری روداد سنائی۔
 ”اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟“ طاہرہ یہ سب کچھ سن کر بہت تاب ہو گئی۔
 ”میں یہ دستور درودرتا ہے۔ علاج جاری ہے مگر ڈاکٹروں کے خیال میں صرف آپریشن ہی اس کا علاج ہے۔“
 ”اور تم آپریشن کرانا نہیں چاہتیں۔ تمہاری منطق میری سمجھ میں نہیں آتی۔“

”تم اسے میرا پگل پن کہہ سکتی ہو۔“
 ”بلاشبہ تم پگل ہی ہو۔“ طاہرہ نے کہا۔ ”اچھا مقبول صاحب کا رو یہ کیسا ہے؟“
 ”وہ حرف بہ حرف اپنے وعدے کی پابندی کر رہے ہیں۔ ہم دونوں الگ بیڈ روم میں سو رہے ہیں۔ سچ یہ ہے طاہرہ کہ ابھی تک میری نظروں سے مقبول صاحب جیسا پاک باطن آدمی نہیں گزرا۔ اگر میں نے شاہد سے محبت نہ کی ہوتی اور یہ بیماری مجھے لاحق نہ ہوتی تو ان کی رفاقت کو زندگی کا بہترین انعام مانتی۔“

☆☆☆
 طاہرہ نے شاہد کا صرف تذکرہ ہی سنا تھا۔ کبھی اسے دیکھا نہیں تھا۔ ایک سے پہلے وہ کچھ شینگ کے بعد کسی میں اپنے گھر واپس جا رہی تھی اچانک کسی کا انجن بند ہو گیا اور ڈرائیور کی تمام تر کوشش کے باوجود پھر اسٹارٹ نہیں ہوا۔ طاہرہ نے ٹیکسی سے اتر کر کسی دوسری سواری کی تلاش کی مگر سڑک نسبتاً سناٹا تھی، نصف گھنٹا انتظار کے بعد بھی کوئی رکشا یا ٹیکسی نظر نہیں آئی تب اس نے کسی سے لفٹ لینے کا فیصلہ کیا۔ وہ ایک بڑھی لمبی، آزاد خیال لڑکی تھی، ایک ماڈرن گھر انے سے تعلق نہ رکھتی تھی اس لیے لفٹ لینے کے سلسلے میں اس کے ذہن میں مرد اور عورت کی کوئی تشخیص نہیں تھی۔ پھر جس شہر سے وہ آئی تھی اور جس سوسائٹی میں اب تک رہی تھی، وہاں یہ ایسی کوئی عجیب بات بھی نہیں تھی۔ اس لیے بغیر کچھ زیادہ سوچے گزرنے والی کاروں سے لفٹ مانگنے کا مخصوص اشارہ آ زمانا شروع کر دیا۔ اب یہ اتفاق تھا کہ جو کار اس کے اشارے کے جواب میں رکی اسے شاہد ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس نے بڑی شرافت کے ساتھ طاہرہ کو اس کے گھر تک چھوڑ دیا۔ اس اتفاقی ملاقات کے بعد وہ ایک دوبار مزید بھی بازار میں اور بھی کسی چمک تفریحی مقام پر ملے۔ شاہد کو ایک اور شکار پتہ آ نظر آیا۔ اس نے ان ملاقاتوں کو دانستہ بنانے کی کوشش کی اور کامیاب رہا۔ طاہرہ اس کی ذات میں دلچسپی لینے لگی۔ شاہد کا طریقہ تھا کہ جن لڑکیوں سے اسے کوثر کا انتقام لینا ہوتا تھا انہیں ہمیشہ اپنے نام کا دوسرا جز حید بتاتا تھا۔ یہی نام اس نے طاہرہ کو بھی بتایا۔

جلد ہی شاہد طاہرہ کو اپنے اس بیٹے تک لے جانے میں کامیاب ہو گیا جو اس نے خاص اسی مقصد سے خریدا تھا۔ طاہرہ دو تین بار گئی اور بغیر کسی غیر معمولی بات کے واپس بھی آ گئی جس سے فطری طور پر شاہد کی ذات پر اس کا اعتماد بڑھ گیا پھر ایک دن..... بلکہ ایک شام شاہد نے اپنی

آخری چال چلی۔ طاہرہ بھی جذبات کی رو میں بہنے لگی۔ لیکن اسے اتنا ہوش باقی تھا کہ جب شاہد نے اس کے لمبوس پر ہاتھ ڈالا تو وہ الگ ہو گئی۔ یہ شاہد کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ایسے ہر وقتے پر وہ لڑکی کے سامنے زیورات اور نوٹوں کی گڈیوں کے ڈھیر لگا دیا کرتا تھا اور جب لڑکی دولت کے چندہ یا دینے والے لالچ میں آ کر قدم بڑھانے کے لیے آمادہ ہو جاتی تھی تب وہ اسے دم دیش نیم عریاں کیفیت میں طوائف، ذلیل اور آوارہ کے خطابات دے کر بچلے دھکے دے کر نکال دیا کرتا تھا۔ اس نے طاہرہ کے چاروں طرف بھی جھنگاتے زیورات اور نوٹوں کے بندلوں کے ڈھیر لگا دیے۔ مگر طاہرہ بہت مختلف لڑکی تھی۔

”تم نے آج میرے اعتماد کو وہ ٹھیس پہنچائی ہے کہ اب شاید میں دوبارہ کبھی کسی مرد پر اعتبار نہ کر سکوں۔“ اس نے زیورات اور نوٹوں کو پائے تھارت سے ٹھکراتے ہوئے کہا۔
 ”اعتماد کو ٹھیس پہنچانے میں تو تمہاری صنف کا بھی جواب نہیں۔“ شاہد نے سچے سچے میں جواب دیا۔ ”تم کیا سمجھتی ہو کہ اگر تم یہ سب کچھ قبول کر لیتیں تو میں سچ سچ حد سے گزر جاتا۔ جیسے ہی تمہاری طرف سے آدمی کا اظہار ہوتا میں تمہیں ٹھوکریں مار کر بیٹھے سے نکال دیتا۔“
 ”میں یقین نہیں کر سکتی۔“

”مجھے تمہارے یقین کی ضرورت بھی نہیں ہے۔“
 ”مگر تم یہ سب کچھ کس لیے کرتے ہو؟“
 ”اس لیے کہ تم بھی ایک لڑکی نے میرے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا تھا۔ اس نے محبت مجھ سے کی اور شادی دولت سے کر لی کیونکہ تب میں غریب تھا۔“
 ”اب جبکہ میں اس تعلق کی نوعیت سے واقف ہو چکی ہوں تو مجھے اس لڑکی کے بارے میں بھی پتا دو۔“

”بڑی عجیب بات ہے۔“ شاہد نے ایک گہری سانس لی۔ ”تم پہلی لڑکی ہو جس نے نہ صرف دولت کو ٹھکرایا بلکہ سچ بڑھ چھو میرا دل تمہارے ساتھ وہ سلوک کرنے پر بھی آمادہ نہیں تھا جو میں اب تک دوسری لڑکیوں کے ساتھ کرتا رہا ہوں۔ مگر جو گھر چکا وہ گھر چکا۔ اسے دہرانے سے اپنے دھم تازہ کرنے کے سوا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میں اپنے سلوک پر شرمندہ ہوں۔ تم واپس جاسکتی ہو۔“

”مجھے یہ سن کر دکھ ہوا کہ کسی لڑکی نے تمہاری محبت کو دولت کے لیے ٹھکرایا۔“ طاہرہ نرم لہجے میں بولی۔ ”لیکن جس حد تک بھی میں تمہیں سمجھ سکی ہوں، مجھے تم ایسے نوجوان معلوم نہیں ہوتے جو کسی ایک کی زیادتی کا انتقام دوسرے

بے قصور افراد سے لے۔ کیا تم نے کبھی سوچا کہ اس طرح تم نے خود کو اس لڑکی کی سطح پر لا کھڑا کیا ہے۔ اگر اس نے برا کیا تھا تو کیا جو کچھ تم کر رہے ہو، وہ کوئی اچھی بات ہے؟“
 ”سچ کہا تم نے۔ میں غصے کے اندھے پن میں بہک گیا تھا۔“ شاہد نے شرمندگی سے جواب دیا۔
 ”تب پھر مجھ سے وعدہ کرو کہ آئندہ تم اپنا یہ طریقہ ترک کر دو گے۔“
 ”تمہیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں خود بھی اپنے دل میں یہی فیصلہ کر چکا تھا۔“ شاہد نے جواب دیا۔

☆☆☆
 طاہرہ اس رات گھر واپس پہنچی تو اس کے دل میں شاہد کے لیے پہلے سے کہیں زیادہ محبت، ہمدردی اور نغمساری پیدا ہو چکی تھی۔ وہ اس کے بعد بھی ایک دوسرے سے ملنے رہے اور دن بہ دن ان کی باہمی پسندیدگی میں اضافہ ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ شاہد نے، جو آئندہ کبھی بھی لڑکی سے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا، ایک شام طاہرہ سے اپنی چاہت کا اقرار کرتے ہوئے اسے شادی کی پیشکش کر دی جو طاہرہ نے کسی قدر شرماتے ہوئے منظور کر لی۔

☆☆☆
 کوثر کی بیماری کو ایک دو تین چھ ماہ گزر چکے تھے اور حیرت انگیز طور پر اس کی حالت دن بہ دن بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ اگرچہ مقبول صاحب کو معلوم نہیں تھا لیکن کوثر نے شادی کے بعد سے دوائی علاج بھی ختم کر دیا تھا۔ دوائیں بازار سے خریدی ضرور جاری تھیں مگر وہ استعمال ہونے کے بجائے کوثر کی الماری کے ایک خانے میں جمع ہو رہی تھیں۔ اس حرکت سے کوثر کا مقصد تو یہ تھا کہ وہ اپنے انجام کو قریب سے قریب تر لے آئے تاکہ اسے اپنی جذباتی کیفیت سے جلد از جلد نجات حاصل ہو جائے لیکن معاملہ اس کے برعکس ثابت ہوا۔ اس کی حالت ڈاکٹر شریف کے اندیشوں کے برخلاف ہر گزرتے دن کے ساتھ بہتر ہو رہی تھی۔

مقبول صاحب نے اس صورت حال کو رحمت الہی کا سبب جانا اور ایک بار پھر کوثر کو ڈاکٹر شریف کے اسپتال لے گئے تاکہ نہ صرف اس کی اچھی صحت کے بارے میں بتایا جائے بلکہ مکمل چیک اپ کر کے یہ اطمینان بھی حاصل کر لیا جائے کہ کوثر اپنی خطرناک بیماری سے سچ نکلی ہے۔ ڈاکٹر شریف نے حیرت کے ساتھ تمام احوال سنا۔ ایک مرتبہ پھر تمام ٹیسٹ اور ایکس ریز لے لیے گئے اور جب رپورٹیں سامنے آئیں تو یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ کوثر کو سرے سے کوئی

پیاری ہی نہیں تھی۔ اس کے سر میں چوٹ ضرور لگی تھی مگر سر کی بڑی سلامت تھی۔ سر کا درد، جھوک کی کمی، چکر آنا، متلی جیسی کیفیت، دماغ کے غلیوں کو چوٹ پہنچنے کی علامات تھیں جنہیں یا تو خود قدرت نے یا ابتدائی دوائی علاج نے صحت پذیر کر دیا تھا۔ مگر اسی کے ساتھ سوال پیدا ہوا کہ پھر اس وقت کے ٹیسٹ کیوں غلط رپورٹ تک پہنچے۔ ڈاکٹر شریف نے لیبارٹری کے ریکارڈ کا باریک بینی سے جائزہ لیا اور تب یہ انکشاف ہوا کہ جن دنوں کوثر کے ٹیسٹ ہو رہے تھے ان ہی دنوں لیبارٹری میں ایک دوسرے ڈاکٹر کی مریضہ کے بھی ٹیسٹ کیے جا رہے تھے۔ دونوں کیس اپنی علامات کے اعتبار سے یکساں تھے اس لیے ان کے جو بھی ٹیسٹ لیے گئے، وہ ایک دوسرے میں مل گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس مریضہ کی رپورٹیں ڈاکٹر شریف کو پہنچ دی گئیں اور کوثر کی رپورٹیں اس دوسری مریضہ کی رپورٹوں کے بطور اس کے ڈاکٹر کو روانہ کر دی گئیں۔ یہ ایک سنگین غلطی تھی۔ ڈاکٹر شریف نے فوراً دوسرے ڈاکٹر صاحب کو فون کر کے حالات معلوم کیے، معلوم ہوا کہ دوسری مریضہ کی حالت بہت نازک ہوئی تھی اس لیے ڈاکٹر نے رپورٹوں کے برخلاف فوری طور پر مریضہ کا آپریشن کر کے اس کی جان بچائی۔ ڈاکٹر شریف نے اطینان کی سانس لی کہ ان کے اسپتال کی لیبارٹری کی غلطی نے کوئی سنگین صورت اختیار نہیں کی۔ انہوں نے بے پروائی برتنے کے الزام میں لیبارٹری انچارج کو برطرف کر دیا اور مقبول صاحب کو یہ خوش خبری سادی کہ کوثر کی زندگی کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔ جو کچھ ہوا انہیں اس پر افسوس ہے۔ وہ ایک دوسری مریضہ کی رپورٹیں تھیں جن کی بنیاد پر انہوں نے اپنے خدشات ظاہر کیے تھے۔

فطری طور پر یہ خوش خبری سن کر کوثر کی مسرت کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا۔ وہ اب تک دانستہ شاہد کے حالات جانتے سے گریز کرتی رہی تھی اور مقبول صاحب نے بھی کبھی اس کے سامنے شاہد کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اب یہ معلوم کر کے کہ اس کی صحت کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے کوثر کے دل میں یہ امید جاگ اٹھی کہ اگر وہ شاہد سے تمام واقعات بیان کر دے تو وہ اسے ضرور معاف کر دے گا۔ اس نے مقبول صاحب سے کہا کہ وہ شاہد سے ملنا چاہتی ہے۔ مقبول صاحب اس کے خیالات و جذبات کا اندازہ لگا رہے تھے۔ انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور کوثر کو یہ بھی بتادیا کہ اس دوران شاہد کی زندگی خود ایک انقلاب سے دو چار ہو چکی ہے، اس کے ماموں اپنا کوئی وارث نہ ہونے کی وجہ سے اپنی کروڑوں کی

دولت شاہد کے نام چھوڑ گئے ہیں اور اب شاہد وہ غریب اور تنگدست شاہد نہیں رہا بلکہ شہر کا ایک کامیاب بزنس من اور متول فروتن چکا ہے۔

☆☆☆

مقبول صاحب نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ شاہد نے اپنے والدین کو ایک الگ بنگلے میں رکھا ہے اور خود تنہا ایک دوسرے بنگلے میں رہتا ہے۔ یوں وہ صبح شام والدین سے ملنے آتا جاتا رہتا ہے۔ کبھی کبھی اسی بنگلے میں رہ رہی جاتا ہے مگر اس کا زیادہ تر قیام اپنے دوسرے بنگلے میں ہوتا ہے۔ مقبول صاحب کے نزدیک یہ ایک فطری بات تھی کہ شاہد جس جذباتی صدمے سے گزر رہا تھا اس کے بعد وہ تنہائی پسند ہو جائے اس لیے انہوں نے اس معلومات پر کوئی حیرت ظاہر نہیں کی اور کوثر کو دوسرے بنگلے کا پتا بتادیا۔ کوثر خود بھی اسیکے جانا چاہتی تھی اور مقبول صاحب بھی یہی چاہتے تھے کہ وہ بات بگڑنے کے اندیشے کے بغیر نظر اس کے ساتھ نہ جائیں۔

چنانچہ ایک شام کوثر شاہد کے بنگلے پر جا پہنچی۔ باہر کوئی چوکیدار یا ملازم نہیں تھا اس لیے وہ کار سے اتر کر سیدھی بنگلے کے اندر داخل ہوئی گئی۔ مگر وہاں اس کی نظروں نے جو منظر دیکھا اور جو باتیں سنیں انہیں اس کی بعید ترین توقع بھی نہیں تھی۔ شاہد اور طاہرہ ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے اپنی عترتیں ہونے والی شادی کے انتظامات پر گفتگو کر رہے تھے۔ کوثر نے ان کی اتنی باتیں سن لیں جن سے اسے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی کہ شاہد اس سے مایوس ہو چکا تھا۔ تقدیر نے اس کی ملاقات طاہرہ سے کرادی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے اور اب شادی کرنے والے ہیں۔ وہ جس طرح آتی تھی، اسی طرح خاموشی سے واپس لوٹ گئی۔

مقبول صاحب نے اسے افسردہ اور مایوس واپس آتے دیکھا۔ وجہ پوچھی، کوثر کے لیے حقیقت چھانے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اس نے سب کچھ بتادیا اور یہ بھی کہا کہ طاہرہ اس کی عزیز ترین بہیلی ہے، وہ اس کے راستے میں دیوار نہیں بننا چاہتی۔ تقدیر اپنا فیصلہ دے چکی ہے اور اسے اس فیصلے سے کتنی ہی تکلیف کیوں نہ ہو اسے قبول کرنا ہی پڑے گا۔

مگر مقبول صاحب کو کوثر کے اس خیال سے اتفاق نہیں تھا۔ ان کے نزدیک کوثر شاہد کو خوش رکھنے کی کوشش میں ضرورت سے زیادہ قربانیاں دے چکی تھی۔ وہ کوثر کو بتائے بغیر طاہرہ سے ملے۔

”شاہد تم شاہد سے شادی کر رہی ہو؟“

”آپ نے غلط سنا ہے۔ میں اپنی پیاری بہیلی کی محبت کو کیسے لوٹ سکتی ہوں؟“ طاہرہ نے جواب دیا ”میں شادی ضرور کر رہی ہوں مگر ان صاحب کا نام شاہد نہیں حید ہے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ تمہیں معلوم نہیں کہ شاہد کا پورا نام شاہد حید ہے۔“ مقبول صاحب نے جواب دیا۔

اور پھر کوثر کی صحت یابی سے لے کر اس کے شاہد کے بنگلے پر جانے اور وہاں شاہد کو طاہرہ سے باتیں کرتے دیکھ کر واپس آنے کی تمام روداد سنادی۔

”خدا کی قسم مقبول صاحب!“ طاہرہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ”جو کچھ ہوا وہ غلط نہیں تھا۔ آپ ابھی میرے ساتھ شاہد کے پاس چلیں، ہم دونوں انہیں بتائیں گے کہ کوثر ان کی چاہت میں کن کن اذیتوں سے گزر چکی ہے۔ میں دانستہ کوثر کے راستے میں آنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ میں خود شاہد کو مجبور کروں گی کہ ان تمام حالات میں کوثر کا کوئی تصور نہیں۔ اس کی شادی بھی ایک دکھاوا ہے اس لیے اب دو چھوڑے ہوئے دنوں کوئل ہی جانا چاہیے۔“

مقبول صاحب اور طاہرہ اسی وقت شاہد کے بنگلے پر پہنچے اور کوثر کو دفتر میں پیش آنے والے واقعے سے لے کر اس کی طبیعت کی خرابی، ڈاکٹر شریف کی پیش گوئی، موت یا اپناج پن کے خطرے کو دیکھتے ہوئے کوثر کے شاہد کی زندگی سے نکل جانے کے فیصلے اور پھر شاہد اس سے نفرت کرنے لگے اس لیے مقبول صاحب سے دکھاوے کی شادی۔ پھر چھ سات ماہ گزرنے کے باوجود کوثر کی طبیعت بہتر ہونے، اس کے دوبارہ چپک اپ کے لیے ڈاکٹر شریف کے پاس جانے اور وہاں یہ انکشاف ہونے تک کہ کوثر کو بھی کوئی ایسی بیماری لاحق ہی نہیں تھی، تمام داستان سنادی۔

”آپ پر افضل ترین حق کوثر کا ہے۔“ طاہرہ نے آخر میں کہا ”غلط فہمی میں ہم نے ایک دوسرے سے جو وعدے کیے تھے۔ میں آپ کو ان سے آزاد کرتی ہوں اور ویسے بھی طاہرہ ہے کہ ان تمام باتوں کے سامنے آنے کے بعد میں آپ سے شادی نہیں کر سکتی۔ اب آپ خواہ کوثر کو معاف کریں یا نہ کریں، آج سے میرے اور آپ کے راستے جدا ہو رہے ہیں۔“

”کوثر کو معاف کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

شاہد نے بھیگی آنکھوں سے جواب دیا ”اس نے کوئی غلطی، کوئی گناہ نہیں کیا۔ نا سمجھ تو میں تھا کہ اس کی محبت کا اندازہ ہی نہیں کر سکا۔ اگر کوثر مجھے معاف کر سکے تو میں اس کی رفاقت کو زندگی کا سب سے بڑا انعام سمجھوں گا۔“

معاملات کے اس خوش اسلوبی سے ملے ہونے پر سب ہی بے حد خوش و مطمئن تھے۔ اسی وقت کوثر کو یہ خوش خبری سنانے کے لیے روانہ ہو گئے کہ بالا خراس کی آزمائش تمام ہوئی۔ اس کی چاہت جیت گئی اور اب ایک خوشگوار زندگی اس کا انتظار کر رہی ہے۔

☆☆☆

لیکن ٹھیک اسی وقت جبکہ طاہرہ شاہد کو کوثر کی داستان سنارہی تھی، مقبول صاحب کے بنگلے میں ایک نیا المیہ وقوع پذیر ہو چکا تھا۔ یادوار اپنی بے غزنی کوئی نکھولا نہیں تھا۔ وہ کبھی سے نکالے جانے کے بعد سے اب تک انتقام کی آگ میں سلگ رہا تھا۔ کوثر اس کی زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی تھی جس نے اسے اس بڑی طرح شکست دی تھی کہ وہ آج تک اس کے اثرات سے نجات نہیں پاسکا تھا۔ مقبول ٹریڈنگ کارپوریشن سے برطرف کیے جانے کے بعد سے اب تک اسے کوئی ملازمت نہیں مل سکی اور نوٹ فاقہ کشی تک پہنچنے والی تھی۔ وہ موقع کی تلاش میں تھا کہ کب اسے کوثر سے بدلہ لینے کا موقع ملتا ہے۔ وہ اس شام کے اندھیرے میں حیراب کے ایک بھرے ہوئے رن کے ساتھ بنگلے میں داخل ہوا۔ کوثر کو اپنے کمرے میں تنہا پایا اور اس سے پہلے کہ کوثر اس کی آمد سے باخبر ہو کر اپنے بچاؤ کے لیے کچھ کر سکے، سارا کارا حیراب اس پر اٹل دیا۔

کوثر کی چیخوں کو سن کر بنگلے کے ملازم اس کے کمرے کی طرف لپکے اور بھاگتے ہوئے یاد کو اس کی تمام تر جدوجہد کے باوجود فرار ہونے کی کوشش میں کامیاب نہیں ہونے دیا۔ ایک ملازم نے کوثر کی حالت دیکھی اور فوراً ڈاکٹر شریف کے اسپتال فون کر دیا۔ ڈاکٹر شریف خود ایبویلیس کے ساتھ بنگلے پر پہنچے اور کوثر کو اسی وقت اسپتال لے گئے۔ تب تک ایک دوسرے فون کے نتیجے میں پولیس بھی آگئی تھی جس نے یاد کو اقدام قتل کے جرم میں گرفتار کر کے حالات پہنچا دیا۔

شاہد، طاہرہ اور مقبول صاحب بنگلے پہنچے تو انہیں اس المناک واقعے کا علم ہوا اور وہ فوراً ڈاکٹر شریف کے اسپتال روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

ان دنوں مجھے ڈاکٹر شریف کے اسپتال میں انچارج نرس کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے صرف ایک ہی ہفتہ گزرا تھا۔ میں نے کوثر کا ایبویلیس سے اتار کر امیر جنی روم میں لے لے۔۔۔۔۔ جاتے دیکھا۔ حیراب سے اس کا سارا جسم

محترمہ مدیر اعلیٰ
سلام تہنیت!
راوی: خوشبو
تحریر: غلام قادر

گلاب

میں کوئی رائٹر تو ہوں نہیں مگر مجھے بہت شوق ہے کہ میری روداد زندگی عوام کے سامنے آئے۔ جو مجھ پر گزری ہے اس سے دیگر احباب سبق حاصل کریں۔ رائٹر نہ ہونے کی وجہ سے میں اس انداز میں اپنی سرگزشت بیان نہیں کر پارہا ہوں جو عام قاری کو پسند آئے۔ اس لیے میری التجا ہے کہ کسی بڑے رائٹر سے اسے دوبارہ خوشبو لکھوالیں۔

(لاہور)

شیکسپیر نے کہا تھا کہ گلاب کو کسی نام سے بھی پکارو وہ گلاب ہی رہتا ہے۔ اسی طرح سب طوائف کو کسی نام سے بھی پکاریں وہ طوائف ہی رہتی ہے۔ یہ بات آج نہیں اس وقت میری سمجھ میں آگئی تھی جب اور کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ سکی تھی اور کیوں نہ آتی، چینی نسلوں کی کہانی میری ماں کو یاد تھی وہ سب طوائف ہی تھیں۔ میری نانی کی ماں، اس کی ماں اور اس کی ماں سب طوائفیں ہی تھیں۔

ایثار اور قربانی کے باوجود وہ شاید اور کوثر کو ایک کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

مگر زندگی اسی تشیب و فراز، اسی مد و جزر کا نام ہے اور آدمی پر قدرت کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ گزرتے وقت کے ساتھ اس کے جذباتی زخم، خواہ وہ کتنے ہی گہرے ہوں، مندمل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ شاید کئی مہینوں تک اپنے آپ سے غافل رہا۔ طاہرہ کے آنسو بار بار بہتے رہے۔ مقبول صاحب اپنی عمر سے کہیں زیادہ بوڑھے نظر آنے لگے مگر پھر رفتہ رفتہ سب ہی کو بھرا گیا۔

دوسرا گزرنے کے بعد مقبول صاحب ہی نے تحریک شروع کی کہ اب زندگی کے تقاضوں سے زیادہ ویریک انجان نہیں رہنا چاہیے اور اگر کسی طرح کوثر کی روح سے رابطہ قائم ہو سکے تو اس کی بھی یہی آرزو ہوگی کہ اس کی مایوسی اور محرومی کو جواز بنا کر شاید اور طاہرہ ایک دوسرے کی زندگی کو عذاب نہ بنائیں۔ بات مقبول صاحبی پھر بھی ابتدا میں شاید اور طاہرہ دونوں کو یہ احساس ستاتا رہا کہ کہیں یہ اقدام کوثر کی قربانی کا مذاق اڑانے کے مترادف نہ ہو لیکن جب سب ہی نے انہیں سمجھا یا حد یہ کہ کوثر کی والدہ نے بھی اس تجویز کی تائید کی (انہیں مقبول صاحب اپنے گھر لے گئے تھے اور وہ ان دنوں انہی کے ساتھ رہ رہی تھیں) تب بالآخر شاید اور طاہرہ بھی آمادہ ہو گئے اور یوں کوثر کے انتقال کے تقریباً ڈھائی سال بعد ان دونوں کی شادی ہو گئی۔

یاد رکھو کہ قید کی سزا سنائی گئی تھی جو اس کے ظلم کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ جب وہ یوم حساب منصف حقیقی کے سامنے پیش ہوگا تو وہاں اسے اپنے گناہ عظیم کی ٹھیک ٹھاک سزا مل کر رہے گی۔

ان واقعات کو کئی برس بیت چکے ہیں مگر ایک دوسرے سے بے انتہا محبت کرنے اور اپنے پھول چسے بچوں کے ساتھ ایک بہت ہی خوشگوار اور کامیاب ازدواجی زندگی گزارنے کے باوجود شاید اور طاہرہ اب بھی کوثر کا ذکر بڑی محبت اور احترام سے کرتے ہیں اور ہر سال اس کی برسی کے دن فاتحہ خوانی کے علاوہ اس کی قبر پر پھولوں کی چادر چڑھاتے ہیں۔ ان کے دلوں میں آج بھی اس کی یاد اسی شدت کے ساتھ موجود ہے اور مجھے یقین ہے کہ ہمیشہ رہے گی۔

اس بری طرح جل گیا تھا کہ پہچانی نہیں جا رہی تھی لیکن ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد جب میں نے طاہرہ کو مقبول صاحب اور شاید کے ساتھ آتے دیکھا تو اسے فوراً پہچان لیا۔ کوثر اور طاہرہ دونوں ہی میٹر تک میری کلاس کیلئے رہ چکی تھیں۔ ہمارے درمیان گہری دوستی تو نہیں تھی مگر ایسے سطحی تعلقات بھی نہ تھے کہ ایک دوسرے کو فراموش کر دیا ہوتا۔ میٹرک کے بعد طاہرہ اپنے والدین کے ساتھ دوسرے شہر منتقل ہو گئی۔ کوثر نے کالج جو ان کر لیا اور میں نے اپنے گھریلو حالات سے مجبور ہو کر نرسنگ ٹریننگ کورس میں داخلہ لے لیا۔ کوثر سے کچھ دنوں تک ملاقاتیں رہیں مگر پھر حالات نے ہمیں ایک دوسرے سے بالکل جدا کر دیا۔ میں نے کورس پاس کیا تو ملازمت کے سلسلے میں کئی برس دوسرے شہروں میں رہی پھر کوشش کر کے اپنے ہی شہر کے ایک اسپتال میں درخواست دی جو حسن اتفاق سے منظور ہوئی یوں میں تو واپس آ گئی مگر طاہرہ اور کوثر سے جو رابطہ منقطع ہوا تھا وہ پھر قائم نہ ہو سکا۔ اب جو میں نے طاہرہ کو آتے دیکھا تو اسے پہچان کر تیزی سے آگے بڑھی۔ اس نے بھی مجھے پہچان لیا مگر وہ اس وقت دوسری ہی شکل میں تھی۔ اس وقت تو اس نے صرف اتنا ہی بتایا کہ ایک شخص نے اتفاقاً کوثر پر تیزاب ڈال دیا ہے۔

کوثر اس بری طرح جل گئی تھی کہ اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ ڈاکٹر شریف نے نہ صرف خود بلکہ شہر کے دوسرے اچھے ڈاکٹروں سے مشورہ بھی کیا لیکن تیزاب کھال کو جلا کر ہڈیوں تک پہنچ چکا تھا۔ دوران میں اور ایک دن تک کوثر کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی مگر وہ غریب جاں بردہ ہوئی اور تیسری شام کا سورج غروب ہونے کے ساتھ ہی اس کی زندگی کا چراغ بھی گل ہو گیا۔ اس دوران طاہرہ کا بیشتر وقت اسپتال میں ہی گزرا اور جو حالات میں نے اوپر بیان کیے ہیں وہ میں نے طاہرہ ہی کی زبانی پوری تفصیل سے سنے تھے۔

فطری طور پر کوثر کی اس انداز میں موت سے سب ہی کو گہرا صدمہ تھا۔ جب یہ ظاہر تمام حالات اس کے حق میں سازگار ہو گئے تھے تو تقدیر نے ایک دوسرے انداز میں اس کی زندگی کی مہلت ختم کر دی۔ اور یوں وہ بے چاری محروم ہی دنیا سے رخصت ہو گئی۔

تدفین کے وقت کوئی ایسی آنکھ نہ تھی جو اٹکلہ نہ ہو۔ شاید کو سب سے زیادہ دکھ اس بات کا تھا کہ اسے کوثر سے معافی مانگنے کا موقع بھی نہ مل سکا۔ مقبول صاحب اور طاہرہ کے غم میں یہ پہلو زیادہ نمایاں تھا کہ ان کی تمام تر کوششیں



اس وقت جب بہت چھوٹی چھوٹی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں، جب سے مجھے یہ سمجھایا جانے لگا تھا کہ میں کون ہوں اور بڑے ہو کر مجھے کیا کرنا تھا؟ پھر جب ہونہار برواکے چلنے چلنے پات نظر آنے لگے تو سب کی امیدیں مجھ سے وابستہ ہونے لگی تھیں۔ خود میری بھی خواہش یہ ہونے لگی تھی کہ میں ان کی امیدوں سے بڑھ کر کوئی کام کر دکھاؤں اور اسی ضمن نے مجھے ہر کام میں مہارت حاصل کرنے پر اکسایا تھا۔ یہاں تک کہ میں وہ کام بھی بڑے شوق سے کرتی تھی جس کا مقصد ماں سمیت کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا، صرف ایک نانی تھیں جن کا اصرار تھا کہ مجھے پڑھائی جاری رکھنی چاہیے۔

نانی نے کسی ادارے سے مارکیٹنگ کی ڈگری نہیں لی تھی لیکن اپنے کاروبار کو وہ بہت اچھی طرح چلا رہی تھیں۔ یوں بھی ہمارے لوگوں میں وہ خوش نصیب ترین خاتون بھی جاتی تھیں۔ ان کی خوش نصیبی یہ ضرور تھی کہ قدرت نے انہیں چھ بیٹیاں دی تھیں لیکن ان بیٹیوں سے جس انداز میں انہوں نے فائدہ اٹھایا تھا، وہ ان کی اپنی منصوبہ بندی تھی البتہ ایک بیٹی ان کی تو قعات پر پوری نہیں اُترتی تھی لیکن پھر نانی نے بھی اس کا نام اپنی زندگی سے یوں خارج کر دیا جیسے اس نام سے وہ کبھی واقف ہی نہ ہوں۔

شمالہ خالہ کے بارے میں جو تھوڑی بہت باتیں ہمارے کانوں تک پہنچی تھیں وہ یہ تھیں کہ وہ اپنے کام میں بہت ماہر تھیں کہ اچانک انہوں نے ایک ٹیکسی والے سے شادی کر لی جو انہوں نے بیٹیوں کو لانے لے جانے کے لیے رکھا ہوا تھا۔

اپنی شادی کی خبر خالہ نے نانی کو فون پر اس دھمکی کے ساتھ دی تھی کہ ان کی تلاش نہ کی جائے کیونکہ اگر انہوں نے ایسا کیا تو یہ ان کے حق میں بہترین نہیں ہوگا۔

نانی نے اس دھمکی پر توجہ دینے کے بجائے پوری شدت سے خالہ کو تلاش کرنے کی کوشش کی، لیکن انہیں کوئی نشان نہیں مل سکا تھا۔ صرف اتنا معلوم ہو سکا تھا کہ خالہ اور ان کے شوہر دینی چلے گئے تھے۔ نانی نے کوشش کی کہ وہ دینی میں بھی انہیں تلاش کروا سکیں لیکن اس میں بھی انہیں کامیابی نہیں ہو سکی تھی، تنہا ہارکرتانی نے خالہ سے وابستہ ورق اپنی کتاب سے پھاڑا اور اپنی پوری توجہ دوسری لڑکیوں کی جانب مبذول کر دی۔

کاروبار میں نفع نقصان تو ہوتا ہی ہے لیکن اچھا

کاروبار وہی ہوتا ہے جو نقصان سے سبق سیکھ کر آئندہ وہ غلطی نہ دہرائے اور نانی نے یہی کیا کہ اپنی غلطی انہوں نے نہیں دہرائی، اب وہ بیٹیوں سمیت کسی پر بھی مجبور و مار کرنے کے لیے تیار نہیں تھیں لیکن میرے معاملے میں وہ قدرے مختلف تھیں۔ مجھ میں انہیں کچھ ایسا نظر آیا تھا کہ وہ اپنے بہت سے اصول بھولنے کے لیے تیار ہو گئی تھیں۔

یہ میری پیدائش سے بھی پہلے کی بات تھی کہ نانی اپنے پرانے محلے سے اٹھ کر اس علاقے میں آ چکی تھیں جو تھا تو شرفا کا علاقہ ہی لیکن جہاں پڑوسی کے بارے میں جاننا اتنا ہی بڑا سمجھا جاتا تھا جتنا کسی زمانے میں شرفا کے گھر میں کسی لڑکی کا گھٹنا تھا۔

نانی کی کامیابیوں کو ایک فقرے میں بیان کرنا مقصود ہو تو یہ کہا جاسکتا تھا کہ وہ آنے والے وقت کو بچھانپ لیتی تھیں۔ جو کام نانی نے سب سے پہلے کیا اس محلے کے بہت سے لوگوں نے بعد میں کیا۔ ان میں سے بہت سے لوگ ان علاقوں میں اٹھ آئے، ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جو نانی کے راستے پر اس طرح چلے کہ انہوں نے اپنے اوپر آرٹسٹ، فنکار اور ماڈل کے سائن بورڈ آویزاں کر لیے اور اپنے کاروبار کو ایک نیا انداز دیا۔

میرے مقابلے میں نانی میری ماں کو پسند نہیں کرتی تھی، شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ جوانی کے ابتدائی دنوں میں ان سے وہی غلطی ہوئی تھی جو خالہ نے کی تھی لیکن نانی انہیں واپس لانے میں کامیاب رہی تھیں۔ نانی میری ماں کی واپسی کو اپنی کامیاب حکمت عملی گردانتی تھیں تو والدہ اسے اپنا غلط انتخاب سمجھتی تھیں۔

”تیرا باپ بھی ان ایک فیصد لوگوں میں سے نہیں تھا جو اپنی عزت کی حفاظت کے لیے جان بھی دینے کو تیار سمجھتے ہیں، ماں بھی کبھی اپنی قسمت کو برا بھلا کہتے ہوئے بڑبڑاتی تھی۔

میری والدہ کی واپسی کو برسوں تک یاد کیا جاتا رہا تھا۔ نانی کی اس کامیابی کو لوگ میری اُٹھان دیکھ کر دوبارہ سے یاد کرنے لگے تھے۔ عام طور پر اس گفتگو کا اختتام نانی کے اس فقرے پر ہوتا تھا جو نانی میری جانب دیکھ کر بڑے غریہ انداز میں کہتی تھیں کہ ”تم دیکھنا میری خوشبو اگلے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دے گی۔“

نانی نے جو کچھ سوچا تھا، میں بالکل ویسی ہی ثابت ہوئی۔ میرے اپنے لوگوں میں میری کامیابیوں کے ڈٹکے

اس طرح بیٹھتے ہیں کہ بزرگ اپنی بیٹیوں کو یہ دعا دیتے ہیں کہ خدا تمہارے گھر میں بھی خوشبو جیسی بیٹی پیدا کرے۔“ میری عمر زیادہ نہیں ہے لیکن جب کسی کی بیٹی پر عشق کا بھوت سوار ہونے لگتا ہے تو وہ مجھے بلوایا کرتے ہیں اور میں اس پیار عشق کو نانی کے الفاظوں میں سمجھاتی ہوں ”کنول کچھڑ میں ہی کھلتا ہے اور وہیں اچھا لگتا ہے۔ اسے صاف پانی میں رکھو گے تو پانی تو گندا ہوگا ہی، کنول بھی مرجھا جائے گا۔“

میں جب یہ کہہ رہی ہوں تو میرے ذہن کے اسکرین پر ایک چہرہ آکھڑا ہے۔ وہ چہرہ جس نے نانی کی جڑ بڑیگ کو خاک میں ملنے سے اپنے ایک فقرے سے بچالیا تھا۔

یہ کہانی اس وقت شروع ہوئی جب مجھے ایک روز ٹی وی پر پیغام ملا کہ شمالہ نانی کوئی خاتون مجھ سے بات کرنے کی خواہش مند ہے۔“

وہ نام ایسا نہیں تھا کہ میں نظر انداز کر سکتی، درنہ اس طرح کے پیغامات تو ملتے ہی رہتے تھے اگرچہ اس وقت میری شہرت بالکل ابتدائی سیڑھیوں پر تھی۔

میں نے ان نمبروں پر ڈائل کیا تو دوسری جانب سے ایک نسوانی آواز سنائی دی تھی اور اس ایک لفظ ”ہیلو“ کے ساتھ ہی میں اس نتیجے پر پہنچ گئی تھی کہ وہ خالہ کوئی نہیں ہے۔

”خالہ، میں خوشبو ہوں۔“ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ کہا اور دوسری جانب سے ایک ٹھنڈی آہ کی آواز آئی تھی جیسے کسی کو میری آواز سن کر خوشی ہونے کے بجائے افسوس ہوا ہو۔

”کتنے عرصے بعد میرے کانوں نے کسی اپنے کی آواز سنی ہے۔“ ان کی آواز آتی تھی۔

”آپ کب واپس آئیں؟“ میں نے سوال کیا۔ ”بچہ ہوئے ساڑھے تین سال ہو گئے اور یہاں تین سال سے ہوں۔“ انہوں نے میرے کئی سوالوں کے جواب سوال کیے بغیر دے دیے تھے۔

”آپ تین سال سے یہاں ہیں تو.....“ میں نے اپنا سوال ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ مجھے وہ لفظ ہی نہیں مل سکے تھے کہ میں اپنا سوال مکمل کر سکتی۔

”میں اب بھی رابطہ نہ کرتی اگر مجھے تم میں جین کی صورت نظر نہیں آتی۔“ انہوں نے کہا اور میں ہنس دی تھی۔

”مجھ سے اکثر لوگ یہی کہتے ہیں۔“ میں نے کہا تھا۔ ”کبھی ہے جین؟“ انہوں نے سوال کیا۔

”کیا سب کچھ فون پر ہی معلوم کریں گی؟“ میں نے سوال کیا اور ان کی جانب کچھ دیر خاموشی رہی۔

”ملنے میں ہم دونوں کے لیے مشکلات ہو سکتی ہیں۔“ ایک مختصر سے..... وقت کے بعد انہوں نے کہا تھا۔

”میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔“ میں نے کہا اور وہ ایک بار پھر کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی تھیں۔

”میں ایسا کرتی ہوں کہ صبح کالچ جانے کے بجائے آپ کی طرف آ جاتی ہوں۔“ ان کی خاموشی کا وقفہ بڑھ رہا تھا کہ میں نے تجویز دی۔

”چلو ٹھیک ہے۔“ انہوں نے رضامندی ظاہر کی اور میں خوش ہو گئی۔

خالہ نے اپنا پتا سمجھایا اور میں نے ان کا نمبر اپنے موبائل میں محفوظ کر لیا کہ اگر کہیں راستہ بھٹک جاؤں تو دوبارہ سے فون کر کے سمجھ لوں لیکن اس کا موقع نہیں آیا۔ خالہ نے وہ سب کچھ اس طرح سے سمجھایا تھا کہ میں آسانی کے ساتھ ان کے فلیٹ تک پہنچ گئی۔

وہ فلیٹ میں اکیلی تھیں، انہوں نے مجھے گلے لگایا، میرے ماتھے پر بوسہ بھی دیا لیکن مجھے یہ بھی محسوس ہوا جیسے وہ کچھ نزوس ہیں اور کچھ دیر بعد انہوں نے اپنی یہ پریشانی ظاہر بھی کر دی تھی۔

”میں نے اطہر اور ظفر دونوں کو نہیں بتایا کہ تم آرہی ہو۔“ انہوں نے کہا تھا۔

”تو کیا وہ ناراض ہوتے؟“ میں نے حیرت بھرے لہجے میں سوال کیا تھا۔

”ہاں نہیں۔“ ان کا جواب تھا۔

اس روز زیادہ تر وہی بولتی رہی تھیں۔ اپنے بارے میں، اپنے مرحوم شوہر کے بارے میں اور اپنے تینوں بیٹیوں کے بارے میں باتیں کرتی رہی تھیں۔ انہوں نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ خوش ہیں لیکن وہ مجھے ابتدا میں ہی کچھ ہنار محسوس ہوئی تھیں۔ پھر جب میرے آنے سے کچھ دیر قبل انہوں نے دوایاں کھائیں تو مجھے ان کی بیماری کی تصدیق بھی ہو گئی۔ وہ مجھے اپنی والدہ کی طرح کی مریض دکھائی دی تھیں جو کئی برس سے سکون آور گولیاں کھا رہی تھیں۔

”ان کے جانے کے بعد سے میری طبیعت خراب

خدارا © خدارا شوگرمریض ذرا عقلندی سے کام لیں

کیونکہ ساری زندگی عارضی دینی گولیاں ہی کھاتے رہتا آخر کہاں کی عقلندی ہے؟ آج کل تو ہر انسان صرف شوگر کی وجہ سے بے حد پریشان ہے۔ شوگر موڈی مرض انسان کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا، بے جان اور تار کا رہتا کر اعصابی طور پر کمزور کر دیتی ہے۔ حتیٰ کہ شوگر کی مرض تو انسانی زندگی ضائع کر دیتی ہے۔ شفاء منقائب اللہ پر ایمان رکھیں۔ ہم نے جذبہ خدمت انسانیت سے سرشار ہو کر ایک طویل عرصہ ریجر تحقیق کے بعد یومی طبی یونانی قدرتی جزی یومیوں سے ایک ایسا خاص قسم کا ہریل شوگر نجات کورس ایجاد کر لیا ہے۔ جسکے استعمال سے آپ شوگر سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر آپ شوگر کی مرض سے پریشان ہیں اور نجات چاہتے ہیں تو خدارا آج ہی گھر بیٹھے فون کر کے بذریعہ ڈاک VP دی پی شوگر نجات کورس منگوائیں۔ اور ہماری سچائی کو آزمائیں۔

المسلم دارالحکمت (جسٹو)

(دیسی طبی یونانی دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061

0308-6627979

0547-521787

آپ ہمیں صرف فون کریں

شوگر کورس آپ تک ہم پہنچائیں گے

مجھے زندہ نہیں رہنے دیتا۔“ انہوں نے کہا اور میں حیرت سے ان کا چہرہ دیکھنے لگی تھی۔ وقت اور حالات نے ان کے ساتھ بہت غلم کیے تھے لیکن وہ اب بھی لاکھوں میں نہیں تو ہزاروں میں ایک ضرور تھیں۔

میں ان سے جو کچھ کہنا چاہا رہی تھی وہ ان کی کیفیت دیکھتے ہوئے کہہ نہیں پاری تھی لیکن پھر خود انہوں نے ہی موضوع کا رخ اس جانب کر دیا۔

”کاش میں اس کی باتوں میں نہ آتی اور شاید کی طرح کسی ایسے شخص کا انتخاب کرتی جو مجھے اس عذاب مانے سے ہمیشہ کے لیے دور لے جاتا۔“ انہوں نے کہا اور اس بار میں خود کو بولنے سے نہ روک سکی۔

”آ خر آپ اسے بھول کیوں نہیں جاتیں؟“ میں نے غماز میں کہا اور ایک بار پھر ان کے ہونٹوں پر وہی بے معنی مسکراہٹ رکھ کر کرنے لگی۔

”میں ہر صبح اسے بھول جاتی ہوں میری جان!“

انہوں نے اسی بے معنی مسکراہٹ کو جاری رکھتے ہوئے کہا قاضی یہ کہتے ہوئے انہوں نے اپنی آنکھیں جیسے میری آنکھوں میں پتھر سے کر دی تھیں۔

”میں اسے یاد نہیں کرتی ہوں بس وہ خود ہی سے اس وقت میرے پاس آ جاتا ہے جب کوئی بھی ہاتھ مجھے اپنی ہاتھوں میں لینے کے لیے پڑھتا ہے۔“ انہوں نے کہا اور اس کے ساتھ ہی ہنس دی تھیں۔ ان کی نہ وہ ہنس نارمل ہنس تھی اور نہ ان کے ہنسنے کا انداز نارمل تھا۔ ایک عجیب سا ہنسنے والا ہنس ان کی ہنسی اور ہنسنے کے انداز میں موجود تھا۔

”اس عمر میں آ جانے کے باوجود تپا ہے لوگ میرے اتنے دیوانے کیوں ہیں؟“ انہوں نے اپنی ہنسی کو بریک لگا کر سوال کیا لیکن قبل اس کے کہ میں کچھ کہہ سکتی، انہوں نے خود ہی جواب دینا شروع کر دیا۔

”لوگ کہتے ہیں کہ میں تنہائی میں جس سے بھی ملتی ہوں، ایک والہانہ انداز میں ملتی ہوں لیکن میں تو کسی سے ملنے نہیں ملتی تو ہر بار اسی کی ہاتھوں میں ہوتی ہوں جس پر ہاتھ نہیں چھو کر میرا فرض بنتا ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

”آپ کی چائے ٹھنڈی ہو گئی ہے۔“ میں نے موضوع تبدیل کرنے کی غرض سے کہا۔

”تم ابھی یہ باتیں نہیں سمجھو گی۔ میں بھی نہیں سمجھتی تھی لیکن پھر.....“ وہ فحشہ ادھورا چھوڑ کر ایک بار پھر مسکرانے

رات دیر تک جاگنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ صبح میری آنکھ بھی دیر سے کھلی تھی لیکن یہ دیر بھی میرے اپنے حساب سے تھی۔ گھر کے باقی افراد اس وقت بھی سو رہے تھے۔ صرف میری اپنی ماں تھیں جو جاگ رہی تھیں۔ وہ کم خوابی کی سریش تھیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی یہ بیماری بڑھتی جا رہی تھی۔ میں اپنی چائے لے کر ان کے پاس ہی چلی آئی تھی۔

”آج ہماری بیٹی کو ہماری یاد کیسے آ گئی؟“ انہوں نے مجھے اپنے پاس بیٹھنے کو دیکھ کر کہا تھا۔ ان کے لہجے میں نہ شگہ تھا نہ شکایت۔ ایک حسرت بھی جو شاید غیر اختیاری طور پر ان کے لہجے میں آئی تھی۔ ”آپ مصروف ہی اتنا رہتی ہیں۔“ ان کی شکایت کے جواب میں میرے ہونٹوں سے نکل گیا تھا اور انہوں نے مسکرا کر مجھے دیکھا تھا۔

”بس چند، اب چند دنوں کی مصروفیات اور ہیں پھر ہماری طرف کوئی دیکھنا بھی پسند نہیں کرے گا۔“ انہوں نے تلخی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔

”یہ جو حلقی عمر کو روکنے کی کوششیں ہیں، یہ اب کچھ ہی دن اور کام کریں گی اس کے بعد تو اس کو بچے کی دیرینہ روایات کے مطابق یا تو کونا آباد کر لیں گے یا پھر تمہارے ساتھ حق ہو جائیں گے۔“ انہوں نے عجیب سے لہجے میں کہا تھا۔

”آپ ہر وقت مایوسی کی باتیں کیوں کرتی ہیں؟“ میں نے تسلی دینے والے انداز میں کہا اور وہ ہنس دی تھیں لیکن ان کی ہنسی بھی عجیب سی تھی۔ اس میں نہ خوشی کا تاثر تھا نہ طنز کی جھلک تھی۔

”تم بھی عجیب باتیں کرتی ہو۔“ انہوں نے اپنی بے چارگی بھری ہنسی کو روکنے ہوئے کہا تھا۔

میرا ایک ایک خواب میری آنکھوں کے سامنے بکھر رہا ہوا اور میں مایوس بھی نہ ہوں۔ ”اس بار انہوں نے طنز یہ انداز میں کہا تھا۔

”تمہارا نام خوشبو جو بڑھ کر تے ہوئے تمہارے باپ نے کب سوچا تھا کہ تم ہر رات ایک نئے بستر پر ایک نئے انداز سے بکھر جاؤ گی۔“ انہوں نے کہا اور اس کے ساتھ ہی ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

”آپ اب تک ماضی میں زندہ ہیں۔“ میں نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا اور وہ مسک پڑیں۔

”میں ماضی میں کب زندہ ہوں میری جان، ماضی

رہنے لگی ہے۔“ گولیاں کھانے سے قبل انہوں نے بتایا تھا۔

میں پانچ گھنٹے ان کے ساتھ رہی ان کے شوہر اور بیٹوں کے بارے میں سنی رہی۔ اپنی والدہ، ثانی، خالہ اور کزنز کے بارے میں بتاتی بھی رہی، لیکن وہ ایک سوال نہیں کر سکی جو سوال کرنے میں ان کے پاس گئی تھی کہ ”ہر طرح کے میس اور آرام پر انہوں نے ایک ایسی ڈرائیور کو کیوں ترجیح دی؟“

وہ سوال کرنے کی تو میں ہمت نہیں کر سکتی تھی لیکن مجھے وہ افسوس اور پچھتاوا بھی نظر نہیں آیا تھا جسے دیکھنے میں وہاں گئی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ انہیں شکایتیں نہیں تھیں، انہیں شکایتیں تھیں لیکن ان کی نوعیت وہ نہیں تھی جو نانی کو میری والدہ اور خالہ و ان اور کزنز سے تھیں۔

ان کی شکایت تھی تو یہ کہ ان کے بیٹے ان کی بات نہیں مانتے ہیں، بڑا ایسا مظہر جو امریکان تھا، وہ ہر مہینے میسج دیتا ہے لیکن خود نہیں آتا۔

”مجھے اس عمر میں بیٹوں کا کیا کرنا ہے، مجھے تو بچے چاہئیں جو اس نے اپنے ساتھ رکھے ہوئے ہیں۔“

انہوں نے اپنے بڑے بیٹے کی شکایت کی تھی۔

اسی طرح کی شکایتیں انہیں اپنے باقی دونوں بیٹوں سے بھی تھیں کہ میں ان سے کہتی ہوں کہ شادی کر لو لیکن دونوں ہی میری بات ایک کان سے سنتے ہیں اور دوسرے سے نکال دیتے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا۔

ان کے گھر سے واپسی پر میں ان کا قائل ثانی اور اپنے ماحول کی باقی عورتوں سے گرتی رہی تھی۔ وہ پہلا دن تھا جب مجھے احساس ہوا تھا کہ اس کے علاوہ بھی ایک دنیا ہے جہاں میں آباد ہوں اور حقیقت یہ تھی کہ یہ نئی دنیا مجھے زیادہ دلچسپ دکھائی دی تھی۔

اس رات میں بہت دیر تک جاگتی رہی تھی۔ اسی جاگنے کی کیفیت کے دوران بہت سے ایسے سوال بھی میرے ذہن میں آئے تھے جن کے کوئی جواب میرے پاس نہیں تھے۔ ایک سوال جو بار بار میرے ذہن میں سر اٹھاتا رہا تھا، یہ تھا کہ ”کیا شاید خالہ ہمیشہ سے ہی ایسی تھیں یا اس شخص نے انہیں تبدیل کر دیا ہے جس سے انہوں نے شادی کی تھی؟“ پھر اس کے ساتھ ہی یہ سوال بھی اُبھرا تھا کہ کیا میری اپنی ماں بھی ان دنوں ایسی ہی ہو گئی ہوں گی جب وہ میرے باپ کے ساتھ ہوں گی؟

گئی تھیں۔ جیسے کسی بچہ کا تصور کر کے خوش ہو رہی ہوں۔
 ”ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی ڈالی پر اُٹنے والے دو پھولوں میں سے ایک سہرے میں جتنا ہے اور ایک قبر کی زینت بنتا ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھیں لیکن ان کا لہجہ ان کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔

”ہو سکتا ہے شاید خالہ اتنی خوش نہ ہوں جتنا آپ سمجھتی ہیں؟“ میں نے آہستہ سے کہا اور انہوں نے ایک زوردار ہنسنے لگا یا اور پھر ہنستی چلی گئیں۔

اب کی بار ان کی ہنسی کا مجھ کو نہ انداز بچھلی بار سے کہیں زیادہ تھا۔ اتنا زیادہ کہ وہ اسی طرح ہنستے ہوئے اٹھی تھیں اور ہنستے ہوئے ہی وہاں سے چل دی تھیں۔

وہ دو ہاں سے چلی گئیں لیکن مجھے یوں محسوس ہوا تھا کہ میری ماں اس... حد تک ہنسنے لگی ہیں جس کے آگے پاگل پن شروع ہو جاتا ہے۔ میں نے اسی وقت سوچا تھا کہ میں ثانی سے اس شخص میں بات کروں گی۔ میں جانتی تھی کہ ان سے کس طرح بات کرنی ہے۔

میں گھر سے کالج جانے کے لیے نکلی تھی لیکن ابھی میں راستے میں ہی تھی کہ میرے موبائل کی گھنٹی بجی لیکن کال کسی نئے نمبر سے کی جا رہی تھی۔ میں عام طور پر اس طرح کی کالز وصول نہیں کرتی تھی لیکن وہ کال میں نے ریسیو کر لی۔

”میں ظفر بول رہا ہوں اور مجھے خوشبو سے بات کرنی ہے۔“ دوسری جانب سے میرے پہلو کہتے ہی کہا گیا۔

”ظفر یعنی شامک خالہ کے صاحب زادے۔“ میں نے سوال کیا اور فوراً ہی اس نے اس کی تصدیق کی۔

”کیسے ہیں آپ؟“ میں نے اسی انداز میں بات کی تھی جس میں وہ کر رہا تھا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں لیکن آپ سے کچھ باتیں کرنی تھیں اگر آپ کے پاس وقت ہو۔“ اس نے کہا تھا۔

وہ مہذب انداز میں بات کر رہا تھا لیکن میرا خیال تھا کہ کسی بھی لمحے اس کا یہ مہذب انداز تبدیل بھی ہو سکتا ہے۔ شامک خالہ سے گفتگو کے دوران مجھے یہی تاثر ملا تھا کہ ان کے مرحوم شوہر اور بیٹے خالہ کے رشتے داروں سے کوئی بھی واسطہ رکھنا نہیں چاہتے تھے۔

”جی فرمائیے۔“ میں نے کہا اور ساتھ ہی توقع کر رہی تھی کہ وہ مہذب لہجے میں کوئی سخت بات کہہ دے گا۔
 ”کیا آج وہ پھر کا کھانا ہم سب کے ساتھ کھا سکتی

ہیں؟“ اس نے سوالیہ انداز میں کہا تھا۔
 ”کوئی خاص بات؟“ میں وہ سوال کرنے پر اس لیے مجبور ہو گئی تھی کہ مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ مجھ سے یہ کہہ بھی سکتا ہے۔

”کل میں امی کو ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا۔“ اس نے کہنا شروع کیا تھا۔ ”ڈاکٹر مل ہر پندرہ دن بعد ان کا ڈاکٹر سے معائنہ ہوتا ہے اور کل وہی دن تھا اور ڈاکٹر نے ان میں بہت بہتری مائی تھی اور اس کی وجہ ان کے نزدیک آپ کی کل ہمارے ہاں آج بھی۔“ ظفر نے مختصر الفاظ میں بہت کچھ بتا دیا تھا۔

”مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرا کچھ دیر ان کے ساتھ گزارنا ان کے لیے اتنا اہم ہو جائے گا۔“ میں نے جواب میں کہا۔

”میرے والد صاحب مرحوم اور پھر ان کے بعد ہم ان کے خاندان والوں سے ملنے کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن ڈاکٹر صاحب کی ہدایت یہی ہے کہ ہمیں اپنے روٹوں میں تبدیلی کرنی ہوگی۔ اگر ہمیں اپنی والدہ کی زندگی عزیز ہے۔“ وہ فون پر کہتا رہا تھا اور میں خاموشی سے سنی رہی تھی۔

اسے جواب میں کہنے کے لیے میرے پاس بہت کچھ تھا لیکن میں نے وہ کچھ نہیں کہا جو میں کہنا چاہتی تھی۔ صرف کہا تو اتنا کہ ”میں پہنچ جاؤں گی۔“

میں ٹھیک وقت پر پہنچی تھی لیکن خالہ نے شکایت کی کہ میں دیر سے آئی ہوں۔

ان کے دونوں بیٹے بھی میرے منتظر تھے۔ دونوں ہی ابتدا میں کچھ کچھ کھینچتے تھے لیکن پھر آہستہ آہستہ کھلے گئے اور کھانا ختم ہونے تک ہم خامے حلل مل گئے تھے۔

”آپ نے ماں کے ہاتھوں کا بنا ہوا کھانا کھا یا اب بیٹے کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چائے بھی پیچھے گا۔“ ظفر نے برتن سینٹے ہوئے اعلان کیا۔

”اور چائے کے پہلے گھونٹ کے ساتھ ہی کھانے کا تمام اچھا تاثر آپ کے ذہن سے رفوچر ہو جائے گا۔“ ظفر نے فوراً ٹکڑا لگا دیا تھا۔

”آپ بھائی کی باتوں میں بالکل نہ آنا کزن، یہ ہمیشہ مجھ سے جلتا ہے۔“ ظفر نے مجھے مخاطب کیا تھا۔
 ”وہ کیوں جلتا ہے گا مجھ سے؟“ خالہ جواب تک مسکرا رہی تھیں۔ ظفر کی حمایت میں بول پڑی تھیں۔

”کیونکہ وہ میرے مقابلے میں کالا ہے۔“ اظہر نے نظر کے دہستے ہوئے رنگ پر تبصرہ کیا۔
 ”اگر اچھی جائے بنانے کے لیے رنگ کا صاف ہونا ہی شرط ہے تو پھر سب سے اچھی جائے خوشبو کو آئی چاہیے۔“ ظفر نے میری جانب رخ کیے بغیر بھائی سے کہا تھا۔

”آپ کو کسی کی کمزوریوں کا یوں اعلان نہیں کرنا چاہیے بھائی! آخر وہ ہماری مہمان ہیں۔“ اظہر نے فوراً ہی بری حمایت کی۔

”لیکن مجھے چائے بنانا آتی ہے اور میں بہت اچھی چائے بناتی ہوں۔“ میں نے اظہر سے کہا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی ان دونوں نے اس طرح ہنسنا شروع کر دیا جیسے میں نے انہیں کوئی لطیفہ سنایا ہو۔

”لیکن میں سچ کہہ رہی ہوں، مجھے بہت اچھی چائے بنانی آتی ہے۔“ میں نے زور زور انداز میں دوبارہ کہا تھا اور اس کے ساتھ ہی ان دونوں نے زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا تھا۔

”خوشبو، ان کی باتوں میں مت آنا۔“ خالہ نے مجھے مخاطب کیا تو میں حیرت سے ان کی جانب دیکھنے لگی تھی۔
 ”یہ شریر تمہیں اپنی باتوں میں الجھا کر تم سے چائے بنانا چاہ رہے ہیں۔“ خالہ نے کہا اور وہ دونوں جو خالہ کی آواز کے ساتھ ہی چپ ہو گئے تھے، ایک بار پھر ہنسنے لگے تھے۔

”بھائی، امی بھی کتنی شوہار ہیں۔“ اظہر نے ظفر سے کہا اور وہ دونوں مسکرانے لگے۔

”آخر ماں کس کی ہیں؟“ ظفر نے اپنے کار کو اونچا کرتے ہوئے کہا تھا۔

”دیکھو کس خوبصورتی سے انہوں نے ہمیں بُری چائے پینے سے بچا لیا۔“ اظہر نے کہا۔

”اور اپنی بھانجی کی کمزوری ہم پر ظاہر بھی نہیں ہونے دی۔“ ظفر نے اسی انداز میں جواب دیا اور دونوں ایک بار پھر ہنسنے لگے تھے۔

”میں ابھی آپ دونوں کی غلط فہمی دور کر دیتی ہوں۔“ میں نے اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے کہا تھا۔

”ایک منٹ کزن!“ اظہر نے مجھے روکے ہوئے کہا۔

”ہم نے یقین کر لیا کہ آپ بہت اچھی چائے بنا لیتی

ہیں۔ اب پلیز آپ تشریف رکھیں۔“ میں اس کے روکنے پر رک گئی تو اس نے کہا تھا۔
 ”دیکھیں، ہم کھانا تو بُرا کھا سکتے ہیں لیکن چائے کے بارے میں ایسا ہونا ذرا مشکل ہے۔“ ظفر نے بھائی کی بات کو آگے بڑھایا۔

”آخر آپ کو یقین کیوں نہیں آتا کہ میں صرف چائے ہی نہیں، کھانا بھی بہت اچھا پکا لیتی ہوں۔“ میں نے جڑ بڑھونے کے انداز میں ظفر سے کہا اور وہ مسکراتے لگے۔

”آپ سے کس نے کہا کہ مجھے آپ کی بات پر یقین نہیں ہے؟“ اس نے اسی مسکراہٹ کے ساتھ سوال کیا جو ایک معنی خیزی اپنے اندر سونے اس کے ہونٹوں پر رتھیں تھیں۔

”مجھے تو اس پر بھی یقین ہے کہ اگر چاند خان اور سورج خان آج کے دور میں زندہ ہوتے تو ایک میریٹ کے اور دوسرے آوارہ کی چیف کلک ہوتے۔“ اس نے کہا اور مجھے واقعی غصہ آ گیا۔

”کیا جانتے ہیں آپ چاند خان اور سورج خان کے بارے میں؟“ میں نے غصہ بھرے لہجے میں کہا تھا۔

”بھئی کہ ایک چاند خان تھے اور دوسرے سورج خان تھے۔“ ظفر نے جواب میں کہا لیکن اس کی مسکراہٹ یہ کہتے ہوئے کچھ اور گہری ہو گئی تھی۔

”بھائی کا مطلب یہ ہے کہ ان کے اگر آپ اچھا کھانا پکا لیتی ہیں تو وہ دونوں تو بہت بڑے فنکار تھے، انہیں تو فانیو اشار ہونے کا ہنڈ کلک ہونا چاہیے۔“ اظہر نے وضاحت کرنے والے انداز میں کہا اور دونوں ایک دوسرے کو معنی خیز انداز میں دیکھ کر مسکرائے تھے۔

”میں آپ دونوں کی بات کی کامیں کا میں بچن سے واپسی پر سنوں گی۔“ میں نے بچن کی جانب قدم اٹھایا ہی تھا کہ اظہر کی جھنجھٹی ہوئی آواز مجھے سنائی دی تھی۔

”بھائی، کزن نے تمہیں کالا کوا کہا۔“ اور میرے اُٹھتے ہوئے قدم رک گئے۔

”میں نے سن لیا ہے یار، لیکن کیا کر سکتا ہوں۔“ ظفر کی حسرت میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی تھی۔

”میں نے ایسا کب کہا؟“ میں نے اظہر پر آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔

”ابھی تو آپ نے کہا کہ کامیں کا میں۔“ اظہر نے فوراً ہی مجھے یاد دلانے والے انداز میں کہا تھا۔

”وہ تو میں نے ایسے ہی کہہ دیا تھا۔“ میں نے ٹھٹھا کر ظفر کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تھا لیکن میرا مخاطب اظہر ہی تھا۔

”اگر ایسے ہی کہنا تھا تو آپ ٹائیں ٹائیں فٹ بھی کہہ سکتی تھیں۔“ اس نے میری بات کو رد کرنے والے انداز میں کہا تھا۔

”ویسے کزن، یوں کسی کی شکل صورت کا مذاق اڑانا ٹھیک نہیں ہے۔“ اظہر نے ظفر کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تھا جو سر جھکائے بیٹھا تھا۔

”غلط کہہ رہے ہیں، میرا ایسا کوئی مطلب نہیں تھا۔“ میں نے اس بار ظفر کو مخاطب کیا تھا اور اس نے سر اٹھا کر مغموں نظروں سے میری جانب دیکھا تھا۔

”کوئی بات نہیں محترمہ خوشبو صلیب!“ ظفر نے رندگی ہوئی آواز میں کہا تھا۔ ”بچپن سے لے کر آج تک لوگ مجھے اسی طرح کے ناموں سے یاد کرتے رہے ہیں، آپ نے بھی کر لیا تو کیا ہو گیا۔“ ظفر نے رندگی ہوئی آواز میں اپنا فقرہ مکمل ہی کیا تھا کہ خالہ نے اس کی پیٹھ پر ایک دھپ جمانی۔

”تو بیٹھ بیٹی!“ انہوں نے مجھ سے کہا۔ ”اور تم چاکر چائے بناؤ۔“ انہوں نے اظہر کی جانب دیکھ کر کہا۔

”امی اگر وہ.....“ اظہر نے کچھ کہنے کے کوشش کی لیکن خالہ نے اسے روک دیا۔

”اب تم دونوں میں سے کوئی بھی ایک لفظ بھی نہیں کہے گا۔“ انہوں نے حکمیہ انداز میں کہا۔ ”اپنی نوٹنگی سے میری بچی کو بے وقوف بناتا رہے ہیں۔“ انہوں نے ڈانٹنے والے انداز میں کہا اور وہ دونوں میری جانب دیکھ کر مسکراتے رہے۔

”چلو سواری کھو دونوں اس سے۔“ خالہ نے ایک نیا حکم جاری کیا جس کی بچوں نے فوری طور پر تعمیل بھی کر دی۔

”سواری کزن!“ اس نے میرے سامنے جاپانی انداز میں جھکتے ہوئے کہا تھا لیکن ظفر اپنی جگہ بیٹھا رہا۔

میری نظریں غیر ارادی طور پر اس کی جانب اٹھیں تو اس نے نظریں ملتے ہی کہا ”کائیں!“ اور ہم سب ہنس پڑے تھے۔

خالہ کے منع کرنے کے باوجود جائے میں نے ہی بتائی تھی جس کی تحریف ان دونوں نے بھی کی لیکن اس طرح کہ

تحریفی جملوں کے درمیان وہ یہ بھی کہتے جاتے تھے کہ ”مہمان ہیں، مہمان کے لیے جھوٹ بولنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔“

میں وہاں سے نکلی تو میرے کانوں میں دور تک ظفر کے وہ الفاظ گونجتے رہے تھے جو اس نے مجھے رخصت کرتے ہوئے کہے تھے ”آپ کی آمد سے امی کے ہونٹوں کی مسکراہٹ واپس آگئی ہے۔ اور ہم چاہیں گے کہ ہماری امی اکثر مسکراتی رہیں۔“

”میں گھر پہنچی تو ہمیشہ کی طرح ہر ایک اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھا۔ سورج کے غروب ہونے میں زیادہ وقت نہیں تھا اور شام ہونے والی تھی۔ میں نے پہلے سوچا کہ نانی سے اپنی ماں کے بارے میں بات کروں لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ نانی دوپہر سے کہیں گئی ہوئی ہیں تو میں اپنے کمرے میں آگئی۔

وہ رات میری زندگی کی عجیب رات تھی۔ میں سوٹا چاہتی تھی لیکن سوٹیں پار ہی تھی۔ خالہ کے گھر پر گزرا ہوا وقت ایک فلم کی طرح بار بار نظروں کے سامنے سے گزر رہا تھا۔

”ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں ہمیشہ کے لیے اس ماحول کا حصہ بن جاؤں؟“ میں نے نہ جانے کس جذبے کے تحت سوچا تھا اور اس کے ساتھ ہی ظفر کا تصور میرے ذہن میں اُبھر اٹھا اور پھر میں دیر تک اس کے بارے میں ہی سوچتی رہی تھی۔

اس رات، میں جو کچھ سوچتی رہی تھی وہ ان تمام اسباق سے مختلف تھا لیکن مجھے اس کا ہوش ہی کب رہا تھا کہ میں ان باتوں پر غور کرتی۔ میرے پورے وجود میں اس سوچ کے ساتھ ہی ایک سنسنی سی پھیلنے لگی تھی اور وہ سنسنی ایسی ہی تھی کہ مجھ پر نشہ سا ہونے لگا تھا۔

جو کچھ میں سوچ رہی تھی اس کے مطابق میری راہ میں کچھ ایسی مشکلات نہیں تھیں۔ خالہ کے بیٹے اپنی ماں کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے اور وہ اپنی ماں کی خواہش کو یقیناً رد نہیں کرتے۔

میں اس کے اگلے روز بھی خالہ کے گھر گئی تھی لیکن زیادہ دیر نہیں رہی تھی۔ نانی سمیت کسی کو بھی میں کسی شک میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی تھی البتہ میں نے شناختی کارڈ بخوانے کا کام شروع کر دیا۔

ظفر سے میری ملاقات، پہلی ملاقات کے دس روز بعد



محترمہ عذرا رسول صاحبہ
السلام علیکم!

امید ہے بخیریت ہوں گی۔ میں صاف صاف بتاؤں کہ مجھے کہانیاں لکھنے یا پڑھنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ تو میرے سالے صاحب کی فرمائش ہے کہ میں اپنی روداد کہانی کی طرز پر لکھ کر آپ کو بھیجوں جسے پڑھ کر لوگ عبرت حاصل کریں۔ میں نے تمام باتیں لکھ دی ہیں اسے کسی اچھے رائٹر سے دوبارہ لکھوالیں۔

ظفری
(ملتان)

مجھے شادی کے نام سے نفرت تھی۔ اتنی نفرت کہ ایک روز کھانے کی میز پر میری شادی کا ذکر پھیرا تو مجھے ایک اپکانی آ گئی۔ جو کچھ کھا چکا تھا سب باہر آ گیا۔ اتنی شدید نفرت کا ایک وسیع پس منظر تھا۔

میں جوان بھی تھا اور میر ترین گھرانے کا فرد بھی۔ میں اگر بتاؤں کہ میرا تعلق کس گھرانے سے ہے تو لوگوں کے ہوش اُڑ جائیں۔ ان گھرانوں میں جتنی آزادیاں میسر ہوتی ہیں، وہ سب مجھے حاصل تھیں۔ گھر میں ہونے والی

ہوئی، لیکن وہ ملاقات بھی یوں ہی سرسری سی تھی کیونکہ میرے چننے کے کچھ ہی دیر بعد چند باتیں کرنے کے بعد وہ دفتر کے کام سے اسلام آباد چلا گیا تھا۔

خالہ اور اس کے گھر والوں سے ملنے ہوئے مجھے پانچ ماہ ہوئے تھے کہ مجھے معلوم ہوا کہ نانی نے ایک بہت بڑی مرغی پھانسی لی ہے اور وہ دن قریب آ گیا ہے جس کا وہ انتظار کر رہی تھیں۔ میں ابھی اس کشش میں تھی کہ خالہ سے یہ بات کروں یا نہیں کہ نانی نے مجھے بتایا کہ ”مجھے دس روز کے لیے دی جاتا ہے۔“

”مگر نانی میرے امتحان.....؟“ میں نے کہا۔

”واپس آ کر دے لینا امتحان!“ نانی نے یوں کہا تھا جیسے یہ کوئی اہم بات ہی نہ ہو۔ ”ویسے بھی امتحان پاس کر کے تجھے کوئی سن لکری کرنی ہے؟“ نانی نے اپنا جواب مکمل کیا۔

نانی اس روز رسم کی ادائیگی کا دن طے کر رہی تھیں جب دو دن کے تانے کے بعد میں خالہ کے گھر پہنچی تھی جہاں ظفر آ گیا تھا۔ خالہ کے بارے اس نے بتایا کہ وہ اسپتال میں ہیں جہاں وہ رات رات تھا اور اب انظر وہاں ہے۔

”معمولی درجے کا ہارٹ ایک تھا لیکن اب وہ خطرے سے مکمل باہر ہیں۔“ ظفر نے میری پریشانی دیکھ کر مجھے سلی دی تھی اور تب ہی میں نے فیصلہ کیا کہ میں براہ راست ظفر سے ہی بات کروں۔

میں نے اسے نانی کی منصوبہ بندی کے بارے میں بتایا جسے اس نے پورے سکون کے ساتھ سنا لیکن سکون کے ساتھ سننے کے بعد اس نے سوال کیا ”میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں؟“

”آپ مجھے اس جہنم میں جانے سے بچا سکتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”شاید تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ میں تم سے شادی کر کے تمہیں اس آگ میں جلنے سے بچا سکتا ہوں؟“ اس نے سوال کیا اور میری گردن اثبات میں ہل گئی۔

”تم بہت اچھی ہو خوشبو اتنی اچھی، اتنی خوبصورت، اتنی سلیقہ مند کہ میں تمہارے لیے کسی بھی طاقت سے مکر جاتا لیکن.....“ اس نے اپنا فقرہ ادھورا چھوڑا اور جیسے میرے دل کی دھڑکن رکے لگی تھی۔

”تمہیں بچانے کے لیے میں خود تو ہر آگ میں جھلس

مخلوط پاریاں آئے دن کا معمول تھیں۔ ان میں شریک ہونے والی لڑکیاں یکے ہونے پھل کی طرح میری گود میں کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتی تھیں۔ لکٹی ہی لڑکیاں تھیں جو میری طرف دوپٹی کا ہاتھ بڑھانے کے لیے بے چین رہتی تھیں۔ میں بھی ایک ستارے سے دوسرے ستارے کی طرف خوش دلی سے بڑھ رہا تھا۔ گھر میں کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا بلکہ میری اس مقبولیت پر پھولے نہیں ساتی تھیں۔ میرا دل چاہتا تھا کہ کوئی مجھے بھی روکنے ٹوکنے والا ہو لیکن یہاں تو ہر بڑی بات کو تہذیب کا حصہ سمجھا جاتا تھا۔

میری اس خواہش نے کہ کوئی مجھے ٹوکنے، اسے لیے ایک اور راستے کا انتخاب کر لیا۔ یہ راستہ کوئی نیا نہیں تھا لیکن اس لیے نیا تھا کہ میں اب تک اس راستے پر نہیں چلا تھا۔ گھر میں شراب نوشی کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ محفلوں میں جام پر جام لٹاؤ لٹاؤ جاتے تھے۔ شراب ہر وقت گھر میں موجود رہتی تھی۔ اس دن گھر میں کوئی نہیں تھا کہ مجھے موقع مل گیا۔ میں نے ملازم کو آواز دی۔

”الماری سے شراب کی بوتل لے آؤ۔“

”کون سی سرکار؟“

”کوئی سی بھی۔“

”مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ کون سی پتی چاہیے۔ مجھے تو شراب سے مطلب تھا۔ ملازم گیا اور جو بوتل اسے سامنے نظر آئی، اٹھا کر لے آیا۔

”بے وقوف آؤ! گلاس اور برف کیا تمہارا باپ لے کر آئے گا۔“

”سرکار، میں سمجھا آپ کو یہ بوتل کہیں پہنچانی ہے۔ آپ تو پیتے نہیں ہیں۔“

”اب پینے لگا ہوں، گلاس لے کر آؤ۔“

وہ گلاس اور برف لے کر آ گیا مگر اس کی آنکھوں میں حیرانی کی چمک ابھی تک باقی تھی۔ وہ محفلوں میں ساتی گری کر چکا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ برف کتنا پانی ملایا جائے۔

اس نے گلاس تیار کر کے میری طرف بڑھا دیا۔

میں پہلی مرتبہ پی رہا تھا لیکن اتنے غصے میں تھا کہ ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر گیا۔ اس نے میرے اشارے پر دوسرا گلاس بنا دیا۔ گھونٹ گھونٹ کر کے میں نے وہ گلاس بھی خالی کر دیا۔

جب تیسرا گلاس خالی کر چکا تو اس نے خبر دی کہ میری

آگئی ہیں۔ وہ ڈرا ہوا تھا کہ میری سنان لیا تو نہ جانے کیا ہنگامہ کھڑا کر دیں۔ میں اس کی بدحواسی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

”اب تو باہر جا اور موقع دیکھ کر میری کے کانوں میں یہ بات ڈال دے کہ میں اندر بیٹھا شراب پی رہا ہوں۔“

”سرکار، اگر انہیں معلوم ہو گیا کہ شراب میں نے آپ کو نکال کر دی تو میری شامت آج جائے گی۔“

”یہی تو میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ کس کس کی شامت آتی ہے، جا۔۔۔ جا کر بتا دے۔“

وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔ بتا بھی دیا کہ میں شراب پی رہا ہوں۔ میں انتظار کرتا رہا کہ اب وہ وندنا ہوئی اندر داخل ہوں گی لیکن وہ نہیں آئیں۔ میرا شک گہرا ہو گیا تھا۔

میں وہیں صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ پھر مجھے اپنی سادہ نہیں رہی۔

میں رات بھر اسی صوفے پر پڑا رہا۔ کسی نے آکر پوچھا کہ نہیں یا اگر کوئی آیا ہو تو اٹھنا مناسب نہ سمجھا ہو۔

مجھے خبر نہیں۔ میری آنکھ تو اب وقت کھلی جب گھر میں سب ناشتا کر چکے تھے۔ ڈیڑی آٹس چلے گئے تھے۔ میری اپنے دوستوں کے ساتھ فون پر مشغول تھیں۔ میں باہر آیا تو وہ فون رکھ کر میری طرف متوجہ ہوئیں۔

”ظفری ڈارلنگ! آج کیا بات ہے، بہت سوئے؟“

”جی ہاں، آج کچھ زیادہ ہی سویا۔“

”یہی ہوتا ہے۔ جوانی میں فینڈ کچھ زیادہ ہی آتی ہے۔“

”ممی، مجھے آپ سے سوری کرنی ہے۔“

”کس بات کی سوری بیٹا!“

”وہ کیا ہے ممی، کل آپ نہیں تھیں تو میں نے شراب کو ہاتھ لگالیا۔“

”تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ میں سمجھی نہ جانے کیا بات ہو گئی جو سوری کر رہے ہو؟“

”آپ کے نزدیک یہ کوئی بات ہی نہیں۔“

”یہ تم کیسی دقیقہ فوس۔۔۔ باتیں کر رہے ہو۔ مجھے تو خوش ہے کہ تم ہماری سوسائٹی میں ایڈجسٹ کرنے کے لائق ہو گئے۔“

مجھے تو فکر ہونے لگی تھی کہ تم سگریٹ تک نہیں پیتے۔“ انہوں نے کہا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ ”میں ذرا باہر جا رہی ہوں، اپنا خیال رکھنا۔“

میں انہیں جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا، ممی پھر شراب پینے پر ذرا بھی اعتراض نہیں ہوا بلکہ ایک طرح سے خوشی ہوئی کہ میں ان کی سوسائٹی میں ایڈجسٹ کرنے کے لائق ہو گیا۔ ان کے جاتے ہی میں پھر خود سے اقامت لینے لگا۔

شراب اور شراب کا ساتھ چوڑی دامن کا ہے۔ میری جینز جرابی نے اثر دکھانا شروع کیا۔ وہ لڑکیاں جن سے میری دوستی تھی، میرے ایک اشارے پر میرے بستر کی بستر بننے کو تیار ہو گئیں۔ یہ آزادی پرست مغربی تہذیب کی دلدادہ دختر تھیں کہ انہوں نے میرے ساتھ کچھ وقت گزارا ہے۔ ان لڑکیوں میں سے بہت سی ایسی تھیں جو میرے علاوہ بھی بوائے فرینڈز رکھتی تھیں۔ بعض خود بتاتی تھیں، بعض کے بارے میں دوسری لڑکیوں نے بتایا تھا۔

میرے دل میں یہ خیال راسخ ہوتا جا رہا تھا کہ ہر لڑکی بے وفا ہوتی ہے۔ ایک سے زیادہ بوائے فرینڈز رکھتی ہے۔ چاہے وہ بتائے چاہے نہ بتائے۔ کوئی بھی ایسی نہیں جس سے شادی کی جا سکے۔ یہ بچوں بستر کے لیے ہوتے ہیں گھر کے لیے نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ جب ناشتے کی میز پر میری شادی کا ذکر چھڑا تو مجھے انکائی آگئی۔ مجھے وہ لڑکیاں یاد آئیں جو میری دوست رہ چکی تھیں۔ چوڑی میری دوست نہیں رہی کسی اور کی دوست رہ چکی ہوگی۔ ایسی کوئی لڑکی ہو ہی نہیں سکتی جسے بیوی بنایا جائے۔

ممی اور ڈیڈی یہ سمجھتے رہے کہ میں اسی طرح شادی سے بھاگ رہا ہوں جس طرح بہت سے نوجوان فٹے

اردی سے بچنے کے لیے بھاگتے ہیں۔ ممی پیچھے پڑی رہیں لیکن میں انکار کرتا رہا آخر ایک دن بالکل واضح طور پر کہہ دیا کہ میں شادی کرنا نہیں چاہتا۔ آئندہ اس موضوع پر بات نہ کی جائے۔

یہ اعلان میں نے جلد بازی میں نہیں کیا تھا۔ پوری ایک رات سوچنے کے بعد کیا تھا۔ اب میری سوچوں میں لڑکیاں ہی نہیں تھیں بلکہ ان کی مائیں بھی تھیں۔ میں نے ان لڑکیوں کی مائوں کو دیکھا تھا جو اپنی بیٹیوں کی حوصلہ افزائی کیا کرتی تھیں۔ میں اگر کسی دوست لڑکی کو آدھی رات کے وقت ان کے گھر چھوڑنے جاتا تھا تو میرا والد اہلناہ انتہا کیا

پوچھتا تھا۔ ممی کسی نے یہ نہیں پوچھا کہ اتنی رات گئے تم

ان لڑکیاں سے آ رہے ہو؟ میں نے بڑے دکھ کے ساتھ

یہ بات کہی کہ کسی ایسی ہی لڑکی سے میرا رشتہ کریں گی۔ اس

سے بہتر ہے شادی کی ہی نہ جائے۔ یہی سوچ کر میں نے شادی نہ کرنے کا اعلان کر دیا تھا۔

ممی بھی کچھ دنوں کے لیے خاموش ہو گئی تھیں۔ ہلکے ہلکے انداز میں ممی بھی سمجھانے کی کوشش کرتی تھیں لیکن پھر بات آنی لگی ہو جاتی تھی۔ وہ بھی شاید اسی امید میں تھیں کہ جب لڑکیوں سے میرا دل بھر جائے گا تو میں شادی پر تیار ہو جاؤں گا۔

میں نشے میں ایسا ڈوبا تھا کہ شراب ہر وقت کی ساتھی بن گئی تھی۔ شراب اسی وقت تک اچھی لگتی ہے جب تک اس سے غیریت کا حلق رکھا جائے۔ اسے ساتھ بنالیا جائے تو وہ کسی کا ساتھ نہیں دیتی یا پھر یوں کہا جائے کہ اپنے سوا کسی کے ساتھ نہیں رہنے دیتی۔ میں نے بھی ہر طرف سے منموڑ کر شراب کو اپنا لیا۔ جب میں دن رات شراب میں ڈوبا رہنے لگا تو میری کوشش میں خطرے کے الارم بجنے لگے۔

جب بھنور سامنے ہو تو ماہر تیراک بھی اُلٹے سیدھے ہاتھ پاؤں مارنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہی حال میرے گھر والوں کا ہوا۔ ہر لوگ شراب کو محفلوں تک محدود رکھے ہوئے

تھے۔ میری جوانی نے دن اور رات کی تیز نہادی کو فکر لاحق ہوئی۔ گھر سے شراب کی بوتلیں ہٹا دی گئیں۔ طرح طرح کے لوگ سمجھانے کے لیے آئے لگے۔ سب کے مشورے یہی تھے کہ شراب پو لینے طریقے سے۔ مجھ پر کسی کی باتوں کا کیا اثر ہونے والا تھا۔ میں نے صرف اتنا کیا کہ اپنے گرو

گھیرا تک ہوتا ہوا دیکھ کر اپنا شراب خانہ باہر کھول لیا۔ میرا ایک دوست تھا جس کے گھر میں بار روٹھا تھا۔ میں وہاں جا کر پینے لگا۔

اسی بیچ پر چلتے ہوئے کئی سال ہو گئے۔ میرے باپ کو میری حرکات کا دکھ اتنا تھا کہ دل کا مرض لگا بیٹھے، ایک روز ہارٹ ایکٹ ہوا اور ان کا انتقال ہو گیا۔

میری حالت دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ اب ان کے وسیع کاروبار کو سنبھالنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ چاہے تمہیں میں فرق ہو لیکن آنسو غریب اور امیر سب کے ایک طرح کے ہوتے ہیں۔ خاندان کے لوگ جمع ہوئے اور کوئی آہوں اور سسکیوں سے بھر گئی۔

یہ طوفان تھا تو مجھے ہوش آیا۔ میرے سوا ڈیڈی کا کاروبار سنبھالنے والا کوئی نہ تھا۔ مجھے آگے بڑھنا پڑا اور میں ایک ہی رات میں ظفر سے یہ ظفر بن گیا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کی امید خود مجھے بھی نہیں

تھی۔ میری زندگی میں ایک ناقابل بیان ٹھہراؤ آ گیا۔ صبح دفتر چلا جاتا، شام کو واپس آتا۔ کچھ دیر آرام کرتا اور پھر کسی دوست کو بلا لیتا۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر شراب پیتا اور رات کو جلدی سو جاتا۔ سڑے نائٹ کو البتہ رات گئے تک ہلاکلا رہتا۔ طرح طرح کے دوست ہوتے اور شراب کے دور چلتے۔ ایسی محفلوں پر می کو بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ می کو میری بھتیجی ہوئی حالت کا احساس ہوا تو ایک مرتبہ پھر انہیں میری شادی کی فکر ہوئی۔ اب وہ اتنی ٹوٹ چکی تھیں کہ مجھے بھی انکار کرنا اچھا نہیں لگا۔

”آپ کس سے میری شادی کرانا چاہتی ہیں؟“

”جس سے تم کہو۔“

”میری کوئی پسند نہیں۔“

”پھر تم مجھ پر چھوڑ دو۔“

”یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ نے کسی خاندان کے بارے میں سوچ رکھا ہے تو مجھے نام بتائیے۔“

”سیٹھ ابراہیم کی بیٹی بھی رہے گی؟“

”آپ کو تو معلوم ہے وہ میری دوست رہ چکی ہے۔“

”تو کیا ہوا۔ شادی سے پہلے سب ہی دوست ہوتے ہیں۔“

”جب وہ میری دوست رہ چکی ہے تو کوئی اور بھی اس کا دوست رہا ہوگا۔“

”کیسی دیکھا تو کسی باتیں کرنے لگے ہو۔ کیا لڑکیوں کے بوائے فریڈ نہیں ہوتے؟“

”آپ اسے میری بیوی بنا رہی ہیں یا جنہر میں بوائے فریڈ کی فہرست طلب کر رہی ہیں۔“

جب انہوں نے دیکھا کہ میرے تیور بدل رہے ہیں تو انہوں نے گھبرا کر ایک اور لڑکی کا نام میرے سامنے رکھ دیا۔ اس کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ لڑکیوں کے نام لیے۔ کوئی میری دوست رہ چکی تھی، کوئی کسی اور کی دوست تھی۔ جس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا اس کے لیے میں نے تصور کر لیا کہ اس کا بھی کوئی نہ کوئی بوائے فریڈ ہوگا۔

دراصل میں نے اپنے ارد گرد جو ماحول دیکھا تھا، جو تجربات مجھے ہوئے تھے، اس نے میرے ذہن میں یہ خیال رائج کر دیا تھا کہ ہر لڑکی بے وفا ہوتی ہے۔ ہر لڑکی کو میں اپنے آئینے میں دیکھنے لگا تھا۔ میں سوچتا تھا، اس دنیا میں کیا میں اکیلا مرد ہوں جو لڑکی میری بیوی بن کر آئے گی، یہ کیا

حافظت ہے کہ اسے کوئی مرد نہ ملا ہو۔ کوئی کسی کو مانتا ہے۔ چلو کیا اس میری دوست رہ چکی ہیں۔ کیا ان کے شوہروں کو کبھی معلوم ہو سکے گا کہ میرے ان سے کیا مراسم رہ چکے ہیں۔ میں ایسا دھوکا کیوں کھاؤں۔

میں جانتا ہوں میری یہ سوچ درست نہیں تھی لیکن اس وقت مجھے یہ احساس ہی نہیں تھا کہ میرے اندر کیسی ٹوٹ پھوٹ ہو چکی ہے۔ میں شک کی تیاری میں مبتلا ہوں۔ اس بیماری کا علاج تباہی کے سوا کچھ نہیں۔

میں نے صبح اٹھتے ہی ایک مرتبہ پھر می سے کہہ دیا کہ وہ میری شادی کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیں۔ وہ مایوس تو ہوئی ہوں گی لیکن کیا کر سکتی تھیں۔

والد صاحب کا خوف درمیان سے ہٹ گیا تھا۔ میں شراب کی محفلیں گھر پر سجانے لگا۔ ایسی ہی ایک محفل میں میری ملاقات اختر نامی ایک شخص سے ہوئی۔ اختر ایک دوست کی معرفت سے اس محفل میں آیا تھا۔ یہ شخص میری دنیا سے مختلف نظر آ رہا تھا۔ اس کے نقوش نہایت عجیب تھے۔ لمبے لمبے بال تھے جو اس کے کانوں پر جمول رہے تھے۔ اس کے جسم پر قیمتی لباس بھی نہیں تھا۔ اپنے حلیے سے کوئی خطمی شاعر نظر آ رہا تھا۔ میں اس سے مل کر قلبی خوشی نہیں ہوا تھا لیکن جب ترنگ میں آ کر اس نے بولنا شروع کیا تو پوری محفل جو حیرت تھی۔ ایسی اعلیٰ درجے کی انگریزی بول رہا تھا کہ انگریز بھی رشک کریں۔ اردو بولنے پر آیا تو کھنواور دہلی کو مات کر کے رکھ دیا۔ محفل میں شراب کی اقسام کا ذکر آیا تو اس نے وہ وہ اقسام گواڈا لیں کہ جن کے نام بھی ہم میں سے کسی نے نہیں سنے تھے۔

اس کا بے پناہ مطالعہ دیکھ کر مجھے اس کے بارے میں جاننے کی فکر ہوئی۔ وہ کون ہے، کہاں رہتا ہے، کیا کرتا ہے؟ یہ سب باتیں کسی کے تعارف کے لیے بہت ہوتی ہیں۔

میں نے اس دوست سے اس کے بارے میں پوچھا جو اسے اپنے ساتھ لایا تھا۔ مجھے تعجب ہوا کہ وہ بھی اس کے بارے میں اتنا ہی لاعلم ہے جتنا میں۔

”بھائی، یہی تو وہ متاع ہے جسے جاننے کے لیے میں اسے اپنے ساتھ لیے پھر رہا ہوں۔ اس کے بارے میں کوئی بھی کچھ نہیں جانتا۔ وہ اپنے بارے میں کچھ بتاتا بھی نہیں ہے۔“

”کی کو اس کا ذکر ایسا آئی ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”بس تو یہ جانتے ہیں کہ علم کا ایک سمندر ہے۔ دنیا کے ہر مسئلے پر تفصیل سے بحث کرتا ہے اور خوب کرتا ہے۔“

”بھائی، یہی تو وہ متاع ہے جسے جاننے کے لیے میں اسے اپنے ساتھ لیے پھر رہا ہوں۔ اس کے بارے میں کوئی بھی کچھ نہیں جانتا۔ وہ اپنے بارے میں کچھ بتاتا بھی نہیں ہے۔“

”کی کو اس کا ذکر ایسا آئی ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”بس تو یہ جانتے ہیں کہ علم کا ایک سمندر ہے۔ دنیا کے ہر مسئلے پر تفصیل سے بحث کرتا ہے اور خوب کرتا ہے۔“

میں پوچھ بھی تو نہیں کر رہا تھا، آہ کھاؤ پھینکیں گئے ہو۔ کسی ایک جگہ کھانا کھا بھی نہیں ہے۔ چند روز کی دوست کے گھر چند روز کی دوست کے گھر۔ کبھی ایسا غائب ہو جاتا ہے کہ مہینوں ڈھونڈو تو نظر نہیں آتا۔ بڑا دلچسپ کردار ہے۔ مجھے اس کی ذات میں اتنی دلچسپی ہوئی کہ اسے دوسرے روز پھر آنے کی دعوت دے دی۔ میرے دوست نے کہا بھی کہ اسے منہ مت لگاؤ، چپک ہی تو جائے گا۔ مجھے پکنا ہی تو تھا۔

دوسرے دن وہ میرے گھر چلا آیا۔ اب شاید اس نے گھر دیکھ لیا تھا کہ اکیلا ہی چلا آیا تھا۔

”اب میں دس چندہ دن یہیں گزاروں گا تمہارے ساتھ۔“ اس نے کہا۔ گویا وہ واقعی چپک گیا تھا۔

”یہ میری خوش قسمتی ہوگی لیکن ایک شرط پر رہنا ہوگا۔ تم دن میں شراب نہیں پیو گے۔ رات میں پیو گے اور وہ بھی میرے ساتھ۔“

”دن میں تو میں پیتا ہی نہیں۔ دن کے وقت کتابیں پڑھتا ہوں۔“

”کتابیں تو میرے گھر میں ہیں ہی نہیں۔“

”وہ میں اپنے ساتھ لایا ہوں، یہ دیکھو۔“ اس نے کندھے پر لٹکے ہوئے بیک کی زپ کھولی اور چار کتابیں اس میں سے نکل آئیں۔

میں مطمئن ہو گیا۔ اتنی بڑی کوشش میں اس کے لیے ایک کرا کاٹنا کون سا مشکل تھا۔ میں نے ایک نوکر سے بھی کہہ دیا کہ وہ مہمان کے کمرے کے قریب رہے اور اس کی ضرورتوں کا خیال رکھے۔ یہ ہدایات دینے کے بعد میں اس کے ساتھ پینے کے لیے بیٹھ گیا۔ ایک مرتبہ پھر میں نے اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کی کہ شاید نشے کی حالت میں وہ سچ کچھ دے لیکن وہ بڑا ہی لکا لکا۔ اپنی ذات کے بارے میں اس نے کچھ بھی نہیں بتایا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کے ساتھ بیٹھ کر شراب پینے کا لطف آ گیا۔ انسانی نفسیات کے بارے میں بات ہوئی تو یہ معلوم ہوتا تھا جیسے نفسیات کا کوئی پروفیسر مجھ سے مخاطب ہے۔ تاریخ کا ذکر نکل آیا تو ایسے ایسے حوالے دے ڈالے کہ اس کے حافظے پر مجھے رشک آنے لگا۔

”یار تم کہیں پروفیسر کیوں نہیں ہو جاتے۔“

”اس لیے کہ میرے پاس ڈگری نہیں ہے۔ جو کچھ میں بول رہا ہوں وہ تو آپ جیسے لوگوں کے پاس بیٹھ کر سیکھا

”یار تم کہیں پروفیسر کیوں نہیں ہو جاتے۔“

”اس لیے کہ میرے پاس ڈگری نہیں ہے۔ جو کچھ میں بول رہا ہوں وہ تو آپ جیسے لوگوں کے پاس بیٹھ کر سیکھا

ہے۔“

یہ پہلی بات تھی جو اس نے اپنے بارے میں بتائی تھی۔ ہم دونوں جب بہت پی چکے، بہت بول چکے تو اسے میں اس کے کمرے میں چھوڑ آیا اور خود اپنے کمرے میں چلا گیا۔

دوسرے دن میں دفتر چلا گیا۔ ملازم کو ہدایت کر گیا کہ وہ اس کا خیال رکھیں۔ اسے کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے۔

شام کو جب میں گھر آیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ می کے ساتھ بیٹھا باتیں کر رہا ہے۔ وہ باتوں کی شخص تھا۔ ایک ہی دن میں اس نے می کو شیشے میں اتار لیا تھا۔ یہ وقت می کے کلب جانے کا ہوتا تھا لیکن غالباً وہ اس کی باتوں میں مشغول ہو کر کلب بھی نہیں گئی تھی۔

”می، آج آپ کلب نہیں گئیں؟“

”میرا کلب تو آج یہیں ہو گیا۔ تمہارے یہ دوست ایسی دلچسپ گفتگو کرتے ہیں کہ بس۔“

”کیوں صاحب، می پر بھی جاو کر دیا؟“ میں نے اختر سے کہا۔

”بھائی اپنا تو ایسا ہی ہے۔ نوکری کرتے ہیں تو کھانے کو ملتا ہے۔“

”چلو، اب می کی جان چھوڑو۔ ہماری نوکری کرو۔“

”ہاں بھائی، کھانے کے بعد پینا بھی تو پڑتا ہے۔“

میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور لے کر کمرے میں آ گیا۔ اس دن کے بعد سے می اس کے گیت گارہی تھیں۔ اس کی انگریزی دانی سے تو بہت ہی متاثر تھیں لیکن میری طرح وہ بھی یہ جاننے کے لیے بے تاب تھیں کہ وہ کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ ظاہر ہے اپنے بارے میں اس نے انہیں بھی کچھ نہیں بتایا ہوگا می کا اپنا خیال تھا کہ وہ کسی دولت مند گھرانے کا فرد ہے جو کسی بات پر غائب نہیں ہو کر گھر سے نکل آیا ہے۔ دراصل می کی برابلم یہ تھی کہ وہ جس کو اچھی انگریزی بولتے ہوئے دیکھتی تھیں، اس کا تعلق کسی دولت مند گھرانے سے جوڑ دیتی تھیں۔ انہیں یہ کہنا گوارا نہیں تھا فلاں کسی شریف گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ شرافت سے مراد ان کے نزدیک دولت مند گھرانہ ہوتا تھا۔

ابھی ایک ہفتہ گزرا تھا کہ اختر نے غالباً می کے کہنے پر مجھ سے میری شادی کی بات چھیڑ دی۔

”یار ظفر، تم شادی کیوں نہیں کر لیتے؟“

”یار ظفر، تم شادی کیوں نہیں کر لیتے؟“

”یار ظفر، تم شادی کیوں نہیں کر لیتے؟“

”تمہیں بیٹھے بیٹھے میری شادی کی کیا سوچ رہی ہے؟“
”جہاں شاید معلوم نہیں۔ میں اور علوم کی طرح ستاروں کا علم بھی رکھتا ہوں۔ میں نے آج تمہارا زانچہ بنایا تھا۔ اس زانچے سے معلوم ہوا تم اگر شادی کرلو تو بہت تری کرو گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے ملک کے صدر یا وزیر اعظم بن جاؤ۔“

”ابے یہ بھی کوئی عہدے ہیں۔ چار دن کی چاندنی اور پھر اندھیری رات۔“

”چار دن کی چاندنی میں عمر بھر کی چاندی ہو جاتی ہے۔“

”چلو، میں مان بھی لوں تو مجھ شرابی سے شادی کرے گا کون؟“

”شرابی تو غریب لوگ ہوتے ہیں۔ آپ تو اعلیٰ سوسائٹی کے نمائندہ ہیں۔ اگر تم اسے بُرا سمجھتے ہو تو چھوڑ دو لیکن شادی کرنا تمہارے لیے بہت ضروری ہے۔“

”آخر، اگر تم سنجیدہ ہو ہی گئے ہو تو یہ بتاؤ تم لڑکیوں کے بارے میں جاننے کتنا ہو؟“

”یہ پوچھو میں انسانوں کے بارے میں کتنا جانتا ہوں۔ لڑکیاں بھی تو انسان ہی ہوتی ہیں۔ جس طرح سب انسان اچھے نہیں ہوتے اسی طرح سب لڑکیاں بھی اچھی نہیں ہوتیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ لڑکیوں میں بُرائی کا تناسب مردوں کی نسبت کم ہوتا ہے۔“

”تم کتابی باتیں کر رہے ہو۔ میں اپنے تجربے سے کہتا ہوں لڑکیاں جلد بہک جاتی ہیں۔ ان کی فطرت میں چاہے جانے کا جذبہ ہے۔ وہ ہمیشہ شائق رہتی ہیں کہ زیادہ سے زیادہ چاہنے والے ہوں۔“

”تم اپنے تجربے کی خود تردید کر رہے ہو۔ اگر ایک عورت چار چاہنے والے رکھتی ہے تو ایک عورت خراب ہوتی، چار مرد خراب ہوئے۔ ایک اور چار کا تناسب کُل آیا۔“

”میں کی یا زیادتی کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ جو بچی مجھے ملے گی کچھ سے پہلے اس کے چار چاہنے والے نہیں رہ چکے ہوں گے۔ کیا مردوں کے اس معاشرے میں اسے کوئی مرد نہیں ملا ہوگا؟“

”تمہارا مسئلہ یہ ہے ظفر کی کہ جو لڑکیاں تمہیں ملیں تم نے ساری دنیا کی لڑکیوں کو دیکھا ہی کبھی۔ یہ تمہاری سوچ کی خرابی ہے، لڑکیوں میں کوئی خرابی نہیں۔ تم نے یہ سمجھ لیا

ہے کہ آرم کے بچہ میں بھی امرود آئیں گے۔ تم یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ جس تہذیب کی پروردہ لڑکیاں تمہارے تجربے میں آئی ہیں، اس سے مختلف تہذیب کی لڑکیاں ویسی نہیں ہوں گی۔ تم اپنی تہذیب سے مختلف کسی تہذیب میں شادی کرلو۔ جن لوگوں کو آپ لوگ دیکھ رہے ہیں وہ تو نئی تہذیب کے لوگ ہیں۔ وہاں شادی کرلو، وہاں بوائے فرینڈز کی وہ نہیں ملے گی۔“

”وہ لڑکی ہمارے ماحول میں رہے گی کیسے؟“

”اگر آپ اس سے وہ کچھ نہیں چاہیں گے جس سے آپ بھاگ رہے ہیں تو ضرور ایڈجسٹ کر لے گی۔ بس یہ خیال رہے کہ وہ پڑھ لکھی ہو۔“

آخر سے میری یہ بحث کوئی ایک دو دن نہیں ہوئی تھی، کئی دن تک وہ مجھے قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ پھر ایک دن میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہہ دیا۔

”میں یا کسی غریب گھرانے کو جانتے تک نہیں پھر کس طرح لڑکی ڈھونڈی جائے گی۔“

میرا خیال تھا کہ میری طرح وہ بھی یہی کہے گا کہ جان پہچان تو اس کی بھی نہیں ہے۔

”یہ مشکل میں مل کیے دیتا ہوں۔ ایک متوسط درجے کے گھرانے کو میں جانتا ہوں۔ مجھ سے پتا لو اور اپنی کوئی لے کر چلے جاؤ لڑکی دیکھ لو، اگر پسند آجائے تو رشہ ڈال دینا۔ یہ تو مجھے نہیں معلوم کہ لڑکی کیسی ہے لیکن ان لوگوں کی شرافت کی گواہی میں دیتا ہوں۔“

”پتے کی کیا ضرورت ہے۔ تم بھی تو ساتھ چلو گے، آخر دوست ہو میرے۔ تم چلو گے تو ہماری سفارش بھی ہو جائے گی۔“

”میں تمہارے ساتھ نہیں چل سکتا بلکہ میرا نام بھی نہ لینا۔ بننا ہوا کام بگڑ جائے گا۔“

”کمال ہے! تم انہیں جانتے بھی ہو اور وہاں جانے سے گریز بھی کر رہے ہو۔“

”بس یار، ایسا ہی ہے۔ وہ لوگ مجھے کسی وجہ سے اچھا نہیں سمجھتے۔ وہ مجھے اچھا نہ سمجھیں لیکن میں تو ان کا بھلائی چاہوں گا۔ اچھا ہے ان کی بیٹی کا رشہ ہو جائے۔“

مجھے پہلی مرتبہ اس کا کردار مشکوک لگا تھا لیکن اس وقت اس پر غور کرنے کا وقت نہیں تھا۔ مجھے تو اس وقت می کی فکر لگ گئی تھی۔ وہ غریب کے نام سے چڑتی تھیں اور یہاں غریب گھرانے کی بھولانے کا مسئلہ درپیش تھا۔ ایک لحاظ سے میں خوش بھی ہو رہا تھا کہ انکار ہوگا تو می کی جانب

بڑھوگا۔ اختر کی نظروں میں، میں تو سرخرو ہو جاؤں گا۔ میں نے ہمت کر کے کئی سے بات کی اور وہی ہوا جس کے لئے وقتاً نہیں یہ گھبراہٹ میں دولت مند گھرانے کی لڑکیوں کو چھوڑ کر کسی غریب گھر میں شادی کے لیے تیار ہو گیا۔ وہ مجھے طعنہ دے رہی تھی کہ بڑس میں گھانے کا سودا میں کرتا۔ وہ تو دولت مند گھر میں، اپنے سے بڑے گھرانے میں شادی کرتا ہے تاکہ کاروبار میں اور وسعت اس میں می کا تصور نہیں تھا۔ ہماری کمپنی میں سب اسی طرح سوچتے تھے۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ بھی تیار نہ ہوتیں تھیں وہ دیکھ رہی تھیں کہ میں بڑی مشکل سے تو تیار ہوا ہوں۔ وہ بھی تیار ہو گئیں۔ میں نے اختر سے ایڈریس لیا اور اس ایڈریس پر پہنچ گیا۔

کسی سے پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی کیونکہ یہاں کے اکثر گھروں پر نمبر پلٹ لگی ہوئی تھی۔ میں نے گاڑی ایک جگہ پارک کی اور نمبر پڑھتا ہوا اس مکان تک پہنچ گیا جہاں کا ایڈریس اختر نے مجھے دیا تھا۔

دروازے پر کال بل موجود تھی۔ اس کے جواب میں ایک صاحب باہر آئے۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہی وہ صاحب ہیں لیکن پھر بھی پوچھنا ضروری تھا۔

”ہیں سید انور علی سے ملنا تھا۔“

”جی فرمائیے، میں ہی انور علی ہوں۔“

”بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔“ میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ”کیا ہم اندر آ سکتے ہیں تاکہ بیٹھ کر باتیں کر سکیں۔“

”مرد، ضرور..... تشریف لائے۔“

انہوں نے مجھے اور می کو لے جا کر ایک کمرے میں لے جانا جو بقیہ تان کا ڈرائنگ روم تھا۔ کمرہ نہایت صاف تھا۔ ایک طرف صوفیٹ پڑا تھا دوسری جانب تخت تھا۔ اس کے دونوں طرف دو کرسیاں پڑی تھیں۔

”معاف کیجئے گا، میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔“ انور صاحب نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”آج پہلی مرتبہ تو ہم مل رہے ہیں۔ اب مل گئے ہیں اب ان پہچان بھی ہو جائے گی۔“

”زحمت کا سبب پوچھ سکتا ہوں؟“

”یہ میں نہیں، میری والدہ بتائیں گی۔ ایسی باتیں ان کے منہ سے اچھی لگتی ہیں۔ میری موجودگی مجبوری ہے بلکہ والدہ کو لانے والا کوئی اور تھا نہیں۔ مجھے اعید ہے

اسے آپ میری گستاخی تصور نہیں کریں گے۔“

”صاحب زادے، آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ ٹھہریے، میں اپنی زبیر کو بھی یہی بلواؤں۔ عورتیں عورتوں سے بات کریں تو اچھا لگتا ہے۔“

وہ گئے اور اپنی بیوی کو بلا کر لے آئے۔

”بہن، میں ذرا بچن میں مصروف تھی۔ آپ کو زحمت کیسے، اتنی دیر ہم بھائی صاحب سے باتیں کرتے رہے۔“

”یہ بولتے کہاں ہیں۔ آپ ہی کو بولنا پڑا ہوگا۔“

”بہن، پہلے میں اپنے بارے میں کچھ بتا دوں۔ اس کے بعد باتیں ہوں گی۔ یہ میرا بیٹا ہے ظفر، مظفر انڈسٹریز کا نام آپ نے سنا ہوگا اور بھی کئی کاروبار ہیں۔ میرے شوہر کے انتقال کے بعد اب یہی تمام کاروبار کا مالک ہے۔ آپ کے دروازے پر میں اس لیے آئی ہوں کہ اب مجھے ظفر کی شادی کی فکر ہے۔“

”یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔“

”بہن، اب تو آنا جانا لگا رہا ہے گا۔ کیا اپنا گھر نہیں دکھاؤ گی؟“

”ہمارا گھر ہے ہی کتنا بڑا۔ دو کمروں کا مکان آپ کے لائق نہیں۔ پھر بھی آئیے میں آپ کو گھر دکھاؤں۔“

”مئی اٹھ کر ان کے ساتھ چلی گئیں۔ گھر دیکھنے کا تو بہانہ تھا دراصل می یہ چاہتی تھیں کہ اندر جا کر لڑکی کو بھی دیکھ لیں۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں اندر آئیں تو می کے چہرے پر اطمینان تھا۔“

انہوں نے بیٹھے ہی کہا ”بہن، مجھے آپ کی بیٹی عدیلہ بہت پسند آتی ہے۔ اب میں یہ چاہوں گی کہ آج کی یہ ملاقات رشہ داری میں تبدیل ہو جائے۔“

انور علی نے نہایت معقول بات کی ”وہ تو ٹھیک ہے، جہاں میری بیوی ہے وہاں چتر آتے ہی ہیں لیکن آپ نے جو اپنا تعارف کر لیا ہے اس کے بعد میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ آپ کا ہمارا کوئی جوڑ نہیں۔ رشہ برابر انوں میں ہی اچھا لگتا ہے۔ ہم آپ کا ساتھ کتنی دیر دے سکیں گے؟“

”بھائی صاحب، یہ نہ کہیے۔ انسان، انسان سب برابر ہوتے ہیں۔“

”یہ آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے جو یہ کہہ رہی ہیں ورنہ ایسا



ستمبر 2012ء..... عید سعید
کی یادوں کے سنگ

قرض مسافت

طوائف کے ہزاروں روپے... کبھی دھوپ میں
چھاؤں اور کبھی سرد موسم میں انتقام کی آگ۔
آخری صفحات پر **عائشہ فاطمہ** کا نئی خیر شاہکار
مع نام

ایک برہمن راجا کی سندھ کی زمین پر بادشاہت
کا منفرد انداز..... راجا دابہر کا تاریخی کردار.....
ڈاکٹر ساجد امجد کی کاوش

JERAS

انوار صدیقی کے قلم سے معاشرے کے منفی کرداروں اور ہمزائے درمیان لیکنے کی جنگ کا احوال

مسافر

زندگی کی رعنائیوں..... دل کی تہائیوں
اور جگ کی رسوائیوں کا مجموعہ.....
ناصر ملک کے قلم کی روانی

جدائی

ہر عزیز قلم کار طاہر جاوید مغل
کی محبتوں کا ایک منفرد انداز

مرزا امجد بیگ کی جرح محفل شہر بخون، آپ کے خط

کاشفِ ذہیب، مریم کے خان،
زاہد نقوی، نظارتِ نصر، سلیم
انور، تنویر ریاض کی سحر انگیز تحاریر

وہ بتانا نہیں چاہتا تھا تو میں کیوں زور دیتا؟
 مددی کے بعد میں نے پہلی مرتبہ عدیلہ کو دیکھا تو میرا
 دل ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ حسن صرف دولت مند
 لوگوں میں ہوتا ہے لیکن عدیلہ کو دیکھ کر یہ خیال ہی باطل
 اس کے چہرے پر حسن کی کتنی بھی محبت اور پاکیزگی
 اب بھی۔ میرا سیریز فخر سے بلند ہو گیا۔ اب میں اپنے ہم
 سے کہہ سکتا تھا، عدیلہ کے پاس دولت نہ بھی حسن کی
 تھی۔

حسن کو ظاہری چیز ہے جس کا اندازہ مجھے دیکھتے ہی
 تھا لیکن سیرت میں وہی وہ بے مثال ثابت ہوئی۔ اس
 کی خدمت گزار سی میرا ہی نہیں مگر کادل بھی جیت
 س نے می اور ڈیڑی کا تعلق بھی دیکھا تھا۔ مگر کچھ
 ہی نہیں تھا کہ ڈیڑی کی ضروریات کیا ہیں اور انہیں
 کچھ پورا کرنا ہے۔ ہمارے گھروں میں ہوتا ہی ہے
 رے کام کو رگوں پر چھو دے جاتے ہیں لیکن عدیلہ
 ہمارے کام خود ہی کرتی تھی۔

میں کی خدمت گزاری ہی کا نتیجہ تھا کہ میں نے ہر وقت کبھی شراب کو کبھی چھوڑ دیا۔ بس یہ خیال آتا تھا کہ جو میری اتنی خدمت کر رہی ہے اس سے ایک لمحے کو بھی نہیں رہنا چاہیے۔

میں نے اس طرح گزر رکھے کہ پتا ہی نہیں چلا۔ عدیلہ بڑی ثابت ہوئی تھی۔ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ شریک گھر سے آئی ہے۔ میرے دوستوں سے ملتی تھی لیکن ایک خاص حد میں رہتے ہوئے۔ پرنس ہوئی تھیں، ان میں بھی اس طرح شریک ہوئی کہ صفر نظر آتی۔

میں نے بے بہادری کو دیکھ کر اختر کے لیے میرے دل
کڑوا دیا۔ اس کے جذبات پیدا ہوتے تھے لیکن وہ کبھی
نہیں نکلتا۔ کبھی نہیں نکلتا۔ جہاں آخری بار ملاقات
ہوئی اس گھر کو بھی چھوڑ گیا تھا۔ میں نے بہت سے
کھوئے تھے لیکن اختر کی بات اودھنی۔

ایک دن میں اس دوست کے گھر پہنچا جس کی معرفت میری ملاقات ہوئی تھی کہ اس سے اختر کے بارے میں پوچھوں۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ اختر کو اس طرح ہو گیا ہے جس طرح گدھے کے سر سے سیٹنگ ہو گئے اس کا کوئی اتار پاتا نہیں۔ کسی دوست کے گھر پر نہیں لے سائی جلا گیا ہے۔

اب لڑکیوں کو خود چیت کرتے تھے۔ انہیں تنہائی دیتے تھے کہ وہ آپس میں خود بات چیت کر لیں۔ ایک یہ ماں باپ تھا کہ لڑکی کی جھلک تک نہیں دیکھنے دی۔

بڑوں کے درمیان بات ہو گئی تھی۔ اب جواب کا انتظار تھا۔

اختر سے بات ہوئی تو اس نے بھی کہا کہ انور صاحب بہت خوددار آدمی ہیں۔ اتنی آسانی سے نہیں مانگے کہ ان کا مان جائیں گے۔ اپنی بیٹی کا بھلا کون نہیں جانتا ہے؟ میں سمجھ رہا تھا انور علی بہت جلد رابطہ کریں گے۔ اسے اچھے رشتے کو کون ٹھکراتا ہے لیکن میری توقع کے برخلاف بہت دن لگ گئے۔ میں نے خوشامد در آمد کر کے می کو پھر بھیجا۔ معلوم ہوا وہ لوگ گھر دیکھنا چاہتے ہیں۔ اب مجھے بھی بھنسنے ہونے لگی تھی۔ گھر کا کیا دیکھنا، شادی کے بعد کیا لیتے۔ اب کچھ وقت اس میں گزر جائے گا لیکن کیا کرنا، نہیں دعوت دے دی۔

وہ گھر دیکھ کر چلے گئے، پھر غائب ہو گئے۔ میں نے پھر مئی کو بھیجا۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح وہ لوگ شادی پر تیار ہو گئے اور شادی کی تاریخ دے دی۔

میں اختر کو یہ خوش خبری سنانے کے لیے گھر پہنچا تو معلوم ہوا وہ سیلابی کتا میں اٹھا کر کہیں جا چکا ہے۔ وہ کہاں جا سکتا ہے، کسی دوست کے گھر گیا ہوگا۔ مجھے معلوم تھا، اس کے کون کون سے دوست ہیں۔ میں نے سب کے گھر کے چکر لگائے اور وہ ایک جگہ مل گیا۔

”یار، تم تو بتائے بغیر ہی چلے آئے۔“
”ایسا ہی ہوتا ہے۔ مسافروں کے ٹھکانے بدلے
تے ہیں۔“

”اب تمہاری ضرورت تھی تو تم یہاں چلے آئے۔“
 ”مجھے معلوم ہے کس وقت کہاں رہنا چاہیے۔ ابھی کوئی
 قادی بڑی تو ضرور آؤں گا تم سے مدد لینے۔“
 ”شادی ہو تو آؤ گے؟“

”اس شہر میں جوا تو ضرور آؤں گا۔ ایک میرے نہ آنے سے کیا فرق پڑے گا۔ بس اتنی گزارش ہے۔ انور علی کی بیٹی کو کبھی کوئی تکلیف مت دینا۔ انور علی بہت اچھے آدمی ہیں۔ انہیں بہت دکھ ہوگا۔“

”یار، اگر وہ اتنے اچھے آدمی ہیں تو تم نے ان سے ملنا جلنا کیوں بند کر دیا؟“

”ہوتا ہے، ایسا بھی ہوتا ہے۔“

ہے نہیں۔ دولت اور امارت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ آپ کو اپنے برابر والوں میں لڑکی دھوونڈنی چاہیے۔“

اب میری باری بھی کہ معاملے کو سنبھالوں ”انور صاحب! میں جس سوسائٹی سے تعلق رکھتا ہوں، وہاں بے جا آزادی ہے جبکہ میں اور میری ماسی آزادی کے خلاف ہیں۔ اسی لیے ہم آپ کے پاس آئے ہیں۔“

”بیٹا، بہت نیک خیالات ہیں تمہارے لیکن میری بیٹی تو وہاں جا کر انہی ہو جائے گی۔ وہ کیسے ایڈجسٹ کرے گی۔ پھر آپ ہی کو شکایت ہوگی۔“

”بھائی صاحب، جلدی نہیں ہے آپ اچھی طرح سوچ لیں۔ میں ایک بات چھوڑے جا رہی ہوں، قبولیت بخشنا آپ کا کام ہے۔“

”جی ہاں، کیوں نہیں۔ ہم ضرور غور کریں گے۔ ویسے ایک بات سمجھ میں نہیں آئی آپ کو ہمارا پتا کس نے دیا؟“

”ہیں ایک صاحب جو ایسے نیک کام کرتے رہتے ہیں۔“ میں جلدی سے بول پڑا کہ کہیں مئی بھانڈا ہی نہ پھوڑ دیں۔

”پھر میں آپ کے جواب کا انتظار کروں گی۔“ مہی نے کہا۔

”ضرور، ضرور۔“
میں دیکھ رہا تھا کہ ممی جس خوش دلی سے آئی تھیں، اس
خوشی سے اُٹھی نہیں تھیں۔ اس کا اظہار انہوں نے راستے میں
کر بھی دیا۔

”ظفری ڈارلنگ! تم نے دیکھ لیا ان غریبوں کے
دماغ کتنے خراب ہوتے ہیں۔ اتنے اچھے رشتے پر بھی
فرما رہے ہیں کہ غور کریں گے۔ یہ تو سراسر ہماری بے عزتی
ہے۔“

”مہی، ہم ان کے لیے بالکل اجنبی ہیں۔ ہمیں جاننے کے لیے انہیں کچھ وقت تو درکار ہوگا۔ وہ اگر وقت مانگ رہے ہوں تو ٹھیک مانگ رہے ہوں۔“

”اب مجھ سے دوبارہ آنے کو مت کہنا۔ بیٹی دینا ہو
 دے گا اور نہ منع کروں گا۔“

”خبر انہیں میں دے آئی ہوں۔“
 می تو خفا تھیں لیکن میں ان لوگوں سے بہت متاثر ہوا
 تھا۔ میں نے اب تک خطوط و خطیں دیکھی تھیں۔ شادی بیاہ
 کے معاملات میں تو اس کا خوب ہی مظاہرہ ہوتا تھا۔ ماں

انتا اچھا دوست کھودے پر مجھے افسوس تھا۔

میرا دوسرا خیال بھی غلط ثابت ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ میری دنیا میں کس طرح ایڈجسٹ کرے گی لیکن اس نے صرف چھ مہینے میں خود کو میرے ماحول میں ڈھال لیا تھا لیکن اعتماد کے ساتھ۔

میری شخصیت کا مثبت پہلو صرف چھ مہینے برقرار رہا۔ اس کے بعد میرے اندر چھپے ہوئے وہ خیالات سر اٹھانے لگے جو شادی سے پہلے میرے ذہن میں پنپتے ہو چکے تھے۔ میں سمجھ رہا تھا ماضی کے نقش مٹ چکے ہیں لیکن اچانک ایک دن مجھ پر دورہ سا پڑا۔ میرے دل میں یہ شک پیدا ہوا کہ عدیلہ اتنی خوبصورت ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے، کسی مرد نے اس کی طرف ہاتھ نہ بڑھایا ہو۔ شک کی چویناری میرے ذہن میں پختی رہی تھی اچانک حملہ آور ہو گئی تھی۔ وہ میرے سامنے بیٹھی تھی اور میں سوچ رہا تھا، ہو سکتا ہے یہ اب بھی چھپ چھپ کر اس آدمی سے ملتی ہو۔ اسی لیے تو بار بار میکے جانے کے لیے کہتی ہے۔ ٹیلی فون پر باتیں بھی کرتی ہے۔ ہو سکتا ہے شادی سے پہلے کا کوئی دوست ہو جس سے اب بھی عدیلہ کا رابطہ ہو۔ میں گھبرا کر اس کے سامنے سے ہٹ گیا۔ وہ دور ہوئی تو شک بھی دور ہو گیا۔ میں نے دل ہی دل میں توبہ کی کہ اس معصوم پر کیسے کیسے الزام لگا رہا ہوں۔ کچھ دیر کو آرام مل گیا لیکن جب وہ میرے سامنے آئی تو پھر یہی خیالات آنے لگے۔

اب یہی معمول بن گیا تھا۔ وہ نظروں سے دور ہوتی تو میرے خیالات قابو میں رہتے لیکن جیسے ہی وہ سامنے آتی تو پیاری مجھ پر حملہ آور ہو جاتی۔ میں سوچنے لگتا، یہ ممکن ہی نہیں کہ اتنی خوبصورت لڑکی کو کسی نے چاہا نہ ہو۔ کئی مرتبہ میں نے یہ بھی سوچا کہ اس سے پوچھ کر دیکھوں لیکن خود ہی اپنے ارادے کی ٹٹی بھی کر دی۔ میرے پوچھنے پر وہ کہتا دے گی؟ اُلٹا یہ ہوگا کہ مزید احتیاط برتتے لگے گی۔ میرے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوئی اور وہ کسی سے ملتی رہے گی۔

میں شک کی آگ میں اندر ہی اندر جل رہا تھا۔ اپنی زندگی کو میں نے خود ہی جہنم بنالیا تھا۔ اس جہنم سے نکلنے کی ترکیبیں سوچتا رہتا تھا۔ اس کا بس ایک ہی علاج تھا کہ جو کچھ میں سوچ رہا ہوں وہ آنکھوں سے دیکھ لوں۔ میں کسی جاسوس کی طرح اس کے پیچھے لگ گیا۔ وہ باہر نکلی تو میں بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا جاتا۔ وہ فون کرتی تو چھپ کر اس کی باتیں سنتا۔ ایک روز تو حد ہو گئی۔ وہ میکے گئی تو میں بھی

اچانک پہنچ گیا کہ دیکھوں اس کے گھر میں کون آیا ہوا ہے۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے اسے بھی عدیلہ کی چال کی قرار دیا۔ وہ اتنی سیدھی نہیں ہے۔ اسے کسی سے ملنا۔۔۔ ہوگا تو باہر جا کر ملتی ہوگی۔ میں ایسا عمل قیصر کر رہا تھا جس کی کوئی بنیاد ہی نہیں تھی۔ اکیلے میں اپنے آپ کو ملامت بھی کرتا تھا لیکن عدیلہ کو دیکھتے ہی بے بس ہو جاتا تھا۔

کہتے ہیں انسان جو دھونڈتا ہے اسے وہی ملتا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ میں ایک روز عدیلہ کو لینے کے لیے اس کے گھر گیا تو عدیلہ موجود نہیں تھی۔ میرے پاس وقت نہیں تھا۔ میں نے اس کی والدہ سے کہہ دیا کہ میں کچھ دیر بعد ڈرائیور کو بیچ دوں گا وہ اس کے ساتھ آ جائے۔ میں باہر نکل کر گاڑی میں بیٹھا۔ ابھی گلی کے موڑ تک آیا تھا کہ میں نے ایک ٹیکسی میں عدیلہ کو دیکھا۔ اس ٹیکسی میں ایک لڑکا اور سید اور علی بھی تھے۔ میرے شک نے فوراً سر اٹھایا۔ اس کا مطلب ہے انور علی بھی ملے ہوئے ہیں۔ یہ لڑکا کون تھا، عدیلہ جس کے ساتھ گئی تھی۔ بے کسی عیار، باپ کو ساتھ لے کر گئی تھی کہ کسی کو شک نہ ہو۔ میں ایسے کی باپ دیکھ چکا تھا جن کی موجودگی میں ان کی بیٹیاں اپنے بوائے فریڈز کے ساتھ سیر پھرتے کیا کرتی تھیں۔ میری آنکھوں میں خون اُڑا ہوا تھا۔ مجھے ضروری کام سے جانا تھا لیکن میں سیدھا گھر چلا گیا۔ شام تک عدیلہ بھی آگئی۔ اسے خبر بھی نہیں ہو گی کہ میں کس عذاب سے گزر رہا ہوں۔ وہ ہنسی ہوئی داخل ہوئی مگر میں نے اسے ٹرلا دیا۔ اسے دیکھتے ہی اس بے ہودگی سے اس لڑکے کے بارے میں پوچھا کہ وہ ہنچا ہوا رہ گئی۔

”چوری پکڑی گئی تو بولنا بھول گئیں۔ بتائیں کیوں نہیں کون تھا وہ؟“

”کیا بولوں، میں تو آپ کی ذہنیت پر افسوس کر رہی ہوں۔ ابو بھی تو میرے ساتھ تھے پھر وہ لڑکا میرے خاندان ہی کا کوئی ہوگا۔“

”تو یہ کہو، ابو کی نگرانی میں ہو رہا ہے یہ سب کچھ؟“

”خبردار! میرے ابو کے لیے ایک لفظ بھی مت کہنا۔“

”اور اس لڑکے کے بارے میں؟“

”وہ میرے بچا کا بیٹا تھا۔ ہم لوگ اسپتال گئے تھے پچا کو دیکھنے۔“

”تمہاری امی تو کہہ رہی تھیں تم اپنے ابو کے ساتھ ان کے کسی دوست کے گھر گئی ہو؟“

”اب میں اپنے خاندانی جھگڑوں کے بارے میں کیا بتاؤں۔ چچا سے ہمارے تعلقات اچھے نہیں ہیں۔ اگر امی کو بتا کر آتے تو وہ مجھے یا ابو کو جانے نہیں دیتیں۔ اس لیے ان سے بہانہ کرنا پڑا تھا۔“

”خوب کہانی گھڑی ہے۔ میں تو سمجھ رہا تھا ماڈرن لڑکیاں ہی آوارہ ہوتی ہیں، تم لوگ تو ان سے بھی بڑھ کر ہو۔ اب تک مجھے دھوکا دیتی رہیں اور مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔“

وہ بے چاری کیا کرتی۔ چٹھوں میں سر دے کر رونے لگی۔ میں نے اسے بھی اس کا ڈراما سمجھا اور برا بھلا کہتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

اس دن کے بعد سے میرے اور اس کے درمیان سرد جنگ شروع ہو چکی تھی۔ وہ مجھ سے بولنے کی کوشش بھی کرتی تو میں نفرت سے منہ پھیر لیتا۔

شک کرنے والا اپنی آگ میں خود جلتا ہے۔ میرا حال بھی یہی تھا۔ چند ہی روز میں برسوں کا بناؤ نظر آنے لگا۔ میں شراب چھوڑ چکا تھا لیکن عدیلہ سے دور ہوتے ہی شراب کے قریب چلا گیا۔ شراب کا نشہ میرے شک کو دوبالا کرتا رہتا تھا۔ غصہ عدیلہ پر اُترتا تھا۔ اب میں نے اس پر ہاتھ بھی اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ وہ بھی کب تک خاموش رہتی۔

اب اس نے بھی لڑنا شروع کر دیا تھا۔ کوئی سمجھانے والا ہوتا تو شاید اس آگ پر پانی چھڑکا جاسکتا تھا مگر یہاں تو عالم ہی دوسرا تھا۔ امی تو اور آگ پر تیل ڈالتی رہتی تھیں۔ وہ سارا ملبا مجھ پر ڈال رہی تھیں۔ بار بار کہتی تھیں، اور گھو غریبوں میں جا کر۔

پانی جب ایک طرف پہنچے لگے تو اپنا راستہ خود بناتا ہے۔ یہی حال شک کی پیاری کا ہے۔ یہ فطرت و واقعات خود سامنے لانے لگتی ہے اور چونکہ فطرت ان باتوں کی وضاحت نہیں مانگتی اس لیے جو حقیقت نہیں ہوتی وہی حقیقت نظر آتی ہے۔

ایک دن میں گھر آیا تو بیڈروم میں رکھی الیش ٹرے میں بچا ہوا سگریٹ دیکھ کر میرے شک نے سر اٹھایا۔ میں تو گھر میں تھا نہیں پھر یہ سگریٹ کہاں سے آگیا اور یہ وہ برانڈ بھی نہیں جو میں پیتا ہوں۔ میں نے سگریٹ کے اس ٹکڑے کو جب میں ڈال لیا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں عدیلہ سے پوچھتا لیکن میرے دل میں تو پتہ تھا۔ میں نے فرض کر لیا کہ اس کا کوئی چائے والا ہوگا جو میرے پیچھے آیا اور بیڈروم تک چلا آیا۔ ہو سکتا ہے وہی کزن ہو یا کوئی اور۔ یہ معلوم

کرنا تھا کہ وہ کون تھا؟ میں نے مٹی سے پوچھا۔ انہوں نے کہا کہ وہ دن بھر سے گھر پر نہیں تھیں۔ شک اور تقویت پکڑ گیا۔ عدیلہ نے اس تنہائی سے فائدہ اٹھایا ہوگا اور فون کر کے اسے بلایا ہوگا۔ میں خود ہی تانے بانے بننا چلا گیا۔ پھر نوکروں سے معلومات کیں، ایک نوکر نے آنے والے کو دیکھا تھا۔ اس نے نام بتایا تو میرے ہوش اڑ گئے۔

”سرکار، وہ جو آپ کے دوست اختر صاحب تھے، وہ آئے تھے۔“

یہ نام سننے ہی ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ اختر نے اپنی محبوبہ میرے حوالے کی ہے۔ اسی لیے وہ کہہ رہا تھا کہ ان لوگوں کو میرا نام نہ بتانا کہ میں نے آپ کو بھیجا ہے۔ وہ خود تو شادی کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اس نے عدیلہ کو یہاں بھیج دیا کہ چھپ چھپ کر ملتا رہے گا۔ اگر اسے آنا ہی تھا تو میری موجودگی میں آتا اور پھر میرے بیڈروم میں۔ پیرا سر پکڑانے لگا۔ ساری شبائیں عدیلہ کے خلاف جاری تھیں۔ ایک شہادت رہ گئی تھی جو خود اس نے اپنے خلاف کر لی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کون آیا تھا تو وہ نہ جانے کیوں انکار کر بیٹھی۔

”کوئی بھی نہیں۔۔۔ کوئی بھی تو نہیں آیا تھا۔ کون آنے لگا اور وہ بھی بیڈروم میں؟“ اس کا کھڑا ہوا جب صاف بتا رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔

”کیا اختر نام کا آدمی تمہارے پاس نہیں آیا تھا۔ بتا دیکھ، تو اسے کب سے جانتی ہے؟“

”بچپن سے جانتی ہوں کیونکہ وہ میرا بھائی ہے۔“

”چلتے غور تمیں جب پکڑی جاتی ہیں تو اسی طرح بھائی بنانے پر اُتر آتی ہیں۔ یہ کیسا بھائی ہے جو نہ تمہارے گھر میں تھا نہ تمہاری شادی میں۔“

”اس لیے کہ ابونے اسے گھر سے نکال دیا تھا۔“

”مجھے جھوٹی کہانیاں سننے سے سخت نفرت ہے۔ اگر وہ تمہارا بھائی ہوتا تو مجھ سے ملتا۔“

”اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں جنہیں کچھ نہ بتاؤں۔ وہ اچانک انکشاف کرے گا۔“

”بے غیرت عورت! رشتوں کو بھی بدنام کرتی ہے۔ پہلے کزن کے ساتھ گھومتی رہی اب اسے بھائی بنالیا۔ بہت ہو چکی۔ اب میں تمہارے بھانے میں آنے والا نہیں اور اسے بھی دیکھ لوں گا جس نے مجھے تمہارے گھر بھیجا تھا کہ تم یہاں چلی آؤ اور وہ میری دولت پر پیش کرتا رہے۔“

اس نے جواب میں کچھ کہنا چاہا لیکن میرا ہاتھ اٹھ گیا۔
میں نے اسے اتار مارا کہ وہ بے ہوش ہوگئی۔ شور سن کر بھی
آنکلیں۔

”کیوں پولیس کیس بناتے ہو۔ ایسی عورت سے
چھٹکارا حاصل کرو۔ طلاق دواور گھر سے روانہ کر دو۔“
ہم دونوں اسے بے ہوش چھوڑ کر کمرے سے نکل
آئے۔ دوسرے کمرے میں آتے ہی میں نے بوتل اٹھالی
اور اتنی پی کہ مجھے ہوش ہی نہیں رہا کہ کب رات آئی، کب
صبح ہوگئی۔ میری آنکھ کھلی تو عدیلہ میرے پیروں کے پاس
پیشی ہوئی تھی۔

”آپ یقین کریں، اختر میرا سگا بھائی ہے۔ ابھی
مجھے لے کر ابو کے پاس چلیں اور ان سے پوچھ لیں۔ اب تو
ان کی ابو سے صلح بھی ہوگئی ہے۔ اب کچھ نہیں چھپائیں
گے۔“

”تمہاری طرح وہ بھی ایک نمبر کے جھوٹے ہوں
گے۔ وہی کہیں گے جو تم کہہ رہی ہو۔ تم اسی وقت اپنے گھر
چلی جاؤ۔ میں وکیل کے پاس جاتا ہوں، طلاق کے
کاغذات تمہیں مل جائیں گے۔“

”خدا کے لیے ظفری! میرا گلا گھونٹ دو مگر مجھے طلاق
مت دو۔ میرے ابو میری موت برداشت کر لیں گے، یہ
برداشت نہیں کریں گے کہ تم مجھے طلاق دو۔“

”میں تمہارا گلا گھونٹ کر اپنے ہاتھ گندے کیوں
کروں؟ اپنا سامان اٹھاؤ اور ڈرائیور کے ساتھ اپنے گھر
چلی جاؤ۔ طلاق نامہ تمہیں مل جائے گا۔“

میں اٹھ کر غسل خانے میں چلا گیا اور پھر تیار ہو کر باہر
نکل گیا۔ ارادہ یہی تھا کہ کچھ دیر کے لیے دفتر جاؤں گا پھر یا
تو وکیل کی طرف جاؤں گا یا وکیل کو دفتر ہی میں بلا لوں گا۔

میں دفتر پہنچا تو مجھ سے پہلے اختر وینٹگ روم میں بیٹھا
میرا انتظار کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میری آنکھوں میں خون
اُتر آیا لیکن میں نے اپنے غصے پر قابو پالیا کہ شاید اس سے
کچھ راز کی باتیں اُگلا سکوں۔ میں اسے لے کر اپنے کمرے
میں آ گیا۔

”یار اختر! کہاں غائب ہو گئے تھے۔ میری شادی تک
میں نہیں آئے۔ کس سے چھپتے پھرتے تھے؟“
”جی ہاں پولیس سے۔ کسی کیس میں پھنس گیا تھا۔
بڑی مشکل سے جان چھوٹی اور ہاں، ایک بات بتاؤں،
میرے والدین سے میرا بھگڑا تھا۔ ان سے صلح ہوگئی ہے

بلکہ تمہاری وجہ سے صلح کرنی پڑی۔“
”میری وجہ سے کیوں؟“
”تا کہ تمہارے گھر میں آزادانہ آجاسکوں۔“

”وہ تو تم آتے رہے ہو۔“
”عدیلہ کے آجانے کے بعد ذرا مشکل تھا کیونکہ
بہنوٹی صاحب، میں عدیلہ کا بھائی ہوں۔ سید انور علی کا
بیٹا۔“

میں دل ہی دل میں سکرار ہاتھ کہ کس خوبصورتی سے
عدیلہ کی کبھی ہوئی باتوں کو دہرا رہا ہے۔
”جناب کا شناختی کارڈ دیکھ سکتا ہوں؟ ذرا ولدیت تو
چیک کروں۔“

اس نے شناختی کارڈ دکھایا۔ ولدیت میں سید انور علی کا
نام لکھا ہوا تھا۔

”اب آپ میرے گھر چلیں اور سید انور علی صاحب
سے مزید تصدیق فرمائیں۔“
”نہیں، اس سے پہلے تم میرے ساتھ میرے گھر
چلو گے اور اپنی بہن سے ملو گے۔ اسے کتنی خوشی ہوگی میرے
ساتھ دیکھ کر۔“

میں گھر پہنچا تو معلوم ہوا میرے حکم کے مطابق وہ اپنے
میکے جا چکی ہے۔ اب مجھے اختر کو تمام بات بتانی پڑی کہ کس
طرح میں نے اس پر شک کیا اور اسے طلاق کی دھمکی دی
اور وہ کیوں اپنے گھر چلی گئی۔

وہ پھر اگیا مگر خیریت گزری کہ میں نے عدیلہ کو طلاق
نہیں دی تھی۔

میں اسی وقت اختر کو لے کر عدیلہ کے گھر پہنچا۔ ابھی
اس کے آنسو خشک نہیں ہوئے تھے، مجھے اختر کے ساتھ دیکھ
کر اس کے ہونٹوں پر ہلکی آگئی۔

اختر نے میرا گھر آباد کیا تھا، اسی نے بروقت آ کر
اسے ٹوٹنے سے بچالیا۔

اس دن کے بعد سے میں نے عدیلہ پر کبھی شک نہیں
کیا۔ میری صحت یابی کے لیے ایک بڑی ٹھوکر کی ضرورت
تھی۔ یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ ٹھوکر لگنے سے پہلے ہی میری
اصلاح ہوگئی۔

اب اختر بے کار نہیں ہے۔ میں اس کی ذہانت سے
فائدہ اٹھا رہا ہوں۔ وہ میرے بڑس میں میرا ہاتھ بناتا ہے۔



مہمان

جناب عذرا رسول صاحبہ
السلام علیکم!

میں نے کراچی میں آنکھیں کھولیں۔ یہیں پلی بڑھی مگر اب
بلوچستان کے ایک دور افتادہ گاؤں کی عزت ہوں۔ میری شادی کن
حالات میں اور کیسے ہوئی، یہ میں آج سرگزشت کے توسط سے ہر
قاری کو بتانا چاہتی ہوں۔ عام کہانی کی نظر سے نہیں بلکہ اس نظر
سے آپ اس آپ بیتی کو پڑھیں کہ بلوچستان کے مہمان نواز لوگ،
سیدھے سادے لوگ، کیوں ہم سے دوری اختیار کر رہے ہیں؟

راحیلہ منصور
(کوئٹہ)

مجھے بلوچستان بہت متاثر کرتا تھا۔

نہ جانے کیوں، شروع سے یہ خواہش رہی تھی کہ میں
بلوچستان جا کر وہاں کے بچے کو دیکھوں، لوگوں سے
ملوں، بلوچستان کے وسیع و عریض صحرا، اونچے اونچے
پہاڑوں میں میرے لیے ہمیشہ ایک کشش رہی ہے۔

عید کی گھما گھمیاں خبر و ہزار بار دہ کی دہلیاں

ماہنامہ جاسوسی



مکڑ خال

عالمی مفادات اور قوتوں کے زیر زمین تصادم پر ایک فکر انگیز اور ہولناک تحریر کا شرف زیور کے قلم سے

ساروق کی کہانیاں

محبت کی نغمہ نگاریاں... نفرت کی چوہ گاریاں... دوستی کی دل فریبیاں... اور دشمنوں کی عیاریاں... دل پسند مرد و حق کی جھلکیاں

مشرق و مغرب کے رنگ و فطرت

مغربی دنیا کے کم و اطوار... معاشرت و تہذیب کے گرد گھومتی مختلف مصنفین کی طبع زاد اور ترجمہ کہانیاں

سلسلہ

انگریز سلسلے

لکار... بریلے ماحول اور گرجے شمنوں کی لٹکائیں
طاہر جاوید مغل کا مہرکہ... ایک ہی ڈگر
پگازن اسماعیل قادری کا سلسلہ گرداب

چینی نکتہ جینی

آپ کے تجربے... بشورے... محبتیں...
ڈاکٹریں... لبرٹی ہی دلچسپ باتیں... آپ کے قلم سے
اور وہ سب جو جاسوسی کا خاصہ ہے

نے مسکرا کر کہا۔
”آئیں، باہر چلیں آپ کے انتظار میں ہے۔“
میں نے اسے تھام دیا کہ میری بلنگ بھرنا پر کل کی ہو چکی ہے۔
”ہاں، وہ بہت غصہ ہے۔“ اس نے کہا ”وہاں کسی حد تک بے چالائی چل جاتی ہے۔“
اس نے بڑی ذہانت کے ساتھ ذہنی بات کہہ دی تھی۔ وہ مجھے راستوں کے بارے میں بتاتا رہا تھا۔ ”مستمر! زرخون روڈ سے گزر رہے ہیں۔ یہ کونسی بہت مشہور اور وی آئی پی قسم کا روڈ ہے کیونکہ اسی روڈ کے ساتھ افغان ایجنسی بھی ہے اور آپ کا وہ ہول بھی ہے جہاں آپ کا قیام ہوگا۔“
”منصور تم یہ بتاؤ، مجھے یہاں کون سے پھرنے میں کوئی دشواری تو نہیں ہوگی۔“
”سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“ اس نے کہا ”ہم بلوچ“
غور توں کی بہت عزت کرتے ہیں۔ آپ کو جہاں جہاں چلنا ہو، میرے ساتھ رہنے گا۔“

میرا ہونا ایک خوبصورت اور بڑا ہول ثابت ہوا تھا۔ ایسا ہی جیسا کہ دوسرے شہروں میں ہوا کرتا ہے۔ کام کرنے والے صاف ستھری یونیفارم میں ملبوس گھومتے پھر رہے تھے۔ کچھ غلغلہ مراءور عوامیں دکھائی دیے۔ اس کا لاؤنج بھی بہت شاندار اور پر تکلف تھا۔

میں نے گاؤن پر جا کر اپنا نام بتایا، شائخی کارڈ پیش کیا۔ مجھے میرے کمرے کا نمبر بتا دیا گیا۔ منصور واپسی کی اجازت مانگ رہا تھا۔
”کیوں، کیا تم کمرے تک نہیں چلو گے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں محترمہ، یہ ہماری روایت کے خلاف ہے، وہ مسکرا کر بولا۔“ ہم کسی غیر خاتون کے کمرے میں نہیں جاتے۔“
میں حلی ہی ہو کر رہ گئی۔

منصور نے کہا ”میں شام کے وقت آپ کی پاس آؤں گا۔“ اس نے ایک کانڈ میری طرف بڑھایا ”اس پر میرا موبائل نمبر ہے، جب بھی ضرورت ہو فون کرو دیجئے گا۔“
وٹر نے مجھے کمرے میں پہنچا دیا۔ یہ دوسری منزل کا ایک بڑا سا کمرہ تھا۔ میرے پاس سامان کے طور پر صرف ایک بگ اور ایک سوٹ کیس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں تھا۔
میں نے شاور لینے کے بعد رومروس سے کھانا کمرے ہی میں منگوایا تھا۔ سب کچھ تو بہت جانا پہچانا تھا۔ یہ اپنا ہی ملک تھا۔ اپنے ہی لوگ تھے۔ پھر لوگ ایسی باتیں کیوں کیا

جاری۔“ میں نے کہا ”میں تو ایک علمی اور ادبی کام کرنے جا رہی ہوں۔“
”کون تمہیں آزادی سے کام کرنے دے گا؟“
”خود وہاں کے لوگ۔“ میں نے کہا ”خود دیکھ لیں، وہاں مجھے کتاب پبلیکیشن ملے گا۔“
”تو اس طرح میں کونسا آؤں گی۔“
میں اپنے بارے میں بتا چکی ہوں کہ میں ایک ریسرچ ہوں۔ ادب میرا شعبہ ہے، نام راجیلہ ہے۔ والد صاحب ایک سرکاری آفیسر تھے۔
میرے بابا ایک مختلف مزاج کے انسان تھے۔ انہوں نے مجھے شے کا برتن بنا کر نہیں رکھا بلکہ حوصلہ مند بنایا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ زمانہ ایسا ہے کہ لڑکی کو گل دان بن کر نہیں رہنا چاہیے بلکہ اسے فوٹو داہن جانا چاہیے۔ اسی لیے میں زمانے بحر کی سیر کرتی پھرتی تھی۔

انہوں نے ایک بات اور بھی کہی تھی کہ دیکھو، تمہیں اچھے بُرے کا خود خیال رکھنا ہے۔ معاشرے، مذہب اور والدین کو جس حد تک سمجھانا اور سکھانا تھا، وہ فرض ہم نے ادا کر دیا ہے، اب تم اپنی اخلاقی قدروں کی خود ہی ذمہ دار ہو۔
تم اپنی مرضی سے فیصلہ کر سکتی ہو لیکن مجھے یقین ہے کہ تم کبھی اس لکیر کو عبور کرنے کی کوشش نہیں کرو گی۔ جو لکیر قدرت اور معاشرے نے منبج دی ہے۔

بہر حال میں ہزار اندیشوں کے ساتھ کونڈ بچھ گئی۔
میں قومی اڑلاؤں سے آئی تھی، میں نے حجاب لے لیا تھا۔ بہرینا ہوں میں میرے کمرے کی بلنگ ہو چکی تھی۔ میرے ایک جاننے والے تھے، انہوں نے کونڈ میں میرے لیے ایک گاڈ کابندوبست کر دیا تھا۔

وہ ان کے کسی دوست کا بیٹا تھا۔ منصور نام تھا اس کا۔ منصور کے بارے میں انہوں نے بتایا تھا ”وہ انتہائی ذہین اور مہذب نوجوان ہے۔ بلوچستان یونیورسٹی میں انگریزی ادب کا طالب علم ہے۔ دنیا کی سیاسی، سماجی اور معاشی صورت حال پر اس کی بہت گہری نظر ہے۔“

وہ نوجوان منصور کونڈ ان پورٹ پر میرے انتظار میں کھڑا تھا۔ پہلی نظر میں وہ مجھے اس لیے اچھا لگا تھا کہ اس کے تیور اور انداز بہت مہذب تھے۔

”مس راجیلہ، میں منصور ہوں۔“ اس نے میرے پاس آ کر اپنا تعارف کروایا ”چاہا جانے مجھے رہبر بنایا ہے لیکن میں بھٹکتے رہنے کا عادی ہوں۔“
”کوئی بات نہیں، مجھے اپنی راہ پر چلنا آتا ہے۔“ میں

میں اکٹرو سوچا کرتی تھی کہ نہ جانے وہاں کتنی اور کیسی کہانیاں ہوں گی، لوگ کیسے ہوں گے؟ ان کی روایت کیسی ہوں گی حالانکہ وہ بھی ہمارے ہی ملک کا ایک صوبہ ہے اور رقبے کے لحاظ سے سب سے بڑا صوبہ۔۔۔ اور کونڈ بھی کراچی سے کچھ زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔

کراچی سے لوگوں کا۔۔۔ آنا جانا لگتا ہی رہتا ہے۔ وہاں بھی وہ سب کچھ ہے جو ہمارے اپنے شہر میں ہے۔ کراچی سے دن بھر میں نہ جانے کتنی گاڑیاں صبح و شام وہاں کے لیے چلا کرتی ہیں۔ یعنی وہاں جانے میں کوئی رکاوٹ یا دشواری نہیں تھی اس کے باوجود مجھے موقع نہیں مل سکا تھا۔

ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ ہر کام کا ایک وقت ہوا کرتا ہے تو ایک دن وہ وقت آ ہی گیا۔

میں اس زمانے میں پاکستان کے مختلف علاقوں میں لکھے جانے والے اردو ادب اور شاعری پر ریسرچ کر رہی تھی کہ ایک غزل نگا ہوں سے گزری۔

بہت خوبصورت غزل تھی ”اے خالق اکبر، مجھے تو یقین عطا کر۔ ہم گرفتار بلائے آسمان کب تلک رہیں۔“ اس پوری غزل میں ایک شاعرانہ پاکیزگی کے ساتھ ایک سلیف کا احتجاج بھی تھا۔ شکوہ تو تھا لیکن بہت خودداری کے ساتھ۔

چونکہ یہ پوری غزل مجھے اچھی لگی تھی اسی لیے میں نے اپنے استاد سے دریافت کیا ”سر، یہ غزل کس شاعر کی ہے؟“
”تمہارا کیا خیال ہے کہ یہ غزل کس کی ہو سکتی ہے؟“
”سر نے انجانہ ہی سے سوال کر ڈالا۔“

”ظاہر ہے کہ اردو ادب کے کسی شاعر کی ہوگی۔“
”جی نہیں، یہ غزل ایک ایسے شخص کی ہے جس کی مادری زبان بلوچی تھی۔“ سر نے بتایا۔

”کیا!“ میں چونک اٹھی تھی ”یہ کیسے ہو سکتا ہے سر! اس میں زبان کی صحت کا کتنا خیال رکھا گیا ہے۔“
”میری تو کمال ہے۔ یہ غزل ہے میر گل خان نصیری۔“

سر نے بتایا۔
اب یہی موقع تھا جو قدرت نے مجھے فراہم کیا تھا۔ مجھے گل خان نصیری کی شاعری پر ریسرچ کرنا تھی اور یہی بہانہ مجھے کونڈ لے گیا۔

جب میں نے کونڈ جانے کا فیصلہ کیا تو میرے گھر والوں اور دوستوں نے سمجھانے کی کوشش کی ”کیا حاکم کر رہی ہو، وہاں دوسری روایت کے لوگ ہیں۔ تم اس طرح آزادانہ نقل و حرکت نہیں کر سکتیں۔“

”ارے بابا! میں وہاں کسی فیشن شو کے لیے تو نہیں

دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میں اسی موضوع پر سوچتا رہا ہوں۔“ اس نے کہا
”خود اندازہ کر لیں، میرا کل خان جیسا انتہائی سوچ رکھنے والا
آدمی بھی محبت کے بحر سے نکل نہیں سکا۔ ان کی شاعری میں
محبت کی بھرپور چاشنی موجود ہے۔“

”تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟“ میں دھیرے
سے بولی ”منصور، محبت ایک لطیف جذبہ کا نام ہے اور یہ
لطیف جذبہ ایک حساس دل ہی میں پیدا ہو سکتا ہے اور کسی
شاعر کے دل سے زیادہ حساس دل اور کس کا ہوگا؟“
”اور اب دوسرا سوال بھی سن لیں۔“

”چلو، وہ بھی سنا دو۔“

”دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا محبت ہر ایک کے لیے
ضروری ہے؟“ منصور نے پوچھا۔

”بات کیا ہے؟“ میں نے جیسے ہی دیکھا ہوں اس کی
طرف دیکھا ”تمہیں اس وقت محبت کیوں یاد آ رہی ہے؟“
”پتا نہیں کیوں، حالانکہ میں جانتا ہوں کہ اور بھی کم ہیں
زمانے میں محبت کے سوا۔“

ہم بول تک پہنچ گئے تھے۔ منصور وہاں سے اجازت
لے کر چلا گیا۔ میں اپنے کمرے میں آ گئی۔ اسی وقت روم
سروس نے اطلاع دی کہ خرم نام کے کوئی صاحب لاؤنج میں
میرا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ کراچی سے آئے ہوئے ہیں۔

میں اس نام کے کسی شخص کو نہیں جانتی تھی۔ وہ بھی کوئٹہ
میں۔ میں فوری طور پر لاؤنج میں آ گئی جہاں ایک معقول
صورت نوجوان میرا انتظار کر رہا تھا۔ وہ میرے لیے بالکل
اجنبی تھا۔

”جی فرمائیں؟“ میں نے اس کی طرف دیکھا۔

”میرا نام خرم ہے۔“ اس نے بتایا ”میں کراچی سے آیا
ہوں۔ انکل نے شاید میرے بارے میں آپ کو بتایا ہوگا۔“
”کون انکل؟“ میں اس وقت تک سمجھ نہیں سکی تھی۔

”آپ کے ڈیڈ نے۔ میں ان کے دوست کا بیٹا
ہوں۔“

اور اس وقت پتا چلا کہ یہ وہی صاحب زادے ہیں جن
سے رشتے کے لیے ابو نے بات کی تھی۔ وہ نہ جانے کیوں
کوئٹہ بھی چلے آئے تھے؟

☆☆☆

دوسری صبح بہت بولچالی محسوس ہو رہی تھی۔
خرم کی آمد نے کچھ الجھا کر رکھ دیا تھا۔ اس کو ابو نے بتایا
تھا کہ میں کوئٹہ ریسرچ کے لیے گئی ہوئی ہوں اور میرا قیام

ماہنامہ سرگزشت

سہریا میں ہے اس لیے وہ سیدھا وہیں چلا آیا تھا۔

لیکن کیوں..... اس سے میرا ابھی تعلق ہی تھا، کچھ
بھی نہیں۔ صرف رشتے کی بات چلی گئی اور وہ موصوف میری
حفاظت کے لیے دوڑے چلے آئے تھے۔

میں نے رات ہی کو اس سے پوچھ لیا تھا ”یہ بتائیں کہ
آپ کوئٹہ کیوں آئے ہیں؟“

”دیکھیں، جب مجھے یہ پتا چلا کہ آپ کوئٹہ آ گئی ہیں چلی
گئی ہیں تو پھر مجھے پریشانی ہونے لگی۔“
”آخری کیوں؟ پریشانی کیسی؟“

”دیکھیں نا..... یہاں کے حالات ایسے ہنسبیل کہ
کراچی سے آئی ہوئی کوئی لڑکی ایسی گھومتی پھرتی ہے۔“ اس
نے کہا ”یہاں ذرا ذرا سی بات پر گولیاں چلنے لگتی ہیں اور
عورت کو تو برداشت ہی نہیں کیا جاتا۔“

”لیکن میرے ساتھ تو ایسی کوئی بات نہیں ہوئی.....“
میں نے بتایا۔

”یہ اتفاق ہے۔ آپ مطمئن نہ ہو جائیں۔ میں اسی
لیے یہاں آ گیا ہوں تاکہ آپ کی حفاظت کر سکوں؟“

مجھے اس کی بات بُری لگی تھی۔ دل میں آیا کاس سے یہ
کہہ دوں کہ میں اپنی حفاظت خود کر سکتی ہوں لیکن کچھ سوچ کر
خاموش رہ گئی۔

خرم نے بھی اسی بول میں کرا لیا تھا۔
رات کے وقت میں نے فون کر کے ابو کو ساری صورت
حال بتا دی تھی۔ ابو یہ سب سن کر ہنسنے لگے تھے ”ہاں بیٹا، وہ
اسی مزاج کا نوجوان ہے، بہت خیال رکھنے والا۔“

”لیکن مجھے کسی کے خیال کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں
نے کہا ”خواجہ وہ میرے سر پر مسلط رہیں گے۔ میرے
لیے یہ ناقابل برداشت ہوگا۔“

”ادھو، ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ وہ خود بھی سمجھ دار
آدمی ہے۔“ ابو نے کہا۔

میں نے ابو سے پھر کچھ نہیں کہا۔
دوسری صبح جب میں منصور کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھی
معمول کے مطابق چائے پی رہی تھی کہ اچانک خرم بھی وہاں
آ ڈکا۔ اس نے بڑی لڑی نگاہوں سے منصور کی طرف دیکھا
تھا۔

”راجیلہ! یہ صاحب کون ہیں؟“ اس نے پوچھا۔
”یہ اس شہر میں میرے رہبر ہیں۔“ میں نے بتایا
”منصور نام سے ان کا۔“

”اب میں آ گیا ہوں تو آپ کو رہبر کی کیا ضرورت؟“

”راجیلہ! یہ صاحب کون ہیں؟“ اس نے پوچھا۔
”یہ اس شہر میں میرے رہبر ہیں۔“ میں نے بتایا
”منصور نام سے ان کا۔“

”اب میں آ گیا ہوں تو آپ کو رہبر کی کیا ضرورت؟“

”راجیلہ! یہ صاحب کون ہیں؟“ اس نے پوچھا۔
”یہ اس شہر میں میرے رہبر ہیں۔“ میں نے بتایا
”منصور نام سے ان کا۔“

”اب میں آ گیا ہوں تو آپ کو رہبر کی کیا ضرورت؟“

”راجیلہ! یہ صاحب کون ہیں؟“ اس نے پوچھا۔
”یہ اس شہر میں میرے رہبر ہیں۔“ میں نے بتایا
”منصور نام سے ان کا۔“

اس نے کہا۔

اس کی یہ بات مجھے بُری لگی تھی۔ نہ جانے کیوں یہ مرد
حضرات فوری طور پر لڑکی پر اپنا حق جتانے کی کوشش کرنے
لگتے ہیں۔

”خرم صاحب، جس قسم کی رہبری یہ کر سکتے ہیں۔ وہ
آپ نہیں کر سکتے۔“ میں جلدی سے بولی ”منصور، ادب کے
طالب علم ہیں اور میں بھی ادبی سلسلے ہی میں کوئٹہ آئی ہوں اسی
لیے یہ جتنے مفید ہو سکتے ہیں، وہ آپ نہیں ہو سکتے۔“

میری بات سن کر خرم جڑ بڑھ کر ہنسا گیا تھا جبکہ میں نے
محسوس کیا کہ منصور کے چہرے پر خوشیوں کے رنگ بکھر گئے
تھے۔

”بہر حال، آپ ذرا جلدی واپس آ جائے گا۔“ خرم
نے پھر کہا ”آج شام آپ کو لے کر کہیں جانا ہے۔“

میں اس کی بات کا جواب دیے بغیر منصور کو لے کر ہوٹل
سے باہر آ گئی۔

”یہ کون صاحب ہیں؟“ باہر آ کر منصور نے دریافت
کیا۔

”میرے ایک امیدوار!“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا
”کراچی سے میری محبت میں یہاں تک چلے آئے ہیں جبکہ
ابھی میرا ان سے کوئی رشتہ نہیں ہوا ہے لیکن ابو نے انہیں
میرے سر پر سوار کر دیا ہے۔“

”شاید..... یہ شخص آپ کو پسند نہیں آیا؟“ منصور نے
پوچھا۔

”کون پسند کرے گا..... جو لوگ مردانہ شاذ ازم کے
ہوتے ہیں، میں ان کو پسند نہیں کر سکتی۔“ پھر میں نے منصور کی
طرف دیکھا ”معاف کرنا، تمہاری سوسائٹی بھی تو ایسی ہی
ہے۔ عورت کو اپنا محکوم سمجھنے والی۔ جسے Male
Dominated Society کہا جاتا ہے۔“

”یہ بات درست بھی..... اور غلط بھی۔“ اس نے کہا
”درست اس لیے ہے کہ ہم عورت کو ایک خاص حد سے آگے
نہیں جانے دیتے..... اور غلط اس لیے ہے کہ ہماری خواتین
بھی زندگی کے ہر شعبے میں آگے آ رہی ہیں۔ آپ کو ہر گز
پچھلی لکھی بلوچ خواتین پوری آزادی کے ساتھ اپنا کام کرنی
ہوئی دکھائی دیں گی۔“

”منصور، میں نے یہاں آ کر ایک بات ضرور محسوس کی
ہے۔“ میں نے کہا۔

”وہ کیا ہے؟“

”عورت کو اپنے تحفظ کا احساس!“ میں نے بتایا

”یہاں لگا ہوں کی بے باکی اتنی عام نہیں ہے جتنی کراچی یا
دوسرے شہروں میں ہو چکی ہے۔“

”بس ہم اسی قدر کی حفاظت تو کر رہے ہیں۔“
اس دن میرا کل خان نصیر کی ہسٹری آف بلوچستان
دیکھنے کا موقع ملا۔ بہت زبردست کتاب ہے اور بہت محنت
اور ریسرچ سے لکھی گئی ہے۔

یہ بھی پتا چلا کہ میرا کل خان نصیر نے ہمارے جوش ملیح
آبادی کی طرح ایسی شاعری بھی کی ہے جس میں بلوچی
نوجوانوں کو ان کا ماضی یاد دلاتے ہوئے انہیں تیز سے۔۔۔
بے دار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

جیسے ”اٹھ کے ابھی دنیا میں پھر جینے کا ساماں کیجئے.....
یا اے بلوچی نوجوانو، پھینک دو جام شراب۔“ وغیرہ۔

اس موضوع پر بات کرتے ہوئے منصور نے کہا
”مختصر یہ، میرا خیال ہے کہ اس میں کوئی بُرائی نہیں ہے۔
اگر کوئی شخص اپنی قوم، اپنی برادری اور اپنے قبیلے کو خواہ
غفلت سے جگانے کی کوشش کر رہا ہے۔“

”نہیں، اس میں کوئی بُرائی نہیں ہے۔ علامہ اقبال نے
بھی تو یہی کیا تھا۔“ میں نے کہا۔

اس دن میرا کل خان نصیر کی زندگی کے اور بھی کئی
پہلوؤں کے بارے میں معلومات حاصل ہو گئیں۔ اُن کا
انتقال 1983ء میں کراچی میں ہوا تھا۔

اس شام ہم نے کوئٹہ کے اور بھی کئی مقامات دیکھے۔ منصور
کے ساتھ سیر کرتے ہوئے ذرا سی دیر کے لیے بھی خرم کا خیال
نہیں آیا تھا جو ہوٹل کی لابی میں میرے انتظار میں بیٹھا ہوگا۔
ہم ہوٹل واپس آئے تو وہ گیٹ ہی پر کھڑا تھا۔ مجھے
منصور کے ساتھ دیکھ کر اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔
”راجیلہ! یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ آپ اس طرح
اس شخص کے ساتھ سیر کر رہی ہیں۔“

”کیا؟“ میں نے چوک کر اس کی طرف دیکھا ”خرم
صاحب! آپ کو روک ٹوک کا حق کس نے دیا ہے؟“
”آپ کے ابو نے۔“ اس نے کہا ”اور اس سوسائٹی
نے..... جو میری اور آپ کی ہے۔“

”ایسا کوئی حق نہیں ہے۔“ میں غصے سے بولی ”اور
جہاں تک ابو کا معاملہ ہے تو میں ان سے خود بات کر لوں گی۔“
منصور پریشان سا کھڑا تھا۔

میں نے خرم کو نظر انداز کرتے ہوئے منصور کی طرف
دیکھا ”منصور! تم کل ذرا جلدی آ جانا۔ ہمیں میر صاحب کے
خاندان کے کچھ لوگوں سے انٹرویو کرنا ہے۔“

گرچہ ہمارے پروگرام میں ایسی کوئی بات نہیں تھی لیکن یہ میں نے خرم کو سنانے کے لیے کہا تھا۔ منصور نے بھی میرا اشارہ سمجھ لیا تھا۔ اسی لیے اس نے کہا ”ٹھیک ہے میڈم! میں کل جلدی آ جاؤں گا۔“

خرم غصے میں پاؤں پٹختا ہوا ہوٹل کے اندر چلا گیا تھا۔ اس کی جانے کے بعد منصور نے کہا ”محترمہ، یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے، میں شاید کل سے نہ آ سکوں۔“

”وہ کیوں؟“

”آپ سمجھا کریں۔“ اس نے کہا ”آپ خود دیکھ لیں۔ ان صاحب کو آپ کا میرے ساتھ رہنا اچھا نہیں لگتا۔ یہ سخت غصے میں ہیں۔“

”تو اس سے کیا ہوا۔ کسی کے غصے کی پروا کر کے ہم اپنی زندگی تو نہیں بدل سکتے۔ اپنی خوشیاں تو ختم نہیں کر سکتے۔“

”خوشیاں.....“ اب منصور کے چوکنے کی باری تھی

”آپ کن خوشیوں کی بات کر رہی ہیں؟“

”منصور! اگر تم صاف طور پر سننا ہی چاہے ہو تو سن لو کہ تمہارے ساتھ رہ کر مجھے اچھا لگتا ہے۔ بس اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں کہوں گی۔“

میں یہ کہہ کر ہوٹل کے اندر چلی آئی تھی، جبکہ منصور وہیں کھڑا رہ گیا۔

☆☆☆

دوسری صبح منصور شاید بہت پہلے آ کر لائی میں بیٹھ گیا تھا۔ آج اس نے بہت عمدہ ڈریسنگ کر رکھی تھی۔ بلوچی کڑھائی کا کرتہ اور جیکٹ۔ اس لباس میں وہ بہت شاندار دکھائی دے رہا تھا۔

میں ہمیشہ کی طرح اس کے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔ ابھی ہم نے چائے پینی ہی شروع کی تھی کہ خرم بھی وہاں آ گیا۔ وہ بہت عیش میں تھا۔ اس نے براؤ راست ہی مخاطب کیا تھا ”راجیلا! آج آپ کو میرے ساتھ کراچی واپس چلنا ہے۔“

”وہ کیوں؟“

”یہ اگلے کا حکم ہے۔“ اس نے کہا۔ اس کا اشارہ میرے ابو کی طرف تھا۔

”تم اگلے سے کہہ دو کہ ابھی میرا کام ختم نہیں ہوا۔“

”کام کو چھوڑو، یہاں تم اپنی عزت.....“

”چپ ہو جاؤ۔“ میں نے غصے سے اس کی بات کاٹ دی ”تمہیں ایسی بکواس کرنے کا اختیار کس نے دیا ہے؟“

”میں بتا چکا ہوں کہ یہ اختیار مجھے اگلے کی طرف سے ملا ہے۔“ اس نے کہا ”کیونکہ بہت جلد ہم ایک ہوئے والے

ہیں۔“

”لیکن خرم صاحب! میں اس رشتے سے انکار کرتی ہوں۔“

میں غصے میں بھری ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔ میں نے ابو کو فون کر کے جب یہ بتایا تو ابو برس پڑے ”مجھے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ تم وہاں کسی شخص کے ساتھ تفریق کرنی پھر رہی ہو، میں یہ برداشت نہیں کر سکتا، تمہارا رشتہ خرم سے طے ہو چکا ہے۔ بس..... میں اس کے علاوہ کچھ نہیں مٹا چاہتا۔“

”واہ..... کیا بات ہوئی۔“ میں نے جھٹکا کر کہا ”ابو! آپ تو قبائلی رسم و رواج کا مذاق اڑایا کرتے تھے کہ یہ لوگ عورتوں کی شادیاں زبردستی کروا دیتے ہیں، لڑکیوں کی مرضی معلوم نہیں کی جاتی اور آپ خود بھی وہی حرکت کرنے جا رہے ہیں؟“

”خاموش رہو۔“ ابو دہانے ”تم صاف صاف بتاؤ، تمہارا کیا فیصلہ ہے، تم واپس آ رہی ہو یا نہیں؟“

”واپس تو آنا ہی ہے۔“ میں نے کہا ”لیکن اس لیے نہیں کہ میں خرم سے شادی کروں۔ آپ نے جہاں مجھے اتنی آزادی دی ہے، وہاں یہ آزادی بھی دے دیں کہ میں اپنی پسند کے کسی نوجوان کا انتخاب کر سکوں۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا، کیا تم نے کسی کو پسند کر لیا ہے؟“

”ہاں، وہی نوجوان..... جس کا نام منصور ہے۔“ میں نے بتایا ”میں یہ نہیں جانتی کہ وہ میرے اس فیصلے پر میرا ساتھ دے گا یا نہیں..... لیکن میں یہ گارنٹی کے ساتھ کہتی ہوں کہ اگر ایسا ہو گیا تو آپ بھی فخر محسوس کریں گے۔“

ابو نے دوسری طرف سے فون بند کر دیا تھا۔

دوسری صبح خرم نے مجھ سے کہا ”لڑکی، میں کراچی واپس جا رہا ہوں۔ مجھے یہ پتا چل گیا ہے کہ تمہاری قسمت میں ٹھوکریں ہی لکھی ہیں۔ تم تیار ہونے والی ہو، تمہاری آنکھوں پر پٹی بندھ گئی ہے۔ تم نے جس کا انتخاب کیا ہے، اس کے بارے میں تم کچھ نہیں جانتیں، اس کا ماحول، اس کا گھر..... وہ لوگ عورت کو جوئے کی نوک پر رکھتے ہیں۔“

”یہ میرا دوسرا خرم صاحب!“ میں نے کہا ”آپ میری فکر نہ کریں۔ اگر میں برباد ہو بھی گئی تو آپ کے پاس فریاد لے کر نہیں آؤں گی۔“

خرم نے اس کے بعد مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ اس دن جب منصور میرے پاس آیا تو میں نے اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا۔

”کیا.....!“ وہ یہ سن کر حیران رہ گیا تھا ”یہ..... یہ

آپ نے کیا کر دیا۔“

”کیوں..... کیا تمہاری کہیں شادی ہو چکی ہے؟“

”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔

”کہیں رشتہ طے ہو گیا ہے؟“

”نہیں، ایسا بھی نہیں ہے۔“

”کیا ہم میں سے کوئی مسلمان نہیں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اوہو، آپ نہیں سمجھ رہی ہیں۔“ اس نے کہا ”بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں اس طرح رشتے نہیں ہوتے۔“

”اب ایک بات بتاؤ، کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ہم دونوں ایک ساتھ زندگی گزار سکیں؟“

”ہاں، چاہتا تو ہوں“ لیکن ایسی خواہشوں کا کیا فائدہ.....؟“

”تم فائدے اور نقصان کو چھوڑو۔“ میں نے کہا ”تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ ابو سے انکار کر کے میں اپنی کشتیاں چلا چکی ہوں۔ اب میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ تم ایسا کرو، مجھے اپنے گھر والوں کے پاس لے چلو، میں ان سے بات کر کے تمہارے کی کوشش کروں گی۔“

”آپ نے تو مجھے مشکل میں ڈال دیا ہے۔“ اس نے کہا ”تمہاری روایتیں بہت سخت ہیں۔ ہم بڑی مشکل سے کسی اور کو قبول کرتے ہیں۔“

”تو پھر کیا، کیا جائے..... میں تو کہیں کی نہیں رہی۔ نہ جانے کیوں تم پر اتنا بھروسہ ہو گیا تھا کہ میں نے ابو سے بھی جھگڑا کر لیا۔“

”تو پھر ایسا کریں، میں پہلے اپنے گھر والوں سے بات کر لیتا ہوں۔“ اس نے کہا ”اس کے بعد دیکھتا ہوں کہ کیا ہو سکتا ہے۔“

”تو جاؤ، جلدی سے بات کرلو۔“

منصور کے جانے کے بعد میں بہت بے قرار ہو گئی تھی۔ میں کیا کر بیٹھی تھی، کہیں یہ کوئی غلطی تو نہیں تھی۔ ایسی غلطی جس کا کوئی مداوی نہ ہو سکے۔

میں تو منصور کو زیادہ جانتی بھی نہیں تھی۔ خود اس نے بھی کبھی محبت وغیرہ کا اظہار نہیں کیا تھا اور میں نے اتنا بڑا قدم اٹھا لیا تھا۔ یہ کیسا باگل پن تھا۔

اگر منصور کے گھر والے راضی نہیں ہوئے تو پھر کیا ہوگا؟ ایسا شاید کم ہی ہوا ہو کہ کسی لڑکی نے کسی دوسرے شہر آ کر بغیر کسی خوں سہارے کے اس قسم کا قدم اٹھا لیا ہو۔ لیکن باگل پن کا کوئی علاج تو نہیں ہوا کرتا۔



1794ء میں قاجار خاندان کے بانی آغا محمد خان نے کرمان کوئی ماہ تک محاصرے میں لیے رکھا اور جس کے دوران لطف علی خان نے حیران کن استقلال اور باہر دی سے مقابلہ کیا۔ گواس کے مصاحب کی نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ دو تہائی فوجی اور باشندے بھوک اور پیاس کی وجہ سے قہرہ اہل بن گئے تھے۔ آخر کار 2 جولائی 1794ء کی رات کو دشمن نے ایک سردار نجف علی خان کو جہاں بخشی اور انعامات وافر کے بدلے اس پر تیار کر لیا کہ وہ آغا محمد خان کا ایک دستہ اس دروازے سے داخل ہونے دے جو اس کے زیرِ کمان حصہ میں تھا۔ چنانچہ یہ دستہ داخل ہوا اور اس نے ایک اٹھوے دروازے کو توڑ دیا اور ساری فوج اندر آ گئی۔ لطف علی خان یہ حالت دیکھ کر گھوڑے پر سوار ہوا اور چند جاں نثاریوں کے ساتھ دشمنوں کو چیرتا بھاڑتا ہوا رات کے اندھیرے میں نکل گیا اور بم نامی شہر چلا گیا جہاں کے گورنر نے اسے دھوکے سے پکڑ لیا اور آغا خان کے پاس بھیج دیا۔ آغا نے بدست خود اس کی آنکھیں نکال دیں اور بعد میں اسے تہران میں مگا گھونٹ کر ماریا گیا تھا۔ زندہ خاندان کے اس مکمل زوال کی یاد تازہ رکھنے کے لیے آغا محمد خان نے سین اس جگہ انسانی کھوپڑیوں کا مینار بنانے کا فیصلہ کیا جہاں لطف علی خان پکڑا گیا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے جیسو قیدیوں کی گردن ماری اور ان کے سر تین سو قیدیوں کے ذریعے جم بھجوائے اور ہر ایک کو بھجور کیا گیا کہ وہ اپنے دو ساتھیوں کو کھوپڑیاں پہنچانے۔ ان تین سو بد بختوں کا بھی وہاں پہنچنے پر بھی حشر کیا گیا اور یہاں پر 1810ء میں میری موجودگی پر بھی قائم تھا اور خون آشام فاتح کا دہشت ناک مظاہرہ تھا۔

لیغٹیننٹ ہنری پونٹنگ کے 1816ء میں لکھے گئے ”مفرمانہ بلوچستان اور سندھ“ سے اقتباس تلاش: اظہر بمثل صدیقی، کراچی

خرم واپس ہو کر واپس چلا گیا تھا۔ وہ رات بہت بے چینی میں گزری تھی۔ میرے پاس تو اب اتنے میسے بھی نہیں تھے کہ ہوٹل میں رہ سکتی۔ کراچی واپس جانا ہی پڑتا۔

اس کے علاوہ یہ بھی سوچ رہی تھی کہ اگر منصور لوٹ کر نہیں آیا تو پھر کیا ہوگا؟
میں بہت بڑی طرح پھنس چکی تھی۔ یہ عشق کم بخت ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ یہ ہمیشہ امتحان میں ڈالتا آیا ہے۔ میرے لیے کتابتِ امتحان آ گیا تھا۔

فوری طور پر ایک مسئلہ ہوٹل کے پیسوں کا تھا۔ والد صاحب سے تو اب کوئی امید نہیں تھی۔ وہ نہ جانے کیوں اتنے ناراض ہو گئے تھے حالانکہ میں نے وہی کیا جس کی انہوں نے تربیت دی تھی۔ مجھے لیکچر دیتے رہے تھے۔

”دیکھو بیٹا! اتنا رنگ و بو کو تو ذکر مذہب میں گم ہو جا۔ نہ افغانی رہے باقی، نہ ایرانی نہ طورانی۔“

ان کا کہنا تھا کہ ہم مسلمان اسی لیے پیچھے رہ گئے ہیں کہ ہم نے اپنے آپ کو رنگ و نسل اور زبان کے خانوں میں تقسیم کر لیا ہے۔ جبکہ خدا کے یہاں ان باتوں کی گنجائش نہیں ہے۔ والد صاحب کی یہ باتیں کتنی خوبصورت تھیں لیکن ان باتوں کے برعکس ان کا کیا رویہ تھا، شاید نصیحت کرتا اور ایک نظریہ رکھنا آسان ہے لیکن جب معاملہ اپنا اور اپنے گھر کا ہو تو پھر منظر نامہ کچھ اور ہو جاتا ہے۔

دوسری طرف منصور بھی نہ جانے کہاں رہ گیا تھا؟

ظاہر ہے، اس کا تعلق جس معاشرے سے تھا، اس معاشرے میں کسی کو اتنی آزادی نہیں دی جاتی تھی کہ وہ اپنی مرضی سے اپنے رشتے طے کرنے لگے۔

منصور کو اس کے گھر والوں نے دھمکی دی ہوگی اور وہ اپنے گھر بیٹھ گیا ہوگا لیکن اب میں کیا کرتی، کہاں جاتی؟ میں نے ہوٹل والوں کا بل معلوم کیا تو پتا چلا بیس ہزار بنتے ہیں۔ میں ہزار ادا کیے بغیر میں چیک آؤٹ نہیں کر سکتی تھی۔

میرے پاس چار پانچ سونے کی چوڑیاں تھیں۔ سونے کی چوڑیاں ہمیشہ میرا شوق رہی ہیں اور اتفاق سے وہ چوڑیاں اس وقت بھی میرے پاس تھیں۔

چوڑیوں کا خیال آتے ہی مجھے ایک طرح سے اطمینان سا ہو گیا تھا۔ اب مجھے صرف یہ کرنا تھا کہ کوئٹہ کی صرافہ مارکیٹ میں جا کر چوڑیاں فروخت کر دوں۔

چالیس پچاس ہزار تو آ ہی جاتے۔ ہوٹل کا بل ادا کرنے کے بعد اتنی رقم بچ جاتی کہ میں کراچی پہنچ سکتی تھی۔

دوسری صبح میں چوڑیاں لے کر اپنے گھر سے نکل تو آتھی لیکن وہی دشوار مرحلہ میرے سامنے تھا۔ آخر میں کہاں

جاتی؟ مجھے نہیں معلوم کہ یہاں کی صرافہ مارکیٹ کہاں ہے؟ اس کے علاوہ کسی اکیلی لڑکی کا بازار تک جانا ایک مشکل مرحلہ تھا۔

پھر میرے ذہن میں ایک بات آ گئی۔ کیوں نہ ہوٹل کے کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی لڑکی سے بات کر لوں۔ وہ اسی شہر کی رہنے والی تھی، کوئی نہ کوئی مدد ضرور کر سکتی تھی۔ گل یا عیمن نام تھا اس کا۔ بہت ہی پیاری سی لڑکی تھی۔

”یا عیمن!“ میں نے اس کے پاس جا کر کہا ”میں تم سے ایک کام لینا چاہتی ہوں۔ کیا تم میرا یہ کام کر دو گی۔“

”جی فرمائیں، کیا کام ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”مجھے اپنی کچھ چوڑیاں بیچنی ہیں۔“ میں نے بتایا۔

”چوڑیاں بیچتی ہیں؟“ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا ”وہ کس لیے؟“

”تمہارے ہوٹل کا بل ادا کرنے کے لیے۔“ میں نے بے تکلف ہو کر بتادیا۔

”بل ادا کرنے کے لیے..... لیکن آپ کا بل تو ادا ہو چکا ہے۔“ اس نے بتایا ”بلکہ دو دنوں کا بلڈوائس بھی آ گیا ہے۔“

”کیا؟“ میں حیرت زدہ رہ گئی تھی ”یہ کیا کہہ رہی ہو، کس نے بل ادا کر دیا؟“

”یہ تو کل شام ہی کو ہو چکا ہے۔“ وہ حیران کیے جا رہی تھی۔

پھر مجھے منصور کا خیال آ گیا۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے ادا کر دیا ہو۔ ”یا عیمن! تم نے اس نو جوان کو دیکھا ہوگا میں جس کے ساتھ جایا کرتی تھی، کیا یہ بل اس نے ادا کیے ہیں؟“

”نہیں تو۔“ اس نے انکار میں اپنی گردن ہلا دی ”اس کو تو میں اچھی طرح پہچانتی ہوں۔ بل ادا کرنے والا کوئی اور تھا۔ اتفاق سے اس وقت میں بھی یہیں پر تھی۔“

میں حیران ہو کر اپنے کمرے میں واپس آ گئی۔ کون ہو سکتا تھا۔ منصور بھی نہیں تھا تو پھر کون تھا؟ میں تو یہاں کسی کو جانتی بھی نہیں تھی۔

پھر مجھے خرم کا خیال آ گیا۔ اب وہی ایک رہ گیا تھا۔ خرم کا نمبر میرے پاس موجود تھا۔ میں نے اپنے کمرے میں آ کر اس کا نمبر ملایا۔ اس نے کچھ دیر بعد فون اٹھالیا تھا۔ اس نے فوری طور پر میری آواز پہچان لی تھی۔ ”ہاں کہو، اب کیا چاہے مجھ سے؟“

”خرم! میں تم سے صرف ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں،

تم نے کیا سمجھ کر میرے ہوش کا بل ادا کیا ہے؟
”تمہارا کیا دماغ خراب ہو گیا ہے؟“ وہ غرایا ”اب میں اتنا پاگل بھی نہیں ہوں کہ تم جیسی لڑکی کے ہوش کا بل ادا کرتا پھروں۔“

میں نے اس کا نمبر کاٹ دیا۔ اب صرف ایک ہی رہ گیا تھا اور وہ سوائے ڈیڈ کے اور کون ہو سکتا تھا؟ ظاہر ہے کہ وہ میرے باپ تھے۔ میں نے شاید فون پر ان سے کہہ بھی دیا ہوگا کہ میرے پاس پیسے ختم ہو گئے ہیں۔

چونکہ کوئی بھی باپ اپنی اولاد کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑ سکتا۔ اس لیے انہوں نے کسی کی معرفت ہوش کے پیسے بچھا دیے ہوں گے۔ اس کے علاوہ کوئی اور بات نہیں ہو سکتی تھی۔

میں نے ڈیڈی کو فون کیا تو انہوں نے بھی فون اٹھالیا تھا۔ ان کی آواز اور لہجے میں ابھی تک ناراضی تھی۔

”تم یہ بتاؤ تم کو واپس آتا ہے، یا وہیں رہ جاتا ہے؟“ ڈیڈی نے پوچھا۔

”بابا۔ میں واپس آ رہی ہوں۔“ میں نے کہا ”لیکن آپ یہ بتائیں کہ آپ نے اتنی خاموشی سے پیسے کیوں بچھوائے؟ وہ آدمی تو مجھ سے مل کر بھی نہیں گیا۔“

”کون مل کر نہیں گیا، کیسے پیسے؟ تم کیا کہہ رہی ہو؟“

”کیا آپ نے کسی کی معرفت ہوش کا بل تو نہیں ادا کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں تو۔ میں نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا۔“ بابا نے کہا ”اور تم جیسی نالائق اولاد کے لیے اب کچھ کرنے کو دل بھی نہیں چاہتا۔“

میں نے بابا کا یہ جواب سن کر فون بند کر دیا۔ میرا دل خون کے آنسو روئے لگا تھا۔ باپ کا یہ رویہ تھا میرے ساتھ۔ اور دوسری طرف خدا جانے وہ کون تھا جس نے ہوش کی پریشانی دور کر دی تھی؟

اور وہ بھی اس طرح کہ احسان جتانے کو سامنے بھی نہیں آیا تھا۔ اس بھلے آدمی نے تو مجھے آزاد کرادیا تھا۔

میں جہاں چاہے جا سکتی تھی۔

سکریے میں رکھے ہوئے فون کی کھنٹی بجتی گئی۔ میں نے جلدی سے ریسپونڈ اٹھالیا۔ دوسری طرف کاؤنٹر سے

یا سمین بول رہی تھی ”بی بی! جلدی سے پیچھے آ جائیں۔“ اس نے کہا۔

”خیریت تو ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اس وقت لابی میں وہی آدمی موجود ہے جس نے آپ کا بل ادا کیا تھا۔“ اس نے بتایا۔

”بس..... بس میں ابھی آ رہی ہوں۔“

میں تقریباً دوڑتی ہوئی لابی تک آئی تھی۔ یا سمین کاؤنٹر پر ہی تھی۔ میں جب اس کے پاس پہنچی تو اس نے لابی میں بیٹھے ہوئے ایک آدمی کی طرف اشارہ کر دیا۔

وہ ایک معقول صورت مقامی آدمی تھا۔ بہت ڈھنگ کے لباس میں ملبوس۔ لیکن میں اسے نہیں جانتی تھی۔ وہ میرے لیے اب بھی تھا۔

اس نے شاید یہ اعزازہ لگالیا تھا کہ یا سمین نے مجھے کچھ بتا دیا ہے۔ اسی لیے وہ تیزی سے اٹھا اور ہوش سے باہر چلا گیا۔ میں اسے آوازیں دیتی رہ گئی تھی۔

یہ ایک اور تیز اسرار سی بات تھی۔ کون تھا وہ؟ اس نے مجھ پر اتنا برا احسان کیوں کیا تھا؟ اس کا مجھ سے کیا تعلق تھا؟

میں سوچتے سوچتے پاگل ہونے لگی تھی۔ میں نے یا سمین سے کہا ”دیکھو۔ یہ آدمی جب دوبارہ دکھائی دے تو فوراً فون کر دینا۔ اس بار میں اسے نکلے نہیں دوں گی۔“

یا سمین نے گردن ہلا دی۔

وہ رات اسی طرح سوچتے ہوئے گزر گئی تھی۔ خدا جانے وہ کون تھا اور کیوں آیا تھا؟ دوسری صبح پھر کاؤنٹر سے فون آیا تھا۔ اس بار یا سمین کی جگہ کسی اور نے فون کیا تھا۔ وہ

مجھے بتا رہا تھا ”کوئی منصور صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“

”او خدا..... منصور!“ میں دھک سی رہ گئی، منصور واپس آ گیا تھا۔

میں تقریباً دوڑتی ہوئی لابی میں داخل ہوئی۔

منصور اپنی خوبصورت مسکراہٹ کے ساتھ لابی میں بیٹھا ہوا تھا ”خدا کے بندے، تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟ کہاں چلے گئے تھے؟“ میں نے تقریباً چیختے ہوئے پوچھا۔

”کچھ ایسے معاملات ہو گئے تھے کہ میں نہیں آ سکا۔“ اس نے اسے مخصوص شرٹ لیے لیے میں بتایا۔

”اور اگر میں واپس چلی جاتی تو.....؟“

”میں جانتا تھا کہ آپ کہیں نہیں جائیں گی۔“ اس نے کہا ”مجھے اتنا خبر و سواتو ہے۔“

”بے وقوف انسان۔ میں یہاں جبری طرح پھنس گئی تھی۔“ میں نے بتایا ”میرے لیے ایک ایک لمحہ عذاب ہو رہا تھا۔ میرے گھر والوں نے مجھے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔“

ہوش کا بل میں جزار ہو گیا تھا۔ پھر کسی خدا کے بندے نے پورا بل ادا کر دیا۔ میں نہیں جانتی وہ کون ہے؟ لیکن اس نے میری جھوٹ دی ہے، وہ میں نہیں بھلا سکتی۔“

”ہوتے ہیں، ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں یہ اس نے کہا۔“

”تم بتاؤ، تم نے میرے لیے کیا کیا؟“ میں نے پوچھا ”میرے پاس صرف آج کا دن ہے۔ کل سے پھر ہوش کا کریم چڑھنا شروع ہو جائے گا۔“

اسی وقت میری نگاہ شیشے کی دیوار کی دوسری طرف چلی گئی۔ وہاں مجھے وہی آدمی دکھائی دے گیا جس نے میرا بل ادا کیا تھا۔

”منصور!“ میں نے اس آدمی کی طرف اشارہ کیا ”یہ وہی آدمی ہے جس نے میرے پیسے دیے تھے۔“

منصور نے اسے دیکھا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ اتنی دیر میں وہ آدمی ہوش کے گیٹ سے باہر نکل چکا تھا۔ پھر میں نے منصور کو تیزی سے اس کے پیچھے جاتے ہوئے دیکھا۔ ذرا سی دیر میں وہ دونوں میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تھے۔

میں بہت بے چینی سے منصور کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔ منصور کچھ دیر بعد واپس آیا تھا۔ وہ میرے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔

”کیا ہوا، کیا کیا اس آدمی نے، کون ہے وہ؟“ میں نے کئی سوال ایک ساتھ کر ڈالے۔

”وہ مجھے نہیں مل سکا۔“ منصور نے بتایا ”وہ تیزی سے چلتا ہوا کسی طرف نکل گیا۔“

”خیر، یہ بتاؤ، تم نے اپنے گھر والوں سے کیا باتیں کیں، کیا کہا انہوں نے؟“ میں نے پوچھا۔

”راجیلہ! آپ جانتی ہیں کہ ہمارے رسوم و رواج کیا ہیں۔“ منصور نے کہا ”اول تو ہم کسی کو اپنے میں شامل ہی نہیں کرتے۔ اگر شامل بھی کرتے ہیں تو بہت جانچ پڑتال کے بعد۔“

”اور اگر شامل کر لیں تو پھر.....؟“

”اس کے بعد تو وہ ہمارے وجود کا حصہ بن جاتا ہے۔“ اس نے بتایا ”اس کے لیے پھر جان بھی حاضر ہوتی ہے۔“

”میرا سوال اپنی جگہ پر ہے۔“ میں نے کہا ”تم یہ بتاؤ میرے لیے کیا کہا انہوں نے؟“

”مجھ تو یہ ہے کہ میں تمہارے بارے میں بات ہی نہیں

کر سکا ہوں۔“ اس نے بتایا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟“

”ہاں۔“ اس نے ایک گہری سانس لی ”اس کے باوجود میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آیا ہوں۔ تم اس وقت میرے ساتھ چلو گی۔“

”اور اگر تمہارے گھر والوں نے مجھے گولی مار دی تو؟“

”ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ وہ چاہے جہیں میرے لیے قبول کر لیں یا نہ کریں، تمہاری حیثیت ایک مہمان کی سی ہوگی اور ہمارے یہاں مہمان کی بہت عزت کی جاتی ہے۔ ہم اس کے لیے جان تک دے سکتے ہیں۔“

”ایک تو میں ان باتوں سے تنگ آ چکی ہوں جان لے سکتے ہیں، جان دے سکتے ہیں۔“ میں چڑ کر بولی ”اس کے علاوہ کیا آتا ہے تم لوگوں کو؟“

”پیار کرنا آتا ہے۔“ وہ ہنس پڑا تھا ”کوئی پیار سے ایک قدم بڑھائے تو ہم اس کی طرف دوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ بہر حال اب دیر مت کرو، ہمیں وہاں جلدی پہنچنا ہے۔“

”دیکھو منصور۔“ مجھے نہ جانے کیوں ڈر سا لگ رہا ہے۔ ”میں نے کہا ”اگر مجھے قبول نہیں کیا گیا تو پھر میرے پاس سوائے موت کے اور کوئی راستہ نہیں رہ جاتا..... کیونکہ میں اپنی ساری کشتیاں جلا چکی ہوں۔“

”جانتا ہوں میں۔“ وہ بھی سنجیدہ ہو گیا تھا ”اگر انہوں نے تمہیں قبول نہیں کیا تو اس کے باوجود میں تمہارے ساتھ ہوں۔ جب تم محبت کی خاطر سب کچھ چھوڑ سکتی ہو تو کیا میں ایسا نہیں کر سکتا؟“

خوشی سے میرا چہرہ دمک اٹھا تھا۔

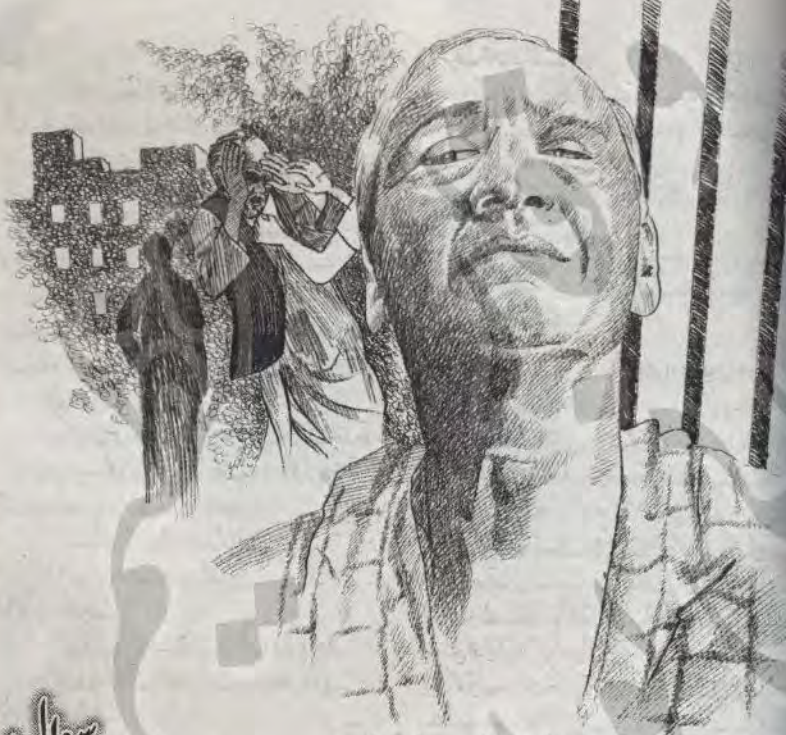
بہت دیر کے بعد، بہت دنوں کے بعد ایک امید بھری اور حوصلہ دلائی ہوئی خبر میرے پاس آئی تھی۔

”ایک بات بتاؤ۔“ منصور نے میری طرف دیکھا ”ہو سکتا ہے کہ ہمارے یہاں پہنچ کر تمہیں حالات بہت خراب دکھائی دیں تو ایسی صورت میں تمہارا کیا رویہ ہوگا۔ کیا تم خوف زدہ ہو کر مجھے چھوڑ جاؤ گی..... لیکن یاد رکھو کہ تمہاری طرح میں نے بھی اپنی کشتیاں جلا دی ہیں۔“

”تو پھر اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے؟“ میں نے کہا ”جہاں تم، وہاں میں۔“

”تو پھر چلو۔ ہمیں جلدی واپس بھی آتا ہے۔“

میں اس کے ساتھ چل پڑی۔ کسی عجیب بات تھی۔ وہ



سوال

جناب معراج رسول صاحب
مؤدبانہ سلام!

امید قوی ہے، بخیریت ہوں گے۔ اس بار خود پرگزرا ایک واقعہ ارسال
کردہا ہوں۔ امید ہے آپ اور آپ کے قارئین کو پسند آئے گا۔

منظر امام
(کراچی)

لمحوں تک یہی صورت حال رہی تھی پھر اس نے اپنے آپ کو
سنجھال لیا تھا۔ ”بہت بہت شکر یہ بیٹے۔“

”انتہائی بدتمیز اور وحشی انسان تھا جس نے آپ کو دھکا
دیا۔“

”جانے دو بیٹا۔ ہو سکتا ہے غلط فہمی میں دھکا دے دیا
ہو۔“

”غلط فہمی کسی میں تو دیکھ رہا تھا اس نے جان بوجھ کر
آپ کو زخمی کرنے کی کوشش کی تھی۔“ میں نے کہا۔ ”آپ

کہاں رہتے ہیں خلیں میں آپ کو لے جاؤں۔“

”ارے نہیں۔ میں خود چلا جاؤں گا۔“

”تکلف نہ کریں میں ہی پہنچا دوں گا۔ میرے پاس گاڑی

مجھ سے کچھ فاصلے پر وہ اس طرح کھڑا ہوا تھا جیسے
اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہو۔

اس نے خود کو گرنے سے بچانے کے لیے دیوار کا سہارا
لے رکھا تھا میں نے اس آدمی کو دیکھا تھا جو اس بے چارے کو

ایک زوردار دھکا دیتا ہوا کسی طرف بھاگ نکلا تھا۔

گرنے والا ایک بوڑھا آدمی تھا اور دھکا دے کر
بھاگنے والا ایک جوان آدمی تھا۔ بہت بڑی حرکت کی تھی اس کم

بخت نے۔ میں نے آگے بڑھ کر اس بوڑھے کو سہارا دے کر
کھڑا کر دیا۔

اسے شاید چکر آرہے تھے۔ اس کی پلکیں اس طرح
جھپک رہی تھیں جیسے اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہو۔ چند

منصور کی طرف تھا۔ نہ جانے وہ اپنے گھر والوں سے کیا کہہ
رہا ہوگا اور وہ لوگ اس سے کیا کہہ رہے ہوں گے، ہو سکتا تھا
کہ مجھے قبول کر لیا جائے یا ہو سکتا تھا کہ مجھے یہیں سے واپس
جانا پڑے۔

کچھ دیر بعد منصور واپس آ گیا۔ وہ مجھے اپنے گھر لے
جانے کے لیے آیا تھا لیکن بہت خاموش تھا ”کیا بات ہے
منصور!“ میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا۔
”ابھی کچھ نہیں کہہ سکا۔“ اس نے بتایا ”تم کو دیکھ کر
ہی فیصلہ کیا جائے گا۔“

اس کا گھر بھی زیادہ دور نہیں تھا۔ ہم وہاں پہنچے، منصور
نے دروازے پر دستک دی۔ اچانک تین آدمی بندوقیں
لے کر مکان سے باہر آ گئے۔

انہوں نے باہر آتے ہی گولیاں چلائی شروع کر دی
تھیں۔

”یہ کیا ہو رہا ہے منصور!“ میں نے خوف سے لرزتی
ہوئی آواز میں پوچھا۔

”یہ ہماری روایت ہے راحیلہ!“ اس نے مسکرا کر بتایا
”جب ہم کسی مہمان کا کھلے دل سے استقبال کرتے ہیں تو
اسی طرح بلاؤں کو دور کرنے کے لیے گولیاں چلاتے ہیں۔
وہ دیکھو، گولیاں چلانے والوں میں ایک میرا باپ ہے اور وہ
دونوں میرے بڑے بھائی ہیں اور تم نے اس آدمی کو تو پہچان
لیا ہوگا۔“ اس نے ایک بندوق بردار کی طرف اشارہ کیا۔

”ہاں، ہاں..... یہ شاید وہی ہے جس نے ہوٹل کا بل
ادا کیا تھا۔“

”ہاں، یہ میرا بڑا بھائی ہے۔ تم کو تو ہمارے گھر والوں
نے اسی وقت قبول کر لیا تھا جب میں نے آ کر بتایا تھا، پھر
میرے بڑے بھائی نے ہوٹل جا کر تمہارا بل ادا کر دیا اور دو
دنوں تک تمہارے آس پاس تمہاری حفاظت کی غرض سے
منڈلا رہا۔“

”میرے خدا! کیا تم یہ سب جانتے تھے؟“

”کیوں نہیں؟“ وہ مسکرایا ”ہم بلوچ لوگ بھی چھوٹی
موتی شرارتیں کر سکتے ہیں ناں۔ وہ دیکھو، میری ماں اور
بہن تمہارے لیے خاص دوپٹے لے کر آ رہی ہیں۔ وہ دوپٹا

تمہارے سر پر ڈال کر تمہیں اندر لے جایا جائے گا۔“

اور اس وقت میں رو رہی تھی اور یہ آنسو خوشی کے
تھے، تشکر کے تھے۔

ستمبر 2012ء

میرے لیے بالکل اجنبی تھا۔ کچھ دنوں پہلے تک میں اسے
جانتی بھی نہیں تھی، اس سے میرا کوئی تہذیبی، کوئی لسانی رشتہ
بھی نہیں تھا۔ ہم الگ الگ شہروں میں رہا کرتے، اس کے
باوجود میں نے اس پر مکمل بھروسہ کر لیا تھا۔

اس کا چہرہ بتاتا تھا کہ وہ بھروسے کے قابل ہے۔ اس کا
لہجہ، اس کے سچے ہونے کی گواہی دیا کرتا تھا۔ اس نے جو کہا
تھا کہ اگر اس کے گھر والوں نے کوئی ہنگامہ کیا تو وہ مجھے تنہا
نہیں چھوڑے گا، مجھے اس بات کا بھی یقین تھا اسی لیے میں
اس کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔

اس نے ایک عیسیٰ کر لی تھی۔

ہم کو نہ شہر کو پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ نہ جانے کتنی دور کا
سفر تھا لیکن وہ میرے ساتھ تھا۔ میں نے اس کی ہدایت پر
اس طرح حجاب لے لیا تھا کہ میرا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

بالآخر ہم ایک بستی میں آ گئے۔ یہاں اس نے عیسیٰ
فارغ کر دی تھی۔

اس بستی کے مرد، عورتیں اور بچے ہمیں بہت حیرت
سے دیکھ رہے تھے۔

منصور تو خیر ان ہی کا تھا۔ لیکن میں اجنبی تھی۔ اس لیے
نگاہیں میری طرف مرکوز تھیں۔ منصور مجھے ایک دو منزلہ مکان
کے پاس لے آیا تھا۔

”کیا یہی تمہارا مکان ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں، یہ میرے ایک دوست زمان کا مکان ہے۔“

اس نے بتایا۔

”تم یہاں کیوں آئے ہو؟“

”گھبراؤ نہیں۔ تم یہاں کچھ دیر رہو گی۔“ اس نے کہا

”اس دوران..... اپنے گھر والوں سے بات کر لوں گا۔ پھر
جو ہوگا وہ تمہارے سامنے ہوگا۔“

اس نے دروازے پر دستک دی، اس کا دوست زمان
باہر آ گیا۔ شاید منصور نے اسے ساری بات سمجھا رکھی تھی۔

اسی لیے وہ بہت احترام کے ساتھ مجھے اندر لے گیا۔
اندر اس کے گھر کی خواتین تھیں۔ وہ مجھے ان کے
درمیان چھوڑ گیا تھا۔

زمان کے گھر کی خواتین بہت مہمان نواز ثابت ہو رہی
تھیں۔ میرے منع کرنے کے باوجود انہوں نے میرے
سامنے کھانے پینے کی بے شمار چیزیں رکھ دیں۔

اس وقت مجھ سے کچھ کھایا ہی نہیں جا رہا تھا۔ میرا دل

ہے۔

”کچھ دیر کے تکلف کے بعد اس نے میری بات مان لی تھی۔ میں نے اسے اپنی گاڑی میں بٹھا دیا اور اس کے بتائے ہوئے پتے پر اسے لے کر پہنچ گیا تھا۔ اس کا گھر زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔

یہ ایک بہت چھوٹا سا مکان تھا جس کی حالت بہت خستہ ہو رہی تھی۔ میں نے سہارا دے کر اسے گاڑی سے اتارا اور دروازے تک لے آیا جس پر ایک تالا پڑا ہوا تھا۔ اس نے اپنی جیب سے چابی نکال کر دروازہ کھولا تھا۔ ”آؤ بیٹا اندر آ جاؤ۔“ اس نے دعوت دی۔ ”کچھ دیر بیٹھ کر چلے جانا۔“

میں اس کے گھر میں آ گیا۔

دو کمروں کا ایک چھوٹا سا گھر، ایک بیٹھک اور دوسرا کمر شاید خواب گاہ کے طور پر استعمال ہوتا ہوگا۔ ”بیٹا تم بیٹھو میں تمہارے لیے چائے لے کر آتا ہوں۔“

”ارے نہیں آپ زحمت نہ کریں۔“

”اس میں زحمت کیسی مجھے خوشی ہوگی اگر تم میرے ساتھ چائے پیو گے۔“

”کیا آپ اکیلے رہتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں بیٹا بالکل اکیلا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”خیر تم بیٹھو میں ابھی آیا۔“

کچھ دیر بعد وہ چائے اور کٹ لے آیا تھا۔ مجھے

شرمندگی ہونے لگی تھی کہ میری وجہ سے اس بے چارے کو

زحمت اٹھانی پڑی۔ بہر حال، چائے پینے کے دوران میں نے

اس سے پوچھ لیا۔ ”محترم کیا آپ کا کوئی بھی نہیں ہے؟“

”ایسا نہ کہو سب ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

ہمارے درمیان خاموشی ہو گئی۔ میں چائے پیتا رہا۔

کچھ دیر بعد اس نے خود بتایا۔ ”میرے دو بیٹے ہیں اور دونوں

اسی شہر میں رہتے ہیں۔“

”اوہ آپ تہا زنگی گزرا رہے ہیں۔“

”ہاں، مجھے تمہارے بچے کی عادت ہے۔“ اس نے کہا۔

”محترم۔“ میرا آپ سے کوئی ایسا تعلق تو نہیں ہے کہ

میں آپ کے حالات جاننے کے لیے زور دے سکوں۔ لیکن

مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا ہے کیونکہ اس عمر میں آپ کو تنہا

نہیں رہنا چاہیے۔“

”کیا بتاؤں بیٹے۔“ بوڑھے نے ایک گہری سانس

لی۔ ”تم نے جس کو دکھا دیتے ہوئے دیکھا تھا وہ میرا بیٹا تھا۔“

”کیا.....!“ میں تقریباً اچھل پڑا تھا۔ ”آپ کا بیٹا۔“

آپ کی اولاد۔“

”ہاں وہ ایسا ہی کرتا ہے۔ راستے میں چار ہا ہوں تو کبھی دھکا دے کر گرا دیا یا کبھی پکڑا چھینک دیا یا کبھی کوئی اور حرکت کر دی۔“

”کیا اس بے غیرت کو شرم نہیں آتی جو اپنے باپ کے

ساتھ ایسی حرکتیں کرتا ہے۔“

”اس کا باپ بھی تو ایسا ہی ہے بیٹا۔“ اس نے ایک

گہری سانس لی۔ ”یہ تو مکافات عمل ہے جو میں نے کیا ہے اس

کا انجام تو یہی ہوتا تھا۔“

”محترم کچھ بھی ہو اولاد تو پھر اولاد ہوتی ہے۔ وہ ایسا

شرمنگ سلوک نہیں کر سکتی۔“

”اسے کرنا چاہیے کیونکہ میں اسی قابل ہوں۔“

میں اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ نہ جانے اس نے اپنی

اولادوں کے ساتھ کیا کیا ہوگا؟ میں نے ایسا کیس پہلے ہی

نہیں دیکھا تھا یہ ایک حیرت انگیز جوشن تھی۔

ہر انسان کے ساتھ کوئی نہ کوئی کہانی وابستہ ہوتی ہے۔

اس بوڑھے کے ساتھ بھی تھی۔ اب تو مجھے اس کے بارے میں

جاننے کا شوق ہو گیا تھا۔ ”محترم اگر مناسب سمجھیں تو مجھے بتا

دیں کہ آپ نے ایسا کون سا جرم کر دیا تھا جس پر یہ سب ہو رہا

ہے آپ کے ساتھ؟“

”بیٹا تم اتنی محبت سے پوچھ رہے ہو تو اپنی کہانی سنا دیتا

ہوں۔“ اس نے کچھ دیر کے بعد کہا۔ ”میں بہت پیسے والا آدمی

تھا، بہت دولت تھی میرے پاس، ایک بہت بڑا بزنس تھا میرا

لیکن میں نے خدا کی ان نعمتوں کا بھی شکر ادا نہیں کیا بلکہ یہ

سمجھتا تھا کہ یہ سب کچھ میں نے اپنی محنت اور تدبیر سے حاصل

کیا ہے۔“

اس زمانے میں کسی انسان کی میرے نزدیک کوئی

اہمیت نہیں تھی۔ سب کچھ میں اپنے آپ کو سمجھتا تھا۔ مجھے یاد

ہے کہ میرے دفتر میں جو لوگ کام کرتے تھے میں ان سے اس

طرح سلوک کیا کرتا جو شاید جانوروں کے ساتھ بھی نہ کرتا ہو۔

ذرا ذرا سی بات پر دھکے دے کر دفتر سے نکال دیا کرتا تھا۔

گالیاں دیتا تھا۔“

”یہ تو بہت نامناسب بات تھی۔“

”وہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں پاگل ہو رہا تھا میں، پیسے

نے میرا دماغ خراب کر دیا تھا۔ میرے والدین کا انتقال ہو چکا

تھا ورنہ شاید ان کے ساتھ بھی میرا یہی سلوک ہوتا۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ والدین کے ساتھ بھی

آپ ایسا ہی کرتے؟“

”ہاں، کیونکہ میرے ماں باپ غریب طبقے کے افراد

تھے اور میرے تے تک غریب ہی رہے۔ جبکہ خود مجھے غربت

پہنچ نہیں گئی، غریب پسند نہیں تھے۔ میں انہیں حقارت سے

دیکھتا کرتا تھا۔ حالانکہ خود میں بھی غریب ہی تھا لیکن میرے

ذخائر کا کچھ اور تھے میں نے بچپن ہی سے ان لوگوں سے

دوستانہ تعلقات جو پیسے والے تھے۔ شاید انہی کی صحبت میں میرا

دماغ خراب ہو گیا تھا۔“

وہ بوڑھا بڑی روانی سے اپنے حالات بتاتے جا رہا تھا

جیسے برسوں کا غبار صاف کر رہا ہو۔

”جوان ہونے کے بعد میں نے پیسے کے حصول کے

لیے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیے۔ وہ سب کچھ کیا جس کا

مقصد پیسے حاصل کرنا تھا۔ جائز ہو یا ناجائز مجھے اس کی کوئی پروا

نہیں تھی بس پیسا چاہیے تھا۔ اس کے علاوہ میرے نزدیک اور

کوئی ویلیو نہیں تھی۔ خدا محاف کرے۔ میں نے امیر گھرانوں

کی لڑکیوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر انہیں بلیک میل بھی

کیا ہے۔ ان سے ہر ممکنے ایک لک بڑی رقم لے لیا کرتا تھا۔“

”یہ تو آپ بالکل کی ظلم کی کہانی سنارہے ہیں۔“

”ہاں بیٹا، میں نے ایسی ہی زندگی گزاری ہے۔“ اس

نے کہا۔ ”صرف ایک ہی جذبہ ایک ہی خناس۔ پیسا پیسا اور

پیرا اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں، کوئی ویلیو نہیں۔ کوئی رشتہ

نہیں۔ انتہائی بے رحمی کے ساتھ میں نے پیسے جمع کیے۔ قسمت

مجھے میرا ساتھ دیتی رہی۔“

”میں نے اسے اسٹاک تک کی ہے کیونکہ اس میں بہت کم

وقت میں بہت دولت جمع ہو جاتی ہے۔ کوئی اخلاقی پابندی میں

نے کبھی قبول نہیں کی۔ یہ ایک بہت طویل داستان ہے کہ

میرے پاس دولت کس طرح آئی۔ میں نے کتنوں کو دھوکے

دیے۔ کتنوں کو برباد کیا ہے لیکن مجھے کسی کی پروا نہیں ہوتی

تھی۔ میں بالکل پاگل ہو رہا تھا۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ میں نے

اپنا کاروبار شروع کر دیا کیونکہ میرے پاس وہ سارے طریقے

تھے جن سے دھوکہ دینا جاسکتا ہے، لہذا کاروبار ترقی کرتا چلا

گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک بہت بڑا دفتر خرید لیا میں نے اور

اس زمانے میں یہ سوچ کر شکر ادا کیا کہ میرے والدین کا

انتقال ہو چکا ہے۔“

”کیا.....!“ میں حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ ”یعنی آپ کو

اس بات پر خوشی ہوئی تھی۔“

”ہاں۔ کیونکہ وہ دونوں میرے راستے کی رکاوٹ

تھے۔“ اس نے بتایا۔ ”دونوں ہی مجھے اخلاقیات پر پیکر دیا کرتے تھے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ میں جو کچھ بھی کرتا پھر رہا ہوں وہ بہت غلط ہے۔ انسان کو دولت کے لیے حیوان نہیں بن جانا چاہیے۔ اسی لیے مجھے ان دونوں کے مرنے پر زیادہ دکھ نہیں ہوا تھا۔“

”میرا صرف ایک چھوٹا بھائی تھا۔ بے چارہ غریب آدمی، میں نے کبھی اس کی پروا نہیں کی بلکہ اس کو اپنے دفتر میں جاب تک نہیں دی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ جس طرح میں نے اپنے لیے راستے بنائے ہیں۔ اسی طرح وہ بھی بنائے۔ میں اس کا ساتھ نہیں دوں گا۔“

”آپ تو واقعی بے رحم انسان تھے۔“ میں نے کہا۔

”نفرت محسوس ہو رہی ہے نا مجھ سے۔ یہی تو میرا کردار

رہا ہے۔ اسی لیے تو میرے دونوں بیٹوں کا بھی برتاؤ ہے

میرے ساتھ، مجھ جیسے آدمی سے کون نفرت نہیں کرے گا؟“

”آگے بتائیں۔ آگے کیا ہوا؟“

”بہر حال، جب میرے پاس بہت پیسا آ گیا تو میں

نے ایک امیر گھرانے کی لڑکی سے شادی کر لی۔“ اس نے بتایا۔

”حالانکہ ایک لڑکی مجھ سے بے پناہ محبت کرتی تھی لیکن اس کا

تعلق غریب گھرانے سے تھا۔ اسی لیے میں نے اسے ٹھکرا دیا

اور ایک امیر لڑکی سے شادی کر لی جس میں صرف یہی خوبی تھی

کہ اس کا تعلق ایک امیر گھرانے سے تھا۔ بس، اس کے علاوہ

اور کوئی بات نہیں تھی اس میں، اس سے میرے دو بیٹے پیدا

ہوئے۔ وقت گزرتا گیا۔ دونوں بڑے ہو گئے۔ تعلیم حاصل کی

اور دونوں ہی میری توقع کے خلاف نکلے۔ ان دونوں نے ایسی

حرکت کی جو میرے مزاج اور اصول کے خلاف تھی۔

”کیا مطلب؟“

”ان دونوں نے غریب لڑکیوں سے شادیاں۔۔۔

کر لیں۔“ اس نے بتایا۔ ”مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ وہ

لڑکیاں شریف اور نیک ہیں اصل خرابی یہ تھی کہ دونوں کا تعلق

غریب گھرانوں سے تھا۔“

اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کی زندگی کا سارا فلسفہ دھرا

رہ گیا۔“

”ہاں۔ سارا فلسفہ۔“ بوڑھے نے ایک گہری سانس

لی۔ ”ان دونوں نے جو کچھ کیا میں کبھی اس کی اجازت نہیں

دے سکتا تھا۔ ان کے فیصلوں اور ان کی اس حرکت نے میرے

پورے وجود میں آگے کی لگا دی تھی۔ میں غصے سے پاگل ہو گیا

تھا۔ دل تو یہی چاہتا تھا کہ فوری طور ان دونوں کو گولیوں سے

پرائز باند

عذرا رسول صاحبہ
السلام علیکم!

میں نے ایک معمولی سی جھونپڑی میں جنم لیا۔ وہیں پلی بڑھی لیکن آج ڈیفنس جیسے علاقے میں رہتی ہوں۔ کروڑوں کی مالک ہوں۔ یہ تبدیلی کیسے آئی، یہی آپ کو بتانا چاہ رہی ہوں۔ پڑھیں، پسند آجائے تو نزدیکی شمارے میں شائع کردیں۔

عالیہ ریاض
(کراچی)

میں ایک غریب لڑکی تھی۔ میں ہی کیا۔ میرے آس پاس جتنے بھی لوگ تھے۔ وہ سب غریب زدہ تھے۔ دوست۔ رشتے دار، ملنے جلنے والے سب کے سب غریب۔ میں نے یہ کبھی نہ سنا کہ میرا فلاں رشتے دار امیر تھا۔ یا فلاں رشتے دار کوئی بڑا آفیسر تھا۔ ایسا کوئی بھی نہیں تھا ہمارے خاندان میں۔

سب کے سب یوں ہی سے تھے۔ مزدور۔ ٹیکسری میں کام کرنے والے۔ درزی، دھوبی وغیرہ۔ اور نہ ہی



خود بتاؤ کیا میں ایسا نہیں ہوں؟

”ہاں، آپ ایسے ہی ہیں۔“ میں نے اپنی گردن ہلائی۔ ”بس اب آپ کے حال پر خدا رحم کرے۔ شاید خدا آپ کو معاف کر دے۔“

میں بہت بو جھل ہو کر اس بوڑھے کے مکان سے باہر آ گیا۔ مجھے اس کی داستان سننے کے بعد اس سے نفرت ہی محسوس ہونے لگی تھی۔ واقعی اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہو رہا تھا وہ اس کے گناہوں کی سزا تھی۔

میں اپنی گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا کہ ایک آدمی نے میرا راستہ روک لیا۔ وہ ایک بوڑھا انسان تھا۔ ”کیوں برخوردار کیا اس کی کہانی سن کر آ رہے ہو؟“

”جی ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔

”لیکن اس نے یہ تو نہیں بتایا ہو گا کہ اس نے اپنی بہویوں کے ساتھ ساتھ اپنے دونوں بیٹوں کو بھی مروادیا تھا۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ اس کے بیٹے تو زندہ ہیں۔“

”یہی تو بات ہے۔“ اس بوڑھے نے کہا۔ ”اس کم بخت کی ہر بات سچی ہے اس نے جو کچھ بتایا ہو گا اس میں کوئی جھوٹ نہیں ہے صرف یہ کہ اس کے دونوں بیٹے زندہ ہیں کیونکہ ان کا بھی قاتل یہی ہے۔“

”خدا کی پناہ۔“ تو پھر وہ لوگ جو اسے دھکے دیتے ہیں مارے ہیں۔“

”وہ کرائے کے لوگ ہوتے ہیں۔“ اس نے بتایا۔ ”یہ کم بخت خود انہیں پیسے دیتا ہے کہ اس کے ساتھ ایسا کیا جائے شاید اس طرح وہ یہ سمجھتا ہے کہ خدا اس کے بھیا تک گناہوں کو معاف کر دے لیکن ایسا نہیں ہو گا اس کے ساتھ اور بھی بہت کچھ ہوتا رہے گا بہت کچھ۔“

وہ بوڑھا آگے بڑھ گیا اور میں سوچتا رہ گیا۔

کیسے کیسے کردار راہ چلتے ہوئے سامنے آ جاتے ہیں۔ کیسی کیسی کہانیاں، ہمیں احساس دلاتی ہیں کہ انسان کتنا بے رحم اور کتنا بھیا تک ہوتا ہے۔

ایک چہرے پر کتنے چہرے ہوتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ اس قسم کی تلافیوں سے کیا جرائم اور گناہوں کے عذاب کم ہو جاتے ہیں۔

اب یہ معاملہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ ہم تو صرف قیاس آرائیاں ہی کر سکتے ہیں۔

محبت

اُڑا دوں لیکن وقتی طور پر میں خاموش ہو کر رہ گیا۔ حالانکہ دونوں بیٹوں نے اپنی بیویوں کے ساتھ آ کر مجھ سے بہت معافیاں مانگیں لیکن میں نے دل سے انہیں معاف نہیں کیا بلکہ ان چاروں کے خلاف اپنے دل میں غصے اور نفرت کی آگ کو پروان چڑھا رہا تھا۔

میں انہیں سزا دینا چاہتا تھا۔ خاص طور پر ان لڑکیوں کو جنہوں نے میرے بیٹوں سے شادیاں کی تھیں۔ اپنی حقیقت کو جانے بغیر انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ غریب گھرانوں کی ہیں پھر ان میں اتنی جرأت کہاں سے آئی کہ وہ میرے بیٹوں کو بھاس کر ان سے شادیاں کر لیں۔ میرے نزدیک یہ اتنی بڑی گستاخی تھی کہ جس کو کسی صورت معاف نہیں کیا جاسکتا تھا۔ لہذا میں نے ان دونوں کو قتل کر دیا۔“ اس نے بتایا۔

”کیا.....!“ میں اُچھل پڑا تھا۔ ”قتل کر دیا؟“

”ہاں۔“ بوڑھے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ ”اس زمانے میں میرے لیے یہ سب بہت آسان تھا کیونکہ میرے پاس دولت تھی اور میں کرائے کے قاتلوں کو خرید سکتا تھا اور میں نے خرید لیا۔ بد قسمتی یہ ہوئی کہ ان دونوں کی موت چھپی نہیں رہ سکی۔ پتا چل گیا تھا کہ ان دونوں کے قتل میں کس کا ہاتھ ہے۔“

میرے دونوں بیٹوں نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ کیونکہ اب ہمارے درمیان رشتوں کی ویلیو ختم ہو چکی تھیں۔ اب میں ایک مجرم تھا۔ بہر حال، اس کے بعد میں گرفتار ہوا۔ اور یہیں سے میری بربادی کی کہانی شروع ہو گئی۔ میرا کاروبار ختم ہو گیا۔ مجھے دس سال کی سزا ہوئی تھی کیونکہ یہ جرم میں نے براہ راست نہیں کیا تھا۔ پھر طبیعت کی خرابی اور دوسرے مسائل۔ مجھے کچھ دنوں کی رعایت دے دی گئی تھی اور جب میں جیل سے باہر آیا تو میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ کاروبار دونوں بیٹوں کے قبضے میں چلا گیا تھا۔ میں ہر لحاظ سے ایک خالی انسان تھا۔

بوڑھا اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ میں حیران ہو کر اس بوڑھے کو دیکھ رہا تھا جو کسی طرح بھی قاتل رہ نہیں تھا۔ جس نے دولت کے غرور میں آ کر بہت بڑے بڑے جرائم کیے تھے۔ جس نے انسان کو انسان نہیں سمجھا تھا۔

”تو آپ کے وہ دونوں بیٹے آپ کے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہیں۔“

”ہاں۔“ اس نے پھر ایک گہری سانس لی۔ ”کیونکہ میں اسی قاتل ہوں کہ مجھے راہ چلتے ہوئے ذلیل کیا جائے۔ تم

ہمارے خاندان میں کوئی زیادہ تعلیم یافتہ تھا۔ اور ہم جہاں رہتے تھے۔ ظاہر ہے۔ وہاں بھی سب ہم جیسے تھے۔ ہماری کیکڑی کے جنہوں نے بھی خواب میں بھی اچھے دن نہیں دیکھے ہوں گے۔

میرا خیال ہے کہ یہ اتفاق ہی ہوتا ہے کہ کسی غریب خاندان کا کوئی بندہ ترقی کرتا چلا جائے۔ عام طور پر سب در نسل غربت ہی چلتی رہتی ہے۔

اور جو غریب نہیں رہتا کسی طرح اس کی ترقی ہو جاتی ہے۔ اس کے پاس پیسے آ جاتے ہیں تو پھر وہ خاندان والوں سے الگ ہو جاتا ہے۔ وہ ظاہر ہی نہیں کرتا کہ اس کا تعلق کس خاندان سے ہے۔

تو میں ایسے گھر میں پیدا ہوئی۔ ایسے ماحول میں پرورش پائی۔ میرٹھ تک کسی نہ کسی طرح تعلیم بھی حاصل کر لی۔ ویسے مجھے کھینے پڑھنے کا شوق رہا ہے۔ درسی کتابوں سے ہٹ کر بھی ڈائجسٹ وغیرہ پڑھتی رہتی تھی۔ یہ ڈائجسٹ ٹیلیوں پر بہت سستلے جایا کرتے۔

میری صورت شکل بھی مناسب تھی۔ میں خود کو خوبصورت تو نہیں کہوں گی لیکن میں بہت سی لڑکیوں سے بہتر تھی۔ اسی لئے سب کی نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ میری اماں میرے لئے خواب دیکھا کرتیں کہ کوئی شہزادہ مجھے اپنانے کے لئے آیا ہے جبکہ میں اچھی طرح جانتی تھی کہ ان چرائی اور گندی جگہوں میں شہزادے نہیں آیا کرتے۔

میرا ارادہ کالج میں بھی پڑھنے کا تھا لیکن ماں باپ کے پاس اتنے پیسے ہی نہیں تھے کہ وہ مجھے اچھی تعلیم دلوا سکتے۔ ان ہی دنوں میرے ساتھ ایک عجیب واقعہ ہوا۔ مجھے راستے میں ایک پرائز بانڈ گرا ہوا مل گیا تھا۔ میں یہ جانتی تو تھی کہ کانڈ کے اس ٹکڑے کو پرائز بانڈ کہتے ہیں لیکن بھی لینے کی تو یقین نہیں ہوئی تھی۔ وہ بانڈ 750 روپے کا تھا۔

میں اسے اپنے گھر لے آئی۔ اب ایک کنکشن میں مبتلا ہوئی تھی کیا کروں اس بانڈ کا۔ نہ جانے کس کا ہوگا؟ کسی نے کتنی چاہت اور امیدوں کے ساتھ خریدا ہوگا؟ اس نے خواب دیکھے ہوں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔

ہوسکتا ہے کہ وہ مجھے ہی کسی آدمی کا ہو لیکن مجھے میں کس کے پاس اتنی رقم تھی کہ وہ 750 روپے والا بانڈ خرید سکتا۔ کیا میں گھر والوں کو بتا دوں؟

بہت سوچ کر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں ابھی کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ خاموشی سے یہ دیکھوں گی کہ مجھے میں کس گھر سے شوق اٹھتا ہے۔ کون اپنے گمشدہ بانڈ کی تلاش میں ہے؟

اگر کوئی سامنے آ گیا تو ٹھیک ہے۔ میں یہ بانڈ اسے واپس کر دوں گی۔ ورنہ خاموش رہوں گی۔ کسی کو بھی نہیں بتاؤں گی۔ اپنے گھر والوں کو بھی نہیں۔ اگر کوئی انعام نہ بھی لکھے تب بھی بانڈ کی شکل میں۔ 750 روپے میرے پاس آ گئے تھے۔

کئی دن گزر گئے۔ کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آئی اور نہ یہ سننے میں آیا کہ کسی کا بانڈ گم ہو گیا ہے۔ ورنہ وہ شخص تو پورا محلہ سر اٹھا لیتا۔

دس دنوں کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ بانڈ میں اپنے پاس ہی رکھوں گی۔ میں نے ایک پرچی پر اس کا نمبر نوٹ کر لیا تھا اور وہ پرچی ہر وقت اپنے پاس رکھتی تھی۔

خدا جانے کس طرح مجھے یہ سارے طریقے آتے جا رہے تھے حالانکہ ایسی باتوں سے مجھے ہمارا واسطہ نہیں پڑا تھا لیکن اب میں پرائز بانڈ کے نمبر بھی دیکھنے لگی تھی۔

اس کے لئے میں بک اسٹال پر چلی جاتی۔ جہاں پانچ روپیوں میں نمبروں کی لسٹ مل جاتی۔ وہیں کھڑے کھڑے نمبر دیکھتی کیونکہ وہ نمبر کو میرے ذہن میں بسا ہوا تھا۔ پھر لسٹ اسی اسٹال والے کے حوالے کر کے واپس آ جاتی۔

اور ایک دن اچانک وہ نمبر آئی گیا۔ پانچ لاکھ روپے۔ اس نمبر پر پانچ لاکھ کا انعام ملا تھا۔ پورے پانچ لاکھ۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر درجنوں بار اس نمبر کو دیکھا۔ اپنے ذہن میں دہرائی رہی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ مجھے نمبر غلط یاد رہا ہو۔

میں وہ لسٹ گھر لے آئی اور خاموشی کے ساتھ پرائز بانڈ سے ملا کر دیکھا۔ بالکل وہی نمبر اور پانچ لاکھ روپے۔ میرے پورے خاندان میں سے کسی نے اتنی رقم ایک ساتھ نہیں دیکھی ہوگی۔ میں اپنی پرداری، اپنے خاندان بلکہ اپنے محلے کی سب سے امیر لڑکی تھی۔

میرے خدا۔ کیا کروں میں۔ کیا سب کو بتا دوں۔ لیکن میں نے پھر بھی کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ یہ میرا دل ہی جانتا ہے کہ میں نے کس طرح خوشی کی یہ خبر چھپائے رکھی ہوگی۔ اب اور بھی کئی طرح کے مرحلے تھے۔ میں یہ سب

کچھ بہت ہوشیاری اور رازداری سے کرنا چاہتی تھی۔ نہ جانے مجھ میں اتنی عقل کہاں سے آئی تھی؟ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ میں نے پیدا ہوتے ہی صرف غربت دیکھی تھی اور اب اس حال سے نکلتا چاہتی تھی۔ اسی لئے مجھے میں اتنا شعور بھی آ گیا تھا۔

میرے محلے میں ریاض نام کا ایک لڑکا تھا۔ نیشن بڑھا یا کرتا اور بے انتہا شریف۔ میں نے اس کے بارے میں کبھی کوئی ایسی ویسی بات نہیں سنی تھی۔ میں نے اسی کو ساتھ ملانے کا ارادہ کر لیا۔

ایک شام وہ راستے میں مل گیا۔ ”ریاض صاحب۔ مجھے آپ سے ایک کام ہے۔“ میں نے کہا۔

وہ حیران ہو کر دیکھنے لگا تھا۔ ”جی فرمائیں۔“ اکثر راہ چلتے ہوئے ہم ایک دوسرے کو سلام تو کر لیتے تھے۔ لیکن اس سے زیادہ اور کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ وہ اسی لئے حیران ہو رہا تھا۔

”کل آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔“ میں نے بتایا۔ ”لیکن کسی کو بتائے گا نہیں اور ہم محلے سے باہر نہیں گے۔ یہ بہت رازداری کا کام ہے۔ پورے محلے میں آپ ہی ایسے آدمی نظر آتے ہیں جس پر میں بھروسہ کر سکتی ہوں۔“

”ویسے خبریت تو ہے نا؟“ ”ہاں۔ ہاں بالکل خبریت ہے۔“ میں نے کہا۔

”کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہے۔ آپ کل صبح نو بجے بس اسٹاپ پر آ جائے گا۔ میں بھی آ جاؤں گی۔“ مختصر یہ کہ ریاض نے اس معاملے میں میرا بہت ساتھ دیا۔

میں نے اسے ساتھ لے جا کر پانچ لاکھ روپے لکھوائے۔ پھر اس کی مدد سے بینک اکاؤنٹ کھلوا دیا اور چار لاکھ اس میں جمع کر کے ایک لاکھ کے اور بانڈ خرید لئے۔

میں اب اپنی قسمت کو بار بار آدنا چاہتی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین ہو گیا تھا کہ خدا میرا ساتھ دے گا اور میرے حالات بدلتے جائیں گے۔

بے چارہ ریاض حیران ہی ہو رہا تھا لیکن وہ اتنا شریف انسان تھا کہ خاموش ہی رہا۔ میں نے اس کا بہت بہت شکر یہ ادا کیا تھا۔

اتفاق دیکھیں کہ میرے کئی نمبر اگلی قرعہ اندازی میں لگ گئے اور میرے پاس پورے پچیس لاکھ ہو گئے۔

پانچ لاکھ پہلے کے اور میں لاکھ کے نئے انعامات۔ میں تو بالکل ہو کر رہ گئی تھی۔ پچیس لاکھ۔ کتنی بڑی رقم تھی، ہم جیسے لوگ اس سے اپنا مستقبل بنا سکتے تھے۔ اتنی بڑی رقم تو پورے خاندان میں کسی کے پاس نہیں ہوگی۔ قسمت مجھ پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہوئی تھی۔

یہ میں لاکھ بھی میں نے ریاض کے ساتھ ہی جا کر لکھوائے تھے اور اسی کے ساتھ جا کر اپنے اکاؤنٹ میں جمع کر دوائے تھے۔ میں اب پچیس لاکھ کی مالک تھی۔

گھر کا یہ حال تھا کہ دس دس روپیوں کے لئے سب پریشان رہتے۔ کبھی گھر میں آنا نہیں ہے۔ کبھی چینی نہیں ہے۔ کبھی دواؤں کے پیسے نہیں ہیں لیکن میں اس وقت بھی خاموش رہی تھی۔

میں ابھی کچھ اور بھی حاصل کر لینا چاہتی تھی۔ یہ سب میری ابتدا تھی۔

میں نے اس سلسلے میں ریاض ہی سے مشورہ کیا۔ ”ریاض صاحب۔ میں کوئی کاروبار کرنا چاہتی ہوں۔ خاموشی کے ساتھ۔ کیا آپ مجھے کوئی مشورہ دے سکتے ہیں۔“

”میں کیا مشورہ دوں۔“ ”کچھ بھی۔ کیونکہ میں آپ پر بہت بھروسہ کر رہی ہوں۔“

”دیکھئے دو چار دنوں کے بعد سوچ کر بتاؤں گا۔“ اس دوران گھر میں میرا ایک رشتہ آیا تھا۔ لڑکے کی ورزی کی دکان تھی۔ ظاہر ہے۔ میں نے اس رشتے سے انکار کر دیا ہوگا کیونکہ اب تو میں کچھ اور ہو چکی تھی۔

اما اور امی نے بہت شور کیا۔ بھائی نے بھی آنکھیں دکھائیں لیکن میں اپنی بات پراڑی رہی۔ میں کبھی کبھی رہی کہ مجھے ابھی شادی نہیں کرنی۔

چار دنوں کے بعد ریاض سے ملی تو اس نے بتایا۔ ”ایک اچھا موقع ہے لیکن اس کے لئے بعد میں بہت محنت کرنی ہوگی۔“

”بتائیں۔ کیا موقع ہے۔“ ”ایک اسکول بک رہا ہے۔ اسکول اگرچہ چھوٹا سا ہے۔ لیکن بہت موقع کی جگہ پر ہے۔ اگر اس پر محنت کی جائے۔ سلیقے سے چلایا جائے تو بہت کامیاب ہو سکتا ہے۔“

یہ تو بہت بڑا موقع تھا۔ میں نے بھی خواب بھی اس قسم کے نہیں دیکھے تھے کہ میں کسی اسکول... میں پڑھا رہی

ہوں لیکن اب تو اسکول کی مالک بننے کی بات ہو رہی تھی۔
 ”کیا مانگ رہے ہیں۔“ میں نے پوچھا۔
 ”میں لاکھ روپے۔“ ریاض نے بتایا۔ ”وہ لوگ
 باہر جا رہے ہیں۔ اسی لئے چلتا ہوا اسکول بچ رہے ہیں۔“
 ”کیا میں اس اسکول کو کچھ کیتی ہوں۔“
 ”کیوں نہیں۔ ابھی چلیں۔“

اسکول مجھے پسند آیا حالانکہ بچے زیادہ نہیں تھے۔
 لیکن جگہ بہت موافق کی تھی۔ چاروں طرف فلیٹس بنے
 ہوئے تھے۔ اسکول کی عمارت چار کمروں کی تھی۔ پرائمری
 تک تعلیم دی جاتی تھی۔ اس لحاظ سے مکان اور فرنیچر سمیت
 میں لاکھ میں سستا ہی مل رہا تھا۔

”ریاض صاحب سودا کر لیں اس کا۔“ میں نے کہا۔
 اور دس بارہ دنوں کے بعد وہ اسکول میرا ہو چکا تھا۔
 کورٹ جانا پڑا تھا۔ میرے نام رجسٹری ہوئی تھی۔ جب
 اسکول میرے نام ہو گیا تو میں نے ریاض سے کہا۔ ”ریاض
 صاحب۔ آپ نے مجھ پر اتنی مہربانیاں کی ہیں۔ بس ایک
 مہربانی اور کر دیں۔“
 ”جی فرما میں۔“

”اب یہ اسکول آپ کے حوالے ہے۔ آپ ہی
 چلائیں گے اسے۔“
 ”میں۔“ ریاض پریشان ہو گیا تھا۔ ”میں یہ ذمے
 داری کیسے قبول کر سکتا ہوں؟“
 ”کیوں نہیں کر سکتے؟ آپ ہی کی ذمے داری
 ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کیونکہ میں نے تو صرف میٹرک تک
 پڑھا ہے۔ میں اسکول کیسے چلا سکتی ہوں۔“
 ”ٹھیک ہے۔ اگر آپ کی یہی مرضی ہے۔“

”اب میں اسکول والی تھی۔ ریاض نے اسکول
 سنبھال لیا۔ خود اس کے لیے بھی مصروفیت نکل آئی تھی۔ کبھی
 کبھی میں بھی اسکول چلی جایا کرتی تھی جو بہت خوبی سے چل
 رہا تھا۔ نئے داخلے بھی ہو رہے تھے۔“

چھلے مینے میں چندہ ہزار کی بچت ہوئی تھی۔ میں نے
 ریاض کی نخواستہ مقرر کر دی تھی۔ پہلے میں نے اس سے کہا تھا
 کہ وہ شریک بن جائے لیکن اس نے انکار کر دیا تھا پھر نخواستہ
 پر راضی ہو گیا تھا۔

گھر والے میرے مستقبل کی باتیں کرتے رہتے۔ کہا
 بیٹے گا میرا۔ ان کو بھائی کی نوکری کی طرف سے بھی پریشانی
 تھی۔ وہ اسے کئی فیکٹری میں کام دلوانے کے لیے کوششیں

کر رہے تھے۔
 ایک دن میں نے ابو سے کہا۔ ”ابو۔ اگر آپ کہیں تو
 میں جعفر کو نوکری دلوا دوں۔“
 ”تو کہاں سے نوکری دلوائے گی۔“
 ”ایک اسکول ہے، اس محلے میں ایک ٹرکار ہوتا ہے
 ریاض۔“

”ہاں ہاں جو شیوز پڑھاتا ہے، اچھا لڑکا ہے۔“
 ”آپ وہ اب ایک اسکول میں کام کر رہا ہے۔“ میں
 نے بتایا۔ ”ایک بار اس نے مجھ سے نوکری کے لیے کہا تھا۔
 میں تو نہیں کر سکتی جعفر کی نوکری ہو جائے گی۔“
 ”ٹھیک ہے۔ تو لے جا جعفر کو اپنے ساتھ۔“

میں نے ریاض کو فون کر کے بتا دیا تھا کہ میں جعفر کو
 لے کر آ رہی ہوں لیکن اس کے سامنے یہ غائب نہ کیا جائے کہ
 اسکول سے میرا کیا تعلق ہے۔“

بہر حال میں جعفر کو لے کر اسکول پہنچ گئی اور جعفر کو
 اسکول میں ٹھکر کی نوکری مل گئی۔
 اس کو یہ پتا ہی نہیں چل سکا تھا کہ وہ اسکول اس کی
 اپنی بہن کا ہے۔

بہت زبردست پرائمری تھی اسکول کی۔ تیسرے یا
 چوتھے مینے پچاس ہزار کی بچت ہوئی تھی۔ یہ بہت بڑی رقم
 تھی۔ ایک دن ریاض نے کہا۔ ”یہ برابر والا مکان لینے کی
 سوچ رہا ہوں کیونکہ اب اسکول میں گنجائش کم ہوتی جا رہی ہے۔“

”اور وہ کیا مانگ رہے ہیں۔“
 ”چالیس لاکھ۔“ ریاض نے بتایا۔
 ”ریاض صاحب۔ یہ چالیس لاکھ کہاں سے آئیں گے؟“

”اسکول کے بی ہاف پر بینک سے مل جائیں گے۔“
 ریاض نے بتایا۔ ”میں نے بات کر لی ہے اگر اسکول کی یہی
 پرائمری رہی تو خدا نے چاہا تو ہم صرف ایک سال میں
 قرض آتا رہیں گے۔“

”چلیں تو پھر بسم اللہ کریں۔“
 اور چالیس لاکھ بھی مل گئے۔ اسکول اب وسیع ہو گیا
 تھا۔ آٹھویں تک تعلیم دی جا رہی تھی۔ ایک سال کے اندر
 اندر چار پانچ سو اسٹوڈنٹ آگئے تھے۔ میں بائیس لوگوں کا
 اسٹاف۔ چیرامی، چوکیدار، ٹھکر۔ کہاں سوچا تھا میں نے
 کہ میرے پاس یہ سب بھی ہوگا۔

اب میرے پاس بینک کے چندہ بیس لاکھ کے علاوہ
 ایک کروڑ کی پراپرٹی تھی۔ ایک چلتا ہوا کاروبار تھا۔ خدا نے
 تو بے سے بڑھ کر دے دیا تھا۔
 ایک دن میرے بھائی کو بخار تھا۔ وہ اسکول نہیں گیا
 جبکہ میں اسکول کے بعض معاملات پر بات کرنے اسکول
 چلی گئی تھی۔ ریاض دوسری بلڈنگ میں معائنے کے لیے گیا
 ہوا تھا۔

میں اس کے کمرے میں جا کر بیٹھ گئی۔ میز پر اس کی
 ڈائری پڑی ہوئی تھی۔ میں نے بے دھیانی میں وہ ڈائری
 اٹھائی۔ اس دن پتا چلا کہ ریاض کو ڈائری لکھنے کا شوق بھی
 تھا۔

اس نے تاریخ و ادراپنی یادداشتیں مرتب کر رکھی تھی۔
 فلاں دن میرے ساتھ یہ ہوا، فلاں دن یہ آج فلاں
 دوست سے ملاقات ہوئی۔ اس نے ڈائری میں خوبصورت
 اشعار بھی لکھے ہوئے تھے اور ایک تاریخ پر میری نگاہ جم کر
 رہ گئی۔ اس نے لکھا تھا۔ ”آج میرا بہت بڑا نقصان ہو گیا
 ہے۔ میں نے ٹیوشن کے بچوں سے بجاکر 750 روپے کا
 ایک برائز پاؤڈر خریدا تھا۔ وہ محفلے میں ہی نہیں گر گیا لیکن میں
 نے کسی کو بتایا نہیں کیونکہ میری یہ عادت ہی نہیں ہے جو خدا کو
 مشکور۔“

میں سکتے میں رہ گئی۔
 تو وہ برائز پاؤڈر ریاض کا تھا۔ وہ پاؤڈر جس کی وجہ سے
 مجھے کامیابیاں ملی تھی جس کی وجہ سے میں نے اتنی ترقی کی
 تھی۔ یہ اسکول، یہ پراپرٹی، یہ بینک بیلنس یہ سب ریاض کا
 تھا۔ کیونکہ یہ سب اسی کے پاؤڈر کا کرشمہ تھا۔ میرے خدا کیا
 کروں میں؟

خاموش رہوں یا ریاض کو بتا دوں لیکن کیا بتاؤں۔
 میری عجیب حالت ہو رہی تھی۔ میں نے بھی سوچا
 بھی نہیں تھا کہ میرے پاس جو کچھ ہے اس کا حقدار کوئی اور
 ہے۔ اگر میں ریاض کو سب کچھ بتا دیتی ہوں تو پھر میرے
 پاس کیا بچتا ہے کیونکہ ان پر اصولاً صرف اس کا حق تھا اور
 اگر خاموش رہتی ہوں تو کیا چین سے رہ سکوں گی؟
 کچھ دیر بعد ریاض واپس آ گیا۔ مجھے دیکھ کر حیران
 اور خوش ہوا تھا۔ ”ارے کب آئیں آپ؟“
 ”بس کچھ دیر ہوئی۔“

”مجھے بلا لیا ہوتا۔“ اس نے کہا۔ ”میں دوسری
 بلڈنگ کی طرف گیا ہوا تھا۔“

محبت کے اس دیوتا کو یونانی ایروز (Eros) اور
 رومن کیوپیڈ (cupid) کہتے ہیں لیکن اس کا رومن نام
 زیادہ معروف ہوا۔ یہ ایفر وڈائنٹ کی آوارگیوں کا نتیجہ تھا اور
 اس کے بارے سے تعلقات کے باعث پیدا ہوا تھا۔ اسی
 لیے اسے محبت کا دیوتا تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ دیوتا اندھا تھا۔
 اس کی تصویر پر ایک محسوس بچے کی شکل تصویر ہوئی ہے جس کے
 ساتھ ایک ترش اور ہاتھ میں کمان بٹائی جاتی ہے۔ کہتے ہیں
 یہ کہ اس کے ترش میں دو طرح کے تیرے ہوتے تھے سہرے
 اور کہنی۔ ان تیروں سے کیوپیڈ، ویولپو، دیوتاؤں اور انسانوں
 اس کے سینوں کو نشانہ بنایا کرتا تھا۔ کیوپیڈ کے سہرے تیروں
 کا نشانہ بننے والے اپنی محبت میں کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن
 لوہے کے تیروں کا نشانہ بننے والے ناکام رہتے ہیں۔
 کیوپیڈ، سائیکی (psyche) سے محبت کرتا تھا
 لیکن اس کے پاس صرف رات کے وقت جایا کرتا تھا کیونکہ
 دن بھر اسے اپنی نگاہوں سے اجڑھل نہیں ہونے دیتی
 تھی۔

اسے چندہ اولینیز دیوتاؤں کا سب سے آخری دیوتا
 قرار دیا جاتا ہے تاہم بعض کے مطابق اولینیز کی تعداد
 صرف بارہ تھی جبکہ باقی ان کے ماتحت دیوتا تھے اور ان کی
 طاقت و حیثیت اولینیز کی نسبت بے حد کم تھی۔
 مرسلہ: طاہر محمود، منڈی بہا الدین

”ریاض مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی
 ہے۔“ میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔
 ”ہاں بتائیں۔“
 ”کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ مجھے اتنی ترقی کہاں سے
 ملی ہے؟“

”ظاہر ہے آپ کی محنت اور آپ کی نیت کی وجہ
 سے۔“ اس نے کہا۔
 ”اس کے علاوہ سب سے بنیادی کردار اس پرائز
 پاؤڈر کا ہے جس پر مجھے انعام ملا تھا۔“ میں دھیرے سے
 بولی۔ ”میں ترقی تو وہیں سے شروع ہوئی ہے۔ ورنہ
 میرے پاس کیا تھا کچھ بھی نہیں۔“

”یہ تو ہے۔“ اس نے اتفاق کیا۔ ”کوئی نہ کوئی بہانہ
 تو ہوتا ہے نا آپ کے لیے پاؤڈر بہانہ مل گیا۔“
 ”کیا آپ جانتے ہیں کہ وہ پاؤڈر کس کا تھا؟“ میں
 نے پوچھا۔

”ظاہر ہے کہ آپ ہی کا ہوگا۔“

جناب ایڈیٹر صاحب
السلام علیکم!

میں... اپنی آپ بیتی لے کر سرگزشت کے قارئین کی محفل میں آئی ہوں لیکن یہ بتادوں کہ میں نے پردہ رکھنے کی خاطر تمام نام اور مقام بدل دیے ہیں لیکن تحریر میں بیان کردہ حقائق صحیح ہیں۔ کچھ بھی بدلنے کی کوشش نہیں کی ہے۔

شکیلہ فرقان علی
(لاہور)

بڑی بڑی موچیں، گول منول گوشت سے بھرا چہرہ، باہر کو نکلی ہوئی توند، بات بات پر گالیاں۔ یہ تھی کسی پولیس والے کی شناخت جو میرے ذہن میں آباد تھی۔ اب جو شرجیل کو پولیس کی وردی میں، آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگائے دیکھا تو یہ معلوم ہوا جیسے کوئی فلمی ہیرو میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ سامنے والے گھر کے سامنے پولیس موبائل آ کر رکی اور تڑا تڑا پولیس والے کو در باہر نکلے تو میں یہ خبر اماں کو سنانے کے لیے فوراً چھت سے نیچے اتر آئی۔

”اماں، مختلفہ خالہ کے گھر پولیس آئی ہے۔“



بالا خراس سے اپنے دل کی بات کہہ دی تھی۔ ریاض کے چہرے پر خوشی کا ایک رنگ آ گیا تھا۔ ”عالیہ۔ اس نے چلی بار تپتی بے تکلفی سے میرا نام لیا تھا۔“ ”کیا تم مجھے اس قابل سمجھتی ہو۔“ ”ریاض صاحب آپ تو اس قابل ہیں کہ آپ کو سر آنکھوں پر بٹھایا جائے۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے بس آپ کے جواب کا انتظار ہے۔“ ”کیا جواب میرے چہرے پر لکھا ہوا نہیں ہے؟“ وہ مسکرا کر بولا۔

پھر میری شادی ہو گئی۔ بہت دھوم دھام کے ساتھ۔ سب کے لیے یہ انکشاف تھا کہ اتنا بڑا اسکول میرا تھا۔ اب ہم دونوں میاں بیوی بہت کامیابی سے اپنا اسکول چلا رہے ہیں اس کی کئی شاخیں بھی کھلی ہیں۔ میں نے بھی بی ایڈ کر لیا ہے۔ ہمارے دو بچے ہیں۔ دونوں ہمارے اسکول میں تعلیم پا رہے ہیں۔ ایک دن میری بیٹی کو ایک پرائز بانڈ گرا ہوا مل گیا۔ وہ اسے لے کر میرے پاس آ گئی۔ ”مما۔ یہ دیکھیں یہ پرائز بانڈ گرا ہوا ملا ہے۔“

”بیٹا یہ جہاں سے ملا ہے وہاں جا کر رکھ آؤ۔“ ”لیکن ممّا آپ نے اپنی جو کہانی سنائی ہے اس لحاظ سے تو یہ پرائز بانڈ میری قسمت بنا سکتا ہے۔“ ”نہیں بیٹا ایسا نہیں ہو سکتا۔“ ”وہ کیوں ممّا۔“

”وہ اس لیے کہ اب اس دور میں تمہارے پاپا جیسا دوسرا ریاض نہیں مل سکتا۔“ میں نے کہا۔ ”یہ میری قسمت تھی کہ مجھے تمہارے پاپا مل گئے۔ کوئی ضروری نہیں ہے کہ کوئی تمہارا جیسی اسی طرح ساتھ دینے والا ہو۔“

میری یہ بات بیٹی کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ اس نے وہ پرائز بانڈ جہاں سے اٹھایا تھا وہیں جا کر رکھ دیا تھا۔

میں نے غربت زدہ ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں لیکن ایک پرائز بانڈ نے میری زندگی بدل کر رکھ دی۔ آپ کو اگر اتفاق سے کوئی ایسا پرائز بانڈ مل جائے تو اسے اٹھانے میں جلدی نہ کریں۔ ہر پرائز بانڈ کے پیچھے ریاض جیسا آدمی نہیں ہوتا۔ آئی لو پور ریاض۔

”جی نہیں وہ بانڈ آپ کا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”کیا؟“

”جی ہاں۔ معاف کیجیے گا میں نے اتفاق سے آپ کی ڈائری پڑھ لی ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”آپ کا جو بانڈ مل ہوا تھا وہ مجھے مل گیا تھا اسی سے یہ سارا کھیل رچا گیا ہے۔“ ”ہوں۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”اب میں آپ کو ایک بات بتاؤں۔ میں یہ جانتا تھا کہ وہ بانڈ میرا ہے۔“

”کیا۔“ اب حیران ہونے کی باری میری تھی۔ ”آپ جانتے تھے۔“ ”جی ہاں آپ جس وقت مجھے لے کر بیک بنی تھیں۔ وہ نمبر میرے سامنے آ گیا تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”وہ نمبر مجھے زبانی یاد تھا کیونکہ میں نے اس سے بہت تو گفت و آبرہ کر رکھی تھی۔“

”تو پھر۔ پھر آپ نے بتایا کیوں نہیں؟“ ”میں نے یہ سوچا کہ انعام آپ کی قسمت سے نکلا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”قدرت نے آپ کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ہو سکتا تھا کہ بانڈ میرے پاس ہوتا تو مجھے کوئی انعام نہیں ملتا۔ یہ سب آپ کی قسمت کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ یہ اسکول، یہ ترقی یہ سب آپ کی تقدیر کے کرشمے ہیں۔ میرا اس میں کوئی کنٹری بیوشن نہیں ہے۔ ہاں اگر آپ میرا نقصان پورا ہی کرنا چاہتی ہیں تو مجھے وہی 750 روپے دے دیجیے گا۔“

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ ریاض کتنا بڑا آدمی تھا۔ کتنے بڑے دل کا مالک تھا اور وہ جہاں تو بنگامہ تو کر ہی سکتا تھا لیکن اس نے مسکرا کر بات ہی ٹال دی تھی۔ ”ریاض صاحب آپ 750 روپے کی بات کر رہے ہیں یہ سب کچھ ہی آپ کا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”نہیں میرا اس میں کچھ نہیں ہے۔“

”اچھا چلیں آپ کا اس میں کچھ نہیں ہے لیکن آپ ایک کام تو کر سکتے ہیں نا۔“ ”چلیں بتائیں۔“

”آپ میرے پارٹنر بن جائیں۔“ ”ہاں اس پر سوچا جا سکتا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میں بزنس پارٹنر کی بات نہیں کر رہی۔“ ”تو پھر۔“

”میں لائف پارٹنر کی بات کر رہی ہوں۔“ میں نے

”اللہ خیر کرے۔ آج کل جگہ جگہ چھاپے پڑ رہے ہیں۔ پڑ گیا ہو گا اس کے گھر بھی۔“
 ”لیکن اماں، ان کے گھر میں تو کوئی لڑکا بھی نہیں، پھر وہ کسے پکڑنے آئے ہوں گے؟“
 ”اس کے گھر میں دودو جوان لڑکیاں بھی تو ہیں۔ کر آئی ہوں گی کوئی ایسا دیا کام۔“
 ”اماں، کسی کی بیٹیوں کے لیے تو ایسے الفاظ منہ سے مت نکالیں۔“

”اچھا نہیں نکلتی، تھوڑی دیر میں خود ہی محلے میں شور مچ جائے گا۔ سب پتا چل جائے گا۔ تجھے بھی اور مجھے بھی۔“
 اماں سے باتیں کرنے کے بعد مجھے پھر موبائل کی فکر ہوئی۔ اب حجت پر جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں دروازے پر گئی اور باہر جھانک کر دیکھا۔ موبائل کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ میں نے واپس آ کر اماں کو بتانا ضروری سمجھا۔

”اماں پولیس موبائل تو اب وہاں نہیں ہے۔“
 ”کالج میں پڑھتی ہو لیکن اتنا نہیں معلوم۔ یہ لوگ کوئی گھنٹوں لگاتے ہیں، منٹوں میں کام کرتے ہیں۔ جسے پکڑنا ہو گا پکڑ کر لے گئے ہوں گے۔“
 بات آتی گئی ہو گئی۔ شام تک کہیں سے کوئی خبر نہیں آئی تو اماں کو فکر ہوئی۔

”اے شکلی! یہاں سے شکفتہ کے گھر جا تو سہی۔“
 ”معلوم تو ہو کیوں آئی تھی پولیس؟“
 ”اماں، آئی ہو گی چھوڑ دو بھی۔“
 ”اوئی بچی! مسئلے داری کا کیا اتنا حق بھی نہیں۔ کسی کے دکھ درد میں کام نہیں آؤ گی تو کل تمہارے کام کون آئے گا؟“

”آپ چلی جائیں، میں کیا اچھی لگوں گی پوچھتے ہوئے۔“
 ”ارے پوچھتے کو کون کہہ رہا ہے۔ چکر لگا کر آ جا۔ ایسی ویسی بات ہو گی تو خود پتا چل جائے گا۔“
 مجھے معلوم تھا یہ ان کی ہمدردی نہیں فطرت بول رہی ہے۔ انہیں ٹوہ ناگنے کی عادت تھی اور شکفتہ باجی سے تو ان کی دیے بھی نہیں بنتی تھی۔

ان کی ضد دیکھ کر مجھے بھی جیس ہوا۔ شکفتہ باجی کے گھر ہمارا زیادہ آنا جانا نہیں تھا لیکن لڑائی بھی نہیں تھی۔ ان کی دو بیٹیاں تھیں ارم اور رفعت۔ دونوں جہاں مل جاتی تھیں، ہم

اچھی طرح بات کرتے تھے۔ میں اس وقت تیار ہوئی اور شکفتہ باجی کے گھر پہنچ گئی۔ ارم اور رفعت سامنے ہی بیٹھی تھیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ دونوں سلامت ہیں۔ شکفتہ باجی بھی مسکراتی ہوئی کمرے سے نکل آئیں۔ کمرے کے ماحول سے ذرا ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ کوئی افتاد پڑی ہے۔
 ”شکلی! آج تم کیسے نکل آئیں؟“ مجھے دیکھتے ہی شکفتہ باجی نے کہا۔

”شکفتہ باجی، میرے امتحان ختم ہو گئے۔ نا۔ پرچہ دے دے کر بور ہو گئی تھی سوچا ارم اور رفعت سے مل آؤں۔“
 ”بہت اچھا کیا۔ نکل آیا کرو کبھی کبھی۔ تمہاری ماں کیسی ہیں؟“
 ”اللہ کا شکر ہے، ٹھیک ہیں۔“

”تم لوگ باتیں کروں، میری نماز کا وقت ہو رہا ہے۔“

میں ارم اور رفعت سے باتوں میں مشغول ہو گئی۔ بار بار سوچتی تھی کہ پوچھوں تمہارے گھر پولیس کیوں آئی تھی؟ لیکن ہمت نہیں ہوئی۔ اگر کوئی بات ہو گی تو وہ خود بتا میں گی یا اٹھتے وقت پوچھ لوں گی۔ ابھی ہم باتیں کر رہی رہے تھے کہ دروازے کی بیل بجی۔

”شاید شرنیل بھائی ہوں گے۔“ ارم بولی وہ ابھی اٹھ کر جانے ہی والی تھی کہ پولیس کی وردی پہنچے ایک نو جوان اندر آیا۔ چہرہ ابدن، گلین شیوہ۔ وردی میں بہت اچھا لگ رہا تھا۔ لیکن کچی بات ہے، میں اسے آتا دیکھ کر ڈر گئی تھی۔ میں نے سوچا تھا، لو پھر چھاپا پڑ گیا۔ میں بھی پکڑی گئی۔
 ”دیکھا، میں کہہ رہی تھی نا کہ شرنیل بھائی ہوں گے۔“

اتنی دیر میں وہ ہمارے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔
 ”ارم، میری آنکھوں کو کچھ ہو گیا ہے۔“ اس نے اپنی آنکھیں ملنے ہوئے کہا۔
 ”کہا ہو گیا شرنیل بھائی؟“

”تم لوگ دو ہو اور مجھے تین نظر آ رہی ہو۔“
 ”اپنی آنکھوں کا نہیں عقل کا علاج کرائیے۔ ہم دونوں تین ہیں۔ یہ شکلی ہے، پڑوس میں رہتی ہے۔“
 ”کیوں جی، یہ ٹھیک کہہ رہی ہیں؟“ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا پھر خود ہی کہنے لگا
 ”ارے میں تو بھول ہی گیا تھا کہ یہ گو گی ہیں۔“

”گو گی کیوں ہونے لگیں؟“
 ”کل تم ہی تو کہہ رہی تھیں کہ ہمارے پڑوس میں ایک گو گی رہتی ہے۔“
 ”وہ دوسری ہے۔“
 ”یہی تو میں کہوں، اتنی خوبصورت لڑکی گو گی کیسے ہو سکتی ہے؟“

”آپ جاکر وردی اُتار دیے۔ ہماری دوست کو ڈرائیو مت۔“
 ”ان سے کہیے گا جائیں نہیں۔ مجھے ان سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔“ اس نے کہا اور بیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلا گیا۔
 ”کون ہیں، یہ ذات شریف۔“

”یہ ہمارے ماموں زاد بھائی ہیں۔ نئے نئے ایس آئی بھرتی ہوئے ہیں۔ ان کے والدین کھڑ میں رہتے ہیں۔ ان کی پوسٹنگ کراچی میں ہے لہذا یہ ہمارے گھر سے آ گئے۔“

”بڑے دلچپ آدمی معلوم ہوتے ہیں۔“
 ”ایک آدھ دفعہ اور آؤ گی تو سننا ان کے لطیفے۔“
 ”اب تو ضرور آؤ گی۔“
 یہ تھا میری اور شرنیل کی پہلی ملاقات کا پس منظر۔

اس کے بعد کئی دن تک میرا ان کے گھر جانا نہیں ہوا۔ شرنیل مجھے اچھا لگتا تھا۔ کئی مرتبہ جی چاہا کہ ارم کے گھر جاؤں۔ شاید اس سے ملاقات ہو جائے لیکن دل میں شاید چور آ گیا تھا۔ ڈر لگتا تھا کہ چوری پکڑی نہ جائے۔

چوری پر مجھے یاد آیا کہ ملاقاتوں کا سلسلہ کیوں چل نکلا تھا۔ ایک چور ہی اس کا سبب بنا تھا۔ اس رات ہم سب سوچتے تھے کہ ایک چور ہمارے گھر میں کودا۔ اتفاق یہ ہوا تھا کہ میرا بڑا بھائی پانی پینے کے لیے اٹھا تھا۔ اس نے چور کو پکڑ لیا اور شور مچا دیا۔ آواز سن کر ابا بھی اٹھ گئے۔ دونوں نے مل کر اسے رسی سے باندھ دیا۔ اتنا شور مچا تھا کہ محلے والے بھی جمع ہو گئے تھے۔ ابا نے دروازہ کھول دیا تاکہ نکلے والے اندر آ کر خود اس چور کو دیکھ سکیں۔ ان آنے والوں میں شرنیل بھی تھا۔ وہ اس وقت وردی میں نہیں تھا اس لیے کوئی بھی نہیں جان سکا تھا کہ وہ کون ہے؟

میں نے اماں کے کان میں کہا ”یہی تو وہ پولیس والے ہیں جو شکفتہ باجی کے گھر میں آ کر ٹھہرے ہوئے ہیں۔“
 ”یہ پولیس ہیں میں تو ان سے کہو پکڑیں اسے۔“

اتنی دیر میں شرنیل کی نظر مجھ پر پڑ چکی تھی لیکن اسنے لوگوں کے سامنے وہ پھل بول نہیں سکتا تھا۔ میرے کہنے پر ابا آگے بڑھے۔

”شرنیل صاحب! آپ تو پولیس میں ہیں۔ آپ بتائیے، اب کیا کرنا ہے اس چور کا؟“
 ”انکل! میں نے تجھانے فون کر دیا ہے۔ پولیس موبائل آئی ہی ہوگی۔ آپ فکر نہ کریں۔“
 گلی میں پولیس موبائل کے سائرن نے شور مچایا اور پھر پولیس اندر آ گئی۔ شرنیل نے ابا کو ساتھ لیا اور چور کے ساتھ موبائل میں بیٹھ کر چلا گیا۔
 ابا واپس آئے تو جھجک رہی تھی۔ شرنیل بھی ان کے ساتھ تھا۔

”اچھا انکل، اب مجھے اجازت دیجئے۔“
 ”بیٹا، اجازت کیسی، صبح ہوگی ہے تا شکار کے جانا۔“
 اماں نے ہاں میں ہاں ملائی ”اور نہیں تو کیا۔ اتنا بڑا احسان ہے ہم پر تمہارا۔ تم نہ ہو تو وہ ہم کہاں تھانے کے چکر لگاتے۔ تمہارے انکل تو کہہ رہے تھے کہ اس چور کو ڈانٹ ڈپٹ کر کے پھوڑ دیتے ہیں۔ وہ تو تم آ گئے۔“
 مجھے غصہ آ رہا تھا۔ اس نے ابھی تک یہ ظاہر نہیں کیا تھا کہ وہ شکفتہ باجی کے گھر مجھے دیکھ چکا ہے لیکن اس کی آنکھوں کی شرارت بتا رہی تھی کہ وہ مجھے پہچان چکا ہے۔ میں چائے بنا کر لائی تو اس نے بڑی مصومیت سے کہا ”آپ کو تو میں شکفتہ باجی کے گھر دیکھ چکا ہوں، شاید وہی ہیں آپ؟“
 ”جی ہاں، ایک روز میں شکفتہ باجی کے گھر گئی تھی۔ وہاں دیکھا ہوگا۔“

”اچھا اب میں چلتا ہوں۔“ اس نے چائے ختم کر کے کہا۔
 ”بیٹا، کبھی کبھی آ جایا کرنا۔ میں بھی تمہاری شکفتہ باجی ہی کی طرح ہوں۔“
 ”جی کیوں نہیں۔ محلے والوں پر تو بڑا حق ہوتا ہے۔“
 اس نے پھر میری طرف دیکھا تھا جیسے مجھ پر اپنا حق جتا رہا ہو۔

یہ تھی میری اس سے دوسری ملاقات۔
 اس کے کہنے کے مطابق اسے مجھ سے پہلی ملاقات ہی میں محبت ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی وہ مجھے حجت پر غلٹے ہوئے دیکھ لیتا تھا۔ پھر چور والا واقعہ نکل آیا اور ملنے جلنے کا بہانہ ہاتھ

آگیا۔ گھر میں سب ہوتے تھے لیکن ہمیشہ تو سب نہیں ہوتے تھے۔ ہمیں اکثر تنہائی مل جاتی تھی اور ہم آٹے سامنے بیٹھ کر محبت کی باتیں کر لیا کرتے تھے۔

یہ باتیں ختم نہیں ہوتی تھیں کہ چھٹیاں ختم ہو گئیں۔ میں پھر سے کالج جانے لگی۔ اب میں باہر نکل سکتی تھی اس لیے شرنیل نے خواہش ظاہر کی کہ ہم باہر ملا کریں۔

”گھر سے اچھی جگہ کوئی نہ ہوگی شرنیل!“

”بات تمہاری بھی غلط نہیں ہے لیکن تمہارے گھر والوں کو کسی وقت بھی شک ہو سکتا ہے۔ میرا روز آنا اور تم سے باتیں کرتے رہنا اچھا نہیں لگتا۔“

”تم کیا گھر آنا بالکل ہی چھوڑ دو گے؟“

”نہیں، مگر کی تو کر سکتا ہوں۔ جس دن تم سے باہر ملاقات ہو جا یا کرے گی اس دن گھر نہیں آیا کروں گا۔“

”طے یہ ہوا کہ ہم ہر تیسرے دن باہر ملا کریں گے۔ گھر کے قریب ہی بس اسٹاپ تھا۔ ایک دن اس نے مجھ سے کہا کہ کل دس بجے اسٹاپ کے قریب پہنچ جاؤں، وہ مجھے وہیں مل جائے گا۔“

میں نے اس دن بھانہ کیا کہ کالج دیر سے جانا ہے۔ دس بجے تیار ہوئی اور اسٹاپ پر پہنچ گئی۔ شرنیل میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے نیکی کو ہاتھ دیا اور میں اس کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ یہ پہلا موقع تھا جب میں اس کے اتنے قریب بیٹھی تھی۔ وہ اس وقت درودی میں نہیں تھا۔ کلف لگے سفید شلوار میں وہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ مجھے خود پر غرور ہوا تھا کہ پولیس والوں سے لوگ دوستی کر کے آتے ہیں۔ میں شرنیل کے اتنے قریب بیٹھی ہوں۔ وہ میرا دوست ہی نہیں مجھ سے محبت کرتا ہے۔

ہم ایک کافی شاپ میں جا کر بیٹھے اور در تک باتیں کرتے رہے۔ جب تک کافی ختم ہوئی ہم یہ طے کر چکے تھے کہ آئندہ کہاں ملنا ہے۔

جب ہم باہر ملنے لگے تو اس نے گھر آنا کم کر دیا۔ اماں نے ایک روز خود ہی ذکر پچھڑا۔

”شرنیل بہت دن سے نہیں آیا۔“

”یوگیا ہوگا کوئی کام۔“

”تو جا کے ارم سے پوچھتی۔“

”اماں، یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ نہیں آتے تو نہ آئیں۔“

”بنا آج کل پولیس والوں سے تعلقات رکھنا بہت ضروری ہے۔ شہر کے حالات دیکھ رہی ہو، تمہارا بھائی اکیلا آتا جاتا ہے۔ کوئی بات ہو جائے تو شرنیل کا سہارا تو ہوگا۔“

”آپ اب اسے کہیں۔ وہ جا کر مل لیا کریں گے۔ ویسے بھی کسی غیر مرد کا روز روز گھر میں آنا اچھا نہیں لگتا۔ مکمل والوں کو بھی اعتراض ہو سکتا ہے۔“

میں نے یہ ظاہر کرنے کے لیے اماں سے کہا جیسے شرنیل کے آنے یا نہ ملنے سے مجھے کوئی دلچسپی ہی نہیں۔ میرے انکار پر اماں خود گفتگو باجی کے گھر گئیں۔ وہ شرنیل کے لیے گفتگو باجی سے تعلق منظم رکھنا چاہتی تھیں۔ میں نے پانی سے پہلے پل باندھنے کے لیے ابا کے کانوں میں بھی بات ڈال دی۔

”ابا، مجھے اچھا نہیں لگتا کہ شرنیل یہاں آئے۔ غیر ہی تو ہے لیکن اماں کو بڑی فکر لگی ہوئی ہے کہ شرنیل نے آنا کیوں بند کر دیا ہے؟“

”ٹھیک تو کہہ رہی ہیں۔ آج کل پولیس والے بہت کام آتے ہیں۔ وہ اگر یہاں آ جاتا ہے تو کیا ہے۔ پولیس میں ہے لیکن بہت شریف لڑکا ہے۔“

میں نے اپنی پوزیشن صاف کر لی تھی۔ میں نے شرنیل سے کہہ دیا کہ وہ اسی طرح آتا رہے جس طرح آتا تھا۔ میرے کہنے پر وہ دوسرے ہی دن آگیا۔ اماں نے اس سے بڑے گلے شکوے کیے۔ اس نے بے شک ہو کر دوبارہ آنا شروع کر دیا۔ اب میرا ضمیر مطمئن تھا۔ وہ اب میرے لیے نہیں آ رہا تھا، اماں کے کہنے پر آ رہا تھا۔

اب مجھے اماں کی طرف سے کوئی ڈر نہیں رہا تھا۔ ہم دونوں خوب ہنسی مذاق کرتے تھے۔ میں مسکوں کر رہی تھی کہ اماں خود مجھے موقع دے رہی ہیں۔ ہم دونوں باتیں کرتے رہتے اور وہ کسی کام میں مصروف ہو جاتیں۔

یہ باتیں چھپنے والی نہیں تھیں۔ مکمل میں باتیں بننے لگیں۔ گفتگو باجی کو خود بھی اعتراض ہونے لگا تھا۔ یہ بات مجھے ارم نے بتائی۔ اب یہ معلوم نہیں کہ اس نے اپنی طرف سے کبھی بھی باجی کو اعتراض تھا۔ میں نے اس کو بتا دیا کہ اس طرح کی باتیں بن رہی ہیں۔ آپ شرنیل سے کہہ دیں کہ وہ یہاں نہ آیا کرے۔ اماں تو اپنی ضد پر آ گئیں۔

”کوئی کون ہوتا ہے ہمیں روکنے والا۔ ہمارا گھر ہے

ہم کچھ بھی کریں۔ ہمارے گھر کوئی بھی آئے، اب تو میں اس سے کہوں گی، صبح شام آیا کرے۔“

اماں نے تو اپنا فیصلہ سنا دیا تھا لیکن شرنیل نے مجھے بتایا کہ گفتگو باجی بہت برامان رہی ہیں۔ اب میں تمہارے گھر نہیں آیا کروں گا۔

اماں نے پھر شور مچایا لیکن ابانے انہیں یاد دلایا۔

”تھکیہ کی ماں، کیوں خد کر رہی ہو۔ یہ باتیں اگر فرقان تک پاس کے گھر والوں تک پہنچیں تو اچھا نہیں ہوگا۔ فرقان آخر مگیتر سے تھکیہ کا۔“

مجھے اچانک یاد آگیا کہ میرا کوئی مگیتر بھی ہے۔ میں نے شرنیل اور فرقان کا موازنہ کیا تو شرنیل اس سے بدرجہا بہتر نظر آیا۔ فرقان بینک میں کلرک تھا۔ چار بہنوں کا ساتھ بھی تھا۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ فرقان میرا مگیتر تھا اور شرنیل میری محبت۔ معنی ٹوٹ سکتی ہے محبت ختم نہیں ہو سکتی۔ اب مجھے یہ بھی امید تھی کہ اگر میں نے کوئی قدم اٹھایا تو اماں میرا ساتھ دیں گی۔

میں اس دن شرنیل سے ملی تو میں نے بات کا آغاز ہی یہاں سے کیا۔

”شرنیل، میں تمہاری محبت میں گم ہو کر یہ بتانا ہی بھول گئی تھی کہ میری منگنی ہو چکی ہے۔“

”منگنی ہوئی ہے شادی تو نہیں ہو گئی۔ منگنی ٹوٹ بھی سکتی ہے۔“

”اسی لیے تو کہہ رہی ہوں۔ وہ لوگ میرے فائل احسان کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس کے بعد شادی کا تقاضا کریں گے۔ تم جلد سے جلد میرے گھر رشتہ لے کر آؤ۔“

”تم نے مجھے سوچ میں ڈال دیا ہے تھکیہ! تمہاری منگنی نہ ہوئی ہوئی تو دوسری بات تھی۔ اب تمہارے گھر والے منگنی توڑنے پر رضامند نہیں ہوں گے اور میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔ اگر میری تم سے شادی نہ ہو سکی تو یہ میرا وعدہ ہے کہ زندگی بھر شادی نہیں کروں گا۔“

”جب میں آپ کے ساتھ ہوں تو آپ فکر کیوں کرتے ہیں؟ ہر ماں باپ اپنی بیٹی کے لیے بہتر سے بہتر رشتہ کی تلاش میں ہوتے ہیں۔ آپ میرے مگیتر سے کہیں بہتر ہیں اور پھر میں آپ کے ساتھ ہوں۔ اماں آپ کے حق میں ہیں، آپ رشتہ لے کر تو آئیں۔“

”میرے والدین سکھر میں ہیں۔ آج کل ایمر جنسی ڈیوٹیاں لگ رہی ہیں۔ جیسے ہی چھٹی ملتی ہے، میں سکھر جا کر

اپنی والدہ کو لے آؤں گا۔“

اس کی دلداری نے مجھے غرور بنا دیا تھا۔ کوئی یہ کہے کہ اگر تم سے شادی نہ ہوئی تو میں شادی نہیں کروں گا، غرور کرنے کے لیے یہ بات ہی کافی تھی۔

شہر کے حالات کشیدہ تھے۔ خاص طور پر اس کا تھانہ بہت متاثر تھا۔ اسے ایک گھنٹے کی بھی چھٹی نہیں مل رہی تھیں کہ وہ سکھر جاتا اور اپنی والدہ کو لے کر آتا۔ میری بھی اس سے ملاقات نہیں ہو رہی تھی۔ صرف فون ہی ایک ایسا ذریعہ تھا جس سے مجھے اس کی خبریت مل جاتی تھی۔ وہ مجھے تسلیاں دے رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ فون کر کے اپنی والدہ کو بلا لے مگر اس کا کہنا تھا کہ فون پر ایسی باتیں نہیں ہوتیں۔ اسے سکھر جا کر اپنے والدین کو بتانا ہوگا کیونکہ وہ ارم باطلعت میں سے کسی سے میری شادی کرنا چاہتی ہیں، وہ اگر یہاں آئیں تو گفتگو باجی انہیں بھڑکا دیں گی۔

میں پھر کچھ دن کے لیے انتظار کرنے پر مجبور ہو گئی۔ پھر اس نے بتایا کہ وہ سکھر جا رہا ہے۔ میں خوش ہو گئی۔

دوسرے دن وہ آج ہی گیا۔ اس نے بتایا کہ اس کی والدہ ایک ہفتے بعد کراچی آئیں گی۔ سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے۔ بات ہو گئی ہے۔

اس دوران میری دو ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ پہلی ملاقات میں وہ بالکل نارمل نظر آ رہا تھا لیکن دوسری ملاقات میں مجھے اس کا رویہ بدلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ میری حوصلہ افزائی کے بجائے مجھے سمجھانے پر تیار آ رہا تھا۔

”تھکیہ، میری بات مانو تو جہاں تمہاری منگنی ہوئی ہے، وہیں شادی کرلو۔“

”شرنیل!“ میں نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔

”یہ تم کہہ رہے ہو۔ وہ بھی ایک سال کی ملاقاتوں کے بعد۔“

”مجھے اگر معلوم ہوتا کہ تمہاری منگنی ہو چکی ہے تو میں کبھی تمہارے قریب نہ آتا۔“

”اب تو بتا دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ مجھے اپنے مگیتر سے کوئی دلچسپی نہیں۔“

”ڈرا سوچو۔ اگر منگنی ٹوٹی تو تمہارے گھر والوں پر کیا گزرے گی۔ وہ میرے بارے میں کیا سوچیں گے۔“

”آپ کو میرے گھر والوں کی پروا ہے، میری نہیں؟“

اب میں آپ کے علاوہ کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔

”میرا بھی یہی حال ہے لیکن اس شریف آدمی پر بھی غور کرو جس نے تم سے منگنی کی ہے۔ اس دوران ممکن ہے

کوئی اور لڑکی بھی اس کی زندگی میں آئی ہو لیکن اس نے یہ کہہ کر اسے ٹھکرا دیا ہو کہ میری منگنی ہو چکی ہے۔ اس کے برخلاف تم اس سے منگنی تو ذکر کسی اور کو اپنا لو اور وہ بھی کئی سال چرائی منگنی۔

”کیا میں اس شخص سے شادی کروں جسے میں پسند ہی نہیں کرتی؟“

”تم ابھی غصے میں ہو۔ اچھی طرح غور کرو۔ تم خود کہو گی کہ میں ٹھیک کہہ رہا تھا۔“

اس کے روئے پر مجھے تعجب بھی ہوا تھا اور دکھ بھی۔ جو شخص ہمیشہ مجھے حاصل کرنے کی بات کیا کرتا تھا مجھے کسی اور شخص کے سپرد کرنے کی ترغیب دے رہا تھا۔ ایک امید کی کرن پھر بھی تھی جو مجھے سنبھالا دیے ہوئی تھی۔ اس نے مجھے غور کرنے کے لیے کہا ہے۔ خود بھی غور کر رہا ہوگا۔ ممکن ہے وہ خود اپنی غلطی تسلیم کر لے۔

میں نے غصے میں اسے فون نہیں کیا لیکن تیسرے دن اچانک مجھے خیال آیا، ان تین دنوں میں شرجیل نے ایک مرتبہ بھی مجھے فون نہیں کیا۔ میں نے اسی وقت اپنے موبائل سے اس کے موبائل پر نمبر ملایا۔ تیل جا رہی تھی لیکن اس نے نہیں اٹھایا۔ میں نے پھر ملایا پھر یہی ہوا۔ میں غصے کے عالم میں بار بار نمبر ملاتی رہی۔ پھر سوچا ہو سکتا ہے وہ کسی مینٹک میں ہو۔ دو چار گھنٹے بعد پھر چرائی کی۔ اس نے فون بند کیا ہوا تھا۔ میں رات بھر کھوئی رہی۔ اس کے فون پر خاموشی تھی۔ شاید اس نے ہم ہی بدل لی ہے۔ مگر کیوں؟ وہ مجھ سے کیوں بھاگ رہا ہے؟

میں صبح ہوتے ہی شگفتہ باجی کے گھر گئی کہ شاید وہاں ملاقات ہو جائے۔ میرے چہرے سے دشت تو برس ہی رہی تھی، میں نے جو بات انہیں بتائی اس کا بھی انہیں یقین آ گیا ہوگا۔

”میرے بھائی کی موٹر سائیکل چھن گئی ہے۔ میں شرجیل صاحب کے پاس آئی تھی کہ شاید وہ کچھ مدد کر دیں۔“

”شرجیل تو دو دن ہوئے ہمارا گھر چھوڑ گیا۔ کہہ رہا تھا اپنے کسی دوست کے گھر جا کر رہے گا۔“

”آپ مجھے اس دوست ہی کا پتا دے دیں۔“

”اب تمہیں گھر کی بات کیا بتاؤں۔ مجھ سے لڑ کر گیا ہے اس لیے پتا بھی دے کر نہیں گیا۔ ویسے اس کا غصہ وقتی ہوتا ہے۔ آجائے گا کسی دن۔“

”اب میں کیا کروں۔ کیسے ہوا ان سے ملاقات۔“

”تم اپنے بھائی کو لے کر تھانے چلی جاؤ یا صرف بھائی کو بھیج دو۔ وہ وہاں مل جائے گا۔“

”جی شگفتہ باجی، یہی کرتی ہوں۔“

میں ان کے گھر سے نکلی تو مجھے یقین آ گیا تھا کہ شرجیل کسی وجہ سے مجھ سے ملنا نہیں چاہتا اور بھاگتا پھر رہا ہے۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں محبت اپنے گرد فریب کا حصار کھینچے رہتی ہے۔ مجھے بھی میری محبت نے فریب دیا۔ کیا خبر وہ بے چارہ اپنی کسی مشکل میں گرفتار ہو۔ شگفتہ باجی کہہ رہی ہیں، ان سے بھی لڑ بھڑ کر گیا ہے۔ اس سے ایک ملاقات ضروری ہے، چاہے کسی طرح بھی ہو۔

میں گھر آ کر کچھ دیر اپنی تقدیر پر ماتم کرتی رہی۔ پھر یہ سوچ کر اٹھ گئی کہ رونا ہی ہے تو جی بھر کے رولوں کی پہلے معلوم تو ہو سکے بات پر رونا ہے؟

میں جلدی جلدی تیار ہوئی اور اماں سے سہیلی کے گھر کا پتہ لے کر تھانے پہنچ گئی۔ اس نے یہ کیوں نہیں سوچا تھا کہ میں تھانے نہیں آ سکتی۔ شاید سوچا بھی ہو لیکن یہ معلوم نہ ہو کہ کب آؤں گی۔ وہ اس وقت تھانے ہی میں تھا کہ میں پہنچ گئی۔

”تم یہاں کیوں آ گئیں؟“

”جس کا کچھ لٹ جاتا ہے وہ تھانے ہی تو آتا ہے۔“

”عجب بے وقوفی ہے۔“ اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا ”اچھا ابھی چلی جاؤ میں بعد میں تم سے ملاقات کروں گا۔“

”شرجیل، اس سے پہلے کہ دیر ہو جائے تمہیں ابھی میری بات سننی ہوگی۔“

”اچھا بھروسہ، میں ابھی ایس ایچ اوس صاحب سے کہہ کر تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔“

اس نے اپنے افسر سے اجازت لی اور مجھے لے کر ایک قریبی ریسٹورنٹ میں چلا گیا۔ اس کے پاس کہنے کو غالباً کچھ بھی نہیں تھا، آخر مجھے بولنا پڑا۔

”شرجیل، میری شادی کی تاریخ طے ہونے والی ہے۔“ اس نے آگے الفاظ نے میرا ساتھ ہی نہیں دیا۔

”میں تمہیں یہی مشورہ دوں گا کہ شادی کر لو۔“

”میں یہی جانتا چاہتی ہوں کہ تم مجھ سے شادی کرنا کیوں نہیں چاہتے؟ بزدلوں کی طرح کیوں بھاگتے پھر رہے ہو؟“

”اس لیے کہ میں شادی شدہ ہوں۔ دو بچے بھی ہیں

میرے۔“

یہ سن کر میں اب سوچتی ہوں کہ بے ہوش کیوں نہیں ہو گئی تھی؟

”تم جھوٹ بول رہے ہو شرجیل!“

”میں تم سے جھوٹ کیوں بولوں گا؟“

”اگر یہ سچ ہے تو تم میرے قریب کیوں آئے تھے؟ میرے جذبات سے کیوں کھینچے رہے ہو۔ مجھے امید یہ کیوں دلارہے تھے۔ کیوں کہہ رہے تھے کہ اپنی والدہ کو لے کر آؤ گے؟“

”میں اپنی غلطی کو تسلیم کرتا ہوں۔“

”تمہاری غلطی نے میری زندگی تو برباد کر دی۔“

”اسی لیے تو کہہ رہا ہوں اپنی زندگی برباد ہونے سے بچاؤ۔ تمہارے ماں باپ جہاں کہتے ہیں وہاں شادی کر لو۔“

”میں کہہ چکی ہوں، کسی اور سے شادی نہیں کر سکتی۔“

”یہ تمہارا مسئلہ ہے۔“ اس نے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا

”کیا خیال ہے، اب چلا جائے؟“

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے پھر بٹھالیا ”شرجیل، مرد دوسری شادی بھی تو کر لیتے ہیں۔“

”کر لیتے ہوں گے لیکن میں ایسا نہیں چاہتا اور پھر میری بیوی اجازت بھی نہیں دے گی۔“ اس نے ایسی بے رحمی سے کہا کہ میں ششدر رہ گئی۔ پھر اچانک میرے اندر کی عورت بیدار ہو گئی۔

”جھوٹے انسان، محبت کا ڈراما رچانے سے پہلے بیوی یاد نہیں آتی تھی۔ اس وقت نہیں سوچا تھا کہ اجازت نہیں ملے گی۔ اب اگر تو چاہے بھی تو میں تجھ سے شادی نہیں کروں گی۔ جاتو ہمیشہ میری بدعا میں رہے گا۔“

اس نے میری بات بھی پوری نہیں ہونے دی اور اٹھ کر چل دیا۔ میری بلند آواز پر پئی لوگوں نے پلٹ کر دیکھا تھا۔ میں وہاں ایکی بیٹھ کر مٹا شہنا نہیں چاہتی تھی۔ میں بھی اٹھ کر باہر آ گئی۔

وہ باہر میرا منتظر تھا۔

”کہو تو میں تمہیں چھوڑ آؤں؟“

”چھوڑ دو یا اور کیسے چھوڑ دوں گے؟“

اسے اس جواب کی توقع تھی۔ اس نے اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور تھانے کی طرف چل دیا۔

میں نہیں جانتی کہ گھر کس طرح پہنچی تھی۔ احساس شکست تھا کہ رخساروں پر مٹانے مار رہا تھا۔ گھر پہنچی تو اماں

نے دیکھتے ہی کہا، اپنا چہرہ تو دیکھ، کیسا لال بھوکا ہو رہا ہے۔ اب انہیں کیا بتانی کہ ناکامی کی چوٹ کوئی معمولی چوٹ نہیں ہوتی۔ جو چوٹ میں کھا کر آئی ہوں اس کے نشان برسوں رہیں گے۔

میں بھاگتی ہوئی کمرے میں گئی اور اوندھے منہ بستر پر گر پڑی۔ کچھ دیر بعد اماں میرے کمرے میں آئیں۔ انہوں نے مجھے اٹھانے کے لیے پیشانی پر ہاتھ رکھا تو گھبرا کر پیچھے ہٹ گئیں۔

”اللہ تھرا! تجھے تو بڑا تیز بخار ہے۔“ دھوپ میں جانے کہاں تک پیدل چلی ہے۔ ٹھہر، ابھی تیری نظر تارے دیتی ہوں۔“

وہ بھاگی بھاگی گئیں اور مجھ سے لے کر آ گئیں۔ میری نظر اُتاری اور آرام کرنے کی تلقین کر کے کمرے سے چلی گئیں۔

ماں کی مستجابی مجھ پر تھی کہ اس کی بیٹی کو نظر لگتی ہے۔ شام تک تو میری حالت ہی غیر ہوئی۔ اماں آئے تو مجھے دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جانا ضروری تھا، وہ فوراً ٹیکسی لے آئے۔

ڈاکٹر نے معائنہ کرنے کے بعد بتایا کہ لڑکی کسی ذہنی صدمے سے دوچار ہوئی ہے۔ بخار کسی بیماری کی وجہ سے نہیں ہوا ہے۔ صدمہ کیا تھا یہ صرف مجھے معلوم تھا۔ میرے علاوہ کون جان سکتا تھا؟ ڈاکٹر نے مجھے نیند کی دوا دی۔ میں پورے ایک دن اور ایک رات سوئی رہی، بخار اتر گیا تھا لیکن آٹھ گھنٹے ہی بخار کی پھر وہی کیفیت تھی۔ مختصر یہ کہ کابل پندرہ دن بستر پر پڑی رہی۔ بستر سے اٹھی تو اتنی خفیف ہو گئی تھی کہ دو قدم چلنا دشوار تھا۔ اماں کو یہ فکر تھی کہ بیٹی کی کمزوری نہ جانے کب تک دور ہو۔ شادی سر پر کھڑی تھی۔

ڈاکٹر نے اب میرا علاج میری غذا کو قرار دیا تھا اور غذا تھی کہ حلق سے نیچے نہیں اُتر رہی تھی۔ شرجیل کی بے وفائی تھی کہ مجھ کو لے میں نہیں آ رہی تھی۔

ایک دن ارم اور طلعت مجھے دیکھنے آئیں۔ میں نے باتوں باتوں میں شرجیل کے بارے میں پوچھ لیا۔

”وہ اب کراچی میں نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنا ٹرانسفر سکھر کر لیا۔ سکھر جانے کو کوئی تیار نہیں ہوتا اس لیے جادلہ بہت جلد ہو بھی گیا اور وہ چلے گئے۔“

”بیوی بچوں والے آدمی کے لیے غلطی سے دور رہنا مشکل بھی تو ہو جاتا ہے۔ اچھا ہوا انہوں نے ٹرانسفر کر لیا۔“

”بیوی بچوں والا آدمی! یہ تم کس کے لیے کہہ رہی ہو؟“ وہ دونوں ہنسنے لگیں ”شرجیل بھائی کی شادی کہاں ہوئی ہے۔“

”ان کی شادی تو ہو گئی ہے۔“
”ہم تو ان کے رشتہ دار ہیں۔ ہم سے زیادہ انہیں کون جانتا ہوگا؟ ای اچھی پرسوں ہی تو کھڑے ہو کر آئی ہیں۔“
ارم اور طلعت کے جانے کے بعد اس خبر نے کچھ ایسا اثر کیا کہ میں سوچنے بجھنے کے قابل ہو گئی۔ طبیعت جیسے ایک دم سے سنبھل گئی۔ وہ شادی شدہ نہیں ہے تو پھر اس نے مجھ سے اتنا برا جھوٹ کیوں بولا؟ صاف ظاہر ہے کہ وہ مجھ سے بھاگنا چاہتا تھا۔ اس کی کوئی مجبوری نہیں تھی۔ جو شخص خود بھاگنا چاہے اس کا پیچھا کرنے سے کیا فائدہ؟ میں اسے بھول جاؤں گی جیسے وہ بھی مٹا ہی نہیں تھا۔ میں اسی وقت اٹھی اور اماں کے پاس چلی آئی۔

”اماں، فرقان کی طرف سے کوئی خیر خبر آئی؟“
اماں نے میری طرف چوک کر دیکھا۔ فرقان کا نام لے کر میں نے انہیں چونکا دیا تھا۔ کتنے دنوں بعد یہ نام وہ میری زبان سے سن رہی ہوں گی۔

”اچھی پرسوں تو فرقان کی ماں کا خط آیا ہے۔ تجھے بتانے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ وہ لوگ کراچی آرہے ہیں۔ شادی کی تاریخ بھی طے کریں گے اور شاید شادی کے لیے شائینگ وغیرہ بھی کریں۔ تو اب بیماری کا ڈھکوسلا چھوڑ اور اٹھ کر کھڑی ہو جا۔“

”میں تو ٹھیک ٹھاک ہوں اماں!“
”اللہ تجھے ٹھیک رکھے۔“

وہ کراچی آیا اور اپنے ایک عزیز کے گھر ٹھہر گیا۔ اس کے والدین اور بہنیں آئیں اور شادی کی تاریخ طے ہوئی۔ اس سے اگلے دن فرقان بھی آیا۔ اسے ابا اور بھائی کے ساتھ بری کے سامان کی خریداری کے لیے جانا تھا۔ میں اس کے سامنے تو نہیں آ سکتی تھی لیکن پردے سے لگ کر اسے دیکھا۔ کئی مرتبہ پہلے بھی دیکھ چکی تھی کیونکہ فرقان سے ہماری دور کی رشتہ داری بھی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں شرجیل اور اس کا موازنہ کیا۔ اگر بے وفائی کا داغ نہ لگا ہوتا تو وہ مجھے کبھی اچھا نہ لگتا لیکن اس وقت دونوں کا کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔ جو شخص مجھے چھوڑ کر چلا گیا اس سے بہتر کیسے ہو سکتا ہے جو مجھے مانگنے آیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ٹھیک ہے لیکن ترقی ہی تو ہو سکتی ہے۔

میں جو شرجیل سے ملنے کے بعد مٹکی توڑنے پر آمادہ ہو گئی تھی، انکار نہ کر سکی۔ مجھے شرجیل کی بے وفائی سے زیادہ اس کی بزدلی پر غصہ آ رہا تھا۔

ایک مہینے بعد کی تاریخ طے ہوئی تھی۔ یہ ایک مہینا تیار یوں ہی میں گزر گیا۔ میں اکلوتی بیٹی تھی، ابا اور بھائی نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ مجھے شرجیل کا خیال تک نہیں آ رہا تھا۔ میں آج سوچتی ہوں تو مجھے جو حیرت ہوئی ہے۔

میری شادی کراچی ہی میں ہوئی۔ فرقان جس گھر میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں بیاہ کر اسی گھر میں گئی اور پھر ایک ہفتہ گزارنے کے بعد فرقان مجھے لے کر لاہور چلے گئے۔

فرقان کے ساتھ کچھ دن گزارنے کے بعد مجھے اپنے والدین کے انتخاب پر غور ہونے لگا۔ فرقان نہایت اچھے شوہر ثابت ہوئے تھے۔ نہایت خیال رکھنے والے بھی تھے اور فراخ دل بھی تھے۔ ان کی تنخواہ کم تھی لیکن گھر کے مالی حالات اچھے تھے اس لیے مجھے بھی تنگی کا سامنا کرنا نہیں پڑا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ نہایت شوخ اور فخر باز تھے۔ مجھے ان کی اس خوبی کا اندازہ نہیں تھا کیونکہ وہ جب بھی ہمارے گھر آتے تھے، خاموش بیٹھے رہتے تھے۔ شاید وہ سسرال کا پاس کر کے خاموش رہتے ہوں گے۔ گھر میں بھی وہ چپ ہی رہتے تھے لیکن جہاں میں خوب کھلتے تھے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ ان کے پاس جو کچھ ہے، میرے لیے ہے۔

اگر فرقان موزوں شوہر نہ ہوتے تو شاید شرجیل کی یاد مجھے پریشان کرتی۔ اب معاملہ دوسرا تھا۔ شرجیل بالکل ہی میرے ذہن سے اُتر گیا بلکہ میں شکر بھیجتی تھی کہ میں بال بال بچ گئی۔ کیا خبر شرجیل کب مجھے چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوتا۔ اب اگر شرجیل بھی یاد بھی آتا تھا تو ایک دھوکے باز کی حیثیت سے۔

قدرت نے ایک اور اختتام بھی کر دیا۔ ایک سال بعد میں ایک بیٹی کی ماں بن گئی۔ اس کے ایک سال بعد خدانے ایک بیٹی بھی دے دی۔

دونوں بچوں کا رزق بھی اللہ نے ساتھ ہی اُتارا۔ ان کی ترقی ہو گئی۔ مالی حالات پہلے بھی کون سے خراب تھے لیکن ترقی کی اپنی خوشی ہوئی ہے اور اس وقت تو مجھے مزید خوشی ہوئی جب انہوں نے اس ترقی کا سبب مجھے قرار دیا۔ ”کہتے ہیں رزق عورت کی قسمت سے ملتا ہے۔ تم نہ آئی ہو تمیں تو ابھی تک ٹھکر ہی پڑا ہوتا۔“
”اس خوشی کے موقع پر ایک بات کہوں؟“ میں نے

کہا۔
”تھکم بھکم۔“
”میں جب سے بیاہ کر آئی ہوں، اپنے میکے نہیں گئی۔“

”کل کی بنگلہ کراؤں، پرسوں کی؟“
”کیا آپ نہیں جائیں گے؟“

”بھئی، نئی ہی پروموشن ہوئی ہے۔ چھٹی کرنا مناسب نہ ہوگا۔ خود ہی جاؤ گی خود ہی آنا ہوگا۔ یہ میری مجبوری ہے اور کوئی بات نہیں۔“

میں ان کی مجبوری کو سمجھتی تھی۔ میں بچوں کو لے کر کراچی آ گئی۔

تین سال بعد آئی تھی۔ پورا محنت مجھے دیکھنے کے لیے اٹھا آ تھا۔ ارم اور طلعت بھی آئیں۔ باتوں باتوں میں نہ جانے کیسے شرجیل کا تذکرہ آیا۔ میں نے اس کے بارے میں پوچھ لیا۔

”کیا حال ہے ان کا؟“

”ان ہی کے بارے میں تو بتانے والی تھی۔ انہوں نے تو پورے خاندان کو پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔ سنا ہے کسی لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو گئے تھے۔ اس کی شادی نہیں اور ہو گئی اور وہ بیٹوں بن گئے۔ شادی کرنے کا نام نہیں لیتے۔ نوکری اب بھی کر رہے ہیں لیکن اس طرح کہ ترقی تو کیا خاک کرتے اور تنزیل ہو گئی۔ ایس آئی سے اے ایس آئی بنا دیے گئے۔“

”انہوں نے تو اپنا رشتہ ٹھکر کر لیا تھا۔“

”اب پھر کراچی آ گئے ہیں۔ سنا ہے پولیس لائن میں رہتے ہیں۔ ہم سے تو میل جول ختم ہی ہو گیا ہے۔ کیسا آدمی تھا اور کس حال کا پہنچ گیا۔“

ارم اور طلعت مجھے انہیں میں چھوڑ گئی تھیں۔ جس لڑکی کا وہ ذکر کر رہی تھیں وہ یقیناً میں تھی۔ جب انہیں اپنا یہی حال بنانا تھا اور مجھ سے دائمی محبت تھی تو شادی سے انکار کیوں کر دیا تھا؟ انہوں نے جھوٹ کیوں بولا کہ وہ شادی شدہ ہیں؟ یہ ایسا سوال تھا جس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میں نے سوچا ہو سکتا ہے وہ لڑکی میں نہیں کوئی اور ہو۔ اس لڑکی سے شادی کرنے کے لیے انہوں نے مجھ سے جھوٹ بولا ہو۔ پھر میں نے اس موضوع پر زیادہ سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

چند روز کراچی میں گزارنے کے بعد میں لاہور آ گئی۔

بچوں میں اور گھر داری میں ایسی مصروف ہوئی کہ پچھلے خیالوں کی طرح سے یاد بھی ذہن سے نکل گئی۔ سال پر سال گزرتے گئے۔ مجھے یاد بھی نہیں رہا کہ میں کراچی میں کسی بیٹوں کا تذکرہ نہ کر آئی تھی۔

ہماری شادی کو دس سال گزر گئے تھے کہ فرقان کو منیجر شپ کی آفر ہوئی لیکن شرط یہ تھی کہ انہیں کراچی جانا ہوگا۔ وہ لاہور چھوڑنا نہیں چاہتے تھے لیکن مجھے یہ خوشی تھی کہ میکا قریب ہو جائے گا۔ یہ خوشی بھی تھی کہ فرقان منیجر بنانے جا رہے ہیں۔ میں نے انہیں مشورہ دیا کہ اس پیش کش کو نہ ٹھکرائیں۔ کراچی چلے جائیں۔ ایک مرتبہ منیجر تو بن جائیں بعد میں لاہور ٹرانسفر کر لیجئے گا۔ یہ بات فرقان کی کچھ میں آ گئی۔ وہ مجھے اور بچوں کو لے کر کراچی آ گئے۔ ہم نے ایک مکان کرائے پر لے لیا۔

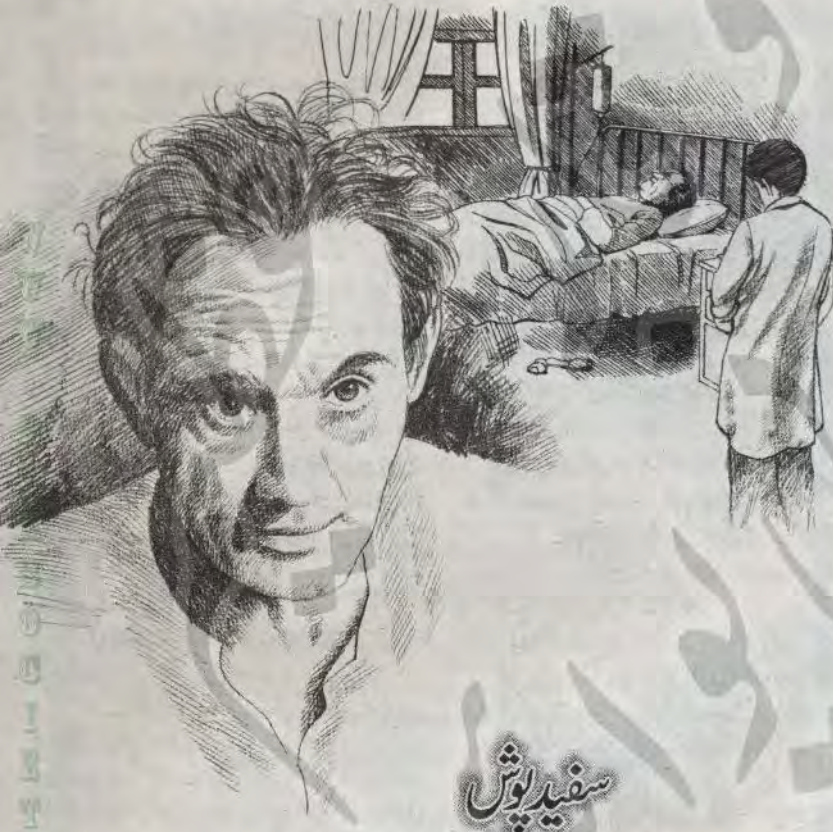
اس مکان میں آئے ابھی پندرہ تیس دن ہی ہوئے تھے کہ وہ بینک سے آئے تو ایک شادی کا رڈان کے ہاتھ میں تھا۔ ”میرے بینک کے ایک اہم کسٹر کے بیٹے کی شادی ہے، تمہیں بھی چلنا ہے۔“

”ظاہر ہے، آپ کی بیٹری کی حیثیت سے میں ہی جاؤں گی، کوئی اور تو نہیں جائے گی۔“

”اس خوش فہمی میں نہ رہے گا۔ آپ کا نام زبردستی نکھوایا ہے۔ کوئی بلا نہیں رہا تھا آپ کو۔ جب میں نے ان سے وعدہ کیا کہ ہائیڈرے ان میں تقریب ہے، ٹیپ ٹاپ سے آئیں گی تب جا کر وہ تیار ہوئے۔“

یہ کراچی آنے کے بعد پہلی تقریب تھی جس میں، میں اور فرقان ایک ساتھ شریک ہو رہے تھے۔

میں اس محفل میں اچھی تھی لیکن ایک خاتون جان پہچان کی نکل آئی تھیں۔ میں ان کے ساتھ کپ شپ میں مشغول ہو گئی۔ فرقان مجھے ان کے پاس چھوڑ کر اپنے دوستوں میں شامل ہو گئے۔ کچھ دیر بعد اچانک میری نظر پڑی وہ ایک شخص سے لغل گیر ہو رہے تھے۔ یہ ظاہر ہوتا تھا جیسے دو بچہ بڑے ہوئے دوست بڑے عرصے بعد مل رہے ہوں۔ ذرا جو غور کیا تو میں سر سے پاؤں تک کانپ اٹھی۔ دوسرا شخص کوئی اور نہیں شرجیل تھا۔ وہ بہت بدل گیا تھا لیکن میں اسے کیسے بھول سکتی تھی۔ اب میں یہ ڈر رہی تھی کہ فرقان ضرور میرے پاس لے کر آئیں گے۔ میرا جی جا رہا کہ بیٹھ کر کسی طرف ٹھک جاؤں۔ میں اس ارادے کو مٹا کر جامد پہنانے ہی والی تھی کہ فرقان اسے تقریباً گھسیٹتے ہوئے



سفید پوش

قابل صد احترام، معراج رسول صاحب

سلام تہنیت!
عرصہ بعد میں ایک تحریر کے ساتھ حاضر ہوا ہوں گوکہ یہ تحریر بہت مختصر ہے مگر اپنے اندر ایک جہان رکھتی ہے۔ جو کچھ دیکھا، محسوس کیا اسے لکھ دیا ہے۔ اب فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اسے اگر طویل کرتا یا دیگر واقعات کو بھی شامل کرتا تو تحریر کا حسن اخگر شہاب مجروح ہوجاتا۔

کہ واقعہ بڑا ہو۔ بعض چھوٹے واقعات و حادثات بھی تادیر اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ دل میں خلش بن کر تا عمر بے چین رکھتے ہیں۔ اب اسی واقعے کو لے لیں، گوکہ یہ ایک چھوٹا سا واقعہ ہے مگر مجھے اب بھی ستاتا ہے، رلاتا ہے، بے چین کیے

حادثات اور انسان لازم و ملزوم ہیں۔ مگر حادثات نہ ہوں تو زندگی کا لطف بھی جاتا رہے مگر کچھ حادثات و واقعات انسانی زندگی پر اثرات نقوش چھوڑ جاتے ہیں جنہیں بھلانا بھی چاہو تو بھلانہ سکنا۔ ایسی اثر پذیر مری کے لیے یہ ضروری نہیں ہے

پورا ہو گیا اور میری شادی فرقان سے ہو گئی۔
اس کا یہ عمل ایک بڑا رسک تھا۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ میں دلبرداشتہ ہو کر خوشی کر لیتا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ فرقان اچھا شوہر ثابت نہ ہوتا اور میری زندگی تباہ ہو جاتی۔

اس نے اپنے دوست کی خاطر اپنی محبت کو قربان کر دیا۔ اپنی شادی کے بعد پہلی مرتبہ مجھے افسوس ہوا تھا۔ اس افسوس کے جواب میں مجھے صرف ایک بات اس سے معلوم کرنی تھی۔ اس کے لیے میں چاہتی تھی کہ وہ یہاں آجائے یا میں اس کے گھر جاؤں۔ فرقان سے کہہ نہیں سکتی تھی کہ مجھے شرجیل کے گھر لے چلو لیکن میں اسے یاد دلانے کے لیے کبھی کبھی شرجیل کے بارے میں پوچھ ہی لیا کرتی تھی۔

”کیا حال ہے تمہارے اس مجنوں دوست کا؟“
فرقان کے پاس اس کا ایک ہی جواب ہوتا تھا ”اس دن کے بعد سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔“

میں کبھی تھی تو لوگ عجیب دوست ہو۔ میرے یہ تقاضے آخر کام آئے۔ ایک دن فرقان نے مجھ سے کہا ”تیار ہو جاؤ، آج شرجیل کی طرف چلتے ہیں۔“
ہم وہاں پہنچے تو اس کا گھر اسیلہ پن کا دلخراش منظر پیش کر رہا تھا۔

میں نے موقع دیکھ کر شرجیل سے کہا ”تمہاری بیوی نظر نہیں آ رہی اور نہ دو بیٹے۔“
”مجھے اور شرمندہ مت کرو۔ میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا۔“

پھر اس نے مجھے وہ کہانی سنائی جو فرقان پہلے ہی سنا چکے تھے۔ میں نے اس سے درخواست کی کہ وہ شادی کر لے لیکن اس کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ تم سے شادی نہیں ہوگی تو عمر بھر شادی نہیں کروں گا۔ میں نے تم سے کیا ہوا وعدہ توڑ دیا۔ کیا اس وعدے سے بھی مکر جاؤں۔ یہ وعدہ ہی تو ہے جو تمہاری یاد کو میرے دل میں آباد رکھے ہوئے ہے، کیا تمہیں بالکل ہی فراموش کر دوں؟“

فرقان اب بھی اس سے ملتے رہتے ہیں۔ اس نے اب بھی شادی نہیں کی ہے۔ کیا آج کے دور میں بھی ایسی محبت کرنے والے ہوتے ہیں؟

میرے پاس لے آئے۔ شرجیل غالباً آنا نہیں چاہتا تھا۔
”ان سے ملو یہ ہیں میری سزا؟“ پھر اس نے کہا ”شرجیل انہیں تم جانتے تو ہو گے۔ تم بھی تو اسی محلے میں رہ چکے ہو جہاں میری سرال ہے۔“

”یار، ہم پولیس والوں کو گھر میں رہنا نصیب کہاں ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے انہیں دیکھا بھی ہو لیکن اب عرصہ گزر گیا، کچھ یاد نہیں آتا کہ کب دیکھا ہے۔“
میں نے اسے شرمندہ کرنے کے لیے کہا ”میں نے آپ کو دیکھا تھا۔ آپ ارم اور طلعت کے مکان میں رہتے تھے۔“
”آپ کو شادی مبارک ہو۔“ اس کے لہجے میں بڑی تلخی تھی۔

شرجیل ہنستے ہوئے ڈر رہا تھا کہ میں کوئی اور بات نکال دوں۔ وہ کسی بہانے سے اٹھ کر چلا گیا۔
ہم گھر واپس آئے تو فرقان بڑی دیر تک اس کی باتیں کرتے رہے۔

”یہ لاہور میں میرا کلاس فیلو تھا۔ پھر اس کے گھر والے اسے کھر شفت ہو گئے۔ برسوں بعد مجھے کراچی میں مل گیا۔ معلوم ہوا موصوف کسی سے محبت کرنے لگے ہیں اور عقریب شادی بھی کر لیں گے۔ مجھ سے پوچھا تو میں نے بھی اپنی مشکفی کا حال بتا دیا۔ یہ سن کر وہ بہت خوش ہوا کہ میری مشکیت یعنی تم اسی محلے میں رہتی ہے جہاں وہ ٹھہرا ہوا ہے۔ میں نے تمہارے والد کا نام بتایا تو پہچان بھی گیا۔ پھر میں لاہور واپس آ گیا۔ اب معلوم ہوا کہ اس لڑکی کی شادی ہو گئی اور اس لڑکی کے سوگ میں اس نے آج تک شادی نہیں کی۔ یہ لڑکیاں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ محبت کسی اور سے کرتی ہیں اور شادی نہیں اور کر لیتی ہیں۔“
”معلوم ہوا کہ وہ لڑکی کون تھی؟“

”مجھے معلوم ہے، بہت خوددار ہے۔ اس لڑکی کا نام کبھی نہیں بتائے گا۔“
مجھے اطمینان ہو گیا کہ شرجیل نے کسی کو میرا نام نہیں بتایا ہے

اب ساری بات میری سمجھ میں آ چکی تھی۔ اسے جب معلوم ہوا کہ فرقان کی مشکیت میں ہوں تو اس نے اپنے دوست (فرقان) کا دل توڑنا مناسب نہ سمجھا اور طے کر لیا کہ میری شادی فرقان ہی سے ہونی چاہیے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ مجھے بدظن کیا جائے۔ اس کے لیے اس نے خود کو شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ ظاہر کیا۔ اس کا مقصد

چیرامیڈیکل اسٹاف، عیادت کرنے والے اور مریضوں کا رش لگا ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا، پورا شہر بیماری کی لپیٹ میں آ گیا ہے۔ ہر کوئی پریشان، ہراساں، بھانسا ہوا۔ اس دوڑ میں ہم بھی شامل ہو گئے۔ اسٹریچر بھیج کر لایا، ابوکولٹایا، بھائی نے اسٹریچر تمام لیا اور دھکیلتے ہوئے آگے بڑھا۔ میں ایبویٹس میں دینے کو رک گیا تھا۔ روپے دے کر پلٹا ہی تھا کہ ایک بڑے میاں کو تھوڑا کر گرتے دیکھا۔ انہوں نے صاف ہتھرے کپڑے پہن رکھے تھے۔ انہیں گرتے دیکھ کر کئی آدمی دوڑے۔ میں خود بھی اٹھانے والوں میں شامل ہو گیا۔ جلدی سے ایک بندہ اسٹریچر لے آیا۔ اس پر انہیں لٹایا گیا اور پیرامیڈیکل اسٹاف اسٹریچر دھکیلتا ہوا امیر جی کی جانب لپکا۔ میں بھی ان کے ساتھ بڑھا۔ ابوکو اُدھر ہی لے جایا گیا اسی لیے مجھے بھی اُدھر ہی جانا تھا۔

امیر جی میں پہنچ کر دیکھا، ابوکو ڈاکٹر ز گھیرے کھڑے تھے۔ طبی امداد دی جا رہی تھی۔ ایک جانب میں کھڑا ہو گیا۔ نظریں شیشے کے پار ابوکو کی جانب مکی ہوئی تھیں۔ ابوکو ایک اسٹاف ممبر ہاتھ میں پرچی لیے ہوئے نکلا۔ اس نے ابوکو کا نام پکارا تھا۔ پکار ستنے ہی میں آگے بڑھا۔

”یہ دوا کیسے لادیں؟“ اس نے پرچی تھا کر کہا۔

میں پرچی لے کر میڈیکل اسٹور کی طرف جا رہا تھا کہ میری نظر اُن بڑے صاحب کی طرف اٹھی مگر جو کچھ دیر پہلے بے ہوش ہو کر گرے تھے۔ میں نے ایک میل نرس سے پوچھا ”انہیں ہوا کیا ہے؟“

”شوگر اور پی ٹی چیک کیا ہے، دونوں ڈاؤن ہیں۔ ایڈ دے رہے ہیں۔“

وقت کم تھا، مجھے دوا بھی لینے تھی اس لیے میں اسے چھوڑ کر میڈیکل اسٹور کی طرف بڑھ گیا۔ دوا میں لیں اور واپس ہوا۔ بڑے صاحب کا سی پی، بی پی نیٹ، ہو چکا تھا اور وہ لمبے لمبے لینے گئے تھے ہوش میں اب تک نہیں آئے تھے۔ ان کی آنکھیں ہنوز بند تھیں۔ تنفس کی رفتار کا اندازہ سینے کے اوپر نیچے ہونے سے بخوبی ہو رہا تھا۔ ان پر نظریں ڈالتا ہوا میں ابوکو کے لیے کمرے کی طرف آ گیا۔ اسٹاف رکن کے ہاتھ میں دوائیں دیں۔ فی زمانہ ادویات کی قیمت تو آسان کو چھوٹی رہی ہے، اسپتال کے دیگر اخراجات بھی ان کا ساتھ دینے کے لیے اونچی اڑانیں بھر رہے تھے۔ کل ملا کر یہ بات سچ ثابت ہو رہی ہے کہ آج موت آسان اور علاج مشکل ہے۔ مریض صحت یاب ہو کر مل دیکھتا ہے تو پھر سے بیمار پڑ جاتا

رکھتا ہے۔ ہوا یہ تھا کہ میں خبر سو رہا تھا۔ دن بھر کی محنت، دفتر کی جتن جتن کو بوجھل کر دیتی ہے اور اس سے نجات کے لیے نیند ضروری ہے سو میں وقت سے کچھ پہلے ہی سو گیا تھا۔ بیگم اس بات سے یہ بخوبی واقف تھیں کہ نیند سے چگانا قیامت لانے کے مترادف ہے۔ اسے دو چار طغیوں کے نشتر سے گھل کر ضرور ہونا پڑے گا اس لیے کبھی بھی ایسی جسات نہیں کرتی تھی مگر اس روز حد ہو گئی، ابھی سویا ہی تھا کہ اس نے چگا دیا۔ وہ بھی جھنجھوڑ کر۔ میں گھبرا کر اٹھا تھا۔ ابھی دو چار صلوامیں سنا کہ اس کے چہرے کی گھبراہٹ نے لگام لگا دی۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ مکی اور زبان میں بھی لغزش تھی۔ اس نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں صرف اتنا کہا ”وہ..... وہ..... ایو.....“

”کیا ہوا ابوکو؟“ نیند میری کا نور ہو گئی اور میں گھبراہٹ میں تقریباً چلا گیا مار کر بستر سے اُتر اور سلپر میں بیڑ ڈالتے ہوئے ابوکو کے کمرے کی طرف دوڑا۔ وہاں گھر کے تمام افراد جمع تھے۔ چھوٹا بھائی، اس کی بیوی، باجی اور ان کے بچے۔ تقریباً بھی جمع ہو چکے تھے اور سب ابوکو کے بستر کو گھیرے کھڑے تھے۔

”کیا..... کیا ہوا.....؟“ کمرے میں پہنچتے ہی میں نے

سوال کیا۔

”ابو بے ہوش ہو گئے ہیں۔ وہ دل پر ہاتھ رکھے ہوئے ہیں۔ لگتا ہے انجانا ہیں۔ میں نے ایبویٹس کے لیے فون کر دیا ہے۔“ چھوٹے بھائی نے بتایا۔ ابھی اس کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ باہر سے ایبویٹس کی آواز سنائی دی۔ میں اسٹریچر لینے باہر لپکا۔ ایبویٹس والا اسٹریچر نکال ہی رہا تھا کہ میں نے اسٹریچر تمام لیا اور جلدی جلدی اندر بھاگا۔ ابوکو اسٹریچر پر لٹایا پھر اٹھا کہ باہر لے آیا۔ ایبویٹس میں چھوٹا بھائی بھی آکر بیٹھ گیا تھا۔ پریشانی کے عالم میں ہم اسپتال کی طرف بھاگے۔ ایبویٹس اپنی رفتار سے چل رہی تھی۔ ہوڑ بجائی ایبویٹس کو لوگ راستہ بھی دے رہے تھے پھر بھی اس کی رفتار مجھے ست لگ رہی تھی، یہی سڑکیں جن پر رواں دواں ٹریفک ہمیشہ مجھے اٹریکٹ کرتا تھا۔ میں فخر یہ کہا کرتا تھا کہ ہمارا شہر ہمہ وقت جاگتا رہتا ہے۔ ٹریفک رواں رہتا ہے۔ رات کے پچھلے پہر بھی سڑکوں پر گاڑیاں مل جائیں گی، مگر آج یہی ٹریفک مجھے عذاب لگ رہا تھا۔ میں جلد سے جلد اسپتال پہنچ جانا چاہتا تھا۔ خدا خدا کر کے درمیانی فاصلے سے اور ہم اسپتال پہنچے۔ امیر جی میں گیٹ سے وارد ٹمک،

غرض

محترمہ عذرا رسول صاحبہ
السلام علیکم!

میں آپ کے اس پرچے کا گرویدہ ہوں، اپنی مصروفیات سے وقت نکال کر پڑھتا ہوں۔ علم و دانش اور سچائی ایک ساتھ شاید اردو میں سرگزشت ہی پیش کرتا ہے اسی لیے مجھے پسند ہے۔ کافی عرصے سے سوچ رہا ہوں کہ اپنی آپ بیٹی بھیجوں، بالآخر لکھ بی لی اور بھیج بھی رہا ہوں۔ اب آپ فیصلہ کریں کہ کیا یہ شائع ہوسکتی ہے؟
ڈاکٹر احمر صدیقی
(کراچی)



جواب مکمل کر کے کوئی ملازمت شروع کر دیتا۔ ویسے تو گھر میں کسی بات کی کمی نہیں تھی۔ ابا جان کا اچھا خاصا سیج کاروبار تھا۔ ذاتی گھر، گاڑی، نوکر چاکر، انہوں نے ہمیں زندگی کی ہر آسائش مہیا کر رکھی تھی۔ وہ خود تو صبح سے شام تک اپنے کام

میں ایم بی بی ایس کا امتحان دے کر فارغ ہی ہوا تھا کہ چچا جان کے یہاں سے شادی کا تقاضا شروع ہو گیا۔ زینبی میری چچا زادھی اور چند ماہ پہلے ہی اس سے میری مطلق ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ شادی اسی وقت ہوئی جب میں ہاؤس

ہوئے تھے۔ میں نے قریب کھڑے میل نرس سے پوچھا۔
”بھائی میاں، تنقہیں ہوا.....! نہیں مرض کیا ہے؟“
”اچھی جنتاب، یہی تو پتا نہیں چل رہا ہے۔ شوگر اور بی پی ڈاؤن تھا۔ انجکشن لگا، انہیں ہوش آیا۔ ڈاکٹر کو آنے میں دیر ہوئی تو پھر سے غنودگی چھا گئی۔ دیگر میٹ کے لیے تیاری ہو رہی ہے، لگتا ہے کوئی کیمبر مسئلہ ہے۔“
”کوئی امینڈمنٹ بھی نظر نہیں آ رہا؟“ میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

”بس جنتاب! کچھ لوگ انہیں لے کر آئے تھے۔ عوامی مسئلہ ہے اس لیے ہم توجہ دینے پر مجبور ہیں۔“ میل نرس نے کہا اور اسے ڈرپ لگانے کی تیاری کرنے لگا۔ میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ پتا نہیں اس کی دوائیں وغیرہ کہاں سے آئیں گی۔ یہ اسپتال والے سستی دوائیں تو دے دیں گے مگر بھنگی دوائیں کب دینے والے ہیں..... بے چارہ دوائی نہ ملنے کی وجہ سے مرجائے گا۔“

میری جیب میں اچھی خاصی رقم تھی۔ جو میں اس لیے ساتھ لے آیا تھا کہ ابا کے لیے ضرورت پڑ سکتی ہے۔ البتہ دعاؤں کی اشد ضرورت تھی۔ انسان زبان سے دعا نہ بھی دے، پھر بھی ہر سام دعا دیتا ہے۔ اسی لیے تو حکم ہے کہ غریبوں، محتاجوں کی دعائیں لو۔ کب کس کی دعا کام آجائے۔
میں نے میل نرس سے پوچھا ”ان کی دوائیں وغیرہ آئیں؟“

”پہلے ہوش تو آجائے۔“ اس نے جواب دے کر ڈرپ میں ایک اور انجکشن منتقل کیا۔ ”اس کے بعد ہی دیگر میٹ ہوں گے۔“

تبھی میری نظر اس پر پڑی اور میں چونک پڑا۔ بڑے صاحب نے آنکھیں کھولی تھیں۔ میں نے ان سے پوچھا ”انکل! اب کیسی طبیعت ہے؟“
”اب بھوک نہیں لگ رہی ہے۔“ انہوں نے کمزور آواز میں جواب دیا۔

میں ان کے اور قریب ہو گیا۔ ان کے مہمل جملے کی تشریح چاہی۔ ”میں سمجھا نہیں؟“

ان کا جواب سن کر میں مل گیا ”بیٹا تین دن سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ کسی کے سامنے دست سوال دراز کرنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔“

وہ

جللی کوہر بی میں زلا یہ کہتے ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ زلا یہی سے بگڑے علی لفظ بنا ہے۔ اس لیے یہ بھی انہیں عربی و فارسی مضامین میں شامل کرنے کے قابل ہے۔ پیرا خالص ہندی مضامین سے اور امرتی بھی ہندی ہے مگر مجھے بتایا گیا ہے کہ امرتی خاص لکھنؤ میں ایجاد ہوئی۔
اقتباس: دکنی طہرا از محمد نصیر الدین ہاشمی
انتخاب: منیلہ انظہر، کراچی

مشہور ادیب احمد شاہ بخاری پطرس نے اپنے زمانہ طالب علمی میں ماچس چرانے والوں کی ایک انجمن قائم کی تھی جس کے وہ صدر بھی تھے۔

اقتباس: پطرس نامہ
مرسلہ: علی شاہ، گلگت

ہے اور یہ بیماری ہارٹ ایک ہوئی ہے۔ گویا گلے نماز بٹشوانے، گلے پڑنے روزے پھر ڈاکٹر کے شگونے الگ، جس کا ذکر اخبارات میں بھی نظر آتا ہے۔ کبھی ڈاکٹر آریشین کے بعد پیٹ میں پتلی بھول جاتے ہیں تو کبھی گلوڑ اور کبھی میدے کے درد والے کی لڈنی کا علاج شروع کر دیتے ہیں۔ سال چھ مہینے بعد انکشاف ہوتا ہے کہ مرض تو کچھ اور تھا جب تک غلط تنقہیں کے باعث ایک تیسرا مرض ظاہر ہو چکا ہوتا ہے۔ ہمارے اسپتالوں میں ایسے کھیل زور و شور سے جاری ہیں۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی لوگ علاج کے لیے انہما پر انحصار کرتے ہیں۔ انہی ڈاکٹرز سے رجوع کرتے ہیں۔

میں آئی سی یو کے باہر کھڑا یہی کچھ سوچ رہا تھا۔ اندر ابو کی ٹریٹمنٹ جاری تھی۔ کسی بھی وقت کوئی نئی پرچی اندر سے آ سکتی تھی اس لیے میں یہاں سے ہٹ نہیں سکتا تھا۔ بس وقت گزاری کے لیے بھی سامنے کچھی کرسیوں میں سے کسی ایک پر بیٹھ جاتا اور بھی کھڑا ہو جاتا۔ بیٹھے وقت میری نظر اس جانب اٹھ گئی جہاں بڑے صاحب کو میڈیکل ایڈیڈی جاری تھی۔ بستر کے گرد کھینچے ہوئے آدھے سے زیادہ بٹے ہوئے تھے گویا وہ آدھے چھپے آدھے نظر آ رہے تھے۔ یہاں چھوٹا بھائی تھا، ضرورت پڑنے پر آواز دے سکتا ہے، یہ سوچ کر میں بڑے صاحب کے بیڈ کی طرف بڑھ گیا۔ نزدیک پہنچ کر دیکھا۔ بڑے میاں اسی طرح بے ہوشی کے عالم میں لیٹے

میں مصروف رہتے اور گھر آنے کے بعد بھی اپنا حساب کتاب لے کر بیٹھ جاتے۔ اس لیے گھر چلانے اور بچوں کی تعلیم و تربیت کی ساری ذمہ داری والدہ نے اٹھا رکھی تھی اور وہ اپنا فرض بڑی خوش اسلوبی سے نبھا رہی تھیں۔ مجھ سے چھوٹی ایک بہن شادی بھی جوان دنوں انٹرن میں پڑھ رہی تھی۔ ابا جان گھر کے معاملات میں بہت کم دخل دیا کرتے تھے اور انہوں نے امی کو تمام سیاہ و سفید کا مالک بنانا تھا لیکن وہ بالکل بھی لائق نہیں تھے۔ کم از کم بچوں کی پڑھائی کے سلسلے میں ان کا رویہ بے حد جارحانہ تھا اور وہ اس بارے میں کوئی سمجھوتا کرنے پر تیار نہ تھے۔ امتحان سے دو مہینے پہلے ہمارے گھر میں کرفیو لگ جاتا اور ہمیں اسکول کا کچھ علاوہ کچھ آنے جانے کی اجازت نہ ہوتی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دفعہ امتحان کے دنوں میں ہماری خالہ کی شادی لے لائی۔ ابا جان چاہ رہے تھے کہ یہ شادی چند دنوں کے لیے ملتوی کر دی جائے کیونکہ صرف ہم دونوں بہن بھائی ہی نہیں بلکہ خاندان کے اور بھی کئی بچے امتحان کی تیاری میں مصروف تھے لیکن لڑکے والوں کی کسی مجبوری کے سبب ایسا ممکن نہ ہو سکا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں اپنی سگی خالہ کی مہندی، مایوں، دھوکی اور دیگر تقریبات میں شرکت نہ کر سکا۔ صرف رخصتی اور ویسے میں ابا جان مجھے دو گھنٹے کے لیے لے گئے تھے۔ اس پر انہیں خاندان والوں کی باتیں بھی سننا پڑیں۔ خاص طور پر میری مائی اور ماموں تو بہت برہم تھے لیکن ابا نے ان کی کسی بات کی پروا نہیں کی اور مجھے پیار سے سمجھا دیا کہ مہندی، مایوں تو میرے بخیر بھی ہو جائے گا لیکن یہ وقت پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔ میں جانتا تھا کہ وہ میرے بھلے ہی کے لیے یہ سب کہہ رہے تھے۔ اس لیے مجھے ان تقریبات میں شرکت نہ کرنے پر کوئی ملال نہ ہوا۔

ابا جان کی اسی سختی کا نتیجہ تھا کہ ہم دونوں بہن بھائی شروع سے ہی ہر امتحان میں اچھے نمبروں سے پاس ہوتے رہے اور مجھے میڈیکل کالج میں داخلہ لینے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ میں نے پانچ سال دل لگا کر محنت کی اور اب میرا ارادہ تھا کہ امریکا جا کر اسپیشل ٹریننگ کروں کیونکہ صرف ایم بی بی ایس کرنے سے بات نہیں بنتی تھی۔ ابا جان بھی اس خیال سے متفق تھے اور انہوں نے وعدہ کر رکھا تھا کہ اگر میں نے امریکا جانے کے لیے مطلوبہ امتحان پاس کر لیا تو وہ میری تعلیم کے تمام اخراجات برداشت کرنے کے لیے تیار ہیں۔ امتحان کا نتیجہ آنے اور ہاؤس جاب شروع ہونے میں

ابھی کچھ وقت تھا۔ اس لیے میں نے امریکا جانے کے لیے مطلوبہ امتحان دینے کی تیاری شروع کر دی۔ میں صبح ناشتا کرنے کے بعد کالج کی لائبریری میں چلا جاتا اور وہاں بیٹھ کر اپنے نوٹس تیار کرتا۔ کچھ کتابیں میں نے اپنے طور پر جمع کر لی تھیں۔ ان کی مدد سے رات کو بھی میں گھر میں بیٹھ کر اسٹڈی کرتا رہتا۔ میری تربیت کچھ اس انداز میں ہوئی تھی کہ مجھے گھر سے باہر جانے، دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے یا تفریح کرنے کا کوئی شوق نہ تھا۔ کوئی کھیل بھی نہیں کھیلتا تھا۔ اس لیے امتحان سے فارغ ہونے کے بعد بھی سارا وقت گھر یا لائبریری میں ہی گزار جاتا۔ البتہ چچا جان کے یہاں دوسرے تیسرے روز ضرور جایا کرتا تھا اور اس کی وجہ زینی کی خستہ بچپن سے تھی، مجھ سے منسوب کر دیا گیا تھا۔

دراصل چچا جان پہلے ہمارے ساتھ ہی رہا کرتے تھے۔ ان کی شادی بھی اسی گھر میں ہوئی تھی۔ جب تک وادی زندہ رہیں، سب کچھ ٹھیک چلتا رہا لیکن ان کے انتقال کے چند روز بعد ہی چچا جان اپنی سبیلی کے ساتھ دوسرے گھر میں منتقل ہو گئے۔ امی بتاتی ہیں کہ چچی جان کو شروع سے ہی الگ گھر میں رہنے کی خواہش تھی اور اس کا اظہار وہ کئی مرتبہ امی کے سامنے دے الفاظ میں کر چکی تھیں لیکن وادی کے سامنے زبان کھولنے کی ہمت نہیں تھی۔ وادی اپنے بیٹوں کو اٹھادیکھنا چاہتی تھیں۔ اس لیے انہوں نے اس رشتے کو مستحکم بنانے کے لیے زینی کی پیدائش پر ہی اسے مجھ سے منسوب کر دیا اور جیسے ہی چچی، زینی کو لے کر اسپتال سے گھر آئیں تو وادی نے واشگاف الفاظ میں اعلان کر دیا کہ یہ گڑیا میری ہے اور اسے میں اپنے احقر کو دوں گی۔ امی بتاتی ہیں کہ چچی جان نے اس فیصلے پر بھی ناک بھوں چڑھائی۔ وادی کے سامنے تو کچھ نہ بولیں لیکن امی سے آج بھی میں اور بولیں کہ وہ اتنی چھوٹی عمر میں بچوں کے رشتے کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ زمانہ بہت آگے چلا گیا ہے۔ ان کی بیٹی کوئی بیٹھڑ بکری نہیں کہ اسے جس کھوتے سے چاہے پانچ ماہہ دیا جائے۔ زینی کی شادی وہیں ہوگی، جہاں وہ چاہے گی۔ امی ہمیشہ سے ہی صبح جو داغ ہوئی تھیں، ہلونا بھگڑنا اور بحث و بحار کرنا ان کی سرشت میں شامل ہی نہیں تھا۔ انہوں نے چچی کو یقین دلایا کہ بچوں کی مرضی کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں ہوگا۔

زینی کی پیدائش کے وقت میری عمر پانچ برس ہوگی۔ اس وقت کی بہت سی باتیں مجھے یاد ہیں لیکن وادی کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ ”یہ گڑیا میں احقر کو دوں گی“ میرے

ذہن سے چپک کر رہ گئے اور میں اسے اپنی ملکیت سمجھنے لگا جس طرح کوئی بچہ اپنے کھلونوں سے پیار کرتا ہے اسی طرح میں بھی زینی پر فریفتہ ہونے لگا۔ میرا زیادہ وقت چچی جان کے کمرے میں گزرتا۔ وہ جاگ رہی ہوتی تو بھاگ بھاگ کر اس کے کام کرتا، سوچاتی تو اس کے سر ہانے بیٹھ کر گفتگو باندھے دیکھتا رہتا۔ اس نے بھی بچپن سے مجھے ہی اپنی نظروں کے سامنے دیکھا لہذا اس کے ذہن میں میری تصویر نقش ہو کر رہ گئی۔

چچی کو یہ سب پسند نہیں تھا اور وہ زینی کو مجھ سے دور رکھنا چاہتی تھیں لیکن ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے یہ ممکن نہیں تھا۔ پھر ایک دن میرا اہلانا پن وکیلہ کران کا دل چنچ گیا اور وہ امی سے کہنے لگیں ”گر زینی اور احقر کی شادی ہوگئی تو مجھے یقین ہے کہ یہ بہت اچھا شو پر ثابت ہوگا۔“ خدا جانے انہوں نے یہ بات طنزاً کہی تھی یا واقعی وہ سنجیدہ تھیں لیکن میں نے ان کے الفاظ پر یقین کر لیا اور میرا سیدہ خوشی و فخر سے چوڑا ہو گیا۔ اب میرے راستے میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی تھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ زینی میری ہے اور ہمیشہ میری ہی رہے گی اور اس کے بعد سے میں زینی پر اپنا زیادہ حق سمجھنے لگا۔

چچا جان نے جب الگ ہونے کا فیصلہ کیا تو میرا دل جیسے کسی منہ میں جکڑ لیا۔ مجھے چچی جان اور چچا جان کے جانے کا کوئی دکھ نہیں تھا لیکن یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ اب زینی مجھ سے دور ہو جائے گی۔ ایک گھر میں رہتے ہوئے تو وہ جو میں سمجھتی تھی میری نظروں کے سامنے ہوتی تھی، دوسرے گھر میں جانے کے بعد تو اسے دیکھنے کے لیے بھی آنکھیں ترس جائیں گی۔ اگر میں روزانہ زینی سے ملنے جاتا تو یہ مناسب بات نہ ہوتی۔ اس کے باوجود میرے لیے وہاں گھنٹا دو گھنٹا سے زیادہ بیٹھنا ممکن نہ تھا۔ جی چاہا کہ چچا جان کے قدموں میں سر رکھ کر ان سے التجا کروں کہ وہ ہمیں چھوڑ کر نہ جائیں لیکن اس کا کوئی فائدہ نہ ہوتا جب انہوں نے ابا جان کی نہیں سنی تو میرے کہنے کا ان پر کیا اثر ہوتا۔

چچا جان صبح اٹل و عیال اپنے گھر میں منتقل ہو گئے اور میرے لیے خزاں کا موسم شروع ہو گیا۔ کوکہ ہمارے گھر سے ان کا مکان کچھ زبردہ فاصلے پر تھا اور میں دن میں وہاں کے دس پندرہ گھنٹا تھا لیکن یہ بڑی معیوب بات ہوتی۔ میں شاید اپنے دل کے چور کی وجہ سے ایسا سمجھ رہا تھا۔ میری حد سے بڑھی ہوئی آمد و رفت کو کسی اور رنگ میں دیکھا جاتا اور وہ لوگ یہی سمجھتے کہ میں زینی کی وجہ سے وہاں پڑا رہتا ہوں۔

اس کے باوجود میرے لیے زینی سے دور رہنا ممکن نہیں تھا۔ شروع کے تین چار دن تو گھر کی ترسین و آرائش میں لگ گئے اور میں نے اس کام میں ان کی بھرپور مدد کی۔ اس کے بعد میں نے یہ تہیہ اختیار کیا کہ اسکول سے واپسی پر تھوڑی دیر کے لیے چچا جان کے یہاں چلا جاتا۔ چچی کا موز ٹھیک ہوتا تو وہ کھانے کے لیے روک لیتیں، ورنہ پندرہ بیس منٹ زینی سے باتیں کر کے اپنے گھر چلا آتا۔

یہ معمول یوں ہی چلتا رہا۔ یہاں تک کہ میں اسکول سے نکل کر کالج میں آ گیا۔ اب میری مصروفیات اور دلچسپیاں مختلف تھیں۔ میڈیکل کالج میں داخلہ لینے کے لیے انٹرن میں اچھا کر ڈیلا نا ضروری تھا اور اس کے لیے بہت زیادہ محنت کی ضرورت تھی۔ اس لیے میں نے زینی کے یہاں جانا کام کر دیا۔ کالج سے واپسی پر سیدہ گھر آتا۔ کھانا کھا کر کچھ دیر آرام کرتا پھر چرل وغیرہ بناتے بیٹھ جاتا۔ یہ میری عادت تھی کہ جو کچھ کالج میں پڑھایا جاتا، اس کے نوٹس کھرا کر تیار کر لیتا اور رات کو پڑھائی کے دوران انہیں اچھی طرح ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتا۔ اس طرح میرے پاس چچا جان یا کسی اور کے گھر جانے کے لیے بالکل وقت نہیں تھا۔ زینی شروع میں تو بہت تیز ہوئی اور اس نے مجھ سے اچھا خاصا جھگڑا کیا لیکن جب میں نے اسے اپنا شیڈول بتایا تو اس کی سمجھ میں بات آ گئی۔ تاہم اس نے مجھ سے یہ وعدہ لے لیا کہ ایک یا دو دن چھوڑ کر اس بے ملے ضرور آیا کروں گا۔

زندگی اسی ڈگر پر چلتی رہی اور میں نے انٹرا کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کر لیا۔ اس طرح مجھے میڈیکل کالج میں داخلہ ملنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ ابا جان میری اس کامیابی پر بے حد خوش تھے اور ہر ایک لمحے سے فخر یہ کیا کرتے کہ بیٹے نے میری لاج رکھ لی ورنہ مجھ میں اتنی سکت کہاں تھی کہ اسے پرائیویٹ میڈیکل کالج میں پڑھاتا۔ چچا جان، چچی اور زینی بھی میری اس کامیابی پر خوش تھے۔ زینی کے تو قدم ہی زمین پر نہ نکلتے تھے۔ گستاخ کہ جیسے میں نہیں بلکہ وہ ڈاکٹر کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ اس کی خوشی بھی اپنی جگہ بجا تھی۔ میں خاندان کا پہلا لڑکا تھا جو ڈاکٹر بنے جاتا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ میں ایم بی بی ایس کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لیے بیرون ملک چلا جاؤں گا اور وہ بھی جانتی تھی کہ مجھ سے منسوب ہو چکی ہے لہذا اسے اپنا مستقبل خاصا محفوظ نظر رہا تھا۔

چچ پوچھیں تو اس نے ابھی سے اپنے آپ کو میری

شریک سفر سمجھنا شروع کر دیا تھا اور پوری طرح مجھ پر قابض ہو چکی تھی۔ اسے میری ایک ایک عادت، طرز زندگی، پسند ناپسند اور مزاج کا پتا تھا۔ وہ میرے کالج اور محلے کے دوستوں کے بارے میں ایک ایک بات جانتی تھی۔ میڈیکل کالج میں مخلوط تعلیم تھی اور میرے کلاس فیلوز میں کئی لڑکیاں شامل تھیں جن سے میرا پڑھائی کے دوران واسطہ پڑتا رہتا تھا۔ وہ مجھ سے ان کے بارے میں کرید کرید کر سوالات کرتی۔ اس طرح اسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ ان میں سے کس لڑکی کی منگنی ہو چکی ہے، کس کا فیئر چل رہا ہے اور ان میں سے کون میری جانب متنت ہے۔ میں خود بھی اس سے کوئی بات نہیں چھپا سکتا تھا۔ میں نے بھی اس سے جھوٹ بولنے یا اسے دھوکا دینے کے بارے میں نہیں سوچا۔ میری پوری زندگی اس کے سامنے ایک کلی کتاب کی مانند تھی جس کا وہ کوئی بھی ورق جب چاہے پڑھ سکتی تھی۔

یہ ساری تجلید بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قارئین، میرے اور زینی کے تعلق کو بہ آسانی سمجھ سکیں۔ وادی نے یہ گزرا میرے اصرار کی ہے، کہہ کر میرے دل میں اس کی محبت کا جوج بویا تھا۔ وہ میرے میڈیکل کے آخری سال تک پہنچتے پہنچتے ایک تاور درخت کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ ہم دونوں کی محبت دیوانگی کی حدوں کو چھو رہی تھی اور ہمارے لیے ایک دوسرے سے دور رہنے کا تصور بھی سوبان روح تھا۔ ہمارے بزرگوں نے بھی اس والہانہ محبت کی تپش کو محسوس کر لیا تھا اور کسی جانب سے اس رشتے کی مخالفت نہیں ہو رہی تھی۔ مجھے سب سے زیادہ ڈر چچی جان سے تھا لیکن وہ بھی حیرت انگیز طور پر میرے حق میں ہو چکی تھیں۔ شاید انہیں اپنی بیٹی کے والہانہ پن نے سب کچھ سمجھا دیا تھا اور وہ دل و جان سے اس رشتے کے لیے رضامند ہو چکی تھیں۔

اب میرے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ زینی کو چھوڑ کر ایک لمبے عرصے کے لیے بیرون ملک کس طرح چلا جاؤں۔ میں تو اس کے بغیر چوبیس گھنٹے نہیں گزرا سکتا تھا۔ فاضل امتحان ختم ہونے کے بعد میں نے یہی مسئلہ زینی کے سامنے رکھا تو وہ ہنستے ہوئے بولی "اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟ دو چار سال میں تمہارا کورس ختم ہو جائے گا۔ پھر تو تمہیں نہیں واپس لوٹ کر آنا ہے۔"

"کتنی آسانی سے تم نے کہہ دیا، دو چار سال....." میں چڑتے ہوئے بولا "یہاں تو یہ عالم ہے کہ ایک دن تمہیں ندیوں کو دل اٹھنے لگتا ہے۔"

"اپنے دل کو قابو میں رکھو اور کیریئر کی جانب توجہ دو۔" وہ ناسمجھانہ انداز میں بولی "اور بھی غم میں رہنا ہے محبت کے سوا۔"

"تم غلط کہہ رہی ہو، فی الحال مجھے صرف یہی ایک غم ہے۔"

"دیکھو، آدی کو تھوڑا سا عملی ہونا چاہیے۔" وہ مجھے سمجھاتے ہوئے بولی "اس وقت تمہاری عمر تیس سال ہے۔ زیادہ سے زیادہ بیس سال کی عمر تک تم تعلیم سے فارغ ہو کر شادی کر سکتے ہو۔ پاکستان میں مردوں کی اوسط عمر ساٹھ سال ہے اس طرح تمہارے پاس محبت کرنے کے لیے بیس سال ہوں گے۔ کیا یہ کافی نہیں ہے؟"

"یہ حساب کتاب اپنے پاس رکھو اور اس مسئلے کا کوئی حل سوچو۔"

"اس کے علاوہ تو ایک ہی حل سمجھ میں آتا ہے۔ جانے سے پہلے مجھ سے نکاح کر لو اور جب وہاں سیٹ ہو جاؤ تو مجھے اپنے پاس بلا لیا۔ میں تمہیں بالکل ڈسٹرب نہیں کروں گی بلکہ اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے کسی ہوٹل میں برتن دھونا شروع کروں گی۔"

اس وقت مجھے اس پر ٹوٹ کر بیار آیا۔ کتنی عظیم تھی وہ جس نے اپنے گھر میں کسی کام کو ہاتھ نہیں لگایا تھا وہ میری قربت کی خاطر دیا بغیر کے ہوٹلوں میں برتن دھونے پر تیار تھی۔ ویسے مجھے اس کی تجویز قابل عمل نظر آئی۔ میں کچھ سوچتے ہوئے بولا "کیا ہم دونوں کے گھر والے اس پر رضامند ہو جائیں گے؟"

"نہیں تیار کرنا تمہارا کام ہے۔ میں، امی سے بات کرتی ہوں اور ہوگا تو انہیں اس پچھلی راضی کر لوں گی کہ وہ تمہارے گھر والوں پر شادی کے لیے داؤ ڈالیں اور انہیں سمجھائیں کہ اگر لڑکے کو تمہا بھیج دیا گیا تو وہ وہاں جا کر کسی گوری کے چکر میں پڑ سکتا ہے۔"

"ہاں، یہ خطرہ تو ہے۔" میں نے اسے چھیڑنے کے انداز میں کہا "اب وہاں صرف گوری ہی نہیں بلکہ سانوں کی یعنی پاکستانی اور انڈین لڑکیاں بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں جن کی عمریں اچھے رشتوں کے انتظار میں نگلی جا رہی ہیں۔ ممکن ہے کہ ان میں سے کوئی مجھے بھال لے۔"

"وہ تم دونوں کی زندگی کا آخری دن ہوگا۔ میں کسی بھی طرح وہاں پہنچ کر تم دونوں کو جہنم واصل کروں گی۔" "اتنا زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں

نے اسے ٹھنڈا کرتے ہوئے کہا "یہ سوچو کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے؟"

"وہی جو میں تمہیں پہلے بتا چکی ہوں۔ یعنی میں اپنی امی کو تیار کرتی ہوں اور تم تکی جان سے بات کرو۔"

اس نے تو بڑی آسانی سے یہ بات کہہ دی لیکن جانتا تھا کہ امی کے سامنے میرے لیے زبان کھولنا بہت مشکل ہوگا۔ ویسے تو میں ان کا بہت چہیتا اور لاڈلا بیٹا تھا۔ بچپن سے لے کر آج تک میری پرخواہش بغیر کے پوری ہوتی رہی تھی۔ لیکن یہ خواہش ایسی نہ تھی جسے آکھ بند کر کے پورا کر دیا جاتا۔ میری عمر صرف تیس سال تھی۔ پڑھائی مکمل نہیں ہوئی تھی اور میں اپنے ہیروں پر کھڑا ہونے کے قابل نہیں ہوا تھا۔ ایسے میں شادی کر کے بیوی کو اپنے ساتھ دیا بغیر لے جانے کی بات کرنا محض دیوانے کا خواب ہی تھی جبکہ مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہاں جا کر گزارا وقت کیسے ہوگی؟ ابا جان میرے تعلیمی اخراجات کس حد تک برداشت کر پائیں گے اور مجھے اپنے طور پر کیا کرنا ہوگا؟ اس حوالے سے یہ نقشہ بالکل غیر واضح تھا اور مجھے اس میں رنگ بھرنے تھے۔ اس لیے میں نے فی الحال شادی کی بات پیچیدہ مناسب نہ سمجھا اور وقتی طور پر خاموشی اختیار کر لی۔

میری خاموشی کا کوئی فائدہ نہیں ہوا کیونکہ اگلے ہی ہفتے چچی جان نے دھماکا کر دیا۔ وہ ہانپتی کا پتلی ہمارے گھر آئیں اور انہوں نے امی سے مطالبہ کیا کہ باہر جانے سے پہلے میری اور زینی کی شادی کر دی جائے۔ امی یہ مطالبہ سن کر حیران رہ گئیں اور انہوں نے چچی کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"دشمن! یہ کیسے ممکن ہے؟ ابھی تو اخر نے امتحان دیا ہے۔ نتیجہ بھی نہیں آیا۔ اس کے بعد ایک سال کا ہاؤس جاب ہوگا۔ اس دوران.... امریکا جانے کے لیے امتحان کی تیاری کرنا ہے۔ سنا ہے کہ وہ امتحان بہت مشکل ہوتا ہے اگر اس میں پاس ہو گیا بھی باہر جانے کی بات ہوگی۔ اس وقت تو وہ اپنا خرچ نہیں اٹھا سکتا۔ بیوی کو کہاں سے کھلائے گا؟"

"بھائی! میں آج شادی کی بات نہیں کر رہی۔" چچی ترخ کر بولیں "اتنی عقل میرے پاس بھی ہے۔ میں نے صرف یہ کہا ہے کہ اگر کے باہر جانے سے پہلے اس کی اور زینی کی شادی ہو جانی چاہیے۔ ورنہ ہماری طرف سے یہ رشتہ ختم سمجھیں۔"

چچی کا جارحانہ انداز دیکھ کر امی نے خاموشی اختیار کر لی

اور انہیں سمجھا بھگا کر واپس بھیج دیا لیکن چچی کے تئیر بتا رہے تھے کہ وہ اس سلسلے کو منطقی انجام تک پہنچا کر رہیں گی۔

امی نے جب یہ خبر ابا جان کو سنا تو وہ بالکل ہی ہتھے سے اُکڑ گئے اور انہوں نے صاف کہہ دیا کہ اگر میری شادی امریکا سے واپس آنے کے بعد ہوگی۔ اگر انہیں بہت جلدی ہے تو وہ اپنی بیٹی کو کہیں اور بیاہ دیں۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

بہت ہی عجیب و غریب صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ میں اور زینی دونوں ہی پریشان تھے کہ کیا سوچا تھا اور کیا ہو گیا۔ دراصل ہمیں چچی جان سے اس جلد بازی کی توقع نہ تھی۔ یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ یہ بھی ان کی ایک چال تھی۔ اسی لیے انہوں نے یہ بتا دیا تھا۔ اصل قصہ کچھ یوں تھا کہ ان دنوں ان کا ایک بھانجا ٹیکل دیئے آیا ہوا تھا۔ وہ وہاں کسی کمپنی میں سپروائزر تھا لیکن پندرہ بیس سال دیئے میں رہ کر اس نے اچھے خاصے پیسے کمائے تھے اور چچی کے خاندان والے اس کی امارت سے بے حد متعجب تھے۔ اسے دیکھ کر چچی کی بھی رال ٹپک پڑی اور انہوں نے سوچا کہ مجھے تو اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے ایک طویل سفر طے کرنا ہے جبکہ ٹیکل کے پاس سب کچھ پہلے سے موجود تھا اور وہ زینی کو تمام آسائشیں فوری طور پر مہیا کر سکتا تھا جو بیس شاید دس سال بعد کر پاتا چلتا۔ جب زینی نے ان سے نکاح کی بات چھیڑی تو انہیں موقع ہاتھ آ گیا۔ وہ جانتی تھیں کہ ابا جان بھی یہ مطالبہ تسلیم نہیں کریں گے اور اس طرح انہیں میرے اور زینی کے رشتے کو ختم کرنے کا ایک مقبول بہانہ مل جائے گا۔

میں اور زینی اس چال کو سمجھ گئے تھے اور زینی نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ میرے علاوہ کسی اور کے ساتھ شادی کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی اور اگر یہ رشتہ ختم ہوا تو وہ کوئی بھی اپنا ہی قدم اٹھا سکتی ہے مثلاً یہ کہ میرے ساتھ گھر سے بھاگ سکتی ہے، کورٹ میرج کر سکتی ہے۔ اور اگر کچھ بھی نہ ہوا تو خود ہی کر لے گی۔ میں اس کی انتہا پسند اور جذباتی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس لیے اسے سمجھانے کی کوشش کرنا رہتا۔ چچی جان نے بے وقت کی راگنی چھیڑ کر اچھا نہیں کیا تھا لیکن اس میں بھی ان کی غرض پنہاں تھی۔ وہ بڑی تیزی سے اپنے منصوبہ کو آگے بڑھا رہی تھیں اور ہر دس پندرہ دن بعد اپنا مطالبہ دہرائے آ جاتیں۔ ایک دن تک آ کر امی نے ان سے کہہ دیا کہ اگر انہیں اگر ہر دس دن نہیں تو وہ باہر نہیں جائے گا اور ہمیں رہ کر کسی اسپتال میں

ملازمت کر لے گا۔

چچی کو یہ بھی منظور نہیں تھا۔ انہوں نے کہا ”میں نہیں چاہتی کہ زینبی کی وجہ سے احمد کا مستقبل تاریک ہو۔ یہاں رہ کر وہ کیا کر لے گا۔ سبھی والدین چاہتے ہیں کہ شادی کے بعد ان کی بیٹی اچھی زندگی گزارے اور میں بھی ایسا ہی چاہتی ہوں۔“

گویا بلی پوری طرح تھیلے سے باہر آگئی تھی۔ میں نے زینبی سے صاف صاف کہہ دیا کہ اس معاملے میں ہم لوگ بالکل بے بس ہو گئے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ چچی جان ہر قیمت پر یہ رشتہ ختم کرنا چاہ رہی ہیں۔ اس پر زینبی نے مجھے یقین دلایا کہ مجھے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ خود ان سے منٹ لے گی اور اگر کچھ بھی نہیں ہوا تو اس کے پاس خود کشی کا آپشن تو موجود ہے۔

انہی اچھٹوں میں گرفتار تھا کہ ایک ایسا حادثہ پیش آیا جس نے میری زندگی کا رخ ہی بدل کر رکھ دیا۔ میری محبت، کیریئر اور رشتے ناتے، سب کچھ اس آگ کی نذر ہو گیا اور اب میں ایک زندہ لاش کی مانند اپنی زندگی کے بقیہ دن پورے کر رہا ہوں۔ کاش اس روز مجھ سے وہ لغزش سرزد نہ ہوئی۔

وہ موسم برسات کا ایک خوشگوار دن تھا۔ آسمان صبح سے ہی بادلوں میں ڈھکا ہوا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میں صبح سویرے ورزش اور ناشتے سے فارغ ہو کر اخبار پڑھ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ تھوڑی دیر بعد زینبی کی طرف جاؤں گا اور اس کے ہاتھ کے بہتے ہوئے گرم گرم پکڑوں کے ساتھ موسم کی رنگینی سے بھی لطف اندوز ہوتا رہوں گا۔ میں اٹھنے کا ارادہ کر رہی رہا تھا کہ ابا جان کام پر جانے کے لیے اپنے کمرے سے باہر آئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک بڑا سا خاکی رنگ کا لفافہ تھا۔ انہوں نے وہ لفافہ مجھے دیا اور تاکید کی کہ اسے فوری طور پر وکیل احمد علی کو پہنچا دوں۔ ان کا دفتر ہمارے گھر سے تین چار میل کے فاصلے پر تھا۔ بایک سے آنے جانے میں زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹا لگتا۔ میں نے سوچا کہ پہلے وکیل صاحب کو لفافہ پہنچا دوں۔ اس کے بعد زینبی کی طرف چلا جاؤں گا۔ میں نے موٹر سائیکل کی چابی اٹھائی اور امی کو بتا کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔

وکیل احمد علی دفتر میں ہی موجود تھے۔ میں نے لفافہ انہیں تھما دیا اور واپسی کی اجازت چاہی وہ مصر تھے کہ چائے پی کر جاؤں لیکن مجھے زینبی کے پاس پہنچنے کی جلدی تھی۔ اس

لیے معذرت کر کے چلا آیا۔ دفتر سے باہر نکلا تو ہلکی ہلکی ہوندا باندی شروع ہو چکی تھی جس کی وجہ سے سڑکوں پر ابھی خاصی چھلن تھی۔ میں احتیاط سے موٹر سائیکل چلاتا ہوا اپنی گلی کے کنارے پہنچا تو بارش تیز ہو گئی۔ وہاں گلی میں کچھ نیچے بارش میں کھیل رہے تھے۔ ان میں سے ایک بچہ اچانک میری بایک کے سامنے آ گیا۔ اگر میں فوراً بریک نہ لگاتا تو وہ بایک کے نیچے آ جاتا۔ اس طرح بریک لگانے سے توازن برقرار نہ رہ سکا اور میں خود موٹر سائیکل سے نیچے گر پڑا۔ وہ بچہ خوف زدہ ہو کر وہاں سے بھاگ گئے۔ اتفاق سے اس وقت گلی میں کوئی اور فرد موجود نہیں تھا۔ اچانک ہی میرے کانوں میں کسی لڑکی کے ہنسنے کی آواز آئی۔ وہ شہینہ تھی جو گلی کے کونے والے مکان میں اپنی ماں کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ اس کا باپ بچپن میں ہی ماں بچی کو چھوڑ کر کہیں چلا گیا تھا۔

ماں، محلے والوں کے کپڑے کی کرکڑاواقت کرتی۔ شہینہ نے بہ مشکل تمام میزک کیا تھا اور ایک پرائیویٹ اسکول میں ملازمت کر لی تھی۔ محلے والے ان ماں بچی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے اور ان کے بارے میں کئی طرح کی باتیں مشہور تھیں لیکن ابھی تک کسی نے اپنی آنکھوں سے کچھ نہیں دیکھا تھا۔ شہینہ جو بھی بہت شوخ و طرار قسم کی لڑکی تھی اور ہر ایک سے بہت جلدی بے تکلف ہو جاتی تھی۔ محلے کے کئی لڑکے اس کے گھر کے گرد چکر لگاتے رہتے لیکن وہ کسی کو گھاس نہیں ڈالتی تھی۔ اس سے دو ہی مطلب نکالے جا سکتے تھے۔ وہ کیریئر کی مضبوط بھی پا پھر اسے کسی ٹنگو کی آسامی کی تلاش تھی۔

میں نے ہنسی کی آواز سن کر اس کی جانب گردن اٹھا کر دیکھا۔ وہ مجھے اشارے سے بلاتی تھی۔ میں نے زمین سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ نہ جانے جسم کے کس حصے پر چوٹ آئی تھی جس کی وجہ سے مجھے اٹھنے میں وقت محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے میری کیفیت بھانپ لی۔ دائیں بائیں دیکھا اور پھر تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے میرے پاس آ گئی۔ اس نے ایک ہاتھ بڑھا کر میری بغل میں ڈالا اور پوری قوت لگا کر مجھے اوپر اٹھالیا۔ میں نے زمین پر قدم جما کر چلنے کی کوشش کی تو اس نے مجھے میں دردی نہیں سی اٹھی۔ میں لڑکھایا تو اس نے فوراً ہاتھ بڑھا کر مجھے سہارا دیا اور آہستہ آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے مجھے لے کر اپنے گھر کی جانب بڑھنے لگی۔ میں نے مڑ کر اپنی موٹر سائیکل کی جانب دیکھا تو وہ بولی۔

”اس کی فکر نہ کرو۔ کسی بچے سے اٹھالوں گی۔“

فی الحال تمہیں دیکھنا ہے کہ کہاں ٹوٹ پھوٹ ہوئی ہے۔“

انہی دیر میں ہم اس کے دروازے تک پہنچ چکے تھے۔ وہ مجھے گھر کے اندر لے گئی اور کمرے میں رہی ایک گرسی پر بٹھاتے ہوئے بولی ”تم دو منٹ کے لیے یہاں بیٹھو۔ پہلے میں موٹر سائیکل کا بندوبست کروں پھر تمہیں دیکھتی ہوں۔“ میں نے دھڑکھڑا کر نظر اٹھائی۔ گھر میں کسی اور فرد کی موجودگی کے آثار نہیں تھے۔ گویا اس کی ماں گھر پر نہیں تھی۔ میں اس سے ماں کے بارے میں پوچھنا چاہ رہا تھا لیکن اتنی دیر میں وہ صبح کا دروازہ کھول کر باہر جا چکی تھی۔ مجھے گھبراہٹ ہونے لگی اور میں نے تہیہ کر لیا کہ وہ جیسے ہی موٹر سائیکل لے کر آئے گی، میں فوراً ہی یہاں سے رفو چکر ہو جاؤں گا۔

اس کی واپسی پندرہ منٹ بعد ہوئی لیکن وہ کسی طرح موٹر سائیکل محسن کے اندر لانے میں کامیاب ہوئی۔ اس کے پیچھے دس گیارہ سال کے دوڑ کے بھی آگئے۔ جنہیں اس نے جھڑک کر چھڑک دیا۔ باہر تیز بارش ہو رہی تھی اور وہ پوری طرح بھیک چکی تھی۔ گلیاں اس کے جسم سے چپک کر رہ گئیں۔ جس سے اس کے بدن کے خدو خال پوری طرح واضح ہو گئے تھے۔ اس نے میری موجودگی کا خیال کیے بغیر دوپٹا اٹار اور اسے نچوڑنے لگی۔ پھر اس نے وہ دوپٹا برآمدے میں لگی الٹ پر پھیلا دیا اور میرے پاس آ کر گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے بولی۔

”لگتا ہے نچنے پر چوٹ آئی ہے۔ ذرا دیکھو تو ہنسی۔“

یہ کہہ کر اس نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے میرا دایاں پاؤں اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ میں نے فوراً ہی اپنی نظریں دوسری جانب کر لیں۔ مجھ میں اس کے جسم کی حشر سائیاؤں کا نظارہ کرنے کی تاب نہیں تھی۔ اسے اتنے قریب پا کر خود میرے جسم میں جیونیاں سی رہ گئے لگیں۔ میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

”پہلے تم اپنا لباس تبدیل کر لو ورنہ پیار پڑ جاؤ گی۔ میں بھی اب چلا ہوں۔ یہ بارش تو رکنے والی نہیں۔“

”لباس بھی تبدیل کر لوں گی۔“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں کمرانی ”مرہم پٹی کے بغیر تو میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔ تمہارے کپڑے بھی تو بھیک گئے ہیں۔ ایسا کرتے شرت اٹار کر لٹی پر پھیلا دو۔ میں ہلدی چونا گرم کر کے لگاتی ہوں۔ ہر قسم کی چوٹ کے لیے اسیر ہے۔“

تب تک قیص بھی سوکھ جائے گی اور ہم گرم گرم چائے بھی پیئیں گے پھر تم بے شک چلے جانا۔“

اس کی قربت اور باتوں نے مجھ پر ایسا سحر طاری کیا کہ میں نے سوچے سمجھے بغیر قیص اٹار کر اس کے حوالے کر دی۔ وہ میرے جسم کو کھربائی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی ”واہ! باڈی تو خوب بنائی ہے۔ لگتا ہے کہ باقاعدگی سے کمرت کرتے ہو؟“

مجھے اس کے چھوڑے پن پر سخت غصہ آیا لیکن اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولا ”خالی کہاں ہیں؟“

”وہ کسی کسٹرو کو پکڑے دینے لگی ہیں۔ بارش کی وجہ سے رک گئی ہوں گی۔“

”چھا، تم جلدی سے پٹی باندھ دو۔ پھر میں چلوں گا۔ اسی انتظار کر رہی ہوں گی۔“

”بس پانچ منٹ میں لے کر آتی ہوں لیکن پہلے تمہارے لیے چائے بنا دوں۔“

یہ کہہ کر وہ لہرائی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ اب میں نے اس کے سرائے کو غور سے دیکھا۔ وہ واقعی قدرت کا تخلیق کردہ حسین شاہکار تھی۔ پتلی کر، اس پر لہرائی ہوئی لمبی سیاہ چوٹی، پشت پر سے قیص کا گلا کافی نیچے تک کھلا ہوا تھا جس سے اس کی گوری چمک دار جلد صاف نظر آ رہی تھی۔ بڑی بڑی آنکھیں، موتوں جیسے دانت اور بھرے بھرے ہونٹ۔ وہ واقعی کچھڑ میں کھلا ہوا کنول کا پھول تھی۔ میرے لیے وہاں ایک پل کے لیے ہنسیا مشکل ہو رہا تھا اور میں انتظار کر رہا تھا کہ وہ جلدی سے مجھے چائے پلائے، پٹی باندھے اور میں وہاں سے دوڑ لگا دوں۔ سب سے زیادہ فکر مجھے اس بات کی تھی کہ اگر اس کی ماں آگئی تو وہ مجھے وہاں بیٹھا دیکھ کر کیا سوچے گی؟

شہینہ پانچ منٹ میں چائے لے کر آگئی۔ اس نے پیالی میرے ہاتھ میں تھمائی اور بولی ”تم چائے پیو تب تک میں تمہارے لیے ہلدی چونا گرم کر کے لاتی ہوں۔ تم دیکھنا اس کے باندھتے ہی آرام آ جائے گا۔“

یہ کہہ کر وہ لہرائی ہوئی بل کھاتی وہاں سے چلی گئی۔ اس نے ابھی تک دوسرا دوپٹا لینے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی اور اس طرح اپنے حسن کی بجائیاں گرائی بار بار میرے سامنے آ رہی تھی۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر مجھ جیسا زاد بھی بے ایمان ہو سکتا تھا۔ باورچی خانہ محسن کی دوسری جانب تھا اور وہ بار بار محسن عبور کرتے ہوئے بڑی طرح بھیک مانی تھی۔ لیکن وہ اپنے

حسن کی فتنہ سامانیوں سے بے نیاز میری دل جوئی اور تیار داری میں مصروف تھی۔ اس بار وہ ہلدی چونا گرم کر کے لائی۔ اس کے ہاتھ میں پٹی بھی تھی۔ وہ میرے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اور جبکہ کر میرے گتے پر چٹی باندھنے لگی۔ میں ایک بار پھر منہ دوسری طرف پھیرنے پر مجبور ہو گیا۔ خدا خدا کر کے یہ مرحلہ ختم ہوا تو میں ایک دم ہی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور آہستہ آہستہ کمرے کے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر مجھے سہارا دیا اور میرے قریب ہوتے ہوئے بولی۔

”دیکھو تو کتنے زوردار کمر برس رہا ہے۔ اب تو سڑک پر بھی پانی جمع ہو گیا ہوگا۔ ایسے میں کس طرح موٹر سائیکل چلاؤ گے۔ میں تو کہہ رہی تھی بھڑی دیر اور رک جاتے۔“

”نہیں شمعین، بہت دیر ہو گئی ہے۔ اب میں جاؤں گا۔ یہ بارش رکنے والی نہیں۔“

ابھی میں نے اپنا جملہ ختم کیا ہی تھا کہ بادل بہت زور سے گرے۔ بجلی چمکی اور اس کے ساتھ ہی لائٹ بھی چمکی گئی۔ کمرے میں گھپ اندھا چھا گیا۔ شمعین ایک زوردار جیج مار کر مجھ سے لپٹ گئی۔ میں اچانک افتاد سے بھرا گیا۔ میں نے اسے اپنے سے الگ کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی گرفت پیلے سے زیادہ مضبوط ہو گئی تو کہ اس کا لباس گیلتا تھا لیکن اس کے جسم کی پیش میرے وجود کو پھلانگ دے رہی تھی۔ اس نے خوف زدہ آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ ان میں ایک واضح پیغام تھا۔ اس کے لب پھڑ پھڑائے اور مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ ہوش آیا تو ہم دونوں کمرے میں ایک ہی بستر پر دراز تھے اور خالہ رضیہ کمرے کے دروازے پر کھڑی تھیں۔ نگاہوں سے مجھے گھور رہی تھی۔ ان کی نگاہوں سے شعلے برس رہے تھے۔ بارش ختم ہو چکی تھی۔ ایک طوفان آ کر گزر گیا تھا اور اب میری زندگی ایک نئے امتحان سے دوچار ہونے والی تھی۔ اس نے شمعین کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ چادر میں اپنا جسم چھپائی کمرے سے باہر چلی گئی۔ میں بھی بستر سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ رضیہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھے آگے بڑھی اور میرے توجہ مقابل آ کر کھڑی ہوئی۔ چند لمحوں بعد مجھے گھوڑی رہی پھر کسی ناگن کی طرح پھنکارنے ہوئے بولی ”اس شہر میں تمہارے باپ کا بڑا نام ہے۔ ابھی محلے کے لوگوں کو آواز دے کر بلاؤں تو تمہارے خاندان کی عزت، گلیوں میں تار تار ہو کر بکھر جائے گی۔“

خاموش کھڑا سر جھکائے اس کے اگلے محلے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ اسی لمحے میں بولی ”ہم بھی کوئی چوڑے چمار نہیں ہیں۔ عزت کی کھاتے ہیں اور سڑاٹھا کر چلتے ہیں۔ اس کا باپ سید تھا۔ اگر وہ ہمیں چھوڑ کر نہ چلا جاتا تو یہی سید زادی کہلاتی پھر دیکھتی کہ کوئی نہیں زادہ اس کی عزت کو کیسے پامال کرتا؟“

وہ چند لمحوں خاموش کھڑی مجھے گھورتی رہی جب اسے اندازہ ہو گیا کہ میں پوری طرح اس کے ٹرائس میں آچکا ہوں تو وہ قدرے دھیمے لہجے میں بولی ”خیر جو ہوتا تھا، وہ ہو چکا۔ کمان سے نکلا ہوا تیر اور گزرا ہوا وقت واپس نہیں آتا۔ جوانی میں ایسی لغزشیں ہو جاتی ہیں لیکن ان کا مادا ابھی ممکن ہے۔ کیا تم اس کے لیے تیار ہو؟“

مجھے لگا کہ ماسی رضیہ کے گھر نہیں بلکہ کسی حقانے میں بیٹھا ہوا ہوں اور پولیس والے مجھ سے کھمکا کر رہے ہیں۔ بہر حال مجھے امید کی کرن نظر آئی تو جلدی سے بولا ”مجھے کتنا کیا ہوگا؟“

اس کے چہرے پر ایک عیارانہ مسکراہٹ ابھری۔ اس نے اپنے لہجے میں مزید نرمی پیدا کی اور بولی ”دیکھو میاں، بات ابھی اس کمرے تک محدود ہے۔ ہم تینوں کے علاوہ کسی اور کو نہیں معلوم کہ تم کیا گل کھلا چکے ہو۔ اگر تم جاہو تو ساری عمر کسی کو معلوم نہیں ہو پائے گا کہ آج کی تاریخ میں یہاں کتنا بڑا طوفان گزر چکا ہے۔“

اب وہ خواجہ کاہن سپنس پیدا کر رہی تھی۔ جی میں آیا کہ اسے دھکا دے کر گھر سے باہر چلا جاؤں بعد میں جو ہو، دیکھا جائے گا لیکن اس کے سنگین مناج برآمد ہو سکتے تھے۔ وہ عورت منہ بھر میں شور مچا کر پورے محلے کو اکٹھا کر سکتی تھی اور میرے پاس اپنی صفائی میں کہنے کے لیے کچھ نہ ہوتا۔ میری قیص ابھی تک اگلی پرنگی ہوئی تھی۔

میں بے بسی کے عالم میں اپنے بازوؤں کی ابھری ہوئی مچھلیاں دیکھ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس موقع پر کوئی جذباتی قدم اٹھانا سراسر حماقت ہوگی لہذا اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بولا ”جی، میں سمجھ رہا ہوں۔ آپ جیسا نہیں کی میں ویسا ہی کروں گا۔“

”دیکھو میاں! میں صاف اور کھری بات کرنے کی عادی ہوں۔ میری بیٹی کی زندگی تو تم نے برباد کر دی، تم جانتے ہو کہ عورت کی عزت ایک نازک آئینے کی طرح ہوتی ہے جو ایک بار ٹوٹ جائے تو اسے کوئی نہیں پوچھتا اور اگر کوئی

بچہ وچ ہو گیا تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسی دہلیز پر بیٹھی رہے گی۔ اس لیے اب تم ہی وہ واحد فرد ہو جو اسے سہارا دے سکتے ہو۔“

”جی..... میں..... میں..... کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“ میں ہکا ماتے ہوئے بولا۔

”ہاں، تم.....“ وہ مکاری سے بولی ”وہ گا نا نہیں سنا۔ تمہی نے درد دیا ہے تمہی دوا دینا۔“

”لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ میں نے دفاعی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

”سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اگر تم کسی لڑکی کی تنہائی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی عزت سے کھیل سکتے ہو تو اسے مزید ذلت اور رسوائی سے بچانے کے لیے اس کا ہاتھ بھی تھام سکتے ہو۔“

”ٹھیک ہے، میں اپنے گھر والوں سے بات کروں گا۔“ میں نے گواہی کے لیے کوشش کی۔

وہ عورت بھی گھاٹ گھاٹ کا پانی پئے ہوئے تھی۔ میری طرف دیکھ کر طنز یہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولی ”ان سے بعد میں بات کرتے رہنا۔ تمہارا نکاح ابھی اور اسی وقت شمعین سے ہوگا۔ اگر منظور ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ میرے پاس دوسرا اختیار موجود ہے۔ اب فیصلہ تمہیں کرنا ہے، نیک نامی چاہتے ہو یا بدنامی!“

مجھے یوں لگا جیسے کمرے کی چھت میرے سر پر آن گری ہو۔ اس عورت نے مجھے بڑی ہوشیاری سے اپنے جال میں پھنسا لیا تھا۔ میری تو وہی کیفیت تھی کہ آگے کنواں اور پیچھے کھائی۔ اگر اپنی عزت بچانے کی خاطر شمعین سے نکاح کر لیتا تو گھر والوں، چچا، چچی اور سب سے بڑھ کر زینی کے سامنے کیا نام لے کر جاتا۔ ان کے سامنے شمعین سے نکاح کا کیا جواز پیش کرتا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ایسی صورت میں میری بچپن کی محبت زینی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے جدا ہو جاتی جو مجھے کسی طور گوارا نہیں تھا۔ میں نے زینی سے محبت نہیں بلکہ عشق کیا تھا۔ جان تو دے سکتا تھا لیکن زینی سے بچھڑنے کا تصور بھی میرے لیے سوہان روح تھا۔

دوسری صورت اس سے بھی زیادہ خطرناک تھی۔ شمعین سے نکاح نہ کرنے پر وہ عورت مجھے بڑی طرح بدنام کر دیتی۔ سارے شواہد میرے خلاف تھے۔ میڈیکل ٹیسٹ اور ڈی این اے کے بعد تو میرے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہ بچتا پھر پولیس، تھانہ، پکھری اگر وہاں سے بیسیوں کے عوض گلو خلاصی

ہو جاتی تب بھی میرے ماں باپ کی عزت دو کوڑی کی رہ جاتی۔ میرا عزت دار باپ جو شان سے سڑاٹھا کر اور غر سے سینہ چھلا کر بچھڑا تھا، وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔ خاندان اور محلے کی عورتیں طعنے دے دے کر میری ماں کا کیچا چھلکی کر دیتیں۔ بہن کے لیے رشتے آتا بند ہو جاتے اور سب سے بڑھ کر زینی، کیا وہ مجھے ایک بدکردار شخص کے طور پر قبول کر سکتی تھی؟ اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ میں شمعین کے ساتھ منہ کالا کر چکا ہوں تو وہ زندگی بھر میری شکل نہ دیکھتی۔ گویا شمعین سے نکاح کروں یا نہ کروں، زینی میرے ہاتھ سے لگی جا رہی تھی۔ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ فی الحال نکاح کے لیے رضامندی ظاہر کروں اور یہ شرط لگا دوں کہ جب تک میں اپنے گھر والوں کو رضامندی نہیں کر لیتا، اس نکاح کو خفیہ رکھا جائے گا۔ بعد میں کچھ دے دلا کر شمعین سے چھکارا حاصل کر لوں گا۔ میں نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور آہستہ سے بولا ”ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں لیکن میری ایک شرط ہے۔“

”وہ کیا؟“

”یہی کہ جب تک میں اپنے گھر والوں کو رضامندی نہ کر لوں، اس وقت تک اس نکاح کو خفیہ رکھا جائے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ شمعین باعزت طریقے سے اس گھر سے رخصت ہو کر جائے۔“

وہ عورت یہ سن کر نہال ہو گئی اور بولی ”میں بھی یہی چاہتی ہوں۔ مجھے تمہاری شرط منظور ہے۔ تم غسل کر لو، میں قاضی اور گواہوں کا بندوبست کرتی ہوں۔“

ایسا لگتا تھا کہ قاضی اور گواہ بھی تیار بیٹھے تھے۔ آدھے گھنٹے میں ہی وہ انہیں لے کر آگئی۔ پھر سب کچھ آٹا فانا ہو گیا۔ اب شمعین قانوناً اور شرعاً میری بیوی بن چکی تھی۔ اس وقت مجھے یوں لگا جیسے زینی مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دور چلی گئی ہے اور نام مشتق کی داستانوں میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا ہے۔ پھر میں نے اپنے دل کو تسلی دی کہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ میں کسی نہ کسی طرح شمعین سے چھکارا حاصل کر لوں گا لیکن میں یہ نہیں جانتا تھا کہ میرا واسطہ کن لوگوں سے پڑ گیا ہے۔

میں ہارے ہوئے جواری کی طرح گھر واپس آ گیا اور کمر بند کر کے لیٹ گیا۔ دل پر ایک بوجھ تھا۔ ہمیر کی خلش بے گل کے دے رہی تھی کہ اب زینی کا سامنا کس طرح کر سکوں گا لیکن اس سے معمول کے مطابق ملنا بھی ضروری تھا، ورنہ وہ ضرور پوچھتی کہ میں نے اس کے یہاں آنا کیوں کم

امام حنبل بن احمد اور مشہور ڈاکو ابوالہیثم

امام موصوف کے بیٹے عبداللہ کہتے ہیں کہ میرے والد ہمیشہ کہتے تھے کہ ”زم اللہ یا اہلہم“ غفر اللہ لابن اہلہم“ ایک دن پوچھا کہ ابوالہیثم کون ہے؟

کہا جس دن سپاہی مجھے دربار میں لے گئے اور کوڑے مارے گئے تو جب ہم راہ سے گزر رہے تھے، ایک آدمی مجھ سے ملا۔ اور کہا کہ مجھ کو جانتے ہو؟ میں مشہور چور اور عیار ابوالہیثم حداد ہوں۔ میرا نام شاہی دفتر میں ثبت ہے۔ بار بار چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا اور بڑی بڑی سزائیں جھیلیں۔ صرف کوڑوں کی مار ہی گنوں تو اٹھارہ ہزار ضربیں تو میری پیٹھ پر ضرور پڑی ہوں گی۔ بااں ہمہ میری استقامت کا یہ حال ہے کہ اب تک چوری سے باز نہ آیا۔ جب کوڑے کھا کر جیل سے نکلا، سیدھا چوری کی تاک میں چلا گیا۔ میری استقامت کا یہ حال شیطان کی طاعت میں رہا دنیا کی خاطر۔ افسوس ہے تم پر اگر اللہ کی محبت میں اتنی بھی استقامت نہ دکھاؤ۔ اور دین حق کی خاطر چند کوڑوں کی ضرب برداشت نہ کر سکو۔“ میں نے جب یہ سنا تو اپنے جی میں کہا اگر حق کی خاطر اتنا بھی نہ کر سکتا جتنا دنیا کی خاطر ایک چور اور ڈاکو کر رہا ہے تو ہماری بندگی پر ہزار جیف اور ہماری خدا پرستی سے بت پرستی لاکھ درجہ بہتر!

اقتباس: تذکرہ امولانا ابوالکلام آزاد
مرسلہ: تاجور سلیم دانش، ہرنگری بالا، لاہور

میری شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انہیں شاید مجھ سے اسی جواب کی توقع تھی چنانچہ انہوں نے یہی پیغام چچی جان کو بھی بھجوا دیا۔ وہ تھوڑی بہت تملائیں لیکن چچا جان کے سمجھانے پر خاموش ہو گئیں۔ میرے پاس اب وقت کی بہت کمی ہو گئی تھی۔ صبح سے شام تک اسپتال میں ڈیوٹی دیتا۔ شام کو گھر آنے کے بعد کچھ دیر آرام کرتا پھر دوسری ڈیوٹی یعنی شہینہ کے پاس جانے کے لیے روانہ ہو جاتا۔ اس طرح میری واپسی رات گئے ہوتی۔ گھر والوں سے یہ بہانہ بٹا کر تھا کہ ایک دوست کے ساتھ کبائٹڈ اسٹڈی کر رہا ہوں۔ ایسی صورت میں زینی کے پاس جانے کے لیے کس طرح وقت نکالنا لیکن مجھے شدت سے اس بات کا احساس تھا کہ وہ میرا انتظار کر رہی ہوگی۔

چھٹی والے دن میں ہمت کر کے اس کے پاس چلا گیا۔ میرا خیال تھا کہ شہینہ کی طرح وہ بھی میرے نہ آنے پر ناراض ہوگی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اس کے برعکس وہ مجھ سے بڑی خوش دلی سے پیش آئی۔ اس نے مجھے امتحان میں پاس ہونے پر مبارکباد دی۔ اپنے ہاتھ سے گرما گرم پکڑے اور چائے بنائی اور میرے سامنے رکھتے ہوئے بولی ”گو کہ یہ برسات کا موسم نہیں ہے لیکن جاتی ہوں کہ تمہیں میرے ہاتھ کے بنے ہوئے پکڑے اچھے لگتے ہیں حالانکہ اصولاً تو تمہیں مٹھائی لے کر آنا چاہیے تھا۔“

”مٹھائی کیسے لے کر آتا؟“ میں نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا ”مجھ پوچھو تو مجھے یہاں آتے ہوئے ہی ڈر لگ رہا تھا کہ نہ جانے میری طویل غیر حاضری پر تمہارا کیا رد عمل ہو؟“ ”ہم اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر ناراض ہونے والے نہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی مصروفیت رہی ہوگی۔ اسی لیے نہیں آ سکے۔ خیر چھوڑو، ان باتوں کو۔ یہ بتاؤ کہ اسپتال کی ڈیوٹی کیسی چل رہی ہے؟“

”اس کے بعد ہم ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ دو گھنٹے بعد واپسی ہوئی تو میرے دل پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ میں زینی اور شہینہ کا موازنہ کرنے لگا۔ اب مجھے احساس ہوا کہ زینی کتنے بڑے ظرف کی مالک تھی۔ اس نے میری طویل غیر حاضری پر بھی کوئی شکوہ نہیں کیا جبکہ شہینہ سے تین چار دن بھی برداشت نہ ہو سکا اور اس نے مجھے دھمکی آمیز رقعہ بھیج دیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ شہینہ سے جلد از جلد گلو خلاصی کی کوشش کروں گا اور اگر وہ نہ مانی تو اسے زبردستی طلاق دے دوں گا۔ چاہے اس کا نتیجہ کچھ بھی نکلے۔

”طرح منہ چپا کر گھر بھینے کی اجازت نہیں دے سکتی۔“ وہ عورت بڑی ہوشیاری سے میرے گرد جال بکیتی جاری تھی اور مجھے اندازہ بھی نہیں ہوا کہ میں کس دلدل میں آخرتا جا رہا ہوں۔ میں نے سوچا گھٹنا بھری تو بات ہے، وقت نکال کر آیا کروں گا۔ اگر اس طرح راز کی پردہ پوٹی ہو سکتی ہے تو یہ کھانے کا سودا نہیں۔ میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے، آئندہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔“ ”یہ ہوئی نا بات!“ وہ خوش ہوتے ہوئے بولی ”جہیں تھوڑی سی بہادری دکھانا ہوگی، ورنہ خاک چاٹنے رہ جاؤ گے۔ اب تم شہینہ کو مٹاؤ، میں تمہارے لیے چائے بناتی ہوں۔“

میں مجھے دل کے ساتھ دوسرے کمرے میں داخل ہوا تو شہینہ منہ پھیرے کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے پشت سے جا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور دوسرے ہاتھ سے اس کا چہرہ اپنی طرف کرتے ہوئے بولا۔

”شہینہ، مجھ سے غلطی ہوگی، معاف کر دو۔ اب ایسا نہیں ہوگا۔“

”معافی کس بات کی؟“ وہ اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے بولی ”مجھے آپ کی مجبوریوں کا احساس ہے، جو کچھ ہوا، اس میں آپ کا کوئی قصور ہے اور نہ میری کوئی غلطی۔ ہماری قسمت میں نہیں لکھا دیا گیا تھا سو وہ ہو گیا لیکن اب میں آپ کی امانت ہوں۔ اس لیے تھوڑا بہت شکوہ کرنے کا حق تو مجھے ہے؟“

”کہہ جو دیا کہ آئندہ شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔ بس اب تم اپنا موڈ ٹھیک کر لو۔“

اس نے اپنا موڈ ایسا ٹھیک کیا کہ میں دو گھنٹے تک اس کی قید سے رہائی نہ پاسکا۔ یوں لگ رہا تھا کہ اس کی منہ زور جوانی نے زینی کے پیار کو شکست دے دی تھی لیکن ایسا نہیں تھا کہ زینی کے پیار کی غمراہی پانی کے ایک عارضی ریلے میں بہہ جاتی۔ شہینہ قیدی دس لڑکیاں بھی زینی کو مجھ سے جدا نہیں کر سکتی تھیں لیکن یہ میری اس وقت کی سوچ تھی، حقیقت کا اندازہ مجھے بعد میں ہوا۔

رزالت آنے کے فوراً بعد ہی میرا ہاؤس جاب شروع ہو گیا۔ اس طرح مجھے ایک بہانہ ہاتھ آ گیا اور میں نے اسی سے صاف صاف کہہ دیا کہ ہاؤس جاب پورا ہونے سے پہلے

کر دیا ہے؟ اب مجھے منافق بن کر یہ دُہرا کھیل کھیلنا تھا۔ میں زینی کا محبوب ہونے کے ساتھ ساتھ شہینہ کا شوہر بھی بن چکا تھا اور مجھے یہ دونوں کردار نبھانا تھے۔

میں تین چار دن تک گھر سے باہر نہیں نکلا۔ کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ اس دوران میں نے کتابوں کو بھی ہاتھ نہیں لگایا۔ چوتھے روز ایک بچہ ہمارے دروازے کے باہر آیا اور مجھے ایک رقعہ دے کر چلا گیا۔ یہ شہینہ نے بھیجا تھا اور اس میں لکھا تھا ”میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں ورنہ۔۔۔۔۔“

اس ورنہ میں جو دھمکی پوشیدہ تھی۔ اس کا تصور کرتے ہی میرے ہوش اُڑ گئے۔ میں نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا اور شہینہ کے گھر کی طرف چل دیا۔ وہ مجھ سے سخت ناراض تھی۔ مجھے دیکھتے ہی دوسرے کمرے میں چلی گئی البتہ اس کی ماں نے میری بڑی آؤ بھگت کی لیکن اس کا انداز ساں نہیں بلکہ تانیکہ جیسا تھا جو گلاب کو قابو میں رکھنے کے لیے ہر جتن کرتی ہے۔ میں اس کی وارنٹی کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ”شہینہ کو کیا ہو گیا۔ مجھے دیکھتے ہی دوسرے کمرے میں چلی گئی؟“

”تم سے ناراض ہے۔“ وہ بناوٹی مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے بولی ”نکاح کے بعد غائب جو ہو گئے تھے۔ اب وہ تمہاری بیوی ہے، اس کا بھی تم پر کوئی حق ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے خالہ لیکن رخصتی سے پہلے میرا یہاں آنا جانا ٹھیک نہیں۔“

”اور یہ رخصتی کب ہوگی؟“

”جب میں اپنے والدین کو راضی کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔“

”اور اگر وہ نہ مانے تو۔۔۔۔۔“

”ایسا نہیں ہوگا۔ میں ان کا اٹکوتا بیٹا ہوں۔ مجھے امید ہی نہیں بلکہ پورا یقین ہے کہ وہ میری بات مان لیں گے۔“ ”دیکھو میاں! میں ان چمکروں میں نہیں پڑتی۔ میرے نزدیک رخصتی سے زیادہ نکاح کی اہمیت ہے۔ اب شہینہ قانوناً اور شرعاً تمہاری بیوی ہے اور میں اسے بخوشی تمہارے ساتھ رہنے کی اجازت دے رہی ہوں۔ یہ تمہاری مرضی ہے کہ اسے یہاں رکھو یا اپنے ساتھ لے جاؤ۔ جب تک تمہارے گھر والے راضی نہیں ہو جاتے، تم شوق سے یہاں آ سکتے ہو۔ جتنا وقت چاہے شہینہ کے ساتھ گزارو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا البتہ میری ایک شرط ہے کہ تمہیں ہر روز یہاں آنا ہوگا۔ چاہے گھٹنا بھر کے لیے ہی آ لیکن اس

اور بولے۔

”یار، تم تو بڑی طرح پھنس گئے۔ وہ لڑکی اور اس کی ماں بہت بڑی حرافہ معلوم ہوتی ہیں۔ انہوں نے سہیں پوری طرح اپنے جال میں جکڑ لیا ہے۔“

”اب ان باتوں کو دہرائے سے کوئی فائدہ نہیں۔ مسئلے کا کوئی حل بتاؤ۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ عورت میرے گھر تک پہنچ جائے۔“

”دیکھو یارا میں تمہارے لیے فلیٹ کا بندوبست تو کر سکتا ہوں۔ دو چار مہینے تک کرایہ بھی نہیں مانگوں گا لیکن تم جانتے ہو کہ میرا باپ کاروباری آدمی ہے۔ زیادہ عرصہ برداشت نہیں کر سکے گا۔ اس دوران اگر تم کچھ بندوبست کر سکتے ہو تو میں تمہاری مدد کے لیے حاضر ہوں۔“

”تم فی الحال فلیٹ کی چابی مجھے دو۔ میں تمہاری دی ہوئی مہلت سے پہلے ہی کوئی انتظام کر لوں گا۔“

عارف نے میرا بہت ساتھ دیا۔ اس نے صرف فلیٹ ہی میرے حوالے نہیں کیا بلکہ قرض حسنہ کے طور پر پچاس ہزار روپے بھی دے تاکہ میں نئے گھر میں ضروری ساز و سامان ڈال سکوں۔ کچھ پیسے میرے پاس بھی تھے۔ ان سے میں نے بیڈروم سیٹ، تھوڑا سا فریج اور کرائی وغیرہ خریدی اور ایک دن خاموشی سے غمینہ کو لے کر اس فلیٹ میں شفٹ ہو گیا۔ غمینہ کی ماں بھی اس کی تنہائی دور کرنے کی غرض سے ساتھ ہی چلی آئی اور بہانہ یہ بنایا کہ بچے کی پیدائش تک اس کا غمینہ کے ساتھ رہنا ضروری ہے۔

اب یہ میرا گھر تھا اور اسے چلانے کی ذمہ داری بھی مجھ پر تھی۔ ہاؤس جا ب ختم ہونے میں ابھی کچھ مہینے باقی تھے۔ اس کے بعد ہی مجھے کوئی ملازمت مل سکتی تھی۔ وہ تو غمینہ ہوا کہ حکومت نے ٹرینی ڈاکٹروں کو معمولی وظیفہ دینا شروع کر دیا لیکن اس سے گھر کے اخراجات پورے نہیں ہو سکتے تھے چنانچہ میں نے ایک کلینک میں پارٹ ٹائم ملازمت کر لی۔ اب میں گھن چکر بن کر رہ گیا تھا۔ صبح سے شام تک اسپتال، پھر کلینک، واپسی میں ایک چکر غمینہ کی طرف۔ اس طرح میں رات بارہ ایک بجے کے قریب گھر پہنچتا۔ شروع شروع میں تو بڑھائی کا بہانہ بنا کر گھر والوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی لیکن وہ بھی دودھ پیٹے بچے نہ تھے۔ انہیں میری سرگرمیوں پر کچھ شک ہوئے لگا۔ اباجان نے اپنے طور پر کچھ انکوائری کی لیکن وہ بھی بات کی تک نہ پہنچ سکے۔

ان حالات میں زینی میرے لیے ایک بھولا بھرا

میں یہ خوشخبری سنا کی کہ میں باپ بننے والا ہوں۔ یہ خبر سننے ہی میرے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ میں تو کچھ اور ہی سوچ کر آیا تھا لیکن یہاں اتنی آنتیں نکلے پڑ گئیں۔ اب بچے کی پیدائش تک غمینہ کو طلاق دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ غمینہ میری حالت دیکھ کر پریشان ہو گئی اور بولی ”کیا بات ہے، آپ کو یہ سن کر خوشی نہیں ہوئی؟“

”یہ بات نہیں ہے غمینہ! میرا مطلب ہے کہ رخصتی سے پہلے اتنی جلدی..... یہ سب کچھ اچھا نہیں لگ رہا ہے۔“

”آپ نے میرے بارے میں بھی کچھ سوچا کہ میں لوگوں کو کیا بتاؤں گی کہ اس بچے کا باپ کون ہے؟ یہ شادی کب تک خفیہ رہے گی؟“

”تم تھیک کھد رہی ہو غمینہ! اب ہمیں اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکالنا ہی پڑے گا۔“

”میں کچھ نہیں جانتی۔ آپ مجھے جلد از جلد یہاں سے لے جائیں۔ اگر اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتے تو میرے لیے عارضی طور پر کوئی ملحدہ مکان لے لیں۔ میں جھوٹے گھر میں گزارہ کر لوں گی۔ اگر آپ نے مزید تاخیر کی تو میں خود ہی اپنا مقدمہ لے کر آپ کے ابا کی عدالت میں پہنچ جاؤں گی۔“

اس کی یہ دھمکی سن کر میں پریشان ہو گیا۔ جانتا تھا کہ وہ ایسا بھی کر سکتی ہے کیونکہ ایسے لوگوں کی نظروں میں اپنی یا دوسروں کی عزت کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ میں نے اسے تسلی دینے کی خاطر کہا۔

”تمہیں ایسا کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ میں جلد ہی کوئی نہ کوئی انتظام کر لوں گا۔“

”آپ کے پاس صرف ایک ہفتہ ہے۔ اس سے زیادہ میں انتظار نہیں کر سکتی۔“

یہ کہہ کر میرے سر سے باہر چلی گئی۔ اس نے چائے کو پوچھا اور نہ ہی میری کوئی خاطر کی۔ اس کی بے مٹنی پر مجھے سخت غصہ آیا۔ انتہائی درجے کی خود غرض عورت تھی۔ اسے صرف اپنی عزت کی فکر تھی۔ میری پریشانیوں کا کوئی احساس نہیں تھا۔

پانی سر سے اوجھا ہوتا جا رہا تھا اور میرے پاس اس مسئلے سے غفلت کی کوئی ترکیب نہیں تھی۔ مجبور ہو کر اپنے ایک دوست عارف کے پاس گیا۔ اس کا باپ بہت بڑا چارپائی ڈیڑھا تھا۔ میں نے اسے اپنا راز دار بنانے کا فیصلہ کیا اور اسے تمام صورت حال بتادی۔ وہ بھی یہ ماجرا سن کر پریشان ہو گیا

انسان سوچتا کچھ اور ہوتا کچھ ہے۔ میں اپنی پلاننگ کر رہا تھا لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ نکاح کو ایک مہینہ بھی نہیں ہوا تھا کہ غمینہ نے بیویوں والا انداز اختیار کرتے ہوئے فرمائش کرنا شروع کر دیں۔ اس زمانے میں ہاؤس جا ب کرنے والوں کو باہر وغیرہ نہیں ملتا تھا اور میں خود اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے گھر والوں کا محتاج تھا۔ ایسی صورت میں غمینہ کی فرمائش کیسے پوری کرتا؟ اسے اپنے ساتھ پا رہے جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جبکہ اس کی خواہش تھی کہ میں اسے کھانا کھلانے کسی ہوٹل میں لے جاؤں یا شاپنگ کراؤں۔ ایک دوسرے تو اس نے دبے لفظوں میں یہاں تک کہہ دیا کہ ہر لڑکی کی طرح اس کی بھی خواہش ہے کہ وہ بھی شادی کے بعد ہی مومن منانے جائے لیکن اس کا یہ ارمان پورا نہ ہو سکا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک دن اس نے اپنی ماں سے میری شکایت کر ڈالی۔ اس پر وہ مکار بڑھیا بڑی ادا سے بولی۔

”بیٹا! میں تمہاری مجبوریاں سمجھتی ہوں۔ تم اسے اپنے ساتھ باہر نہیں لے جا سکتے تو کیا ہو، کچھ پیسے اس کے ہاتھ پر رکھ دو۔ یہ خود ہی اپنی ضرورت کی چیزیں خرید لے گی۔“

میرا ماتھا ٹھنکا۔ گویا مجھے لوٹنے کے منصوبے کا آغاز ہو چکا تھا۔ میں اس وقت تو انہیں مال کر آ گیا لیکن اس کے ساتھ ہی میں نے غمینہ سے جان چڑھانے کی منصوبہ بندی کرنا شروع کر دی۔ بہت سوچ بچار کے بعد یہی حل سامنے آیا کہ غمینہ اور اس کی ماں سے صاف صاف کہہ دوں کہ میرے گھر والے اسے شادی پر رضامند نہیں ہو رہے۔ وہ پہلے ہی بچا زاد سے میرا رشتہ طے کر چکے ہیں اور ان کے لیے زبان دے کر پھر جانا ممکن نہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر میں نے اس شادی پر اصرار کیا تو وہ مجھے عاق کر دیں گے اور مجھے ان کی دولت اور جائداد میں سے چھوٹی کوڑی بھی نہیں ملے گی۔

میں یہ فیصلہ کر کے مطمئن ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ لاپرواہ لوگ ہیں جب انہیں معلوم ہوگا کہ غمینہ سے شادی کرنے کی صورت میں مجھے دولت اور جائداد سے محروم ہونا پڑے گا تو وہ خود ہی مجھ سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہے گی۔ اس طرح میں مہر کے علاوہ لاکھ دو لاکھ روپے اضافی دے کر اپنی جان چھڑا لوں گا۔ یہی سوچ کر میں غمینہ کے گھر پہنچا تو وہاں ایک نئی خبر میری منتظر تھی۔ مجھے دیکھ کر اس مکار بڑھیا کے چہرے پر ایک مستحق خیر مسکراہٹ پھیل گئی۔ جب اس نے ہمیں تنہائی کا موقع فراہم کیا تو غمینہ نے شرماتے ہوئے مجھے اپنی دانست

دوایا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک گھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ سسٹمز ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے براہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالہ (بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 600 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 7,000 روپے

بقیمت ماک کے لیے 6,000 روپے

آپ ایک وقت میں تین سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم ای حساب ارسال کریں، ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا مانی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجے پر ہماری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C، سیشن ڈینس ہاؤسنگ اتھارٹی، مین روڈ، کراچی

فون: 35895313، 35802551

خواب بن کر رہ گئی تھی۔ کبھی کبھی اس کا خیال آتا تو دل میں ایک نیسی اٹھنے لگتی۔ ہر نیتے سوچتا کہ چھٹی والے دن اس سے ملنے ضرور جاؤں گا لیکن شہینہ پہلے سے ہی کوئی نہ کوئی پروگرام بنا کر بیٹھی ہوئی۔ جیسے جیسے ڈیوری کے دن نزدیک آ رہے تھے، اس کے خروں اور فرمائشوں میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ میں اپنے گھر بالکل نہ جاؤں اور سارا وقت اس کی پٹی سے لگا بیٹھا رہوں۔ ایک دن مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور میں وقت نکال کر زینبی سے ملنے چلا گیا۔

وہ مجھے کافی کمزور لگ رہی تھی۔ یوں لگا جیسے وہ کافی دنوں سے بیمار ہو۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر پھٹکی سی مسکراہٹ اُبھر آئی لیکن اس نے کوئی شکوہ نہیں کیا اور نہ ہی پوچھا کہ میں اتنے دنوں تک کیوں نہیں آیا وہ بالکل نارمل انداز میں مجھ سے باتیں کرتی رہی لیکن میں اس کے چہرے پر لکھی پریشانی پڑھ چکا تھا جسے وہ مجھ پر ظاہر نہیں کرتا چاہے وہ تھی۔ میرے لیے اس کا یہ رویہ بھی پریشان کن تھا۔ اگر وہ یونہی دل ہی دل میں کھتی رہی تو یہ اس کی صحت کے لیے نقصان دہ ہو سکتا ہے۔

میں نے سوچ لیا تھا کہ اب باقاعدگی سے زینبی کے پاس جایا کروں گا تا کہ وہ میرے بارے میں کسی بدگمانی کا شکار نہ ہو۔ میں اسے ہر حال میں خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ میری محبت تھی اور اسے ایک نہ ایک دن میری زندگی میں آنا ہی تھا لیکن شہینہ نے مجھے کچھ اس طرح اپنے جال میں جکڑ رکھا تھا کہ میں کوشش کے باوجود زینبی کی طرف نہ جاسکا۔ اسی اثنا میں شہینہ کی ڈیوری کا وقت قریب آ گیا اور مجھے اس کی ناز برداری کرنے کے لیے بیک وقت اسپتال اور کلینک دونوں جگہ سے چھٹی کرنا پڑی۔

شہینہ نے ایک خوبصورت بچی کو جنم دیا جو مجھے یوں لگا جیسے میرے پاؤں میں زنجیر بڑی ہے۔ اب اگر میں اسے طلاق دیتا تو وہ مجھ سے نان و نفقہ کا مطالبہ کر سکتی تھی اور اس طرح مجھے ایک مخصوص مدت تک بچی کے اخراجات کے لیے ایک معقول رقم اسے دینا پڑتی چنانچہ مجھے ایک بار پھر اپنا ارادہ ملتوی کرنا پڑا اور شہینہ سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے مزید سوچ بچار میں مصروف ہو گیا۔ اب شہینہ اور اس کی ماں کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا کہ میں گھر والوں سے بات کر کے شہینہ کو اپنے گھر لے جاؤں۔ شاید وہ مالی تنگی برداشت نہیں کر پاری تھیں اور میرے باپ کی دولت پر غش کرنے کا منصوبہ ادھورا رہ گیا تھا لیکن میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ مجھے معلوم تھا

کہ ابا جان یہ سنتے ہی مجھے بچ بچ عاق کر دیں گے اور اس کے بعد میں گھر کا رہوں گا نہ گھٹاں کا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ زینبی مجھ سے ہمیشہ ہمیش کے لیے دور ہو جانے کی جو مجھے کسی قیمت پر بھی گوارا نہیں تھا۔ چنانچہ میں ان لوگوں کو کسی نہ کسی طرح ٹالتا رہا۔

ہاؤس چاہ ختم ہوتے ہی مجھے ایک سرکاری اسپتال میں ملازمت مل گئی اور میں نے کوشش کر کے اپنا ٹرانسفر حیدرآباد کر والیا کیونکہ کراچی میں رہنا میرے لیے خطرے سے خالی نہ تھا، آخر میں کب تک چوروں کی طرح زندگی گزارتا رہتا۔ ابا جان اس ملازمت کے سخت خلاف تھے۔ انہوں نے مجھ سے باہر جانے کے پروگرام کے بارے میں پوچھا تو میں نے بتا دیا کہ تیار ہی نہ ہونے کی وجہ سے امتحان نہ دے سکا۔ اب اگلے سال کوشش کروں گا چنانچہ وہ مطمئن ہو گئے اور میں حیدرآباد چلا آیا۔

جانے سے پہلے میں زینبی سے مل گیا تو وہ سوکھ کر بڑیوں کا ڈھانچا بن چکی تھی۔ نہ جانے اسے کون سا روگ لگ گیا تھا جوہ اندر ہی اندر مغل رہی تھی۔ میں نے اس سے بہت پوچھا لیکن وہ یہی کہتی رہی کہ اسے کوئی بیماری نہیں ہے۔ بس تھوڑی سی کمزوری ہے جبکہ بچی جان کا کہنا تھا کہ اس کی بھوک پیاس سب ختم ہو چکی تھی۔ کھانے کی طرف وہ دیمکتی بھی نہیں۔ بہت اصرار کرنے پر دو چار لقمے منہ میں ڈال لیتی ہے بس ہر وقت اس کی نظریں دروازے پر رہتی رہتی ہیں۔ جیسے اسے کسی کا انتظار ہو، مگر ڈاکٹر کو دکھانے ہیں۔ سب کا یہی کہنا ہے کہ اسے کوئی بیماری نہیں ہے۔ بس کوئی سوچ ہے جو اسے اندر ہی اندر گھلار رہی ہے۔

”تمہارے آجانے سے اس کا دل بہل جاتا تھا لیکن تم نے بھی مصروفیت کی وجہ سے آنا جانا کم کر دیا اور اب تو تم بھی دوسرے شہر جا رہے ہو۔ نہ جانے کتنے مہینوں بعد شکل دکھایا کرو گے۔“

میں زینبی کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا اور میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ اپنا تبادلہ منسوخ کر وا دوں لیکن یہ اتنا آسان نہیں تھا لہذا مجبوراً زینبی کو الوداع کہہ کر اور ہر شے آنے کا وعدہ کر کے واپس چلا آیا۔ ایک مہینے بعد رہائش کا بندوبست ہو گیا تو میں نے شہینہ کو بھی اپنے پاس ہی بلالیا۔ اس کی ماں بھی کہاں چھپا چھوڑنے والی تھی، وہ بھی ساتھ ہی چلی آئی۔ شہینہ بہت خوش تھی کہ اب اس کو آزادی سے میرے ساتھ کھونے کا موقع ملے گا۔ میں بھی مطمئن ہو گیا

کہ وقتی طور پر اس نے میرے گھر جانے کی ضد چھوڑ دی تھی۔ اس واقعے کے ایک مہینے بعد مجھے ابا جان نے فون پر بتایا کہ زینبی کی حالت بہت خراب ہے اور وہ مجھے یاد کر رہی ہے لہذا میں فوراً کراچی پہنچوں۔ یہ اطلاع ملنے ہی میری آنکھوں کے آگے اندھیرا اُبھا گیا۔ میں نے شہینہ سے ایک ضروری کام کا بہانہ بنایا اور فوراً ہی کراچی کے لیے روانہ ہو گیا۔ زینبی کے گھر پہنچا تو اس کی حالت بہت خراب تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں چراغ روشن ہو گئے۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے کمرے میں موجود سب لوگوں کو باہر جانے کے لیے کہا جیسے تنہائی میں مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہی ہو۔ جب سب لوگ باہر چلے گئے تو اس نے مجھے اپنے پاس بلایا اور میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے نجف آواز میں بولی۔

”تم نے جو کچھ کیا، اس کے لیے میں تمہیں کوئی الزام نہیں دوں گی البتہ اتنی شکایت ضرور ہے کہ تم نے مجھ سے اتنی اہم بات چھپائی حالانکہ مجھ سے لے کر آج تک تم مجھ سے ہر بات شیئر کرتے آئے ہو۔ میں انتظار ہی کرتی رہی کہ تم کبھی نہ کبھی مجھے اس راز میں شریک کر لو گے پھر ہم مل کر اس مسئلے کا کوئی حل تلاش کر لیں گے مگر شاید تم نے مجھے اس قابل ہی نہیں سمجھا۔ یقین جانو، اگر تم مجھے اپنا ہم راز بنا لیتے تو میں خود تباہی جان کو اصرار کر کے شہینہ کو دہن بنا کر لاتی۔ کیونکہ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ جو کچھ ہوا، تمہارا اس میں کوئی قصور نہیں تھا۔ تمہیں اپنے خاندان کی عزت بچانے کے لیے یہ قدم اٹھانا پڑا۔ اس کے لیے میں تمہیں معاف کرتی ہوں۔ ہو سکے تو مجھے نجی معاف کر دینا کہ میں تمہارے کسی کام نہ آ سکی۔“

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ زینبی کو یہ سب باتیں کیسے معلوم ہوئیں؟ شہینہ، اس کی ماں، قاضی اور دو گواہوں کے علاوہ کسی کو اس نکاح کے بارے میں علم نہیں تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ شہینہ یا اس کی ماں نے کسی ذریعے سے زینبی تک یہ کہانی پہنچا دی ہو تا کہ وہ مجھ سے بدلتی ہو جائے کیونکہ انہیں بھی میرے اور زینبی کے تعلق کے بارے میں تھوڑا بہت علم تھا۔ میں نے بدحواسی کے عالم میں زینبی سے پوچھا ”یہ تم کیا کہہ رہی ہو زینہ! میں نے ایسا کیا کر دیا؟“

”جان امیرا آخری وقت قریب آن پہنچا ہے۔ اب تو مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ۔ یقین کرو میں تم سے کوئی شکایت نہیں کروں گی۔ اگر شکایت کرنا ہوتی تو بہت پہلے کر چکی ہوتی لیکن میں تمہاری پریشانی میں اضافہ نہیں کرنا چاہتی تھی جو ہونا

ملک کی تقسیم کے بعد سوائے قسادات کے اور کچھ ذہن میں باقی نہ رہا۔ ملک بکھرا، دنیا بکھری اور اس کے ساتھ ہی ہی حسین و نازک قدریں چور چور ہو گئیں۔ مقصدی ادب کے نعرے نے اور زیادہ گڑ بڑا دیا۔ کیوں لکھیں اور کیا لکھیں؟ کہ مجھے میں پڑ کر اور بھی راستہ کم ہو گیا۔ انجمن ترقی پسند معنفین نے بہت کچھ دیا اور بہت کچھ مٹا دیا۔ کتنے نئے سانس ملے اور پھر انے چھڑ گئے اور پھر ”وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا۔“

انجمن کے پرچے اُڑ گئے۔ بہنیں گروپ جس کی طرف لوگوں کی نظریں اٹھا کرتی تھیں، بفلوں میں غرق ہو گیا۔ ظاہر ہے صرف رسالوں کے لیے لکھ کر روزی نہیں کمائی جاسکتی۔ نہ ناولیں اور افسانوں کے مجموعوں سے بہنیں کا خرچ چل سکتا ہے۔ فلم ہی ایک ایسی لائن ہے جہاں اگر ہاتھ لگ جائے تو فلم چلا کر روٹی کا سہارا ہو سکتا ہے۔

فلموں کے لیے لکھتے وقت معلوم ہوا کہ یہاں نہ بیباکی کی دھول چلتی ہے نہ صاف گوئی کا کام آتی ہے۔ یہاں تو وہ چڑ چاہیے جو چھپر پھاڑ کر دودت لائے۔ یہاں ایک خاص بندگی ہوئی لکیر کے مطابق چلنا ہوگا۔ لہذا چلنے والے چلے اور ناک کے بل چلے۔

اقتباس: عصمت چغتائی
مرسلہ: راجہ احمد، گجرات

تھا وہ ہو چکا۔ شاید میری قسمت میں یہی لکھا تھا۔ البتہ یہی حسرت ہے کہ اس دنیا سے جاری ہوں کہ کاش، تم مجھے اپنا سمجھ کر اس راز میں شریک کر لیتے۔“

میں اس کی بات سن کر تڑپ اٹھا اور بولا ”زینبی۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دین لیکن ڈر رہا تھا کہ کہیں تم مجھ سے دور نہ ہو جاؤ۔ اسی لیے اپنے طور پر اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔“

”اب وہ مصیبت نہیں بلکہ تمہاری بیوی ہے۔ اس کا خیال رکھنا تمہارا فرض ہے۔ میری یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا۔“
یہ کہہ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ میرے ہاتھ پر

پاک، سوسائٹی ڈاٹ کام آپکو تمام ڈائجسٹ
 ناولز اور عمران سیریز بالکل مفت پڑھنے کے ساتھ
 ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک کے ساتھ
 ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے۔
 اب آپ کسی بھی ناول پر بننے والا ڈرامہ
 آن لائن دیکھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ
 لنک سے ڈاؤنلوڈ بھی کر سکتے ہیں۔

For more details kindly visit
<http://www.paksociety.com>

اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور وہ خاموشی سے اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گئی۔ اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی زوردار بارش شروع ہو گئی۔ مجھے یاد آیا کہ جس روز میری محبت کی موت واقع ہوئی تھی، تب بھی بارش ہوئی تھی اور آج جب میری زندگی مجھ سے روٹھ کر جاری تھی تو آسمان کو بھی رونا آ گیا، لیکن میری آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ بہا۔ میں پتھر کے بت کی طرح کم مہم اپنی محبت کی لاش کو دیکھتا رہا۔

زینہ کے چالیسویں کے بعد زندگی معمول پر لوٹ آئی۔ ایسا لگا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ البتہ شہینہ بہت خوش تھی جیسے اس کے راستے کی رکاوٹ ہٹ گئی ہو۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ انہی ماں بیٹی میں سے کسی نے زینہ کو خیر پہنچا دی ہوگی۔ مجھے ان کی شکل سے نفرت ہو گئی تھی، اگر زینہ کی وصیت کا پاس نہ ہوتا تو میں انہیں جو تے مار کر گھر سے نکال دیتا۔

شہینہ نے ایک بار پھر ابا جان کے گھر چلنے کی ضد شروع کر دی تھی۔ تنگ آ کر میں نے بھی جواب دینے کا فیصلہ کر لیا۔ دو ہی صورتیں تھیں یا تو وہ شہینہ کو بہو کے طور پر قبول کر لیتے یا مجھے بھی گھر سے نکال دیتے۔

چنانچہ ایک ایک اینڈر میں گھر گیا اور جی کڑا کر کے انہیں پوری بات بتادی اور ان حالات سے بھی آگاہ کر دیا جن سے مجبور ہو کر مجھے یہ قدم اٹھانا پڑ گیا تھا۔ وہ دم سادھے میری داستان سننے رہے پھر بولے ”جو ہوا، اچھا ہوا۔ تمہارے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے خاندان کی عزت بچانے کے لیے اپنی محبت کی قربانی دی۔ اگر تم نہیں پہلے بتا دیتے تو شاید اس مسئلے کا کوئی حل نکل سکتا تھا۔ مجھے زینہ کی موت کا بہت افسوس ہے۔ میں نے اسے ہمیشہ اپنی بہو کے روپ میں دیکھا تھا۔“

ابا جان نے فرار دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شہینہ کو اپنی بہو کے طور پر قبول تو کر لیا لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی عائد کر دی کہ وہ ان کی زندگی میں اس گھر میں نہیں آئے گی۔ البتہ اگر میں چاہوں تو وہ میرے لیے اسی شہر کے کسی گوش علاقے میں علیحدہ مکان کا انتظام کر سکتے ہیں۔ شاید وہ شہینہ کی ماں کی سادھ کے حوالے سے ڈرتے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ محلے میں کسی کو ان کے رشتے کے بارے میں علم ہو۔

پھر وہی ہوا جو شہینہ نے چاہا۔ ابا جان نے ڈینس میں مجھے مکان خرید کر دے دیا۔ اس کی توہین و آرائش بھی میرے ذوق کے مطابق ہو گئی۔ اس کے علاوہ انہوں نے ذاتی کلیک کھولنے میں بھی مدد کی۔ وہ چاہتے تھے کہ میں

شمارہ اگست 2012ء کی منتخب جہانیاں

ہماری پیشکش.....آپ کا انتخاب

☆ اول: عشق ناتمام.....صبح یار خان

☆ دوم: تقدیر عشق.....شاہین اطہر

☆ سوم: عشق نامکمل.....خرم وجاہت

پہلے دورے اور تیسرے انعام کے لیے آپ جتنی منتخب کیجئے

ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے